خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

pklibrary.com

فروری 2020

بانی

معراج رسول

صفحات 290

قیمت 100 روپے

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد

نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن مینجر

سید منیر حسین

0333-3285269

07 انشائیہ — جون ایلیا
انسانوں کے حقیقی مسائل کے تناظر میں دانشوروں اور حکمرانوں کے رویے

08 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

14 آخری تعاقب — ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

51 گہری چال — نجمہ مودی
آفتاب بن جانے والی ایک بے وقعت عورت کی احسان فراموشی

61 حاصل زندگی — طاہر جاوید مغل
سب کچھ پا کر بھی بے چین رہنے والے ہوشیار لوگوں کی اذیت

70 شہہ زور — اسما قادری
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

101 سراغ — شاکر لطیف
تنہائی سمجھ داری کا مظاہرہ کرنے والے ایک سراغ رساں کی کارستانی

122 بے لگام — ملک صفدر حیات
بے لگام جانوروں کو سدھارنے والے ملک جی کا ایک اور کارنامہ

155 قاتل کون — نسرین اختر نینا
مسیحا کا روپ دھارنے والے سنگدل دوستوں کا رنگ ڈھنگ

تنویر ریاض

ایک کمزور مگر عقلمند حسینہ کا خوفناک انتقام

فارئین

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

مظہر سلیم ہاشمی

جرم کی دلدل میں اترنے والے ایک قاتل کا ماجرا

منظر امام

پل پل جینے کی تمنا میں قدم قدم پر ٹھکرائے جانے والا ہنرمند

انجم فاروق ساحلی

خطرناک سازشوں کے درمیان" جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے" کی کھلی تفسیر

طاہر عمیر

معاشرے کے ناسوروں کے ہاتھوں جنم لینے والے سرد انتقام کی لرزہ خیز روداد

شاہ زین رضوان

ڈرتے ڈرتے قدم اٹھانے والی دوشیزہ کی ایک لمبی چھلانگ

رضوانہ ساجد

اللہ کے ایک نیک فطرت اور برگزیدہ بندے کا مقام

غلام قادر

زندگی کے حسین موڑ پر بچھڑ جانے والی محبتوں کی دل فگار روداد

سلیم اختر

بعد از مرگ بھی ساتھ نبھانے والی شریک حیات کا قصہ

عمر عبداللہ

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

انشائیہ

امید

جون ایلیا

وہ قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کا چین رہی ہے۔ ان زمانوں میں بھی جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ ان زمانوں میں بھی جن کی کچھ نشانیاں ہمارے ہاتھ لگی ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جن کے بارے میں ہم نے کچھ دھندلی کہانیاں سنی ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جو نیم تاریخی کہے جاتے ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جو تاریخی کہلاتے ہیں اور اس زمانے میں بھی جس میں ہم اور تم سانس لے رہے ہیں۔ ہاں وہ قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کا چین رہی ہے اور ہے۔

انسان نے اس کی زندہ رکھنے والی آنچ کے سہارے نہ ختم ہونے والے برفانی دور گزارے۔ وہ سب کچھ وہاں زمین، آسمان اور آگے پیچھے اور دائیں بائیں کا سب کچھ سہتا رہا اور صرف اسی کے سہارے رہتا رہا۔

وہ نہ ہوتی تو آج انسانی تاریخ نام کی کوئی چیز بھی نہ پائی جاتی۔

تُو ہم میں ہے اور اس طرح ہے جس طرح ہم تجھ میں ہوں۔

اگر تو ہم سے، ہمارے دلوں سے کوچ کر جائے

تو ہمارا ہر سانس جاں کنی کا سانس ہو۔

ہماری پتلیاں پتھرانے لگیں اور ہم دم توڑ دیں۔

تُو ہم میں ہے اور اس طرح ہے جس طرح ہم تجھ میں ہوں۔

اے مسیحا زادی! تو ہماری صحت اور طاقت ہے۔

اے دل آبادی، خزاں، بہار اور ان کے بیچ ہماری دل آبادی

تو زردی میں بھی ہمارا آسرا ہے اور سرسبزی میں بھی

ہم نے تجھے چوترے پر بٹھایا اور تیرے دونوں پاؤں

چوترے سے نیچے اپنے سینے پر رکھے

اور پھر بیج ڈالنے والوں نے اتر سے دکن تک

اور پچھم سے پورب تک بیج ڈالے

اور تیرے دونوں پاؤں ہمارے سینے پر تھے

اور پھر فصل پکی اور کاٹی گئی

اناج کو گاہا گیا

اور تیرے دونوں پاؤں ہمارے سینے پر تھے

ہم تیرے ہی سہارے زندہ ہیں۔

اور تیرے ہی بھروسے پر دن اور رات کے سارے کام کرتے ہیں۔

تُو ہی ہمارا آسرا اور ہمارا بھروسا ہے۔

یہ دن بہت بُرے دن ہیں۔

یہ راتیں بہت بُری راتیں ہیں۔

پر ہم تیرے آسرے اور تیرے بھروسے پر گزران کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف ہیبتیں، دہشتیں اور ہلاکتیں ہیں

مگر ہم قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کے چین کے سہارے جیتے ہیں۔

ہم تیرے سہارے جیتے ہیں۔

اور اب بھی اچھے دنوں اور اچھی راتوں کے خواب دیکھتے ہیں

اے قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کے چین! .....

آخری تعاقب تک

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی میں حاکم تو بہت گزرے اور کئی حکومتوں نے بڑا نام بھی کمایا مگر... مغلیہ سلطنت کی بات کچھ نرالی رہی... اس دور کا ہر بادشاہ تاریخ کے آسمان پر روشن ستارے کے مانند نظر آتا ہے... اورنگزیب اور داراشکوہ کے عہد پر جب بھی نگاہ گئی ہمیشہ منفرد احساس نے دل میں جنم لیا... اس دور کے خونیں واقعات نے گویا ایک چٹکی سی بھر لی ہو... محلاتی سازشوں نے کبھی بھی مسندِ احباب کو معاف نہیں کیا... دوستوں کے روپ میں دشمنی نباہنے والے انفرادی فوائد کی خاطر اجتماعی مفادات کو زیروزبر کر گئے اور پھر اپنوں کے ہاتھوں اپنوں نے کیسے کیسے زخم کھائے تاریخی اوراق نے یہ سب کچھ رقم کر لیا تاکہ آنے والی نسلیں ان سے بے خبر نہ رہ سکیں... سلطنت کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ حکمرانی آسان سہی مگر کارِ جہاں بینی دشوار ترین ہے...

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت انگیز واقعات

لال قلعہ کی نئی نویلی چم چم کرتی دیواریں کسی کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ دہلی سے اکبر آباد کی طرف جانے والی سڑک پر سپاہی گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے۔ قریب کے کھیتوں میں کام کرنے والے کسان طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا جنگ چھڑنے والی ہے۔ کسی کا خیال تھا کسی امیر کی سواری اس طرف سے گزرنے والی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کچھ نہیں بس گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ان سب باتوں سے بہت دور قلعہ آگرہ میں بادشاہ کو سونے چاندی میں تولا جا رہا تھا کہ نجومیوں کی تجویز یہی تھی۔ یہ سونا چاندی محتاجوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کارِ خیر کی تعبیر اسی وقت مل گئی۔ راجا راج سنگھ کا پوتا پرشوتم سنگھ ہدایت و توفیق الٰہی کی بدولت وادی گمراہی سے نکل کر شاہراہِ ایمان پر آیا۔ بادشاہ نے سعادت مند نام رکھا۔ خلعتِ خاصہ اور ہزار روپے انعام عطا فرمائے۔ اس سے اگلے ہی دن محل دار خاں دکن سے آ کر سعادت حاضری سے مشرف ہوا۔ بادشاہ نے اسے بھی نیک شگون جانا اور اسے طرح طرح کے خیالات سے سرفراز فرمایا۔ چار ہزاری ذات اور دو ہزار سوار کا منصب عطا کیا۔ بیس ہزار روپے انعام بھی عطا ہوا۔

ان پے در پے واقعات نے یہ گواہی دے دی کہ اب عازمِ سفر ہوا جا سکتا ہے۔ نجومیوں نے بھی تائید کر دی۔ حکمِ سفر ہوا تو راستوں کے نصیب جاگے۔ بادشاہ کی سواری فوج ظفر موج کو ہم رکاب لیے دہلی کی طرف روانہ ہوئی جسے اس نے نیا دار الخلافہ قرار دیا تھا اور شاہ جہاں آباد نام تجویز کیا تھا، لال قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ آٹھ سال کی مدت میں ساٹھ لاکھ روپے کے خرچ سے تعمیر ہوا تھا۔

بادشاہ روانہ ہوا اور آگرے کے پاس موضع گھاٹ سائی میں اپنے مبارک دستور کے مطابق تین روز قیام کیا تا کہ لشکر والے سامانِ سفر درست کر سکیں اور پیچھے رہ جانے والے لشکر سے آ ملیں۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے خان عالم میر شکار... جو شکاری پرندوں کو پرواز دیتا اور تمام پرندوں کی نگہداشت میں ماہر کامل تھا... کو طلب کیا۔

خیمے کا پردہ ہٹا اور خان عالم سر جھکائے حاضر ہوا۔ قاعدے کے مطابق فرشی سلام گزارا اور ہاتھ باندھ کر خاموش کھڑا ہو گیا تا کہ بادشاہ خود اپنا مطلب بیان کرے۔

''خان عالم! تم جان سکتے ہو گے کہ ہم نے تمہیں کیوں طلب کیا ہے؟''

''حضور مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ بندہ تعمیلِ حکم کو حاضر ہے۔''

''پالم کی شکارگاہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''زیادہ دور نہیں۔''

''تو پھر آپ ہمارے ساتھ چلیے۔ کچھ وقت شکار میں گزارتے ہیں۔''

''آپ کی ہم رکابی میرے لیے باعثِ فخر و اعزاز ہو گی۔''

''چلنے کا بندوبست کیجیے۔''

یہاں سے کوچ کر کے رعیت کی فلاح و بہبود کے واسطے شاندار سپاہیوں کا ایک دستہ مامور کر دیا کہ لشکر شاہی کے کوچ کرنے سے راستے کی کھیتیاں برباد نہ ہو جائیں۔

ان سب تیاریوں کے بعد جب کوچ ہوا تو قصبہ متھرا میں خیمے ہوئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ قریب کے جنگل میں شیروں کا کچھار ہے جو آس پاس کی رعیت کی زندگی عذاب کیے ہوئے ہیں۔ آئے دن یہ شیر مویشیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ شاہی خیمے لگتے ہی آس پاس کے لوگوں نے بھی آ کر شکایت کی۔ بادشاہ کا ارادہ تو پالم جانے کا نہ تھا لیکن رعیت کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے بے تامل ادھر روانہ ہوا۔

اس شکار کے دوران دو تنومند شیر اور شیرنیاں شکار کیں۔ شیر کا ایک بچہ زندہ ہاتھ آیا۔

دہلی کے صوبہ دار اعتقاد خاں نے شہر سے ایک منزل آگے آ کر بادشاہ کی رکاب کو بوسہ دینے کا فخر حاصل کیا۔

بادشاہ کی سواری آگے بڑھی اور دریائے جمنا کے کنارے سلیم گڑھ میں خیمہ زن ہوئے۔ دوسرے روز جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے مقبرے کی زیارت کا قصد کیا۔ اس مقدس اور تبرک روضے کی زیارت کر کے خدام اور مجاوروں کو انعام عطا کیا۔ اس کے بعد خواجہ نظام الدین اولیاء کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس روحانی سعادت کے بعد پالم روانہ ہوئے۔ اس فرحت بخش قصبے میں چار روز تک شکار کے شغل سے محظوظ ہوتے رہے۔ ایسی دلچسپ تفریح بخش صید افگنی ہوئی کہ شکاریوں کے دل خوش ہو گئے۔

وہ دہلی شہر میں داخل ہوا۔ ابوالمظفر شہاب الدین صاحب قراں ثانی شاہ جہاں بادشاہ کے نعرے بلند ہوئے۔ ان نعروں کی گونج میں وہ شاہ جہاں آباد (دہلی) میں نو تعمیر لال قلعہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔

باہر کی محفلوں سے فارغ ہو کر جب بادشاہ محل کے اندر گیا تو ملکہ ممتاز محل نے سونے چاندی کے تھال اور لعل وگہر کے طبق نچھاور کیے۔ اس کے بعد دوسری خواتین نے تعظیم وتسلیم اور تہنیت کے مراسم ادا کیے۔ بادشاہ نے بھی جواب میں بیگم کو چار لاکھ روپے نقد اور ایک لاکھ روپے کے مرصع آلات مرحمت کیے۔ اسی طرح تمام حرم کی خواتین کو اور امراء کو خلعت، نقد رقم اور جواہرات عطا ہوئے۔

بیس دن تک مسلسل یہ جشن منعقد رہا جس میں امراء، فضلاء، شعرا اور ارباب طرب کو طرح طرح کے انعامات واعزازات..... نوازے گئے۔ ایران، توران اور کشمیر کے مطرب، رقاص اور ہندوستان کے مرد عورت اہل فن کو زر وجواہر کے تھال تقسیم کیے گئے۔ اہل حرفہ نے اپنے اپنے ہنر کے نمونے پیش کیے اور جھولی بھر بھر کر سونے چاندنی کے سکے لے گئے۔ بادشاہ کی فیض رسانی سے لوگوں نے اپنے گھروں میں برسوں کا ذخیرہ جمع کر لیا۔

ابھی تقریبات کا زور ٹوٹا نہیں تھا کہ قندھار کے قلعہ دار خواص خاں کی عرضداشت پہنچی۔

''شاہ عباس (ایران) نے ایک بھاری لشکر لے کر قندھار پر فوج کشی کرنے کے لیے صفاہان سے کوچ کر دیا ہے اور اپنے ایک امیر کو اپنے آگے ہرات روانہ کر دیا ہے کہ وہ وہاں جا کر دس ہزار برقنداز سواروں کو فراہم کرے۔ سنا گیا ہے کہ شاہ ایران نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ جب موسم تبدیل ہو اور برف باری کی شدت ہو اور راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے ہندوستانی فوج قندھار کو کمک نہ پہنچا سکے تو قلعے پر حملہ کر دیا جائے۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ شاہ نے شاہ قلی نامی ایک سفیر کو خط دے کر بادشاہ سلامت کے پاس بھیجا ہے چنانچہ یہ سفیر قندھار پہنچ چکا ہے اور اب بارگاہ شاہی کے لیے وہاں روانہ ہو گیا ہے۔''

اس اطلاع کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ قندھار کی طرف کمک بھیجی جائے۔ بادشاہ نے تمام امراء کو طلب کیا اور ان کے سامنے اس اطلاع کی بازگشت رکھی۔

''اس اطلاع کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ ہم برف باری سے پہلے لشکر شاہی کو قندھار روانہ کر دیں۔ اگر دیر ہوئی تو راستے بند ہو جائیں گے۔''

تمام امراء نے بیک زبان اس کی تائید کی۔ بادشاہ کی نظر انتخاب نے سعد اللہ خاں کا انتخاب کیا جو صاحب سیف بھی تھا اور صاحب قلم بھی۔

''تمہیں چاہیے کہ تم اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہم خیال امراء کو منتخب کرو۔ لشکر کی سرداری کے لیے ہم نے شہزادہ محمد اورنگزیب کو مقرر کیا ہے۔''

''جو حکم عالی جاہ کا۔''

''بس اب جاؤ اور تیاری کرو۔ خدا تمہارا حامی وناصر ہو۔'' سعد اللہ خاں ابھی کمرۂ خاص سے باہر آئے ہی تھے کہ پھر طلبی ہو گئی۔

''ساٹھ ہزار سواروں اور دس ہزار برقندازوں پر مشتمل فوج تیار کی جائے جن میں زیادہ تر مساوات بارہہ، ازبک افغان اور راجپوت ہوں۔ خیال رہے کہ ایران کے آدمی کم سے کم ہوں۔''

سعد اللہ خاں کے رخصت ہونے کے بعد بادشاہ نے کاتب شاہی کو طلب کیا۔

''دارا شکوہ کے نائب کو جو لاہور میں ہے خط تحریر کرو کہ جب ایران کا ایلچی وہاں پہنچے تو اسے وہیں روک لیا جائے۔ اسے آگے نہ آنے دیں۔''

بادشاہ نے اورنگزیب کو اس کے ہمراہیوں کے ساتھ اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کر دیا اور خود لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

پہلے یہ ارادہ تھا کہ اورنگزیب کو آگے روانہ کر دیا جائے پھر یہ طے پایا کہ لاہور تک بلکہ کابل تک ایک ساتھ بہ عجلت سفر طے کیا جائے لیکن آرام طلب امراء نے لشکریوں کی خیر خواہی کا بہانہ کر کے عرض کیا کہ لشکریوں کی بڑی تعداد خصوصاً قزلباش جاڑوں کے تین مہینے کسی سفر اور مہم پر نکلنے کو تیار نہیں اور یہ جو خبر ہے کہ اس موسم میں شاہ عباس قندھار پہنچے گا، غلط معلوم ہوتی ہے۔ ان حیلہ سازوں نے غلے اور چارے کی قلت کی خبریں بھی حضور میں پہنچائیں۔

بادشاہ کے ذہن میں بھی یہ بات آ گئی کہ فی الواقعہ ان تین چار ماہ میں جبکہ شدت سرما سے سفر ممکن نہیں، قزلباش نقل وحرکت کی ہمت نہیں کریں گے اور پھر قندھار کا محاصرہ اور لشکر کشی عمل میں نہیں آئے گی لہٰذا بادشاہ نے کابل کا ارادہ فسخ کر دیا اور یہ طے پایا کہ جاڑوں کا موسم لاہور میں بسر کیا جائے۔

ابھی اس ارادے کی گرد بیٹھی بھی نہیں تھی۔ فراغت طلب لوگ اپنے اپنے خیموں میں پڑے آرام کر رہے تھے اور سرمائی سفر اور کوچ وقیام کی زحمتوں سے بچ کر آرام سے سرد یاں گزار رہے تھے کہ اچانک قلعہ قندھار پر شاہ عباس کے پہنچ جانے کی خبر وہاں کے قلعہ دار کی عرضداشت کے ذریعے معلوم ہوئی۔

قلعہ دار نے لکھا تھا۔

''شاہ ایران نے کثرت سپاہ کے غرور میں بڑی سخت کوشی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس وقت جبکہ زمین برف کی سل بنی ہوئی تھی، دنیا نے برف کا لحاف اوڑھ رکھا تھا، پچاس ہزار کا لشکر لے کر جس میں قزلباش، ترک اور تاجک ہیں، ایک بھاری توپ خانہ لے کر یلغار کرتا ہوا پہنچ گیا ہے۔ یہ جلدی اس نے اس لیے دکھائی ہے کہ وہ بادشاہی کمک سے خوفزدہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ جہانگیر کا لشکر کمک پر آجائے گا اس لیے وہ برف باری کی پروا کیے بغیر کوچ پر کوچ کرتا ہوا پہنچ گیا اور قلعے کا محاصرہ کرلیا ہے۔ جس قدر جلد ہو سکے بادشاہی لشکر محصوروں کی فریاد پر پہنچ جائے تو بہتر ہے۔''

یہ عرضداشت ملتے ہی غلطی کا احساس ہوا۔ اگر سردیوں کا خوف بالائے طاق رکھ کر کابل روانہ ہوا جاتا تو شاہ عباس کو موقع نہ ملتا۔ بہرحال اب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ روانہ ہوا جائے۔ اورنگزیب نے کمر ہمت باندھی اور سعداللہ خاں کے ساتھ چونتیس نامور امیروں کی افواج لے کر جن میں سادات، ازبک، افغان اور راجپوت تھے، روانہ ہوا۔

جلدی کی وجہ سے شہزادے کو رخصت کے لوازم و مراسم کا اہتمام کیے بغیر ملتان کے راستے سے رخصت کر دیا گیا۔ شہزادے کے لیے خلعت، گھوڑا، جواہر اور ہاتھی اس کے پیچھے سعداللہ خاں کے ہمراہ بھیجے گئے۔ دوسرے امراء کو حکم دیا گیا کہ وہ کسی قریبی راستے سے کابل اور پھر وہاں سے قندھار پہنچ جائیں۔

ان سب انتظامات کے بعد بادشاہ خود بھی لاہور سے کابل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک دن جب وہ لشکر سمیت ایک دریا عبور کرنے کی فکر میں تھا تو ایک سوار مخالف سمت سے آتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر معلوم ہوا یہ قندھار کا گرز بردار ہے جو کوئی اہم اطلاع کے ساتھ آیا ہے۔ وہ جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے جعفر خاں بخشی کے ٹھکانے پر پہنچا اور زبانی اطلاع دی۔

''میری روانگی کے بعد قزلباشوں کے قندھار پر قابض ہو جانے کی خبریں پھیل گئی تھیں۔ اس اطلاع کی تصدیق غزنی سے پہنچنے والے تیز رفتار قاصدوں کے مراسلات سے بھی ہو گئی۔'' جعفر خاں نے خلوت میں بادشاہ تک یہ ساری اطلاعات پہنچا دیں۔

☆☆☆

قندھار کا حال برا تھا۔ حملہ آور فوج ایک ماہ تک نقب لگانے اور دلیرانہ حملوں کے ذریعے رات دن قلعے میں گولہ اندازی اور آتشیں بان پھینکنے میں لگی رہی۔ قلعے والے بھی باہر نکل نکل کر مورچوں پر حملے کرتے رہے۔ کمک کا انتظار ہوتا رہا لیکن جب کمک پہنچنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو قلعے والوں کا حوصلہ ٹوٹنے لگا۔ یہ حال دیکھ کر ایک تجربہ کار جاسوس قلعے سے نکلا اور شاہ ایران کے لشکر میں پہنچ گیا تاکہ یہ اندازہ لگا سکے کہ شاہ عباس کی طاقت کتنی ہے اور وہ کتنے دن مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس جاسوس نے وہاں رہ کر حملہ آور فوجوں کی وقتوں، غلہ اور چارے کے ذخیروں کی کمی اور ہندوستانی کمک کی خبروں پر ان کی بدحواسی کا اچھی طرح معائنہ کیا۔

یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے دشمن کے لشکر سے نکلنے اور قلعے میں پہنچنے اور لشکر ایران کی حقیقی صورت حال سے آگاہ کرنے کی بڑی کوشش کی۔ بالآخر اس کی نظر ایک حسین دوشیزۂ ایران پر پڑی۔ وہ رات کے وقت لشکر کا جائزہ لینے کے لیے نکلا تھا کہ ایک خیمے سے اسے ساز و آواز سنائی دیے۔ وہ کچھ دیر خیمے سے باہر کھڑا سنتا رہا۔ ایسا بے خود ہوا کہ گرفتاری کی پروا کیے بغیر خیمے میں داخل ہو گیا۔ وہاں موجود لوگ اتنے بے خود تھے کہ کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ کوئی آیا اور کہاں بیٹھ گیا۔ یوں بھی اس نے ایرانی لباس زیب تن کر لیا تھا۔ دیکھنے میں وہ بالکل ایرانی معلوم ہوتا تھا۔ چند لوگ ساز بجا رہے تھے اور ایک رقاصہ اس دائرے میں دائرہ بنی محو رقص تھی۔ شراب کے دور چل رہے تھے۔ اس نے بھی قریب رکھی صراحی سے شراب انڈیلی اور پیالہ منہ سے لگا لیا۔

رقص و سرود کی یہ محفل رات کے پچھلے پہر تک جاری رہی۔ محفل ختم ہوئی تو وہ رقاصہ دو قوی ہیکل سپاہیوں کے ساتھ خیمے سے باہر نکلی۔ یہ جاسوس بھی خیمے سے باہر آیا اور کچھ فاصلہ دے کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ دور جا کر وہ رقاصہ خیمے میں داخل ہو گئی۔ جو سپاہی اسے چھوڑنے آئے تھے، وہ بھی واپس ہو گئے۔ جاسوس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، خیمے میں داخل ہو گیا۔ اس رقاصہ کی نظر جونہی اس پر پڑی وہ خوفزدہ ہو گئی۔

''اے اجنبی! تو کون ہے اور یہاں کیوں گھس آیا؟''

''ڈرو مت، میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آیا۔''

''پھر کیا مقصد ہے تمہارا؟''

''میری بات غور سے سنو۔ میں تمہارا ہم قوم نہیں ہوں۔ جب ایرانیوں نے قلعہ قندھار کا محاصرہ کیا تو میں قلعے سے باہر تھا۔ پھر حملے شروع ہو گئے اور میں قلعے میں

دوبارہ نہ جاسکا۔ مجبوراً تمہارے لشکر میں آ گیا۔ اسی دن سے برابر چھپتا پھر رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے اور قلعے میں واپس جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ کیا تم میری مدد کر سکتی ہو؟"

"کیا بھرے لشکر میں ایک میں ہی ہوں جو تمہاری مدد کر سکتی ہوں..... تم نے یہ کیسے سمجھ لیا؟"

"یہ اس لیے کہ تم بھی خالص ایرانی نہیں ہو۔ تمہاری ماں غیر ایرانی تھی اور تم ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس لیے تم میرا درد سمجھ سکتی ہو۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میری ماں غیر ایرانی تھی اور میری پیدائش ہندوستان کی ہے؟"

"یہ مت پوچھو، یہ بتاؤ کہ میری اطلاع صحیح ہے یا غلط؟"

"مجھے تم سے خوف آنے لگا ہے۔ کہیں تم جاسوس تو نہیں؟"

"اگر تم یہ چاہتی ہو کہ یہ باتیں مجھ تک رہیں تو مجھے قلعے تک پہنچا دو۔"

"مجھے ایک خفیہ راستہ معلوم ہے۔ اس وقت سب سو رہے ہوں گے۔ اسی وقت نکل چلو۔ میں تمہیں قلعے تک پہنچا دوں گی۔ آگے تمہاری قسمت۔"

اس رقاصہ نے باہر نکل کر خوب اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر اس جاسوس کو اپنے ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ صبح ہونے کے قریب تھی۔ لشکر میں سب سو رہے تھے، اس کے باوجود وہ لشکر کے مخالف سمت میں چل پڑی۔

"یہ تم مجھے کس طرف لے جا رہی ہو؟"

"خاموش رہو۔ کوئی بھی ہماری باتیں سن سکتا ہے۔ میں تمہیں خفیہ راستے سے لے جا رہی ہوں۔"

اس جاسوس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد قلعہ سامنے نظر آنے لگا تھا۔ صبح کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔

"میں نے تمہیں قلعے تک پہنچا دیا ہے۔ اب مزید آگے جانے اور قلعے کے اندر جانے کی تدبیر خود کرو۔"

"تمہارا شکریہ، اب میں خود کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔"

رقاصہ واپس چلی گئی۔ اس نے قلعے کے اندر جانے کے لیے راستہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ قلعے کی پشت پر ایک خفیہ دروازہ ہے۔ وہ اس طرف چل دیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں کوئی ایرانی سپاہی موجود نہیں تھا لیکن اس کی بدقسمتی یہاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اچانک ایرانی سپاہیوں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ وہ ایک بڑی چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سپاہی آگے بڑھ جائیں گے لیکن یہ تو محاصرے کی نیت سے آئے تھے۔ اب اندر جانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ مجبوراً اس نے ساری تفصیل ایک کاغذ پر لکھی۔

"چارا گھاس کی کمی، رسد کی نایابی، شدت سرما اور برف باری کی وجہ سے قزلباشوں کا حال نہایت تنگ ہے۔ گھوڑوں میں جان نہیں رہی ہے۔ وہ ہڈی چمڑا رہ گئے ہیں۔ بادشاہی لشکر کوچ بہ کوچ قندھار کی طرف آ رہا ہے اور اب قزلباشوں کا لشکر ڈیرا اٹھانے کی فکر میں ہے۔"

اس نے یہ پرچہ ایک تیر سے باندھ کر قلعے میں پھینک دیا۔ یہ تیر ایک سپاہی کے ہاتھ لگا جو فوراً قلعہ دار تک پہنچا دیا گیا۔ کاغذ پر لکھی تحریر نہایت ہمت افزا تھی لیکن قلعہ دار پہلے ہی ہمت چھوڑ بیٹھا تھا۔ وہ شاہی کمک کا انتظار نہ کر سکا۔ اس نے شاہ عباس کے سرداروں سے صلح کی گفت وشنید کا آغاز کیا اور بالآخر قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔

قلعہ دار باہر آیا اور ہتھیار ڈال کر مال واسباب اہل وعیال کو نکالنے کے لیے دو روز کی مہلت طلب کی۔ تیسرے دن شاہ کا قلعہ دار محراب خاں قلعے میں داخل ہو گیا۔

قندھار کا قلعہ دار سیدھا بادشاہ کے حضور روانہ ہو گیا۔

جب وہ بادشاہ سلامت کی بارگاہ میں پہنچا تو خجالت سے سر جھکائے ہوئے تھا اور آنسو بہہ رہے تھے۔

☆☆☆

جس وقت کمک کے لیے لشکر روانہ کیا گیا تھا، اورنگزیب اور سعداللہ خاں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو، جلد از جلد قندھار پہنچ جاؤ۔ ممکن ہے کہ بادشاہی افواج کے پہنچنے تک شاہ ایران قلعے سے محاصرہ اٹھا کر چلا جائے اور اگر کسی کی پست ہمتی سے قلعہ قزلباشوں کے قبضے میں چلا جائے تو تم تامل نہ کرو، گرم روی سے پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لو۔

جب اورنگزیب ملتان پہنچا تو وہاں لشکروں کو جمع کرنے اور ضروریات فراہم کرنے میں تاخیر ہوئی۔ سعداللہ خاں بھی راستے میں بے وقت بارش ہو جانے کی وجہ سے اور شہزادے کے انتظار میں چند دن تک ٹھہر گیا۔ اسی اثناء میں قلعہ قندھار دشمن کے قبضے میں چلے جانے کی اطلاع پہنچی۔ یہ اطلاع بھی ملی کہ شاہ ایران حصولِ مقصد کے بعد قندھار سے واپس چلا گیا ہے۔ اس اطلاع کے بعد شاہی

لشکر نے پیش نظر راستہ چھوڑ دیا اور پہاڑوں کی بلندی پر چڑھائی شروع کردی۔ ساری فوج پیادہ ہوگئی۔ اپنا چلنا دوبھر تھا، سامان کا بوجھ کون اٹھاتا۔ ضروری وغیر ضروری سارا سامان وہیں چھوڑ دیا اور گھاٹیوں میں اتر گئے۔ بہت سے لوگ شدت سرما سے ٹھٹھر کر رہ گئے۔ نوکر اور غلام اپنے آقاؤں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس حال میں بہ مشکل کابل پہنچے۔ یہاں پہنچ کر کچھ آرام ملا۔ کابل میں چند دن گھوڑوں اور باربردار جانوروں کی خریداری میں لگ گئے کہ اکثر لوگ پیادہ ہوگئے تھے۔

کابل سے کوچ کر کے یہ لشکر غزنی پہنچا۔ وہاں گھاس اور چارا مطلق دستیاب نہیں تھا۔ خبر ملی کہ غزنی سے قندھار تک ایرانیوں کے تسلط کے سبب انسانوں اور جانوروں کی غذا کا ملنا بالکل ناممکن ہوگیا ہے۔ یہ حال دیکھ کر سعداللہ خاں نے بادشاہ کے حضور مراسلہ لکھ بھیجا جس میں تفصیلی حالات درج کیے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے جواب آیا۔

''ملک گیری اور آرام طلبی کا کوئی جوڑ نہیں۔ ہر قیمت پر قندھار پہنچو۔ قزلباشوں کو مہلت نہ دو کہ وہ ذخیرے جمع کر کے قلعے میں جم کر بیٹھ جائیں۔ قندھار کے گردونواح میں اب جو فصل کاٹی جائے گی، اسے قلعے میں پہنچنے نہ دو بلکہ اپنے تصرف میں لے آؤ۔''

ان احکام کے آتے ہی سارے لشکر میں کوچ کی منادی کردی گئی۔ لشکر کو ازسرنو ترتیب دیا گیا اور منزلیں مارتے ہوئے قندھار کی سرحد پر واقع ایک قلعے پر پہنچ گئے۔ قزلباشوں نے اس قلعے پر بھی قبضہ کرلیا تھا لیکن فوجوں کی آمد کا سن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

شاہی لشکر نے قلعہ قندھار کے مقابل ایک باغ میں قیام کیا اور محاصرے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لوگ مورچال، نقب وغیرہ کا سامان فراہم کرنے میں مصروف ہوگئے۔

چند امراء نے قلعے کو ایک جانب سے خالی دیکھا تو وہ اپنے سپہ سالار کو اطلاع دیے بغیر جرأت کر کے آگے بڑھ گئے اور پہاڑ اور حصار کے دامن میں پہنچ کر پناہ لے لی۔

''یہ موقع اچھا ہے۔ قلعے میں موجود تمام لوگوں کی توجہ دوسری جانب رہے گی اور ہم یہاں سے حملہ آور ہوکر قلعے کے اندر پہنچ جائیں گے۔'' راجا بہاؤ سنگھ نے کہا۔

''ممکن تو ہے لیکن ہم سپہ سالار کی اجازت کے بغیر یہاں پہنچے ہیں۔ اگر ناکامی ہوئی تو ہم سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔'' دوسرے امیر نے کہا۔

''ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ساتھ ایک بڑی جمعیت ہے اور قلعے والے ہماری موجودگی سے بے خبر ہیں۔''

ایک سپاہی قلعے کی دیوار پر مورچا جمائے بیٹھا تھا۔ اس نے جو دشمن کی نقل وحرکت دیکھی تو فوراً قلعہ دار کو خبر کی۔ خبر کی تصدیق ہوتے ہی قلعے والوں نے نہایت شدت سے گولہ باری شروع کردی۔ شاہی جمعیت کو اس حملے کا گمان بھی نہیں تھا۔ شاہی ملازمین کی کثیر تعداد اس معرکے میں کام آگئی اور ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ سعداللہ خاں کو جب معلوم ہوا تو اس نے ان امراء کو پیغام بھیجا۔

''میرے حکم کے بغیر یہ جرأت بے جا تمہاری گستاخانہ حرکت تھی اور بے محل بھی مگر اب وہاں، پہنچنے کے بعد کھسک آنے سے قلعے والوں کی جسارتیں بڑھ جائیں گی۔ جو نقصان ہوا سو ہوا، اب حوصلہ مضبوط رکھو اور وہیں جنگل کے درختوں کی پناہ میں پامردی سے ٹھہرے رہو۔ ہم بھی اطراف واکناف سے کمک پہنچانے میں لگے ہوئے ہیں۔''

اس پیغام کے بعد واپسی ناممکن تھی۔ شاہی ملازمین نے اس مقام پر بڑی مشقت اور آدمیوں کے نقصان کے بعد مورچا قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔

☆☆☆

لشکر کی روانگی کے بعد شاہ جہاں نے بھی کوچ کرنے کا ارادہ کیا۔ ابھی کوچ کے لیے قدم اٹھائے بھی نہیں تھے کہ اطلاع ملی کہ شاہ عباس کا ایک فرستادہ شاہ وردی بیگ خط لے کر کابل پہنچ گیا ہے۔ حکم ہوا کہ گرز بردار جائیں اور شاہ وردی بیگ کو لے آئیں اور شائستہ خاں کے پاس ٹھہرائیں۔ ہم اس سے ملنا نہیں چاہتے۔

شائستہ خاں کو الگ سے بلا کر یہ ہدایت کردی گئی۔

''شاہ وردی بیگ جو خط لایا ہے، وہ اس سے نہ لیں اور ہماری طرف سے اس سے کہیں کہ چونکہ شاہ ایران سے ہمارے دیرینہ تعلقات تھے اس لیے ہم نے قندھار کے قلعے پر اپنے ایک مصاحب کو قلعہ دار بنا دیا تھا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ ادھر سے یہ حرکت کی جائے گی تو ہم وہاں کسی تجربہ کار جنگجو کو قلعہ دار بناتے کہ اس کی جان بھی چلی جاتی تو وہ قلعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ چونکہ یہ معاملہ خلاف توقع پیش آیا ہے اس لیے جو بھی اس کا بدلہ ہوگا اس پر گلہ شکوہ نہ کیا جائے۔ اب چونکہ تعلقات کا چشمہ غبار آلود ہوگیا ہے، خطوط اور ایلچیوں کو بھیجنے کا کیا فائدہ۔''

بادشاہ کی سواری چوتھے دن کابل پہنچ گئی۔ شاہ وردی

بیگ کو جلال آباد بھیج کر نظر بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

سعد اللہ خاں برابر اس کوشش میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح محاصرے کو جنگ میں بدل دے اور قلعے پر براہِ راست حملہ آور ہو جائے۔ بڑی کوششوں اور کافی آدمیوں کی قربانی کے بعد وہ خندق تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری طرف سے دوسرے جانباز بہادر مورچے اور نقب لے کر آ گئے مگر ایرانی قلعہ دار محراب خاں کو قلعہ داری کا وسیع تجربہ تھا۔ اس نے قلعے کے نچلے حصے سے رات دن توپوں اور بندوقوں سے ایسی گولہ باری کی کہ قلعے کے نیچے مورچے لگ جانے کے باوجود کسی کو ہاتھ پیر ہلانے کی مہلت نہ مل سکی اور قلعہ والوں نے سرنگوں اور نقبوں کو تباہ کر دیا۔ شاہی لشکر آگے بڑھتا اور سیکڑوں جانیں ضائع کر کے واپس آ جاتا۔ نقصان قزلباشوں کا بھی خوب ہو رہا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ قزلباشوں کی ایک جماعت اسیر بنا لی گئی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ شاہ عباس نے ہرات پہنچنے کے بعد مرتضیٰ قلی خاں قورچی باشی کی سرکردگی میں بیس امیروں اور تیس ہزار سواروں کے ایک لشکر کو محراب خاں (قلعہ دار) کی مدد کے لیے روانہ کر دیا ہے۔ ہراول کے طور پر تین چار ہزار سوار قریب پہنچ چکے ہیں۔

قزلباشوں کی اس اطلاع کو جھوٹ سمجھا گیا تھا لیکن انہی دنوں قزلباشوں کے پہنچنے اور بادشاہی رسد کے دستے پر اچانک حملہ کرنے اور ایک بڑی تعداد کو قتل و زخمی کر کے جانوروں کو لوٹ لے جانے اور آدمیوں کو اسیر بنا لینے کی خبریں ملیں۔ یہ خبریں اس وقت حقیقت میں بدل گئیں جب شتربان اور خچر والے فریاد لے کر آ گئے کہ دشمن کی فوج آئی، اونٹ اور دوسرے جانور بڑی تعداد میں ہانک کر لے گئی۔ یہ سنتے ہی رستم خاں سوار ہوا اور قزلباشوں کے تعاقب میں چل دیا۔ چار پانچ کوس دور جا کر اس نے دشمن کو جا لیا اور ایک زبردست مقابلے کے بعد چند عدد اونٹ، بیل، خچر اور گھوڑے ان سے چھین کر لے آیا۔

دوسرے دن وہ خبر بھی آ گئی جس کا انتظار تھا۔ معلوم ہوا تیس ہزار قزلباش نامی گرامی امیروں کی سرکردگی میں بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ ان کو روکنے کے لیے رستم خاں کی سرکردگی میں دس ہزار سوار بھاری توپ خانے کے ساتھ اس طرف سے بھی روانہ ہوئے۔

جب قزلباشوں کی فوج گرد اڑاتی ہوئی نمودار ہوئی تو ہندوستانی فوج نے بھی گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ ادھر سے قزلباش بھی آگے بڑھے۔ راجپوتوں نے گھوڑے دوڑائے۔ ایران کے سرداروں نے گرد اڑائی۔ پہلے تو گولہ باری بان بازی ہوتی رہی پھر جب لڑائی نے زور پکڑا تو ایران کی تینوں فوجیں بادشاہی لشکر کے اطراف تلواریں سونتے آ گئیں۔ دونوں مقابل ایک دوسرے پر بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔ ایرانی فوج نے ایسے کاری حملے کیے کہ ہندوستانی فوج کے قدم اکھڑنے لگے۔ ایسے میں رستم خاں نے اپنے ساتھی بہادر راجاؤں کے ساتھ مست ہاتھیوں کو آگے بڑھایا۔ یہ دیکھ کر دوسرے سپاہیوں کو بھی حوصلہ ہوا اور وہ بھی پوری جانفشانی سے لڑنے لگے۔ اس لڑائی میں بہت سے آدمی کام آ گئے مگر ان کی قربانی رائگاں نہیں گئی۔ قزلباشوں کے قدم اکھڑ گئے اور بالآخر وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لڑائی کے بعد ان کے بے شمار گھوڑے اور خچر مالِ غنیمت میں ہاتھ آئے۔

دوسری جانب شاہ ایران کا بھیجا ہوا سفیر شاہ وردی بیگ ابھی تک شاہ جہاں کے حضور پیش ہونے سے محروم تھا۔ اسے باریابی کی اجازت نہ مل سکی تھی۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ پھر خط پڑھے بغیر اس کے پاس زبانی پیغام روانہ کیا۔

''مرحوم شاہ عباس کلاں ہمارا اخلاص مند اور قدرداں تھا اور وہ اتحاد کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد ہم نے جو توقعات اس سے وابستہ کر رکھی تھیں، اس سال ان کے خلاف عمل ہوا اور ایران والوں نے اپنے بزرگوں کے طریقے کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اب جو کچھ خدا دکھائے گا اور ہم سے ہو سکے گا سامنے آ کر رہے گا۔''

اس پیغام کے بعد شاہ وردی بیگ ایرانی سفیر کو رخصت کر دیا گیا۔ محافظ اس کے ساتھ کر دیے کہ اسے قندھار میں اورنگزیب کے پاس پہنچا دیں اور حکم دیا کہ قندھار سے گرز بردار ساتھ کر کے اسے شاہ ایران تک پہنچا دیں۔

بادشاہ ابھی تک جلال آباد میں تھا اور قندھار کے محاصرے میں پیش آنے والے مصائب کی خبریں اس تک برابر پہنچ رہی تھیں۔ جب یہ خبریں تواتر سے پہنچنے لگیں تو اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ محاصرہ جس قدر طویل ہوتا جائے گا، اتنی ہی فوجیں ضائع ہوتی جائیں گی اور نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔

بادشاہ نے اورنگزیب کے پاس قاصد دوڑا دیے۔

''فوجوں کو ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ قلعے کی تسخیر کو آئندہ سال تک ملتوی کر کے محاصرہ اٹھا کر لوٹ آؤ۔''

دوسرا حکم دارا شکوہ کے پاس روانہ کیا۔

''شہزادہ محمد اورنگزیب کے غزنی پہنچنے کی خبر آنے تک کابل میں ٹھہرے رہو۔''

شہزادہ دارا شکوہ اس وقت کسی ماہر نجومی کے روبرو بیٹھا تھا۔ مختلف علوم کے ماہرین اس کی صحبت میں ہمیشہ بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت بھی ایک نجومی سامنے تھا۔ اس نے بادشاہ کی جانب سے بھیجا ہوا رقعہ پڑھا اور نجومی کی طرف بڑھا دیا۔

''ذرا دیکھنا تو۔ اس حکم نامے کے بارے میں ستارے کیا کہتے ہیں۔ مجھے کابل میں ٹھہرنا چاہیے یا نہیں؟''

نجومی نے حساب کتاب لگا کر بتایا۔

''یہ حکم ماننے میں آپ کی ترقی کے دروازے آپ پر کھل جائیں گے۔ ایک دن وہ بھی آئے گا جب آپ کو قندھار کی مہم پر بھیجا جائے گا۔''

دارا شکوہ کو اس موقع پر یہ بھی پوچھنا چاہیے تھا کہ اس مہم کا نتیجہ کیا نکلے گا لیکن وہ تو خوشی سے ایسا نہال ہوا کہ گلے کی مالا اتار کر نجومی کے حوالے کر دی۔

''اب ہمیں جلد از جلد اورنگزیب کے غزنی پہنچنے کا انتظار رہے گا تاکہ ہم سرخروئی کے ساتھ بادشاہ سلامت کے حضور پہنچیں اور قندھار کی مہم پر تعیناتی کا انتظار کریں۔''

دارا شکوہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ کب غزنی سے خبر آتی ہے کہ اورنگزیب وہاں پہنچ گیا۔ بادشاہ لاہور میں تھا اور دارا شکوہ وہاں پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ بالآخر ایک روز اورنگزیب کے غزنی پہنچنے کی خبر آ گئی۔ دارا شکوہ نے قدم اٹھائے اور منزلیں طے کرتا ہوا باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

''ہم نے قندھار کی مہم سے ہاتھ نہیں اٹھایا ہے، محض اسے ملتوی کیا ہے۔ ایک سال بعد ہم پھر لشکر روانہ کریں گے۔''

دارا شکوہ کو یوں محسوس ہوا جیسے بادشاہ یہ بھی کہہ رہا ہو۔ ''اور اس مہم کو تمہاری سرکردگی میں سر کیا جائے گا۔''

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ سعد اللہ خاں اور رستم خاں بھی قزلباشوں کے چند جھنڈے اور توپوں کو لے کر پہنچ گئے۔ اورنگزیب بھی حاضرِ بارگاہ ہو گیا۔

'کہیں اگلی مہم کے لیے ابھی سے اورنگزیب کو مقرر نہ کر دیا جائے۔' دارا شکوہ نے دل میں سوچا اور عجیب سی نظروں سے اورنگزیب کی طرف دیکھا۔

یہ خیال اس کے دل میں اس لیے آیا تھا کہ بادشاہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اورنگزیب کا استقبال کیا تھا اور اس مہم کے دوران اس کے کارناموں کی تعریف کی تھی۔ اس کو خوشی تو اس وقت ہوئی جب اورنگزیب کو ملتان کی صوبہ داری پر مقرر کر کے رخصت کر دیا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد دارا شکوہ ہی امیدوار رہ گیا تھا۔ بادشاہ اسے رکھتا بھی بہت عزیز تھا۔ اب اسے بادشاہ کی ہمراہی میں لاہور سے ہوتے ہوئے اکبر آباد کی طرف روانہ ہونا تھا۔

بادشاہ نے اکبر آباد میں قدم رکھا تو جلوسِ شاہی کا چوبیسواں سال شروع ہو چکا تھا۔ اس موقع پر شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا۔ جشن کے دن حافظ مومن جو شاہ ایران کے دربار کا حافظ اور موسیقار تھا، بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوا۔ اس نے ایک تصنیف جو بادشاہ کے نام سے موسوم کی تھی، پڑھ کر سنائی۔ بادشاہ نے اسے خلعت اور دس ہزار روپے نقد عطا کیے اور اسے بادشاہی ملازمت میں رکھ لیا۔

جشن کی دھوم کم ہوئی تو بادشاہ قندھار کو بھول کر ہندوستان کے مسائل کی طرف متوجہ ہوا۔ سعد اللہ خاں نے بادشاہ کی توجہ میواتیوں کی طرف مبذول کی۔

''حضور! میواتیوں کی سرکشی نے بڑا سر اٹھایا ہے۔ یہ قوم شاہی سلطنت کے کسی حکم کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اگر ان کا سر نہ کچلا گیا تو دوسری قومیں بھی ان کے ساتھ مل کر بڑا ہنگامہ برپا کریں گی۔''

''آپ کا اس سلسلے میں کیا مشورہ ہے؟''

''آپ فرمائیں تو میں لشکر لے کر پہنچوں۔''

''معمولی فساد کے دفع کے لیے آپ کا جانا آپ کے شایانِ شان نہ ہوگا۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دارا شکوہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے سامنے بھی یہ مسئلہ رکھا گیا۔ اسے تو ہر قدم پر بادشاہ کی خوشنودی عزیز تھی لہٰذا اس نے خود کو پیش کیا۔

''آپ فرمائیں تو باغیوں کی سرکوبی کے لیے میں پہنچوں۔''

''تمہارا جانا مناسب نہیں۔ میں نے تمہارے لیے کچھ اور سوچا ہوا ہے۔''

دارا شکوہ کا دھیان بے اختیار ''قندھار'' کی طرف گیا۔ وہ ہر قیمت پر یہ چاہتا تھا کہ جو مہم قلعہ قندھار کی سرکوبی کے لیے ہو وہ اس کی سرکردگی میں ہو۔ اس نے اس گستاخی کی معذرت طلب کی کہ اپنا نام از خود پیش کیوں کیا۔

''یہ خاکسار زمیں بوس ہو کر معافی کا خواستگار ہے کہ میں نے میواتیوں کی سرکوبی کے لیے حضور کے جنبشِ لب سے پہلے اپنی خدمات پیش کیں۔''

''آئندہ ایسی جسارت سے گریز کیا جائے۔''

''بسر و چشم۔''

اس کے بعد بادشاہ سعد اللہ خاں سے مخاطب ہوا۔

''راجا جے سنگھ کا بیٹا کیسری سنگھ ایک روز ہمارے حضور آیا تھا۔ ہم نے اس کے چہرے پر بہادری اور ذہانت کے آثار دیکھے تھے۔ ہم نے اس سے وعدہ بھی کیا تھا کہ اس کو کسی قابلِ ذکر مہم پر بھیجیں گے۔ اس کی وفاداری کا امتحان اس مہم سے ہو جائے گا۔ اسے ابھی اور اسی وقت ہمارے حضور پیش کیا جائے۔''

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نوجوان تسلیمات بجالایا۔

''کیسری سنگھ! ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہیں کسی روز کسی مہم پر بھیجیں گے۔ اب وہ وقت آگیا ہے۔ میواتیوں نے بہت شور و فساد مچایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں ان کی سرکوبی کے لیے تم وہاں جاؤ۔''

''آپ کے حکم سے سرتابی کیسے ہو سکتی ہے۔''

''تو پھر تیاری کرو۔''

راجا کیسری سنگھ اپنی پہلی مہم کی کامیابی کے لیے کوششیں کرنے لگا۔ اس نے میواتیوں کی گوشمالی کے لیے چار پانچ ہزار سواروں اور چھ سات ہزار بندوقچیوں اور تیراندازوں کو ملازم رکھا اور بڑی سعی و جہد کے بعد اس شر انگیز قوم کا اچھی طرح قلع قمع کر دیا اور ان کے بیوی بچوں کو گرفتار کر لیا اور بقیہ کو ان کے مقامات سے نکال باہر کیا۔

کیسری سنگھ کے نکلتے ہی بادشاہ نے کشمیر جانے کے ارادے سے کوچ کر دیا تھا۔ وہ برف سے اٹے ہوئے راستوں پر سفر کرتے رہے۔ کوچ کبھی تو دن کے آخر میں ہوتا تھا اور کبھی رات کا کچھ حصہ گزرنے پر۔ آخر کار شاہی سواری حرم کی بیگمات کے ساتھ منزل پر پہنچ گئی۔ کشتی کے ذریعے بادشاہ ساحل پر پہنچا۔ اس گل گشت کی سیر و تفریح بڑے شان و شکوہ سے ہوتی رہی۔ محل کی خواتین کے ساتھ کشتیوں پر دریا کی سیر کی جاتی تھی۔ کشتیاں زربفت کے طرح طرح کے پردوں سے مزین تھیں۔ ستون لاجورد کے منقش بنائے گئے تھے۔ ان رنگین اور زرکار بجروں میں شاہی قافلہ ڈل کی سیر و تفریح کرتا رہا۔ بادشاہ نے ملاحوں کو جھولی بھر بھر کر انعام دیا، یہاں تک کہ کشمیر میں کوئی مستحق نہ رہا۔

کشمیر کے مشہور درویش ملا شاہ بدخشی بادشاہ سے ملنے آئے۔ ان کی آمد کے دوسرے دن بازدید کے لیے بادشاہ خود ان سے ملنے گیا اور درویشوں کے لیے پندرہ ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا۔

بادشاہ ابھی سیر گل و گلزار سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ بارش کا موسم شروع ہو گیا۔ یہ موسم بھی نہایت لطف آمیز ہوتا ہے لیکن ہر چیز کی کثرت بری ہوتی ہے۔ بارشیں ایسی شدید ہوئیں کہ کشمیر کا حسن پھیکا پڑ گیا۔ پھل ضائع ہو گئے، ٹہنیاں کھڑی رہ گئیں۔ بادشاہ کا دل اچاٹ ہو گیا۔

''اکبر آباد اور لاہور کے ایسے بارونق باغوں کو چھوڑ کر اتنی طویل مسافت کر کے ہم آئے اور خدا کی مخلوق زحمتیں برداشت کرتی رہی۔ صرف اپنے نفس کی لذتوں کے لیے اتنے لوگوں کو اذیت میں مبتلا کر دینا خدا پرستی سے دور ہے۔''

بادشاہ نے کوچ کا حکم صادر کر دیا۔

جب سواری لاہور کے قریب پہنچی جبکہ سعد اللہ خاں بھی آگیا تھا، حکم ہوا کہ رستم خاں دوسرے تمام امیر اور راجا توپ خانے کے انتظام کے ساتھ قندھار کی مہم کے لیے حاضر ہو جائیں۔ اس موقع پر دارا شکوہ بھی حاضرِ خدمت ہو گیا۔

رستم خاں جو قندھار کی مہم کے لیے مامور کیا گیا تھا، اپنی جاگیر سے سرکاری خزانے کا ایک کروڑ روپیہ لے کر حاضر ہوا۔

سعد اللہ خاں کے بیٹے لطف اللہ اور عنایت اللہ ابھی تک حاضرِ بارگاہ نہیں ہوئے تھے، وہ اس وقت پہنچے جب بادشاہ لاہور میں قیام کر چکا تھا۔ سعد اللہ خاں کی جمعیت کا معائنہ ہوا۔ چار ہزار سوار، ایک ہزار برقنداز، پانچ سو بنبل دار اور تیردار شمار کیے گئے۔ بادشاہ نے معائنہ کیا اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

شہزادہ اورنگزیب کو روانگی کا حکم دے دیا گیا تھا۔ وہ حکم ملتے ہی ملتان سے روانہ ہو گیا۔ شہزادے کے ساتھ جو امیر تھے ان کے علاوہ اکیس امیروں کو دربار سے بھاری خزانہ اور بہ کثرت قلعہ شکنی کے ساز و سامان دے کر مامور کیا گیا کہ وہ ملتان کے راستے قندھار کا ارادہ کریں۔ سعد اللہ خاں کو بھی حکم ہوا کہ وہ اسی تاریخ کو شہزادے کے پاس پہنچ جائیں۔

سعد اللہ خاں کے ساتھ پچاس ہزار سوار، دس ہزار پیادہ برقنداز، چند ہزار بان اور بیس بڑی قلعہ شکن توپیں..... قلعہ شکنی کا سامان روانہ کیا اور حکم دیا کہ مقررہ وقت پر لشکر وہاں پہنچ جائے اور قلعے کا محاصرہ کر لے۔

رستم خاں کو بھی روانہ کر دیا گیا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ کابل روانہ ہو گیا۔

شاہی لشکر نے قندھار پہنچتے ہی قلعے کے چاروں طرف گولہ باری کی زد سے دور کیمپ لگا دیا۔ چند دن کے محاصرے کے بعد قلعہ دار بالکل خاموش بیٹھ گیا۔ اس نے

کچھ ایسا انتظام کر دیا تھا کہ قطعاً کسی آدمی کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ قلعہ جیسے قبرستان بن گیا تھا۔ مدافعت اور مقابلے کی کوئی تیاری نظر نہ آتی تھی۔ محاصرے والے اپنی دلیری کے مظاہرے کر رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے مگر قلعے والوں کے جیسے کان بند تھے ..... کوئی جواب نہیں تھا۔ اس خاموشی کا فائدہ اٹھا کر رستم خاں کے مورچے قلعے کے نیچے خندق تک پہنچ گئے۔

ایک دن ایک بہادر نے آکر اطلاع دی کہ خندق اور حصار کے درمیان برج کے پاس ایک ایسی جگہ نظر آئی ہے جو اوپر چڑھنے کے لیے موزوں ہے۔ برج کے محافظ غافل اور بے خبر ہیں۔ اگر اجازت ہو تو میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کمند کی مدد سے اوپر پہنچ جاؤں اور جیسے ہی بگل بجاؤں، لشکر حملہ کر دے اور سیڑھیوں کی مدد سے اوپر پہنچے۔ سعد اللہ خاں نے اسے اجازت دے دی۔

اس بہادر راجا نے اجازت ملتے ہی چند جانبازوں کو ساتھ لیا جو قلعہ گیری کے فن کے ماہر تھے اور رات کے وقت قلعے پر چڑھائی کر دی اور بلا مزاحمت فصیل پر پہنچ کر مقررہ اشارے پر لشکر کو طلب کر لیا۔ بہادر لشکر اشارہ ملتے ہی دوڑ پڑا۔

قلعہ والوں کی خاموشی ایک چال تھی۔ وہ اس حملے سے غافل نہ تھے چنانچہ جیسے ہی انہوں نے بگل کی آواز سنی، ہر طرف سے نکل کر موقع پر پہنچ گئے اور نہایت تیاری کے ساتھ حملہ آور ہو گئے۔ توپوں اور بندوقوں سے ایسی سخت آتش باری کی کہ قیامت ہی تو آ گئی۔ جو لشکری اوپر چڑھ آئے تھے انہیں نیچے گرا دیا۔ جو برج اور دیوار سے اتر کر دوسری طرف چلا گیا تھا پھر اس کی خبر نہ ملی کہ کیا حشر ہوا۔ بے شمار مسلمان اور راجپوت ڈھیر ہو گئے۔ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ مقتولین کا شمار ممکن نہ تھا۔

اس ناکام حملے کے بعد سے دو ماہ تک جنگ اور زور و شور سے ہوتی رہی کہ جو بھی مورچے سے سر اٹھاتا، اسی وقت اس کا صفایا ہو جاتا۔ رات ہوتے ہی گویا قیامت کا دروازہ کھل جاتا۔ قزلباشوں کے دستے باہر نکل کر مورچوں پر حملے کرتے رہتے۔ دونوں طرف سے برابر بہ کثرت آدمی مارے جاتے رہے۔

اس روز تو غضب ہی ہو گیا۔ قزلباشوں کی ایک بڑی جمعیت نے سعد اللہ خاں کے مورچے پر حملہ کر دیا۔ توپوں کو ناکارہ کر کے اور آدمیوں کو گرفتار کر کے قلعے میں چلے گئے۔ بادشاہی سواروں نے ان کا بہت تعاقب کیا لیکن قلعے کی طرف سے سخت آتش باری کے سامنے بے بس ہو کر ناکام لوٹ آئے۔

مورچے قلعے کے قریب تک تو پہنچا دیے۔ بڑی محنت اور سعی کی مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ بھاری توپوں کی گولہ باری سے یہ ساری کوششیں رائگاں چلی گئیں۔ اسی دوران نعیم نے بادشاہی فوج کی دو توپوں کو ناکارہ بنا دیا۔

مسلسل ناکام گولہ باری کا نتیجہ یہ ہوا کہ توپ خانے کا سارا ساز و سامان ختم ہو گیا اور کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور محاصرہ بہت طویل ہو گیا۔ مجبور ہو کر ناکامی کی اطلاع بادشاہ کو پہنچا دی گئی۔ بادشاہ نے دستخطِ خاص سے فرمان جاری کر دیا کہ مہم کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر دی جائے اور شہزادہ محاصرہ اٹھا کر لوٹ آئے۔

جب لشکریوں تک واپسی کا پیغام پہنچایا گیا تو ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ ہر ایک دل سے یہ چاہتا تھا کہ اب واپس ہوا جائے۔

بادشاہ کا فرمان ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ اورنگزیب کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ قزلباشوں کے حملوں نے اسے ناکام ضرور کر دیا تھا لیکن وہ مایوس نہیں ہوا تھا مگر بادشاہ کے حکم کے سامنے بے بس تھا۔ اس نے اسی جھنجلاہٹ کے عالم میں سعد اللہ خاں کو طلب کیا۔

''آپ کو ناکام حملوں کی اطلاع بادشاہ تک نہیں پہنچانی چاہیے تھی۔''

''شہزادہ عالم! میں مجبور تھا۔ لشکر میں بے دلی پھیلتی جا رہی تھی۔ توپ خانے کا سارا سامان ختم ہو گیا تھا۔''

''میں آخری سانس تک لڑنے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔''

''شہزادہ عالم! جنگیں خالی ہاتھوں سے نہیں لڑی جاتیں۔ ہمارے بے شمار آدمی مارے جا چکے ہیں۔ قلعے کا مکمل وقوع ایسا ہے کہ قزلباشوں کی جیت یقینی ہے۔ ابھی ہمیں مکمل شکست نہیں ہوئی۔ ہم اپنی مرضی سے محاصرہ ختم کر کے جا سکتے ہیں۔ اگر ہمیں کھلے میدان میں شکست ہو اور ہمیں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑے تو کیا ذلت نہیں ہو گی۔ اب ہم بادشاہ کے حکم سے واپس جا رہے ہیں۔ کیا یہ ہماری جیت نہیں؟''

''ہم بادشاہ کو کیا منہ دکھائیں گے۔''

''بادشاہ سلامت ہماری مجبوریوں سے واقف ہیں ورنہ وہ واپسی کا حکم قطعی جاری نہ فرماتے۔''

ان کی باتوں سے شہزادے کی بھی کچھ ڈھارس بندھی اور اس نے واپسی کے احکام صادر کر دیے۔ لشکریوں نے واپسی پر کمر باندھی۔

واپسی ہوئی تو اس شان سے ہوئی کہ اونٹوں کی

قطاروں کے پیچھے ''طبل'' شور مچا رہے تھے۔ نشان کے ہاتھیوں پر اورنگزیب کے علم لہرا رہے تھے۔ شجاعوں کے پرے ننگی تلواریں لٹکائے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایرانی اور بدخشانی کنیزوں کے چھکڑے ان گھوڑوں کے پیچھے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ناکام نہیں کامیاب واپس ہوا ہے۔

اس شان وشوکت کے باوجود دیکھنے والوں کی آنکھیں شرمندگی کے احساس سے جھکی ہوئی تھیں۔

''ارے میاں، ہماری تمہاری زندگی میں تو قندھار کی مہم سر ہونے سے رہی۔''

''کیوں ایسی بری باتیں منہ سے نکالتے ہو۔''

''دیکھتے نہیں، شاہی لشکر سیکڑوں سر کٹوانے کے بعد ایک مرتبہ پھر واپس آ گیا ہے۔''

''جنگوں میں فتح بھی ہوتی ہے شکست بھی۔ دیکھتے نہیں یہ شکست فاتحانہ ہوئی ہے۔ لشکر واپس آیا ہے مگر لٹا پٹا نہیں ہے۔''

''یہ تو شاہ جہاں کی دانش مندی ہے ورنہ کچھ بھی واپس نہ آتا۔''

''جنگ ہتھیاروں سے ہی نہیں، عقل سے بھی لڑی جاتی ہے۔ اس وقت واپسی ہی مناسب تھی۔ کسی مناسب وقت پر یہ لشکر پھر روانہ ہوگا۔''

شہزادہ اورنگزیب بازار میں کھڑے ان لوگوں کی باتوں سے بے خبر چلتا ہوا قلعہ معلیٰ کے سامنے پہنچا اور نوبت خانے کے دروازے پر اترا۔ گھوڑے کو تھپکی دی اور دولت خانہ خاص کی طرف چلا۔ خواجہ سراؤں نے اسے دیکھتے ہی تلواریں زمین سے لگا دیں۔ نقیبوں نے شہزادے کی آمد کا اعلان کیا۔ بوڑھا شہنشاہ شاہ جہاں گاؤ تکیے سے پشت لگائے کشمیری شال گھٹنوں پر ڈالے بیٹھا تھا۔

''شہزادے، ہم تمہارے استقبال کے لیے نہ آ سکے۔''

''ابا حضور! ہم تو خود یہ چاہتے تھے کہ آپ ہارے ہوئے لشکر کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔''

''شہزادے! تم اسے ہارا ہوا لشکر کیوں کہتے ہو۔ تم میدان چھوڑ کر فرار نہیں ہوئے ہو، دشمن کو معافی دے کر واپس ہوئے ہو۔''

''ابا حضور! ہمیں یہی تو دکھ ہے کہ واپس کیوں آئے۔ بہ خدا اگر آپ کا حکم نہ ہوتا اور سعد اللہ خاں اصرار نہ کرتے تو ہم کبھی واپس نہ آتے۔''

''ہم تم سے خوش ہیں کہ تم نے ہمارے حکم کی تعمیل کی۔''

جب شہزادہ واپس ہوا تو بادشاہ نے اس کی خدمت سے خوش ہو کر اسے دکن کے چار صوبوں کا بااختیار صوبہ دار بنا کر رخصت کر دیا۔ داراشکوہ کو ترقی دے کر تیس ہزاری بیس ہزار سوار کا منصب اور دو کروڑ انعام اور کابل کی صوبہ داری عطا کر کے روانہ کر دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ بادشاہ ملکی انتظامات میں مشغول رہا۔ داراشکوہ کابل میں تھا لیکن بے چینی اس پر مسلط تھی۔ وہ ہمیشہ سے اس فکر میں غلطاں تھا کہ کسی طرح قندھار کی مہم پر اس کا تقرر کر دیا جائے۔ اب جبکہ شہزادہ اورنگزیب دکن میں تھا اور وہ خود کابل میں تھا، ایک مرتبہ پھر اس کے دل میں سودا سمایا کہ وہ قندھار کی مہم کے لیے نکلے۔ دارالخلافہ سے دور کابل میں ہونے کی وجہ سے بادشاہ کے عتاب کا خوف بھی دل سے نکل گیا تھا۔ اس کے نادان مشیروں نے بھی اسے خوب بھڑکایا۔

''ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ میواتیوں کے خلاف اپنی خدمات پیش کی تھیں تو بابا جانی سخت برہم ہوئے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ ہم نے ازخود یہ فرمائش کیوں کی۔ اگر ہم نے اس وقت اس خواہش کا اظہار کیا تو نہ جانے کیا ہو۔''

''اُس وقت میں اور اس وقت میں بہت فرق ہے۔'' اس کے ایک مشیر نے کہا۔ ''اب آپ خودمختار ہیں۔ اگر بادشاہ نے انکار کیا بھی تو کابل آپ کی سلطنت ہے۔ یوں بھی بادشاہ کی علالت کی خبریں برابر آ رہی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اورنگزیب اس کا فائدہ اٹھائے۔ آپ جلد از جلد قندھار کا قلعہ فتح کر کے بادشاہ کے دل میں جگہ بنائیں۔''

''لشکر کی تیاری کے لیے بادشاہ کی مدد تو بہرحال درکار ہوگی۔''

''اگر بادشاہ نے انکار کیا تو آپ قندھار کے بجائے دارالخلافہ کا رخ کر سکتے ہیں۔''

''یہ تو بغاوت ہوگی۔''

''آپ خود سمجھدار ہیں۔''

اس کے بعد کچھ کہنے سننے کو رہ نہیں گیا تھا لیکن داراشکوہ کے کانوں میں بہت سی باتیں پڑ چکی تھیں جن پر اب اسے عمل کرنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی درخواست ٹھکرا دی جائے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے کابل سے واپس بلا لیا جاتا۔ اس صورت میں اسے کیا کرنا ہے؟ یہ سوالیہ نشان تھا جس کا جواب اسے ڈھونڈنا تھا۔ اس نے ایسے لوگوں کی فہرست تیار کی جو اورنگزیب کے مخالف تھے اور ان سے رابطہ

کیا تا کہ وہ اورنگزیب کی طرف سے بادشاہ کے کان بھرتے رہیں۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ اورنگزیب ہی سے تھا جس کے پاس ایک آزمودہ کار لشکر اور بھاری توپ خانہ تھا۔ بادشاہ کی نظر پھرتے ہی وہ اس کی مدد کو آسکتا تھا۔ دوسری جانب ہندو اور راجپوت تھے جو داراشکوہ کے ساتھ تھے۔ وہ اسی کشمکش میں دن اور راتیں جاگ جاگ کر گزارتا رہا۔ وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ ایک ہندو جوگی اس کے دروازے پر آیا۔ پہرے داروں کو معلوم تھا کہ داراشکوہ ان جوگیوں سے بہت عقیدت رکھتا ہے۔ ایسے کئی جوگیوں کا اس کے پاس آنا جانا رہتا تھا لہٰذا پہرے داروں نے فوراً داراشکوہ کو خبر کی۔ جوگی کو اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ داراشکوہ نے آگے بڑھ کر جوگی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''بادشاہ ہو کر میرا ایسا استقبال؟'' جوگی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''میں بادشاہ کہاں سے ہو گیا..... ابھی تو ظلِ سبحانی زندہ ہیں۔''

''مرتے کسی کو دیر نہیں لگتی۔''

''ابھی تو قندھار کا قصہ ہی طے نہیں ہوا۔''

''تیری کوششیں بھی تو کمزور ہیں۔''

''مجھے بادشاہ کی جانب سے خطرہ ہے۔''

''کیا فقیروں کی خدمت کی جانب سے بھی خطرہ ہے؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''بہت جلد سمجھ جائے گا۔''

اور داراشکوہ واقعی سمجھ گیا۔ اس نے اپنے گلے سے سچے موتیوں کا ہار اتارا اور جوگی کے گلے میں ڈال دیا۔ جوگی خوش خوش رخصت ہو گیا۔

جوگی کے رخصت ہوتے ہی شہزادے نے مشیروں کو طلب کیا اور انہیں جوگی سے ہونے والی باتوں کے بارے میں آگاہ کیا، خاص طور پر ان دو جملوں سے آگاہ کیا۔

''مجھے بادشاہ کی جانب سے خطرہ ہے۔''

''کیا فقیروں کی خدمت کی جانب سے بھی خطرہ ہے۔''

ایک مشیر نے ان فقیروں کی وضاحت فوراً کر دی۔

''یہ فقیر آپ کو یہ بشارت دے کر گیا ہے کہ ظلِ سبحانی کی جانب سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ آپ بادشاہ کی جانب اپنی درخواست روانہ فرمائیں۔ وہ یقیناً آپ کو قندھار کی مہم پر سرفراز فرمائیں گے۔''

''فقیروں کی خدمت کی جانب سے بھی خطرہ ہے؟ اس فقرے کا کیا مطلب ہے۔''

''فقیر یہ نوید دے گیا ہے کہ قندھار کی مہم میں آپ سرخرو ہوں گے۔''

اس مشاورت کے بعد شہزادے کی بھی ہمت ہوئی۔ اس نے فوراً بادشاہ کے نام ایک درخواست تحریر کی اور تیز رفتار قاصد کے ذریعے روانہ کر دی۔ اس کے بعد بھی وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ سفر کی تیاریاں شروع کر دیں کہ اگر بادشاہ نے اسے اجازت نہ دی تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ دارالخلافے کا رخ کر سکے۔ دوسرا راستہ اس کے پاس یہ بھی تھا کہ کابل میں رہتے ہوئے خودمختاری کا اعلان کر دے۔ وہ جو بھی راستہ اختیار کرتا، اس کا انحصار بادشاہ کے جواب پر تھا۔ وہ بے چینی سے دن گن رہا تھا کہ ایک روز قاصد واپس آ گیا۔ اس کے چہرے کی بشاشت بتا رہی تھی کہ جواب کیا آیا ہوگا۔ بادشاہ نے اس کی درخواست منظور کر لی تھی۔

''تسخیر قندھار کی مہم تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔''

داراشکوہ تو تیار ہی بیٹھا تھا۔ جواب آتے ہی لاہور کی طرف روانہ ہو گیا تا کہ سامانِ جنگ کی تیاری اپنے سامنے کرا سکے۔ بادشاہ نے بھی لاہور میں اپنا قیام بڑھا دیا اور قلعہ گیری کا سامان تیار کرایا۔ دس بڑی توپیں، 35 چھوٹی توپیں، چھوٹے بڑے ایک ہزار گولے، چودہ ہزار بان، بارود وغیرہ مہیا کر دیا۔ بنجاروں کو رسد پہنچانے کے لیے مامور کیا۔

جب تمام تیاری مکمل ہو گئی تو محاصرے کی تاریخ مقرر کی گئی۔ رخصت کرتے وقت شہزادے کو خلعت، تلوار، خنجر مرصع اور دوسرے جڑاؤ آلات، گھوڑے، ہاتھی، جن پر طلائی مینا کار اور طلائی ساز تھے عنایت فرمائے۔

شہزادے کے ساتھ نامی گرامی امیر اور راجا بادشاہی لشکر کابل کی متعینہ فوج اور دوسرے صوبوں کی جمعیتوں میں سے مقرر کیے گئے تھے۔ مجموعی طور پر لشکر میں ستر ہزار سوار منصب دار اور تنخواہ یاب امیر تھے۔ فوج کے اخراجات کے لیے ایک کروڑ روپے کا خزانہ جو ہمراہ تھا، شہزادے کو دے دیا۔

رستم خاں شہزادے کے لشکر کا ہراول تھا۔ وہ قلعہ گیری کا سامان بارہ ہزار سوار اور چند مشہور امیروں کو لے کر بادشاہ کی متعینہ تاریخ کو قلعے پر پہنچ گیا اور محاصرے کے ارادے سے بہادر نوجوانوں اور قزاق ازبکوں کو قلعے کے اطراف پھیلا دیا۔ قزلباشوں نے بھی قلعے سے نکل کر حملہ کیا اور خواجہ خاں کو ازبکوں کی ایک جماعت کے ساتھ قتل اور زخمی کر دیا۔ قلعے والوں کے بھی چند آدمی مارے گئے۔ اسی

دن رستم خاں نے قلعے کے دروازے کے سامنے گولہ باری کی زد سے باہر کیمپ لگا دیا۔ دوسرے دن سوار ہو کر باقاعدہ منظم فوج کے ہمراہ قلعے کے اطراف معائنہ کرنے کے لیے نکلا اور تیس دن تک مورچے باندھنے اور نقب لگانے کی تجویزیں بناتا رہا۔ شہزادہ بھی دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کر کے قلعے کے قریب پہنچا اور دن کے سات بجے قلعے سے دور چھاؤنی ڈال دی پھر قلعہ کشائی کی تجویز اور انتظامات کے ملاحظے کے لیے سوار ہو کر نکلا۔ بعد میں شہزادہ نے مرزا کامران کے باغ کے قریب قیام کیا۔ رستم خاں کو دوسرے امراء کے ساتھ جگہ جگہ متعین کیے مورچے تقسیم کیے اور ہر ایک کو توپ خانہ اور دوسرا سامانِ جنگ تقسیم کر دیا پھر ہر امیر مورچے باندھنے کے لیے بیل داروں کی مدد سے کوشش کرنے لگا۔ خاص طور سے جعفر میر آتش دوسرے تمام امیروں سے بڑھ کر سرگرم تھا۔

بادشاہ کا حکم پہنچا تھا کہ قندھار سے پہلے اس کے ماتحت قلعوں کی فتح کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا جائے تاکہ قندھار کے محصوروں کے حوصلے پست ہو جائیں۔ یہ حکم ملتے ہی شہزادے نے رستم خاں، نجابت خاں اور راجاؤں کے ساتھ بیس امیروں، پندرہ ہزار سواروں، احدیوں اور... بہ کثرت برقندازوں کو قلعہ بست پر فوج کشی کے لیے مقرر کیا۔ جب لشکر قلعے کے نیچے پہنچا تو دونوں طرف سے سخت مقابلے ہوئے۔ توپوں کی گرج اور بندوقوں کی آتش باری سے میدان دھواں دھار ہو گیا۔ اس آتش باری کو دس دن گزرے تھے کہ رستم خاں کے حکم سے بڑی توپ سے گولہ باری شروع کر دی گئی۔ جب قلعے کے در و دیوار پر چند گولے جا کر گرے تو محصوروں کے حوصلے پست ہو گئے اور قلعہ دار پناہ اور امان لے کر قلعے کی چابیاں لے کر رستم خاں کے پاس آ گیا۔

رستم خاں نے قلعہ دار کی بڑی خاطر مدارت کی۔ وہ رستم خاں سے ایسا متاثر ہوا کہ جب شاہی فوج نے قلعہ کرسنگ کا محاصرہ کر لیا تو اس نے اپنے بیٹے کو جو قلعہ کرسنگ کا قلعہ دار تھا، خط لکھا۔

''اب محصور ہونے اور جنگ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جس طرح میں نے قلعے کو حوالے کر کے امان حاصل کر لی ہے، تم بھی اطاعت اختیار کر لو۔''

اس کے بیٹے نے پہلے تو اس خط پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بار بار کے اصرار پر بھی وہ تیار نہ ہوا مگر چند دن جنگ کرنے کے بعد قلعے کو خالی چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

علاقے میں شاہی فوج کی ایسی دھاک بیٹھی تھی کہ اردگرد کے کئی قلعے بہ آسانی قبضے میں آ گئے۔

ان قلعوں کی فتح کی اطلاع دربارِ شاہی تک پہنچی۔ امید تو یہ تھی کہ بادشاہ ان فتوحات کو پسند کرے گا لیکن بادشاہ کی جانب سے ناپسندیدگی کی اطلاع پہنچی۔ بادشاہ نے مزید پیش قدمی سے روک دیا اور قندھار کی تسخیر کے لیے مسلسل تاکیدی پیغام بھیجے۔

ایک روز ایک گھڑسوار دھول میں اٹا تھکن سے چُور لشکر میں داخل ہوا۔ لشکری روکتے رہ گئے لیکن وہ نہایت بدتمیزی سے شہزادہ داراشکوہ کے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں کھڑے پہرے داروں نے اسے نیزوں اور تلواروں پر روک لیا۔

''کون ہے تُو اور کہاں چلا جاتا ہے؟''

''میں لاہور سے یہاں تک رکے بغیر چلا آ رہا ہوں اور تم مجھے روک رہے ہو۔''

''جانتا نہیں، یہ عالی مرتبت شہزادہ داراشکوہ کی آرام گاہ ہے۔''

''مجھے شہزادے سے ہی ملنا ہے۔''

''ملنا سر آنکھوں پر مگر یہ کون سا طریقہ ہے؟''

''میں اجڈ آدمی مجھے طریقہ کیا معلوم۔''

''یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ ہے کہ تُو ہے کون۔''

''بس اتنا بتا دینا کافی ہے کہ میں لاہور سے ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں۔''

''ہم کیسے مان لیں کہ تو لاہور سے آیا ہے؟''

''یہ تمہارا شہزادہ تمہیں بتائے گا اگر وہ مناسب سمجھے گا۔''

''تو یہاں ٹھہر۔ ہم شہزادے سے پوچھ کر بتاتے ہیں۔''

''اس سے کہنا میں اپنا نام نہیں بتا سکتا۔ صرف اس سے مل کر ہی بتا سکتا ہوں کہ مجھے کس نے بھیجا ہے۔''

کچھ دیر بعد پہرے دار واپس آئے اور شہزادے کی اجازت سے اسے شہزادے کے سامنے پیش کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو اسی طرح دیکھ رہے تھے جس طرح ایک اجنبی دوسرے کو دیکھتا ہے، بالآخر وہ گھڑسواریوں گویا ہوا۔

''حضور، مجھے دیکھ کر یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے۔ میرا مختصر تعارف تو یہ ہے کہ میں لاہور سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کی فتح یابی کے لیے ان ''جنوں'' کو مجبور کر دوں جن کو میں تسخیر کر چکا ہوں۔''

داراشکوہ پر صوفی مشرب ملدوں کی صحبت کا بڑا اثر تھا۔ اس نے کفر و اسلام کو توام (جڑواں) قرار دے دیا تھا اور تصوف کو بدنام کر رہا تھا۔ اس کی صحبت میں برہمن، جوگی اور جعلی عامل جمع رہتے تھے۔ خصوصاً ہندو جوگی اسے طرح طرح سے ورغلاتے رہتے تھے۔ اس کے لباس میں ٹنکے ہوئے ہیروں میں ''شیو'' کی تصویر اور ''پربھو'' کے الفاظ درج رہتے تھے۔ اسی طرح وہ مسلمان صوفیوں کا بھی عقیدت مند تھا۔

وہ اگر توہم پرست نہ ہوتا تو آنے والے اجنبی سے یہ ضرور پوچھتا کہ وہ آخر اس کی مدد کرنے کے لیے اتنی دور سے کیوں چلا آیا۔ وہ تو بس اس بات سے ہی خوش ہو گیا کہ جنات کی مدد سے قلعہ فتح ہو جائے گا۔ اورنگزیب ناکام واپس گیا تھا لیکن وہ کامیاب لوٹے گا۔

اس نے اجنبی مہمان کے لیے ایک شاندار خیمہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ شام ہوئی تو ہیرے جواہرات کے زیورات اس کی خدمت میں روانہ کیے۔ خدام اور رقاصائیں اس کے خیمے میں پہنچا دی گئیں۔

اس خیمے میں تین دن گزارنے اور تھکن اتارنے کے بعد وہ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''اب وقت آ گیا ہے کہ میں آپ کے لیے ''عمل'' شروع کروں لیکن اس کے لیے مجھے بعض اشیا درکار ہوں گی۔''

''وہ کون سی چیز ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔ جو کہو گے حاضر ہو جائے گی۔''

''مجھے ایک مرد (نوعمر لڑکا) درکار ہو گا جس کا رنگ گندم گوں، آنکھیں بادامی، گردن صراحی دار، قد نہ دراز نہ کوتاہ۔''

''ہم ابھی تلاش کرنے کا حکم دیتے ہیں۔''

''تین سالہ دو آتشہ شراب بھی مل جائے تو میں اس امرد کے خون اور اس شراب سے چند ہزار نقش لکھ کر بعض جنوں کو جو میرے محکوم ہیں، ان کے لشکروں سمیت بلاؤں گا اور ان کو قلعہ والوں کی سرکوبی کے لیے مامور کر دوں گا۔''

''شاہی لشکر کا کردار کیا ہو گا؟''

''اس عمل کے چالیس دنوں میں بادشاہی لشکر حملہ کرنے میں پوری کوشش کرے تاکہ ''جن'' بھی مدد کرنے میں سرگرمی دکھائیں۔''

شہزادے نے اس شخص کی مطلوبہ اشیا فراہم کرنے کے لیے اپنے ایک امیر کو مقرر کر دیا۔ جب یہ خبر لشکر میں پھیلی تو لشکر میں جتنے امرد (نوعمر لڑکے) تھے روپوش ہو گئے۔ بڑی مشکلوں سے ایک نوعمر لڑکا ہاتھ لگ گیا۔ شراب کا ملنا مشکل نہیں تھا۔ اس مردود نے اس لڑکے کو نہایت بے دردی سے قتل کر کے اس کے بقول نقش لکھ کر ''جنوں'' کے حوالے کر دیے۔

داراشکوہ نے ایک بڑی رقم اس کے حوالے کی اور وہ خلوت خانے میں عیش کرنے لگا۔ عیش بھی ایسا کہ خوبصورت لڑکیاں اس کی خدمت کے لیے مقرر کردی گئیں۔ شہزادہ خود ایسا بے فکر ہوگیا کہ بادشاہ کی جانب سے آنے والی کسی عرضداشت کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ جنگ کا تمام کاروبار امیروں کے سپرد کر کے مطمئن بیٹھ گیا۔

شاہی لشکر نہایت جانفشانی سے لڑ رہا تھا لیکن فتح کی صورت نظر نہ آتی تھی، الٹا بھاری نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ شہزادے کی خیمہ گاہ بھی قلعے والوں کی گولہ باری سے محفوظ نہیں تھی۔ اب شہزادے کو بھی ہوش آنے لگا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ امراء کے پاؤں اکھڑنے لگے ہیں تو اس نے ان سب کو طلب کیا اور انہیں ڈرایا دھمکایا۔

''مجھے اورنگزیب نہ سمجھنا جو اس قلعے کے نیچے سے دو مرتبہ ناکام واپس چلا گیا۔ اگر تم نے قلعے کو فتح نہ کیا تو میں تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا کہ واپس جا کر اپنے بیوی بچوں کی شکل دیکھ سکو۔''

اس دھمکی کے بعد جنگ میں تیزی آگئی لیکن فتح کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جب اس مکار شعبدہ باز نے دیکھا کہ مقررہ مدت گزر گئی ہے تو وہ جان گیا کہ اب سارا بھید کھل جائے گا۔ شہزادہ اس سے ضرور پوچھے گا کہ تیرے جنات مدد کو کیوں نہیں آئے اور وہ عتاب کا حقدار ٹھہرے گا تو وہ لشکر سے فرار ہو کر قلعے کے حصار کے نیچے چلا گیا اور امان کا رومال ہلا کر پناہ طلب کی۔ قلعہ دار نے سارے حالات معلوم کرنے کے بعد اسے قلعے میں بلالیا۔ گویا وہ قلعہ دار کی پناہ میں چلا گیا مگر اس کی موت آچکی تھی۔ وہ اکثر برج اور حصار پر سیر کرتا تھا اور بادشاہی فوج کے آدمیوں سے باتیں کرتا تھا۔ قزلباش اس کی طرف سے پہلے ہی مشکوک تھے۔ اس کی ان حرکتوں سے ان کا شبہ اور بڑھ گیا۔ ایک دن موقع دیکھ کر اسے قلعے سے نیچے گرا دیا گیا۔

☆☆☆

قلعے پر آخری حملے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ رات کے آخری حصے میں ہزاروں لشکریوں نے زینے اور کمندیں لے کر چڑھائی کردی اور قلعے کی دیوار پر پہنچ گئے۔ راجپوتوں کی ایک جمعیت کے ساتھ بڑی جانبازی دکھائی۔ محصوروں کو مرعوب کرنے کے لیے قلعے کے چاروں طرف سے توپوں، بندوقوں سے قلعے پر بڑی سخت آتش باری کی گئی۔ ہزاروں گولے قلعے میں جا کر پھٹے۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ دن میں گولہ باری سے جو دیواریں گر جاتی تھیں، قلعے والے راتوں رات ان کو تعمیر کر لیتے تھے مگر اس رات اس غضب کی گولہ باری ہوئی کہ ان کو مرمت کا موقع بھی نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اب قلعے والوں نے توپوں، بندوقوں سے گولہ باری شروع کردی اور بڑی سخت سنگ باری کی۔ رات کی نسبت ان کا حملہ زیادہ سخت ہوگیا۔ ایسا سخت کہ شاہی فوج کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ سادات بارہہ، مغل، راجپوت اور افغانوں کی ایک کثیر تعداد کام آگئی اور ایک بڑی جماعت زخمی ہوگئی۔ آخر یہ ناکام لشکری گرتے پڑتے واپس آگئے۔ غرض اس حملے میں دو ہزار سے زیادہ آدمی ہلاک ہوگئے۔

اس ناکامی پر شہزادہ سخت برہم ہوا اور رستم خاں سمیت تمام امراء کو بلا کر خوب ڈانٹ پلائی۔

''ہم نے بار بار کہا ہے کہ ہم اورنگزیب کی طرح نہیں ہیں کہ بغیر قلعہ فتح کیے واپس چلے جائیں گے۔''

سب نے جواب میں اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ کیا، جاں نثاری کی قسمیں کھائیں اور از سر نو نقب لگانے، دمدمے بنانے اور مورچے قائم کرنے میں لگ گئے۔ روزانہ دونوں طرف سے کافی آدمی مارے جاتے تھے جن میں شاہی لشکر کے آدمیوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ آخر عرب اور عجم کے ہنرمندوں نے لکڑی کے تختے رسیوں سے باندھ کر جھولے بنائے اور لشکری ان کے ذریعے پہاڑ کی اس بلندی تک پہنچ گئے جہاں تک گولہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ محصوروں نے یہ کیا کہ مٹی کے تیل کی مشکیں بھر بھر کر ان چوبی تختوں کے آس پاس لٹکا دیں پھر ان مشکوں پر تیر مار کر اس طرح سوراخ کردیے کہ ...تختوں پر تیل کا چھڑکاؤ ہوگیا۔ پھر لحافوں اور پرانے کپڑوں کو تیل میں تر کر کے لانبی لانبی لکڑیوں پر باندھ دیا اور انہیں آگ دکھا کر ان رسیوں اور تختوں تک پہنچا دیا۔ اس تدبیر سے تمام جھولے مع سواروں کے جل کر راکھ ہوگئے۔ خندق کے کنارے سے دمدمے تک انہوں نے نقب لگا کر اندر اندر دمدمہ کی مٹی نکال دی اور جب تک بادشاہی فوج کو اطلاع ہوتی، وہ گر کر ڈھیر بن گیا۔

محاصرے کی مدت پانچ ماہ سے بھی بڑھ گئی تھی اور سرنگ بارود وغیرہ کا سامان ختم ہونے لگا، غلے کا ملنا مشکل ہوگیا۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ برفباری شروع ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر برف کی سل جم گئی۔ سردی کی شدت اور بھوک سے بہ کثرت آدمی اور جانور تلف ہوگئے۔

بادشاہ تک یہ حالات برابر پہنچ رہے تھے لہٰذا دستخطِ خاص سے محاصرہ اٹھا کر واپس جانے کے لیے فرمان جاری

ہوگیا۔ اب رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شہزادے نے قلعے سے واپسی کے لیے کوچ کیا چونکہ قزلباشوں کے تعاقب اور افغانوں کی شرارت کا اندیشہ تھا اس لیے غیرت خاں کی حفاظت میں توپ خانے کو پہلے ہی غزنی روانہ کر دیا اور خود چند مقام کرتے ہوئے کوچ کرنے لگا۔ ہر منزل پر قزلباشوں اور اس نواح کے لوگوں کی شرارتوں سے فوج کے اطراف کے آدمیوں اور عقبی حصے کو کافی نقصان پہنچتا رہا۔ یہاں تک کہ شکست خوردہ لشکر ملتان پہنچ گیا۔ وہاں چند دن آرام کرنے کے بعد شہزادہ لاہور لوٹ آیا۔ لوٹ تو آیا مگر کیسے۔ جلیل الشانی منصب دار ہم رکاب نہ تھے۔ مشہور زمانہ ہاتھی جنہیں وہ ساتھ لے گیا تھا، ان میں سے کوئی بھی ساتھ نہ تھا۔ نیم روشن بازار اس کی آمد کو غور سے دیکھ رہے تھے اور اورنگزیب کی واپسی کو یاد کر رہے تھے۔ شکست کھا کے وہ بھی لوٹا تھا لیکن جس شان سے گیا تھا اسی شان سے واپس آیا تھا۔ اونٹوں کی قطاروں کے پیچھے ''طبل'' شور مچا رہے تھے۔ مست ہاتھیوں پر اورنگزیب کے ''علم'' لہرا رہے تھے۔ شجاعوں کے پرے تھے جو ننگی تلواریں لٹکائے گھوڑوں پر سوار تھے۔

شہزادہ داراشکوہ بے کس و نامراد، سر سے پاؤں تک شکست کا لباس پہنے لاہوری دروازے سے گزرا اور قلعہ معلیٰ کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ گنے چنے ساتھی پیچھے کہیں رہ گئے تھے۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ قندھار کی مہم میں شکست کھا چکا ہے۔ پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ وہ خود واپس نہیں ہوا ہے بلکہ بادشاہ کے حکم سے لوٹ کر آیا ہے۔ وہ گھوڑے سے اترا اور پاپیادہ دولت خانہ خاص کی طرف چل دیا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ آرام فرما رہے ہیں۔ اس وقت ملنا محال ہے۔ وہ تو اپنے باوا کا لاڈلا بیٹا تھا۔ اورنگزیب پر اسے ہمیشہ ترجیح دی جاتی تھی۔ یہ کیسا انقلاب آیا کہ بادشاہ کو اس کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ وہ الٹے قدموں لوٹ آیا۔

☆☆☆

عصر کی اذان بلند ہوئی تو بادشاہ کے خدمت گاروں نے اسے بیدار کیا۔ جب وہ نماز اور وظائف سے فارغ ہوا تو مصاحبین نے اسے داراشکوہ کی واپسی کے بارے میں آگاہ کیا۔ بعض مصاحبین نے داراشکوہ کی خستہ حالی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا، بادشاہ نے انہیں درمیان میں ٹوک دیا۔

''کیا تم ہمیں اتنا بے خبر جانتے ہو۔ بس اتنا سن لو کہ آج تک ایسی شکست کسی ولی عہد کو نصیب نہ ہوئی ہوگی جس شکست کا سامنا داراشکوہ کو ہوا ہے۔''

اس موقع پر سعد اللہ خاں نے داراشکوہ کی حمایت کی۔

''حضور! یہ بھی تو دیکھیے کہ شہزادے نے وہاں پہنچتے ہی اطراف کے تین قلعے فتح کر لیے تھے۔''

''ہم نے اسے اطراف کے لیے نہیں، قلعہ قندھار کے لیے بھیجا تھا۔ وہاں اس نے کیا کارنامہ انجام دیا؟ ہم نے تو یہ تک سنا ہے کہ وہ ایک چالاک شعبدہ باز کی باتوں میں آگیا تھا جس نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ جنات کے ذریعے قلعہ فتح کرا دے گا۔ داراشکوہ قندھار کی کنیزوں کو خود پر حلال کرتا رہا۔ جنات کے آسرے پر اس نے کوششیں ترک کر دیں۔ کیا شہزادے ایسے ہوتے ہیں؟ اس نے تو رعب شاہجہانی کو خاک میں ملا دیا۔ جنات کے آسرے پر ظاہری اسباب سے غافل ہوگیا اور ساری سپاہ کٹوا کر واپس آگیا۔''

بعض امراء نے بہت کوشش کی کہ شہزادے کی طرف سے اس کا دل صاف ہو جائے لیکن بادشاہ کی برہمی نے کسی کی بات نہ مانی۔ داراشکوہ معتوب ہوگیا۔ بادشاہ نے آئندہ اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔

☆☆☆

داراشکوہ کو معتوب ہونے کا صدمہ تو تھا لیکن خوشامدی اسے خوش فہمیوں کی ہوا میں اڑا رہے تھے۔ نجومیوں اور جوگیوں کی چاندی ہوگئی تھی۔ اسے طرح طرح کی خوش خبریاں سنائی جا رہی تھیں۔ یہ تک کہا جا رہا تھا کہ بہت جلد وہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھنے والا ہے۔ اس کسمپرسی کے عالم میں بھی وہ جوگیوں اور نجومیوں پر مٹھیاں بھر بھر کے دولت نچھاور کر رہا تھا۔

بادشاہ کا یہ حال ہوا تھا کہ گوشہ نشیں ہو کر رہ گیا تھا۔ چند ہی امراء رہ گئے تھے جن سے ملاقات کے لیے وقت نکال لیا کرتا یا پھر اس کی بیٹی جہاں آرا تھی جو اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتی تھی۔

اس مسلسل گوشہ نشینی اور شکست کے غم نے اسے بیمار کر دیا۔ امور سلطنت پرائے ہاتھوں میں جانے لگے۔ امرائے کبار ان حالات کو سنبھالا دے سکتے تھے لیکن انہیں مشورے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سعد اللہ خاں کے انتقال کے بعد تو میدان بالکل ہی خالی ہوگیا۔ وزارت عظمیٰ کا قلم دان ایک ہندو کے سپرد ہوا تھا جو قطعی بادشاہ کا مزاج داں نہیں تھا۔

دارا شکوہ نہایت دکھ سے یہ حالات مشاہدہ کر رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ بادشاہ کی بیماری کی خبر دکن میں اورنگزیب تک نہ پہنچ سکے۔ وہ خود عتاب کے دن گزار رہا تھا۔ کوشش کے باوجود بادشاہ کی مزاج پرسی کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ ایک جہاں آرا تھی جو اس سے مسلسل رابطے میں تھی یا سرمد تھے جن سے ملاقات کے لیے وہ کبھی کبھی چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی بے تحاشا دل گھبرایا اور وہ سرمد سے ملاقات کے لیے ہاتھی پر سوار ہوا۔

شاہ جہانی مسجد کے قریب سرمد اپنی کٹیا میں ننگ دھڑنگ بیٹھے تھے۔ گھاس پھوس کی بنی اس کٹیا کے قریب وہ ہاتھی سے اترا۔ خاص برداروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر سرحد تک پہنچا دیا۔ ان کے قریب بیٹھے ہوئے عقیدت مند شہزادے کو دیکھتے ہی ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ سرمد کی آنکھوں نے اس کا استقبال کیا۔

''حضرت! میرے لیے دعا فرمایئے۔'' شہزادے نے عرض کیا۔

''بادشاہ ہو کر فقیروں سے دعا کا طالب ہے۔''

سرمد کی زبان سے اس فقرے کا ادا ہونا تھا کہ مبارک سلامت کی آوازوں سے کٹیا گونج اٹھی۔ ساتھ آئے خاص برداروں نے سرمد کے ہاتھ چوم لیے۔ اس فقرے کا مطلب یہ لیا گیا تھا کہ شہزادے کے سر پر تاجِ شاہی سجنے والا ہے۔ وہ اب شہزادہ نہیں بادشاہ ہونے والا ہے۔ خود دارا شکوہ نے بھی اس کا یہی مطلب لیا تھا۔ اس لیے کہ جواب میں اس نے بھی سرمد کا ہاتھ چوما تھا۔

وہ ابھی کٹیا سے باہر نکلا ہی تھا کہ جہاں آرا کا پیغام اسے مل گیا۔ جہاں آرا نے اسے طلب کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے سرمد کی زبان سے نکلا ہوا پورا ہونے والا ہے۔ میری بہن یہی خوش خبری سنانے کے لیے مجھے طلب کر رہی ہے۔ بادشاہ کے بعد ولی عہد ہی بادشاہ بنتا ہے۔ اورنگزیب کیسا ہی لائق سہی عمروں کا فرق نہیں مٹا سکتا۔ مجھے تختِ شاہی تک پہنچنے سے نہیں روک سکتا۔ اس نے کچھ سوچے بغیر ہاتھی کا رخ موڑ دیا۔

دارا شکوہ کی آمد کا شور مچا تو جہاں آرا نے طلائی کرسی پر پہلو بدلا۔

''دارا شکوہ بابا کو فوراً اندر بھیجو۔''

یہ جملہ ادا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دارا شکوہ کمرے میں داخل ہوا۔

''دارا شکوہ بابا، جس پریشانی نے ہمیں فکر مند کیا ہے ہم آپ کو اس سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہم ہمہ تن گوش ہیں۔''

''اس خبر میں کوئی نئی بات نہیں کہ بابا جانی سخت بیمار ہیں۔''

''ہمیں معلوم ہے اور افسوس ہے کہ ہم ان سے ملاقات سے بھی محروم ہیں۔''

''امید کی شمعیں بجھنے لگی ہیں۔''

''خدا انہیں جلد صحت عطا فرمائے۔''

''دعاؤں اور دواؤں سے قطع نظر ضروری ہے کہ ہم ملکی حالات کا بغور مشاہدہ کریں اور کوئی قدم اٹھائیں۔''

''حالات آپ کے سامنے بھی ہیں اور ہمارے سامنے بھی۔''

''ہم جہاں تک دیکھ رہے ہیں تمہاری نظر وہاں تک نہیں جا رہی ہے۔''

''ہمیں معلوم ہے آپ اورنگزیب کے بارے میں بات کریں گی۔''

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ دکن یہاں سے بہت دور ہے لیکن ہندوستان سے باہر نہیں۔ اورنگزیب کو آتے دیر نہیں لگے گی۔ ابھی تک ہم نے ظلِ سبحانی کی خبر کو دکن تک پہنچنے سے روکے رکھا ہے لیکن کبھی نہ کبھی یہ خبر پہنچے گی ضرور۔''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''یہی کہ اورنگزیب کے یہاں پہنچنے سے پہلے تاجِ شاہی اپنے سر پر رکھ لو۔''

''یہ آپ کہہ رہی ہیں؟''

''ہاں، ہم کہہ رہے ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... ظلِ سبحانی۔''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اس وقت اگر کسی سے خطرہ ہو سکتا ہے تو وہ اورنگزیب ہے۔ اس کے پاس شاہی لشکر موجود ہے۔ تم نے اگر تختِ طاؤس پر قدم رکھ دیا تو شاہی فرمان کے ذریعے لشکر کو واپس بلا سکتے ہو۔ امراء بھی تمہارے حکم کے منتظر ہوں گے۔''

دارا شکوہ کے کانوں میں سرمد کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''بادشاہ ہو کر فقیروں سے دعا کا طالب ہے۔'' انہوں نے تو پہلے ہی خوش خبری سنا دی تھی اب جہاں آرا بھی یہی کہہ رہی ہے۔ اس نے جہاں آرا کو مزید ٹٹولا۔

''ظلِ سبحانی کی زندگی میں، میں یہ جسارت کیسے کر سکتا ہوں۔''

''ہم اس جسارت کی ضمانت لیتے ہیں۔ اگر ظلِ سبحانی صحت یاب ہو گئے تو ان سے تمہاری معافی کی درخواست ہم

کریں گے۔ اس وقت تو تم ملک کی سلامتی کی فکر کرو اور بس۔ ذرا یہ بھی تو سوچو کہ اگر ظل سبحانی انتقال فرما گئے تو اقتدار کے حصول کی رسا کشی کا مقابلہ کر سکو گے؟ اس وقت سب بے خبر ہیں، اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لو۔"

اب کہنے سننے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ کسی فیصلے تک پہنچنا داراشکوہ کا کام تھا۔ دونوں طرف سکوت پہرا دے رہا تھا۔ آخر داراشکوہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

"جیسا آپ فرماتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

"میرے بھائی! اللہ آپ کی حفاظت کرے۔"

"میرے لیے کوئی اور حکم؟"

"آج جمعۃ المبارک ہے۔ غسل کریں۔ خلعتِ فاخرہ زیب تن فرمائیں۔ ظل سبحانی کی خاص سواری پر سوار ہو کر جامع مسجد جائیں۔ رعایا سے خطاب فرمائیں اور ہاں..... اس خطاب میں ظل سبحانی کی صحت کی دعا بار بار کی جائے۔"

داراشکوہ نے کوئی جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا اور کمرے سے نکل گیا۔

محل میں پہنچتے ہی بہن کی ہدایت پر عمل کیا۔ نہا کر نکلا تو حالت یہ تھی کہ بازوؤں پر جوشن آراستہ تھے جن پر "برہما" کے الفاظ کندہ تھے۔ کمر میں بندھے پٹکے میں "شیو" کی مورتی تھی۔ اسی سج دھج کو لیے وہ جہاں آرا کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا اس لباس میں مسجد جاؤ گے؟"

"اس لباس میں نامناسب بات کیا ہے؟"

"کم از کم آج تو اپنے لباس سے یہ ہندو نشانیاں مٹا دو۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

"یہی کہیں گے کہ دارا آج بھی نہیں بدلا۔"

"کم از کم مصلحت کا خیال کرو۔"

"میں مصلحت کے لیے اپنے اصول نہیں بدل سکتا۔ دنیا کو مجھے اسی حالت میں قبول کرنا ہوگا۔" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

"فلک سیر" نامی گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ گرز برداروں نے گھوڑے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شہزادہ سوار ہوا۔

شہر میں شور مچا ہوا تھا کہ داراشکوہ نماز جمعہ ادا کرنے مسجد آئے گا۔ اسے دیکھنے کے شوق نے بے نمازیوں کو بھی نمازی بنا دیا تھا۔ کثرت سے مخلوق جمع تھی۔ راجپوت محافظ سواروں نے اسے بہ حفاظت مسجد کے اندر پہنچایا۔ قاضی القضا نے اعلان کیا۔

"ولی عہدِ سلطنت، بلند اقبال، سلطان داراشکوہ اپنی رعایا کو شرفِ کلام عطا فرمائیں گے۔"

داراشکوہ منبر پر آیا۔

"آپ لوگ یقیناً میرے لباس کو دیکھ رہے ہوں گے جس پر "شیو" کی تصویر اور "پربھو" کے الفاظ کندہ ہیں۔ یقیناً آپ لوگ اس پر معترض ہوں گے۔ جو لوگ معترض ہیں وہ سن لیں کہ میں ایک ایسے ملک پر حکومت کر رہا ہوں جس میں ہندو اور مسلمان دونوں رہتے ہیں۔ مجھے دونوں کی دلجوئی کا خیال ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے اور یہی انصاف ہے۔ میں مسلمان ہوں اسی لیے مسجد میں ہوں۔ یہ تصویریں ہیں، اسی کا نام انصاف ہے۔ میری اس وضاحت کے بعد بھی اگر کسی سازش کا شکار ہوئے تو پھر میں نہیں، میری تلوار انصاف کرے گی۔"

آخر میں اس نے شہنشاہ کی صحت یابی کے لیے دعا کروائی۔

"خدا شہنشاہ کو صحت عطا فرمائے تاکہ ان کی یہ بات غلط ثابت ہو جو یہ کہتے ہیں کہ میں نے تخت پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں ولی عہد ہوں، صرف ولی عہد۔ یہ الگ بات کہ سلطنت میرا حق ہے۔"

وہ مسجد سے رخصت ہوا تو ان نمازیوں کو زبان مل گئی جو اس کی موجودگی میں بولنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ بعض کو تو یہ بھی شک تھا کہ شہنشاہ مر چکا ہے۔ عوام سے یہ خبر چھپائی جا رہی ہے۔

بازاروں میں ان آوازوں کی گونج بھی سنائی دے رہی تھی۔

"یہ خبریں دکن پہنچنے کی دیر ہے۔ دیکھ لینا اورنگزیب، داراشکوہ کا دماغ درست کر دے گا۔"

"بھائی! ہاتھی لڑتے ہیں تو نقصان کھیتوں کا بھی ہوتا ہے۔ بس اللہ سے پناہ مانگو۔"

☆☆☆

داراشکوہ کا مسجد جانا اور دعائے صحت کے لیے ہاتھ اٹھانا ایسا بابرکت ہوا کہ چند دن بعد ہی اس نے شہنشاہ کی شفایابی کی نوید سن لی۔ وہ اس وقت اکیلا بیٹھا تھا کہ غلام حاضر ہوا اور حکیم احسن کے آنے کی اطلاع پہنچائی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "یا اللہ خیر! ظلِ سبحانی خیریت سے ہوں۔"

وہ ابھی اجازت کے الفاظ ادا بھی نہ کر پایا تھا کہ حکیم احسن کمرے میں داخل ہوئے۔ کورنش بجا لانے کے بعد رکوع کی حالت میں چلے گئے۔

"مبارک ہو۔ ظلِ سبحانی نے کئی روز بعد آنکھیں کھولی

ہیں اور تبسم فرمایا ہے۔"

"اس وقت تو ہمیں ان کے پاس ہونا چاہیے تھا مگر افسوس ہمارا تو مجرا ہی موقوف ہے۔"

"آگے تو سنیے شہزادہ حضور۔ خوش خبری یہ بھی ہے کہ بادشاہ بیگم (جہاں آرا) کی کوششوں سے ظل سبحانی کا دل آپ کی طرف سے صاف ہو چکا ہے۔ آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ آپ کی باریابی کے لیے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"سچ..... کیا سچ۔ ہم ابھی ابا حضور کے قدموں میں سر جھکا کر آتے ہیں۔"

وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ آداب شاہی کیا ہوتے ہیں۔ وہ شہزادہ ہے کوئی عام آدمی نہیں۔ وہ تو حکیم احسن کو رخصت کی اجازت بھی نہ دے سکا۔ تقریباً دوڑتا ہوا دولت خانہ خاص کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خواجہ سرا سلام کرتے رہ گئے اور وہ اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں بادشاہ آرام فرما تھا۔ دارا نے باپ کے قدموں میں سر جھکا دیا۔ بادشاہ کا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر آ گیا۔

"ہم شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی تم سے شرمندہ ہیں دارا۔ غلط فہمی پیدا کرنے والوں نے کچھ دیر کے لیے ہمیں تم سے دور کر دیا تھا۔"

"غلام کو ملال ضرور تھا لیکن حکم شاہی بھی تھا ورنہ یہ سر بہت پہلے جھک چکا ہوتا۔"

"ہمیں ہوش ہی کب تھا کہ تمہیں طلب کرتے۔"

"اللہ نے آپ کو دوبارہ زندگی دی ہے۔ تخت طاؤس آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

"اتنی عجلت کیا ہے۔ سلطنت کے کام تم چلا ہی رہے ہو۔"

"فقیر میں یہ صلاحیت کہاں۔ یوں بھی مخلوقِ خدا میں طرح طرح کی افواہیں جنم لے رہی ہیں۔"

"بادشاہ بیگم ہمیں سب کچھ بتا چکی ہیں۔ تم کسی کی پروا نہ کرو۔"

"آپ کا حکم ہو تو میں داروغہ سے کہہ کر آپ کی صحت یابی کی خوشی میں چراغاں کا بندوبست کروں تاکہ رعایا پر حال ظاہر ہو۔"

"تم فی الحال خود شہنشاہ ہو۔ ہم سے اجازت کی ضرورت نہیں۔" شہنشاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

بنگالہ اور گجرات میں کیا ہو رہا ہے، اس ہنگامۂ مسرت میں کسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔ حقیقت یہ بھی کہ بنگالہ میں متعین شہزادہ شجاع نے دربار کی تشویش انگیز خبروں پر خودمختاری کا اعلان کر دیا اور اسی طرح احمد آباد میں محمد مراد بخش نے اپنے نام کا سکہ جاری کر دیا۔ شجاع ایک بھاری لشکر لے کر پٹنہ اور بہار پہنچ گیا اور بہار و بنگال سے لے کر دارالخلافہ تک جتنے فتنہ پرور لوگ موقع کے منتظر بیٹھے تھے، شجاع کے کوچ کی خبر سن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اسی طرح احمد آباد میں مراد نے سکہ اور خطبہ اپنے نام کر لیا اور خواجہ سرا خواجہ شہباز کو فوج اور قلعہ شکنی کا سامان دے کر بندرگاہ سورت کے قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔

دارالخلافہ سے باہر یہ حال تھا اور دارالخلافہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بادشاہ کی صحت یابی کی خوشی میں چراغاں کیا جا رہا تھا۔ رات میں دن کا سماں تھا۔ رقاصائیں اور کنیزیں حاضرِ دربار تھیں۔ کان کسی بری خبر سننے کو تیار نہیں تھے لیکن یہ خبر ہی ایسی تھی کہ سنے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ رقاصاؤں کی بھیڑ سے نکل کر ایک خواجہ سرا سامنے آیا۔ اتنی جلدی میں تھا کہ کورنش بجالانا بھی بھول گیا۔ شہزادے کے بالکل نزدیک پہنچا اور کان میں کچھ کہا۔ حاضرین کو تعجب تو اس وقت ہوا جب خواجہ سرا کے اٹھتے ہی شہزادہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ شمشیر زن حرکت میں آئے۔ شہزادے کے قدم دیوانِ خاص کی طرف اٹھ رہے تھے۔ دیوانِ خاص میں اس کا سنہری تخت رکھا تھا۔ شہزادہ اس تخت پر بیٹھ گیا۔

"وزیر اعظم کو پیش کیا جائے۔"

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ گرز برداروں کی قطار وزیر اعظم کو لیے دیوانِ خاص میں داخل ہوئی۔ شہزادے کا اشارہ ملتے ہی تخلیہ ہو گیا۔

ایک مرتبہ پھر یہ راز، راز ہی رہا کہ تخلیہ میں دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔

وزیر اعظم کے نکلتے ہی شہزادہ بھی تخت سے اترا اور نہایت عجلت میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جہاں آرا کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے مشورے کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہا تھا۔ جو کچھ اس نے خواجہ سرا سے سنا تھا وہ بہن تک پہنچا دیا۔

"یہ بھی کسی سازش کا حصہ تو نہیں..... ہندوستان کی تاریخ میں دراڑیں ڈالنے کا عمل تو نہیں؟"

"خبر پہنچانے والا کوئی اور نہیں وزیر اعظم ہے۔"

"وزیر اعظم کو یہ خبر کس نے پہنچائی؟"

"حشمت بیگ ہزار سواروں کے ساتھ دارالخلافہ پہنچا ہے۔"

"وہ یہ خبر ظل سبحانی کو بھی تو پہنچا سکتا تھا۔"

"ظلِ سبحانی کی علالت کے پیش نظر وہ نہیں چاہتا تھا

کہ یہ خبر بادشاہ تک پہنچے۔"

"مگر تم یہ غلطی مت دہراؤ۔ اتنی بڑی خبر ابا حضور سے چھپانا دانش مندی نہیں۔ بنگالہ میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے انہیں باخبر ہونا چاہیے۔"

داراشکوہ نے بہن کی بات مان لی اور دونوں مل کر بادشاہ کے حضور پہنچ گئے۔ شاہ جہاں اس وقت تکیے پشت سے لگائے نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ اس نے پہلے دارا کی طرف دیکھا اور پھر جہاں آرا پر نظر پڑی۔ دونوں کو ساتھ دیکھ کر تبسم ابھر آیا۔

"تم یہاں کیوں چلے آئے..... تمہیں تو جشنِ مسرت میں ہونا چاہیے تھا؟"

"حضور! اگر طبعِ نازک پر گراں نہ ہو تو ایک اطلاع آپ تک پہنچانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"کہو ہم سن رہے ہیں۔"

"بات ایسی ہے کہ بتانا بہت ضروری ہے۔"

"کچھ کہتے کیوں نہیں؟"

"حشمت بیگ یہاں پہنچا ہے اور ایک بری خبر لایا ہے۔"

"تفصیل بیان کرو۔"

"شجاع نے خودمختاری کا اعلان کر دیا ہے۔"

"کیا؟" شاہ جہاں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اس کی بیماری رخصت ہو گئی ہو۔

"شجاع ایک بھاری لشکر لے کر بہار پہنچ گیا ہے۔ بہار و بنگال سے لے کر دارالخلافہ تک جتنے فتنہ پرداز تھے، سب اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔"

"گویا وہ باغی ہو گیا ہے۔ اطلاع کیسی، باغیوں کے سر کچلنے کے لیے تو شاہی فوجیں حرکت میں آتی ہیں۔"

"آپ کی اجازت کے بغیر کوئی کارروائی کیسے کی جا سکتی ہے۔"

"صبح ہوتے ہی ہم دربار منعقد کریں گے۔ بس اب تم لوگ جا سکتے ہو۔" اس حکم کے بعد کسی کو بولنے کا یارا نہیں تھا۔ چپ چاپ کمرے سے نکل آئے۔

صبح کی پہلی توپ داغی گئی۔ گرز بردار، خدام، خواجہ سراء، خاص بردار سب اپنی جگہ استادہ ہو گئے۔ شہنشاہ نے مہینوں بعد لباسِ فاخرہ زیب تن کیا اور تختِ طاؤس پر مسند آراء ہوا۔

داراشکوہ باریاب ہوا۔ اس کا بیٹا سلیمان شکوہ حاضر ہوا۔ اس کے بعد دوسرے نامور امراء حاضر ہوئے۔ شاہ جہاں کی آواز گونجی۔

"ہم علیل کیا ہوئے ایک ناگوار انقلاب برپا ہو گیا۔ بنگالہ کے صوبہ دار نے جسے آج سے ہم اپنا بیٹا نہیں، باغی کہہ کر یاد کریں گے..... ہمیں مردہ سمجھ لیا اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ہم نے اس باغی کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس کی کمان دارا کے بیٹے سلیمان شکوہ کے ہاتھ میں ہو گی اور معاونت میں راجا جے سنگھ اور دلیر خاں ہوں گے۔"

سلیمان شکوہ اپنی نشست سے اٹھا اور کورنش بجا لایا۔ اب شاہ جہاں اس سے مخاطب تھا۔

"خبردار! یہ خیال مت کرنا کہ تمہارے مقابلے پر ہمارا بیٹا شجاع ہے۔ وہ اب ہمارا بیٹا نہیں رہا محض ایک باغی ہے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسے زندہ یا مردہ ہمارے حضور پیش کرنا ہو گا؟"

"ظلِ سبحانی! انشاءاللہ ایسا ہی ہو گا۔" سلیمان شکوہ نے گھٹنوں تک جھک کر حکم کی تکمیل کا عہد کیا۔

دارا اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں اورنگزیب کی صورت گھوم رہی تھی۔ کانوں میں جہاں آرا کی آواز گونج رہی تھی۔ "سب سے زیادہ خطرہ اورنگزیب کی طرف سے ہے۔" وہ سوچ رہا تھا کہ وہ وقت ہے جب اورنگزیب قدم بڑھا سکتا ہے۔ اس کے دل میں بہت سی باتیں تھیں لیکن یہ ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔ اس نے کسی اور وقت پر ٹالا اور شہنشاہ کے اٹھ جانے کے بعد وہ بھی دربار سے اٹھ گیا۔

ابھی سلیمان شکوہ کو رخصت ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے حاضر ہو گیا۔

"ظلِ سبحانی! وہ وقت دور نہیں جب طاقت کے نشے میں سرشار اورنگزیب کو شجاع کے ساتھ ملتے دیر نہیں لگے گی۔"

"تم نے یہ بات سوچی بھی کیسے۔ اورنگزیب سے ہمیں یہ امید نہیں۔"

"امید تو مجھے بھی نہیں لیکن دکن سے آنے والی خبروں کو کیا کہوں۔ مسلسل خبریں آ رہی ہیں کہ ورغلانے والے اورنگزیب کو ورغلا رہے ہیں۔ یہ خبریں تو مصدقہ ہیں کہ اورنگزیب اور مراد بخش کے درمیان خط کتابت ہو رہی ہے۔"

"اگر تم بضد ہو دارا بابا تو تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ پر ہماری جان فدا۔ اورنگزیب کے ہمراہ جو بڑے بڑے امراء بیجاپور کی تسخیر پر مامور ہیں، انہیں واپس بلا لیا جائے۔"

''اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ بیجاپور سے ہاتھ اٹھالیا جائے۔''

''اورنگزیب یہ پہلے ہی کر چکا ہے۔ خبریں گرم ہیں کہ وہ عادل شاہ سے صلح کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مقصد صاف ہے کہ وہ بیجاپور کی مہم ختم کرنے کے بعد ان فوجوں کو دارالخلافہ کی طرف بڑھائے گا۔''

دارا کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام افسروں کو جو فوج میں شامل تھے، شاہ جہاں کا فرمان پہنچا کہ فوراً عالمگیر کا ساتھ چھوڑ کر دربار میں چلے آئیں۔

افسران پہلے ہی طویل محاصرے سے تنگ آچکے تھے۔ اس فرمان کو بہانہ بنا کر اورنگزیب کی فوج سے نکل آئے۔ اب اورنگزیب کے سامنے صلح کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے والیِ بیجاپور سے ایک کروڑ روپیہ وصول کیا اور صلح کرلی۔ جیتی ہوئی مہم ناتمام رہ گئی۔

اورنگزیب برہان پور پلٹ آیا۔

اورنگزیب کے سامنے اس کے سوا اب کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ داراشکوہ کی دشمنی میں اپنے دیگر دو بھائیوں کے ساتھ مل جائے۔ اس نے مراد کے نام خط تحریر کیا۔

''مجھے اس دنیائے غدار کے معاملات سے کوئی وابستگی نہیں ہے۔ میرے پیشِ نظر تو صرف بیت اللہ کا طواف ہے۔ اس برادر بے شکوہ (داراشکوہ) کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے ردعمل میں دوسرے بھائی جو کچھ سوچ رہے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل حق بجانب اور بجا ہے۔ مجھے بھی اپنا شریک کار اور مددگار سمجھا جائے مگر چونکہ اب تک کی اطلاع کے مطابق والد بزرگوار ابھی بقیدِ حیات ہیں، اس لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں بھائی والدِ محترم کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کرلیں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے اس بے دین کی خیرہ سری کا تدارک کریں جو بادۂ غرور اور نخوت میں مست ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ اس جائز ارادے میں تاخیر نہ ہو اور تم ایک منظم و آراستہ فوج لے کر اس بے ادب کا فریعنی جسونت سنگھ کی تادیب کے لیے کوچ کردو۔ بس سمجھ لو کہ ہم بھی دریائے نربدا کے اس کنارے پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے ساتھ جو لاؤ لشکر اور توپ خانہ ہے، اسے تم اپنی فتح یابی کا ہی وسیلہ سمجھو۔ کسی وسوسے کو دل میں جگہ نہ دو۔''

☆☆☆

داراشکوہ نے شاہی حکم کے مطابق اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کی کمان داری میں راجا جے سنگھ اور دوسرے چند امراء کو ایک بھاری فوج دے کر روانہ کیا۔

راجا ہراول کے طور پر بنارس کے قریب پہنچا تو محمد شجاع بھی مقابلے کے لیے تیار ہوگیا۔ دریا میں جتنی کشتیاں تھیں، وہ سب اس نے قبضے میں کرلیں اور پھر آگے بڑھ کر راجا کی فوج سے ڈیڑھ کوس پر چھاؤنی ڈال دی۔ راجا نے چالاکی یہ کی کہ دوسرے دن حملے کا اعلان کیے بغیر صبح سے پہلے ہی کوچ کردیا اور شجاع کی فوج پر حملہ کردیا۔ شجاع ابھی نیند سے بیدار بھی نہیں ہوا کہ سارا معاملہ ہی درہم برہم ہوگیا۔ اب یہی ایک راستہ رہ گیا تھا اس نے اپنی عورتوں اور خاص ہمراہیوں کو ساتھ لیا اور کشتیوں میں سوار ہوکر فرار ہوگیا۔ وہ ایسا بھاگا کہ بنگال جاکر دم لیا۔ سارا علاقہ داراشکوہ کے قبضے میں آگیا۔

☆☆☆

بیجاپور سے محاصرہ اٹھانے کے بعد اورنگزیب برہان پور چلا گیا تھا۔ اس نے یہاں رہ کر حالات کی تحقیق کی۔ اس عرصے میں شہزادہ مراد سے خط کتابت کرتا رہا۔ ایک خط کے ذریعے طے ہوا کہ باہم ملاقات کی جائے اور آیندہ کا لائحہ عمل طے کیا جائے۔ یہ بھی طے ہوگیا کہ ''نربدا'' کے کنارے ملاقات ہوگی۔

برہان پور سے نکلنے سے قبل اورنگزیب نے برہان پور کے مشہور بزرگ شیخ برہان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ شیخ برہان اس وقت کسی اور ہی عالم میں تھے۔ انہوں نے ملاقات سے انکار کردیا۔ ادھر اورنگزیب کی طبیعت میں بھی ضد تھی۔ انکار سننے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے سفر موقوف کردیا اور ملاقات کے لیے بضد ہوگیا۔ ایسے لوگوں کی تلاش شروع کردی جن کی بات شیخ ٹال نہیں سکتے تھے۔ بالآخران کے ایک مقرب شیخ نظام تک رسائی ہوگئی۔ پہلے تو شیخ نظام نے بھی معذرت کی لیکن بالآخر مجبور ہوکر ملاقات کے لیے راہ ہموار کرنے کو تیار ہوگیا۔

''میں اپنی جانب سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شیخ کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا تو ضرور ملاقات ہوجائے گی۔''

وہ دو دن بعد اورنگزیب کی خدمت میں حاضر ہوا اور خوشخبری سنادی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ بھی ملاقات کے وقت اورنگزیب کے ہمراہ ہوگا۔ اورنگزیب کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ شیخ نظام کے ہمراہ شیخ سے ملاقات کے لیے چلا گیا اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ شیخ نے ایک نظر اورنگزیب پر ڈالی اور مراقبے میں چلے گئے۔ سر اٹھایا تو یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے۔

''تم بادشاہ ہو تمہارے لیے ہم فقیروں کی دعا وفاتحہ سے کیا ملے گا۔ ہاں، تم عدل وانصاف اور رعیت پروری کے قصد سے دعا مانگو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھالیں گے۔''

اس کے علاوہ کوئی بات نہ ہوئی۔ اورنگزیب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ شیخ برہان نے اس کے ساتھ مل کر دعا کی۔ اس کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔

شیخ نظام نے اپنے مرشد کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ یاد رکھے اور باہر نکل کر اورنگزیب کو سلطنت کا مژدہ سنایا۔

''آپ نے سنا نہیں، مرشد نے آپ کو بادشاہ کہا۔ آپ کو بادشاہت مبارک ہو۔ اب انشاء اللہ سلطنت کے حصول تک راہ کی رکاوٹیں دور ہوتی جائیں گی۔''

☆☆☆

اکبرآباد کی گرمی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ شاہ جہاں کی طبیعت سنبھل ضرور گئی تھی لیکن ابھی وہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ یہ موسم اس کی صحت کے لیے خطرناک ہوسکتا تھا۔ اطبائے شاہی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ گرمی کا موسم دہلی میں گزارے۔ وہ تقریباً گوشہ نشین ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک دارا شکوہ تھا جسے باریابی کی اجازت تھی۔ بادشاہ نے اسے اطباء کے مشورے سے آگاہ کیا۔ دارا شکوہ اس نازک وقت میں مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ بادشاہ اکبرآباد سے باہر جائے لیکن بادشاہ ارادہ کر چکا تھا۔ دارا شکوہ کو مجبور ہونا پڑا۔ مجومیوں سے مبارک ساعت لی گئی اور شاہ جہاں نے پائے سفر اٹھایا۔

بادشاہ کے رخصت ہوتے ہی دارا شکوہ نے مہاراجا جسونت سنگھ والی جودھپور کو فوج اور توپ خانہ دے کر گجرات کی طرف روانہ کر دیا کہ اگر اورنگزیب اپنی جگہ سے حرکت کرے اور مراد سے ملنے کی کوشش کرے تو اس سے معرکہ آرا ہو۔

شہزادہ اورنگزیب ضروری تیاریاں کرنے کے بعد برہان پور سے روانہ ہوا۔ اس کی سواری منزل بہ منزل گزرتی ہوا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے دریائے نربدا عبور کر لیا۔ شہزادہ مراد بھی اس کا خط ملتے ہی ملاقات کے لیے احمد آباد سے کوچ کر چکا تھا۔ دونوں کی ملاقات دیبال پور کے مقام پر ہوئی۔ دونوں نے دیکھا کہ گھاٹوں اور خشکی کی گزرگاہوں پر ایسی سخت ناکا بندی ہے کہ ہوا کو بھی راستہ نہ ملتا تھا۔

یہ غالباً شیخ برہان کی دعا کا اثر تھا کہ مہاراجا جسونت سنگھ کو اس وقت اطلاع ملی جب اورنگزیب اجین کے قریب پہنچ گیا تھا۔

اورنگزیب نے جسونت سنگھ کے مذہب کا پاس کرتے ہوئے ایک برہمن کو مہاراجا کے پاس بھیجا اور پیغام دیا۔

''ہم صرف ولی نعمت کی عیادت اور قدم بوسی کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ تم سے لڑائی کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ ہمارا راستہ نہ روکو اور بندگانِ خدا کی خون ریزی کا باعث نہ بنو۔ ہماری نیت دیکھنا ہو تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم خدمت والا میں پہنچ جائیں تو تم بھی اپنے وطن چلے جانا۔''

جسونت سنگھ نے اس پیغام کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور پیغام بھیج دیا۔

''مجھے جو حکم دیا گیا ہے اس کی تکمیل ضروری ہے۔ مجھے آپ کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا گیا ہے لہٰذا میں راستہ ضرور روکوں گا۔''

اب اورنگزیب کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ اپنے لیے راستہ بنائے اور جسونت سنگھ کو روندتا ہوا گزر جائے۔ اس نے اپنی فوج کو آراستہ کیا۔ توپ خانے کا مناسب انتظام کرنے اور کوہ پیکر ہاتھیوں کو آراستہ کر لینے کے بعد شہزادہ محمد سلطان کو ہراول کا کمان دار مقرر کیا۔ دوسری طرف مہاراجا نے بھی اپنے لشکر کی صف آرائی کر لی۔

دونوں لشکر پلک جھپکتے میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ معرکہ آرائی نے زور پکڑا اور پھر لحہ بہ لحہ جنگ تیز ہوتی گئی۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کون کس وقت کس پر غالب آجائے۔ اورنگزیب اس صورت حال کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جب حالات بہت نازک ہو گئے تو اورنگزیب نے اپنا ہاتھی آگے بڑھایا۔ اسے دیکھ کر مراد بھی آگے بڑھا۔ یہ دیکھ کر فوج کا بھی حوصلہ بڑھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ ہی بدل گیا۔ خود مہاراجا جسونت سنگھ ایسا خوف زدہ ہوا کہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاگتے ہی سب کے قدم اکھڑ گئے۔ دارا کی بھیجی ہوئی فوج منتشر ہو گئی۔

شاہ جہاں کا بحری قافلہ جمنا کے پانی کا منہ چومتا ہوا آہستہ آہستہ دہلی کی جانب رواں تھا کہ ایک مغل پانی کا سینہ چیرتا ہوا دارا کی کشتی کے قریب آیا۔ دارا کے حکم پر ڈونگی دریا میں ڈالی گئی کہ معلوم تو ہو کون ہے اور کیا خبر لایا ہے۔ کیا خبر کہاں سے تیرتا چلا آرہا ہے۔ اس مغل کو دارا کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا تو دارا کو گمان بھی نہیں تھا۔

''اورنگزیب اور مراد کی فوجوں نے شاہی لشکر کو شکستِ فاش دے دی۔ جسونت سنگھ اپنے وطن کی طرف بھاگ گیا۔''

اس خبر نے دارا کے ہوش اڑا دیے۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اورنگزیب کو روکنے والا اب کوئی نہیں۔ وہ کسی بھی وقت اکبرآباد پہنچ سکتا تھا۔ اکبرآباد خالی پڑا تھا۔

''جلدی کرو۔ بجرے کو ظل سبحانی کے بجرے کے قریب پہنچاؤ۔ جلدی کرو۔'' وہ زور سے چلایا۔

اس کے بجرے کو شہنشاہ کے بجرے کے نزدیک پہنچا دیا گیا۔ اس نے شہنشاہ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ بادشاہ کے لیے اب اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ واپسی کا حکم صادر ہو گیا۔ جمنا کے کنارے کنارے اونٹوں اور خچروں کی لمبی قطاروں نے واپسی کی راہ لی۔ محافظوں کی کشتیوں اور ڈونگیوں نے منہ پھیرا۔ ایک شہر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ گیا۔

اکبرآباد پہنچتے ہی دارا اضطراب کے عالم میں جلدی جلدی لڑائی کی تیاری کرنے لگا۔ بھاری بھاری توپیں دھول پور کی جانب حرکت کرنے لگیں۔

شاہ جہاں صاحبِ فراش تھا لیکن سن رہا تھا کہ جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ وہ تلملا کر اٹھ بیٹھا۔ حکم ہوا کہ پیش خانہ شاہی کو شہر سے باہر لگایا جائے۔ مابدولت اس جنگ میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوں گے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔

دارا شکوہ باریاب ہوا۔

''اگر مابدولت میدانِ جنگ میں نزولِ اجلال کریں گے تو مراد باغی آدھی لڑائی تو اسی وقت ہار جائیں گے۔ اگر وہ پھر بھی بضد ہوئے تو ہم انہیں سمجھائیں گے۔ ہم اس بڑھاپے میں بھائیوں کو بھائیوں کے ہاتھوں لڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اگر کچھ غلط فہمیاں ہو گئی ہیں تو ان کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''آپ کے بیٹے کے پاس اتنا وقت نہیں۔ اورنگزیب طاقت کے نشے میں چُور بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ آپ کی خدمت میں گزارش ہے کہ آپ قلعہ معلیٰ میں جلوس فرما رہیں اور غلام کو رخصت کریں۔''

شہنشاہ نے دارا کو جنگ کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

جمنا کے کنارے داراشکوہ کے ماہر سنتھوں اور سادھوؤں کی بھیڑ جمع تھی۔ محل کے اندر داراشکوہ بکتر اور ''خود'' پہنے تیار کھڑا تھا۔ خواجہ سراؤں کے پرے صدقات سے بھرے سونے چاندی کے خوان سروں پر دھرے ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ داراشکوہ نے ان خوانوں پر ہاتھ پھیرا، خواجہ سرا دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔ یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ جہاں آرا امام ضامن ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ صدقات تقسیم ہو چکے تو جہاں آرا نے بھائی کے بازو پر امام ضامن باندھا۔

داراشکوہ محل سے باہر آیا۔ آچاریہ نے ڈنڈوت کے بعد اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ ایک سنتھ آگے بڑھا اور بائیں بازو پر مالا باندھ دی۔

نذر و نیاز کی یہ تمام منزلیں گزر چکیں۔ اب دارا کو قلعہ معلیٰ جا کر باپ سے جنگ کی اجازت لینی تھی۔ وہ ہاتھی پر سوار ہوا۔ نقارے پر چوٹ پڑتے ہی ہاتھی نے قدم بڑھا دیے۔

''غلام کو اجازت مرحمت فرمائیں۔''

''کس بات کی اجازت؟ یہ اجازت کہ ایک بھائی دو بھائیوں سے لڑنے جا رہا ہے۔''

''یہ جنگ ہم اپنے لیے نہیں شہنشاہیت کے وقار کو بلند کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اورنگزیب نے مراد کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔''

''تمہارے جانے سے یہ مخالفت مزید شدید ہو جائے گی۔ ہم ان دونوں کو سمجھانے کے لیے خود جائیں گے۔''

''آپ کا جانا خلافِ مصلحت ہوگا۔ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اب اس بغاوت کا فیصلہ تلوار ہی سے ممکن ہے۔''

بادشاہ کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا لیکن شائستہ خاں اور دوسرے کئی بااثر امیروں نے بھی دارا کی تائید کی۔ بیماری نے شاہ جہاں کی قوتِ فیصلہ پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ کچھ دیر اس کے ہونٹ لرزتے رہے بالآخر اس نے اجازت دے دی۔

''جانِ پدر جاؤ۔ ہمارے اورنگزیب سے کہنا اس جنگ سے باز آ جائے۔''

''جو حکم ظل سبحانی کا۔ ہمارے لیے کوئی نصیحت؟''

شاہ جہاں نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔ دارا نے بھی اصرار مناسب نہ سمجھا۔ کھڑے کھڑے سات سلام کیے۔ باہر رتھ تیار کھڑا تھا۔ اس رتھ پر سوار ہو کر اسے دکن کی طرف جانا تھا۔

دارا نے خلیل اللہ خاں کو ہراول بنایا تھا۔ وہ داراشکوہ اور بادشاہ کی فوجوں کو لے کر ہراول کے طور پر آگے بڑھا اور دھول پور جا کر چھاؤنی ڈال دی۔

داراشکوہ سفر کو قطع کرتے ہوئے دھول پور پہنچ گیا۔ ابھی وہ سفر کی تھکن اتار رہا تھا کہ جاسوسوں نے یہ ہولناک خبر پہنچا دی کہ اورنگزیب دریائے چنبل کے نزدیک پہنچ چکا ہے۔ یہ خبر ایسی تھی کہ داراشکوہ کا ہراساں ہونا لازمی تھا۔ وہ

اس وقت تک جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک سلیمان شکوہ اس سے آنہ ملے۔ سلیمان شکوہ شجاع کی جنگ سے فارغ ہوکر واپس آرہا تھا۔

"سلیمان کے بارے میں کچھ علم ہے؟" دارا نے جاسوسوں سے پوچھا۔

"صاحب عالم! بس وہ تشریف لاتے ہی ہوں گے۔"

"کیا وہ اس وقت آئے گا جب جنگ کا بگل بج چکا ہوگا۔"

"ہم یہاں رہ کر مسلسل خطرے میں ہیں۔ ہمیں کسی ایسی جگہ چلے جانا چاہیے جہاں ہم اطمینان سے سلیمان شکوہ کا انتظار کر سکیں۔ پھر اس کے ساتھ آئے ہوئے لشکر کے ساتھ مل کر اورنگزیب پر ٹوٹ پڑیں۔" مشیروں نے مشورہ دیا۔

دارا کو یہ مشورہ پسند آیا اور کوچ کا حکم دے دیا۔

چالیس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک گاؤں سے گزر ہوا۔ اس گاؤں کا نام کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ ایک خواجہ سرا سامنے آیا۔ کورنش بجالانے کے بعد اس نے عجیب بات بتائی۔

"میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ چنبل کے گھنے جنگلات اور دلدلی زمین گزرنے کے بعد جو مقام آتا ہے، اسے سموگڑھ کہتے ہیں۔ ہم نے جنگلات بھی پار کر لیے۔ دلدلی زمین سے بھی گزر آئے۔ یہ یقیناً سموگڑھ ہے۔ یہ علاقہ دراصل چنبل اور اکبرآباد کے درمیان کا مقام ہے۔"

یہ سنتے ہی داراشکوہ کھل اٹھا۔ جیسے اسے کوئی راستہ مل گیا ہو۔ جیسے اندھیرے میں مشعل روشن ہو گئی ہو۔

"کیا کہا تم نے؟ یہ علاقہ چنبل اور اکبرآباد کے درمیان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دشمن نے اکبرآباد کی راہ لی تو ہم سموگڑھ میں موجود ہوں گے۔ ہمیں یہیں موجود رہنا چاہیے۔ ہم سے لڑے بغیر دشمن اکبرآباد نہیں جاسکتا۔"

اورنگزیب کسی جنگ میں پڑے بغیر اکبرآباد جانے کا خواہش مند تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ دوسرا راستہ اسے معلوم نہیں تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کون سا ایسا راستہ اختیار کیا جائے کہ دارا سے سامنا بھی نہ ہو اور دارالخلافہ تک پہنچا بھی جاسکے۔

"اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔" خان خاناں نجابت خاں نے عرض کیا۔

"اجازت ہے۔"

"ایک مقامی زمیندار میری قید میں ہے۔ اسے

سلطنت سے بڑی دولت

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک مرتبہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ تشریف لے جارہے تھے۔ پرندے آپ کے سر پر سایہ کناں تھے اور آپ کے دائیں بائیں آگے پیچھے جن و انس اور وحوش و طیور کے لشکر تھے۔ اس بے مثل شوکت کو دیکھ کر ایک عابد و ذاکر شخص نے کہا۔

"اے اللہ کے پیغمبر! آپ کو بہت بڑی سلطنت و دولت عطا فرمائی گئی ہے۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔

"میری اس سلطنت و دولت سے بھی بڑی دولت خدا کی یاد ہے۔ اس لیے کہ یہ سلطنت و دولت فانی ہے اور خدا کی یاد باقی ہے۔"

مرسلہ: میاں غضنفر محمود بوتالوی، گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

ماں

بچپن میں آنکھ میں کسی اور بچے کی انگلی لگ جاتی یا کوئی اور چیز پھر جاتی تو فوری طور پر ماں کے پاس پہنچ جاتے آنکھ میں آنسو لیے۔

چال میں تیزی اور آواز میں لرزش ہوا کرتی ---- ماں کا کیا کام ہوتا کہ پہلے تسلی بھرے الفاظ اور چہرے کے تاثرات پھر دوپٹے کا ایک حصہ آنکھ پر رکھ کر ماں پھونک مار دیتی اور واقعتاً آنکھ کی تکلیف چبھن کم ہو جایا کرتی ---- زیادہ مسئلہ تو زیادہ پھونک ---- ماں کا لمس، پھونک میں موجود ہلکی ہلکی حدت آنکھ میں محسوس ہوا کرتی ---- آنسو بھی رک جایا کرتے ---- اور تکلیف بھی دور ہو جاتی۔ میڈیکل سائنس کیا جانے شفا کے ان اصولوں کو۔

اچھائی... برائی

میری ماں ہر ایک کو اچھا کہتی، میں نے پوچھا۔ "ماں! تو کسی کو برا نہیں کہتی، سب کو اچھا کیوں کہتی ہے؟"

ماں نے کہا۔ "کسی کو اچھا کہو گے تو اچھا ثابت کرنا اس کی ذمے داری ہے اگر اس کو بُرا کہو گے تو اس کو بُرا ثابت کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"پھر کسی کی ذمے داری تم اپنے ذمے کیوں لیتے ہو؟"

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، پھل ہزارہ

دوسرے راستے کا علم ہے۔ اگر اسے رہائی کا لالچ دیا جائے تو وہ ہمیں بہ حفاظت لے جا سکتا ہے۔"

"اگر اس نے راستے میں ہمیں بھٹکا دیا۔"

"ہم اسے اپنے ساتھ رکھیں گے۔ اگر ہم بھٹکے تو وہ بھی ہمارے ساتھ بھٹکے گا۔"

نجابت خاں نے آدمی بھیج کر زمیندار کے دو بیٹوں اور خود اسے بلوا لیا۔ طے یہ ہوا کہ رات ہی کو یہاں سے نکلا جائے گا۔

اندھیرے نے پاؤں پھیلا لیے تھے۔ صرف ایک مشعل کی روشنی میں اورنگزیب برآمد ہوا۔ تیس ہزار کا لشکر۔ کوتل گھوڑوں، اونٹوں اور خزانوں کی سائنڈنیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ اورنگزیب عام سپاہیوں کی طرح گھوڑے پر سوار ساتھ تھا۔

تیس چالیس میل کا سفر طے کرنے کے بعد "سموگڑھ" آ گیا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں دارا کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ جاسوسوں نے آ کر دارا کے لشکر کی خبر دی۔ دارا کو بھی یہ خبر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ مخالف فوجیں سامنے آ گئی ہیں۔ یہ خبر پہنچتے ہی وہ فوج کی صف بندی میں مشغول ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک گولے کی مار تک کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا تھا۔

دوسرے دن جب داراشکوہ سوار ہوا تو اس کا عظیم الشان لشکر اور بے شمار ہاتھی دو کوس کے رقبے میں پھیلے ہوئے تھے مگر اس دن بڑی سخت گرمی تھی۔ اس لیے جنگ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اورنگزیب بھی انتظار کرتا رہا اور جنگ کرنے میں پہل نہیں کی۔

دوسرے دن جب صبح ہوئی تو اورنگزیب نے اپنی صف آرائی کی۔ توپ خانہ آگے بڑھایا۔ کوہ پیکر ہاتھیوں کو غرق آہن کر کے توپ خانے کے پیچھے متعین کیا۔ دارا کے پاس فوج کی کثرت تھی لیکن اورنگزیب کثرتِ تعداد سے بے پروا آگے بڑھا اور غنیم پر حملہ کر دیا۔ لڑائی کا آغاز دونوں طرف کے توپ خانوں سے ہوا۔ گولے سروں سے گزر رہے تھے۔ آتش بان آگ برسا رہے تھے۔

اس کے باوجود بھی جنگجو آگے بڑھے۔

ایک موقع وہ آیا جب بادشاہی فوج کا ہراول بہر شکوہ کی کمان میں آگے بڑھا اور صفوں کو چیرتا ہوا شہزادہ محمد سلطان کے قریب تک جا پہنچا لیکن بالآخر شکست ہوئی۔ داراشکوہ کو بہر شکوہ کی شکست کی خبر ملی تو وہ قلب کی فوج کو لے کر آگے بڑھا۔ ایسی شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ اورنگزیب کے توپ خانے کے مقابل آ گیا اور گولہ باری سے بچنے کے لیے مراد کی فوج پر حملہ آور ہو گیا۔ دونوں فوجیں دست بہ دست لڑنے لگیں۔ مراد کی بہادری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ہاتھی کے پاؤں میں زنجیریں ڈالے لڑ رہا تھا۔

جنگ کا نقشہ تو اسی وقت پلٹا جب دارا شکوہ کی عماری پر ایک آتش بان آ کر لگا اور وہ گھبرا کر ہاتھی سے نیچے اتر گیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ بس یہی غضب ہو گیا۔ جب فوج نے اس کے ہاتھی کو خالی دیکھا تو سب ہمت ہار بیٹھے اور فرار کا سوچنے لگے۔ ایسے میں شدید گولہ باری نے سب کے قدم اکھاڑ دیے۔ ہوا خواہوں میں کوئی نہیں تھا جو بھاگتی ہوئی فوج کو منتشر ہونے سے روکتا۔ یہ دیکھتے ہی داراشکوہ پر غشی طاری ہو گئی۔ چاہتا تو یہ تھا کہ دشمن کے توپ خانے پر ٹوٹ پڑے۔ بچے کھچے مصاحبوں نے ہاتھ جوڑ لیے۔

"حضور! کیوں خودکشی پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ دارالخلافے کا رخ فرمائیں۔ سلطان سلیمان شکوہ دارالخلافت پہنچنے والا ہے۔ آپ وہاں پہنچیں گے تو ایسے ایسے کتنے لشکر چشم زدن میں تیار کر لیں گے۔"

دارا اس دلیل کا قائل ہو گیا۔ میدانِ جنگ سے فرار ہوا اور اکبرآباد کی راہ لی۔

اورنگزیب کی فوج میں فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ مبارک باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اس کامیابی پر اورنگزیب ہاتھی سے نیچے اتر آیا اور شکرانے کی دو رکعتیں پڑھیں۔ داراشکوہ کے خیمے میں گیا وہیں قیام کیا۔ شہزادوں اور امیروں نے نذریں گزاریں اور تحسین و آفرین سے معزز ہوئے۔

☆☆☆

داراشکوہ دو ہزار بے سروساماں سواروں کے ساتھ جن میں سے اکثر زخمی تھے، شام کے وقت بغیر کسی مشعل کے اکبرآباد پہنچا۔ شرمندگی ایسی تھی کہ باپ سے ملاقات کے لیے بھی نہیں گیا۔ شاہ جہاں نے اسے بلانے کے لیے کئی بار پیغام بھیجے مگر وہ نہیں گیا۔

اورنگزیب نے سموگڑھ سے کوچ کرنے سے پہلے ضروری سمجھا کہ باپ کی خدمت میں ایک تفصیلی خط روانہ کر دے تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

"عرصے سے تشویش ناک خبریں سننے میں آ رہی تھیں تو میں نے عقیدت و ارادت کے جذبے سے حضور والا کی خدمت میں آنا چاہا مگر راجا نے بے سبب روکنے کی کوشش کی۔ ناچار اس کی گوشمالی کر کے آگے بڑھا تو

داراشکوہ ایک بڑی فوج لے کر سدِراہ ہو گیا۔ آخر وہ ہزیمت اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے پاؤں بڑھانے کو تیار ہوں۔"

اس خط کو آگے بھیج کر اورنگزیب امرائے نامدار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کوچ کرتا ہوا اکبرآباد کی طرف چلا لیکن اکبرآباد میں داخل نہیں ہوا بلکہ شہر سے باہر ہی ٹھہر گیا۔

اسی اثناء میں داراشکوہ اور سپہر شکوہ اشرفیوں سے لدے ہوئے اونٹوں اور جواہرات کے صندوقوں کے ساتھ دلی کی طرف کوچ کر گیا۔ اورنگزیب چاہتا تو دارا کا تعاقب کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ قلعہ معلیٰ کا محاصرہ کر لیا اور جمنا پر پہرے بٹھا دیے۔ اسے غالباً یہ شک تھا کہ شاہ جہاں بھی دارا کے پیچھے پیچھے دلی روانہ ہو جائے گا۔

شاہ جہاں کو اس محاصرے نے بے حواس کر دیا۔ میرا بیٹا ایک طرف تو مجھ سے ملنے کا متمنی ہے اور مصالحت کے لیے خط لکھتا ہے، دوسری جانب قلعہ معلیٰ کا محاصرہ کرتا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند نے گرفت میں لے لیا۔ عالم خواب میں اس نے اپنی چہیتی مرحومہ بیوی ممتاز محل کو خواب میں دیکھا۔ وہ سخت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"آپ خود قلعہ معلیٰ میں ہیں اور میرا بچہ ایک باغ میں پڑا ہوا ہے۔ اسے فوراً بلا لیجیے۔ وہ سدا کا ضدی ہے۔ اگر بگڑ گیا تو بھائیوں بھائیوں میں بڑا خون خرابا ہوگا۔ جہاں آرا کو اس کے پاس بھیجو، وہ مان جائے گا۔"

اس کی آنکھ کھلی تو چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے چہرہ صاف کیا کہ بادشاہوں کی آنکھوں میں آنسو زیب نہیں دیتے اور جہاں آرا کو طلب کیا۔

"ممتاز محل ہمارے خواب میں آئی تھیں۔ وہ اس بات کی طلب گار تھیں کہ ہم اورنگزیب کو منا لیں ورنہ جو سیلاب بڑھ رہا ہے اگر اسے روکا نہیں گیا تو سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں تم اس کے پاس جاؤ اور ہماری طرف سے اسے دلاسا دو اور ملاقات پر راضی کرو۔ ہو سکتا ہے ہم داراشکوہ کی طرف سے اس کا دل صاف کر دیں اور آئندہ آنے والی تباہی سے بچ جائیں — باپ دادا کی بنائی ہوئی سلطنت کو قائم رکھ سکیں۔"

"وہ بہت ضدی ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ تم اسے یہاں لاؤ تو ہم اسے خود سمجھا لیں گے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ہم ضرور جائیں گے۔"

"ہم چاہتے ہیں "عالمگیر" نامی تلوار اس کو تحفے میں بھیجیں۔ تیموری خاندان کا اس سے بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

جہاں آرا ایک خواجہ سرا کے ساتھ، گھوڑے پر سوار باہر آئی۔ محاصرہ کیے ہوئے لشکر نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور سواری آگے بڑھتی گئی۔

اورنگزیب کو جیسے ہی اس کی آمد کا علم ہوا، مصاحبین کے ساتھ پیشوائی کے لیے آگے بڑھا۔ اسے تخت پر بٹھایا اور خود فرش پر دوزانو بیٹھ گیا۔

جہاں آرا نے "عالمگیر تلوار" اورنگزیب کے ہاتھ میں دی۔

"اسے قبول کیجیے۔ ظل سبحانی نے یہ خاص آپ کے لیے بھیجی ہے۔" اورنگزیب نے تلوار کو چوما۔ اپنی تلوار کھول کر یہ تلوار باندھی۔ یہ گویا قبولیت کی نوید تھی۔

اس کے بعد جہاں آرا اصل مطلب پر آئی۔ شاہ جہاں کے اشتیاقِ ملاقات سے آگاہ کیا۔ اپنی جانب سے بھی نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور بالآخر اسے ملاقات پر رضامند کر لیا۔

"ظل سبحانی سے فرما دیجیے گا کہ آپ کا بیٹا اورنگزیب آج شام ہی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جائے گا۔"

شام ہونے کے انتظار میں وہ ضروری تیاریاں کرتا رہا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ظہر کی نماز ادا کی تو صبر کا یارا نہیں رہا۔

وہ سوار ہوا۔ پچیس ہزار کی فوج اس کے جلو میں چل رہی تھی۔ خلقِ خدا بے خوف و خطر اس کے استقبال کے لیے جمع تھی۔ سب کے چہرے مطمئن تھے کہ ایک باغی بیٹا، باپ سے ملنے جا رہا ہے۔ آنے والے کشت و خون کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سازشیں بھی اس جلوس کے ساتھ چل رہی ہیں۔ یہ جلوس اکبری مسجد تک پہنچا تھا کہ بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک خواجہ سرا اس کے نزدیک آیا اور ایک خط پیش کیا۔ یہ خط بظاہر شاہ جہاں کی طرف سے لکھا گیا تھا اور داراشکوہ کے نام تھا۔ اس خط میں اسے نئی فوج آراستہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ نوید سنائی تھی کہ جب اورنگزیب اس سے ملنے آئے گا تو اس کی بوٹیاں اڑا دی جائیں گی۔

خط پڑھتے ہی اورنگزیب کو چکر سے آ گئے۔ ایک لمحے کو یہ شبہ بھی ہوا کہ خط جعلی ہے لیکن پھر اس کی آنکھوں میں جہاں آرا کا چہرہ گھوم گیا۔ جہاں آرا، بادشاہ کے مزاج پر پوری طرح حاوی ہے، اس نے یہ خط لکھوا لیا ہوگا یا خود ہی لکھ کر بادشاہ سے دستخط کرا لیے ہوں گے۔ بات کچھ بھی ہو، کوئی نہ کوئی سازش ضرور ہے۔ اس وقت قلعے میں جانا ٹھیک

نہیں۔ اس نے واپسی کا حکم دے دیا۔ راستے سے پلٹا اور دارا شکوہ کے محل میں اتر گیا۔ اس خط نے اسے چوکنا کر دیا تھا۔ اس نے شہر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ قلعہ معلیٰ کا محاصرہ سخت کر دیا۔ اس سے پہلے قلعے سے باہر آنے پر پابندی نہیں تھی لیکن اب کسی کو اندر سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی، نہ کوئی باہر سے اندر جا سکتا تھا۔ شاہ جہاں عملاً نظر بند ہو کر رہ گیا۔ اورنگزیب یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے خلاف سازش کی گئی ہے۔ بادشاہ دھوکا دہی کا مرتکب ہوا ہے۔ بادشاہ کو یہ غصہ تھا کہ اورنگزیب نے اقتدار کی ہوس میں وعدہ خلافی کی ہے۔ دونوں کے مزاج برہم تھے لہٰذا باپ بیٹوں میں تلخ و تند مراسلت بھی ہوتی رہی۔

دارا شکوہ شاہ جہاں آباد کے قریب پہنچا تھا کہ یہ وحشت ناک خبریں اس کے گوش گزار ہوئیں۔ یہ خبر بھی پہنچی کہ اورنگزیب اس کے تعاقب میں روانہ ہونے والا ہے۔ اس خوف نے اسے شہر کے اندر جانے سے روک دیا۔ اس نے شہر سے باہر ہی پڑاؤ ڈال لیا۔

اب اسے سلیمان شکوہ کی آمد کا انتظار تھا جو شجاع کو شکست دینے کے بعد اس کے خیال میں بس آنے ہی والا تھا۔

سلیمان شکوہ، شجاع کے فرار کے بعد بہار اور پٹنہ کے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ پھر جو اس نے عالم گیر کی فتح و تسلط کے متعلق سنا تو اسے وہاں سے نکلنے اور باپ کے پاس جانے کی ہمت نہیں پڑی۔

دارا شکوہ نے بڑی بے چینی سے چند دن گزارے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ اسی طرح یہاں ٹھہرا رہا تو اورنگزیب کے ہاتھوں گرفتار ہو سکتا ہے۔ اس نے کوچ کا فیصلہ کر لیا اور ایک تازہ لشکر تیار کر کے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

چوہے بلی کا کھیل جاری تھا۔

اورنگزیب نے اکبر آباد کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد تعاقب کرنے والوں کو شاہ جہاں آباد (دلی) کی طرف دوڑایا کہ پہنچتے ہی شہر کا محاصرہ کر لو اور جس طرح بھی ہو دارا کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کرو۔ دارا یہ عقل مندی پہلے ہی کر چکا تھا۔ اب وہ دہلی میں نہیں لاہور میں تھا۔ اس کا لاہور میں ہونے کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ شہنشاہ سے خط کتابت کرتا رہے گا۔ خطرے کا باعث بنا رہے گا۔ اس نے شہنشاہ پر سختیاں بڑھا دیں۔ قلعے کا پانی بند کر دیا۔ مقصد یہی تھا کہ شہنشاہ عاجز ہو کر قلعہ اس کے حوالے کر دے۔

تقدیر الٰہی تھی کہ حالات روز بہ روز بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ جب شاہجہاں پر سختیاں سخت ہو گئیں تو اس کو اپنے بچاؤ کی فکر ہوئی۔ تلوار نہیں چل سکتی تھی لیکن قلم تو چل سکتا تھا۔ اس نے خفیہ طور پر ایک خط کابل کے صوبہ دار مہابت خاں کے پاس بھیجا۔

''عقیدت کیش مہابت خاں کو معلوم ہونا چاہیے کہ زمانے کے ہاتھوں اس سلطنت کو کتنا بڑا نقصان پہنچا ہے اور ان بے سعادت حرام خوروں نے کیا بدسلوکی کی ہے اور کر رہے ہیں۔ اس آڑے وقت میں تم ایسے مخلص اور عقیدت مند ہو کہ دنیا کے معمولی فائدوں کو خاطر میں لائے بغیر نام ونگ کو پیش نظر رکھو گے لہٰذا ہم تم کو اپنا درِ دل لکھ رہے ہیں اور تم سے مناسب تدارک کی توقع رکھتے ہیں۔ دارا شکوہ بس لاہور پہنچ رہا ہے۔ اس موقع پر مہابت خاں جیسا بہادر جس کی ہیبت سے زمانہ لرزاں ہے شاہ جہاں کی طرح گوشہ نشیں بیٹھا رہے تو ہزار تعجب ہے۔ مناسب یہ ہے کہ وہ بہادر آراستہ لشکر لے کر عزیمت کرے اور لاہور پہنچ کر دارا شکوہ بابا کی مدد کرے اور ان دونوں نابرخوردوں کو جزائے اعمال پر پہنچانے کی سعی کرے۔

میں نے فرزند ارجمند کو بھی لکھ دیا ہے کہ وہ خود کو تمہارے سپرد کر دے اور اس سپہ سالار کی اطاعت میں ہی اپنی فلاح و بہبود اور میری رہائی کو مضمر سمجھے۔''

اس خط کا حشر بھی یہی ہوا کہ وقت سے پہلے پکڑا گیا۔ اس خط کے مندرجات نے اورنگزیب کے ہوش بالکل اڑا دیے۔ اب مزید کسی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے شہزادہ محمد سلطان کو حکم دیا کہ وہ قلعے میں داخل ہو جائے اور شہنشاہ کو معزول کر دے۔

باحکم اورنگزیب، شہزادہ محمد سلطان قلعے میں داخل ہو گیا۔ خزانوں پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ کو ایک کمرے تک محدود کر دیا۔ خدمت کے لیے اس کی چہیتی بیٹی جہاں آرا کو بھی اس کمرے میں قید کر دیا۔ بوڑھا شہنشاہ اب بھی مطمئن تھا کہ مہابت خاں اورنگزیب کی ہر چال ناکام بنا دے گا۔

جہانگیر جس طرح بے بس قیدی بن گیا تھا اس کے بعد اورنگزیب کو یقین ہو گیا تھا کہ بادشاہ کا مرنا ضروری نہیں۔ وہ اس کی زندگی میں بھی بادشاہ بن سکتا ہے بلکہ بن گیا ہے۔ تمام امور مملکت اسی کے ہاتھ میں تو ہیں۔ بادشاہ وہی ہے، صرف اعلان ہونا باقی ہے۔

یہ خیال یقین میں بدلا تو اسے مراد کی یاد آئی۔ ایک امیدوار وہ بھی تو ہے اور قید میں نہیں آزاد ہے۔ کسی وقت دارا سے مل بھی سکتا ہے۔ اس کانٹے کو نکالنا ضروری ہے۔ مراد اس

لیے بھی خطرناک تھا کہ بیس ہزار کی فوج اب بھی اس کے پاس تھی۔ اس لیے بھی خطرناک تھا کہ نہایت دلیر تھا۔ اورنگزیب اس کی ان صفات سے قطع نظر یہ بھی جانتا تھا کہ وہ نہایت سادہ لوح بھی ہے۔ اورنگزیب نے اس کی اسی صفت سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی۔ کچھ دن التفات ومروت کی خط کتابت کرتا رہا اور پھر اپنے پاس خلوت میں دعوت پر بلایا۔

خیر خواہوں نے سنا تو زمانے کی نیرنگیوں کی طرف توجہ دلائی۔ طرح طرح کے اندیشے ظاہر کیے۔ یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر جانا ہی ہے تو لشکر کے ساتھ جائے لیکن اس کے دل میں بھائی کی طرف سے عہد شکنی کا گمان تک پیدا نہیں ہوا بلکہ تمام مشوروں کو بے ہودہ گوئی قرار دیتا رہا اور بھائی کی طرف سے دی گئی دعوت میں شریک ہونے چلا گیا۔

دعوت کے بعد آرام کرنے کے لیے لیٹا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ بدقسمتی کو یہی وقت درکار تھا۔ پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔

آنکھ کھلی تو بے بسی کے سوا کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

چار ہاتھیوں پر پردہ دار ہودج بندھوائے۔ ان میں سے ایک پر بے چارے مراد کو بٹھایا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ مراد کس ہاتھی پر ہے اور ان چاروں ہاتھیوں کو مختلف سمتوں میں بھیجا گیا۔ جس ہاتھی پر مراد سوار تھا اسے گوالیار پہنچا دیا گیا۔

گرفتاری کے بعد مراد بخش کا تمام خزانہ اور ساز وسامان ضبط کر لیا گیا۔

یہ کانٹا نکل جانے کے بعد اسے دارا کا تعاقب کرنا تھا جو اس وقت فوج جمع کرنے میں مشغول تھا۔ زمینداروں اور فوج داروں سے عہد وپیمان کر رہا تھا۔ شاہ جہاں کے خطوط بھی برابر آ رہے تھے جو تسلی کا باعث بن رہے تھے۔ فوج جمع کرنے میں اسے دقت پیش آ رہی تھی کیونکہ چڑھتے سورج کے سب پرستار ہوتے ہیں۔ اورنگزیب کے بلند ہوتے ہوئے اقبال کو دیکھ کر سب اس سے کترا رہے تھے۔ مہابت خاں بھی مدد کو نہ آ سکا تھا۔ مجبور ہو کر اس نے بنگال میں شجاع کے پاس بھی ایک خط روانہ کیا اور اس عہد کے ساتھ اتحاد کی دعوت دی کہ اورنگزیب پر فتح پانے کے بعد ملک کو باہم تقسیم کر لیں گے۔ شجاع نے مراد کا حشر دیکھ لیا تھا اس لیے اورنگزیب سے امید نہیں کی جا سکتی تھی لہٰذا دارا شکوہ کی مدد کے لیے تیار ہو گیا اور ایک باقاعدہ فوج اور بڑا توپ خانہ لے کر نکلا۔

اب ضروری ہو گیا تھا کہ دارا سے پہلے شجاع کی سرکوبی کی جائے۔ وہ دارا کا تعاقب کرتا ہوا ملتان تک آ گیا تھا۔ دارالخلافہ کی طرف واپسی کا حکم دے دیا۔ شاہی سواری پہلے لاہور گئی اور پھر لاہور سے روانہ ہو کر شاہ جہاں میں داخل ہوئی۔ شجاع کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ بنارس پہنچ چکا ہے۔ بنارس پر دارا شکوہ کا مقرر کردہ قلعہ دار رام داس تھا۔ اس نے دارا کے اشارے پر قلعہ، شجاع کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ اسی طرح اردگرد کے کئی قلعہ دار اس سے مل گئے۔ اس خبر کو سنتے ہی اورنگزیب نے شہزادہ محمد سلطان کو حکم دیا کہ وہ امیر الامراء کو اکبرآباد میں چھوڑ کر خدمتِ شاہی میں حاضر ہو جائے۔ دہلی سے مشرق کی طرف کوچ ہوا۔ جب اٹاوہ کے قریب سواری پہنچی تو معلوم ہوا شہزادہ سلطان حسب الحکم کھجوہ کے قریب پہنچ کر مقابلے کے لیے حکم شاہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ شجاع بھی بنارس سے مقابلے کے لیے نکل آیا۔ اورنگزیب بذات خود کھجوہ پہنچا۔ جب کھجوہ کے قریب منزل ہوئی تو شہزادہ سلطان خدمتِ شاہی میں حاضر ہوا۔

بادشاہ اورنگزیب نے فوج بندی کا حکم دیا۔

شجاع نے بھی اپنی فوج کی صف بندی کر لی تھی۔ اپنے بیٹے بلند اختر کو ہراول پر مقرر کیا۔

جب دونوں جانب سے انتظامات مکمل ہو گئے تو اورنگزیب ہاتھی پر سوار ہوا اور نہایت اطمینان سے کوچ عمل میں آیا۔ سہ پہر کے قریب دشمن کی فوج سے نصف کوس کے فاصلے پر جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ شجاع کی فوج پر بادشاہی لشکر کا ایسا رعب پڑا کہ اس نے پہل کرنے اور حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اس دن دونوں طرف سے بس گولہ باری ہوتی رہی جس کا سلسلہ شام تک جاری رہا۔ دونوں طرف سے کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔ وہ رات دونوں لشکروں نے بڑی احتیاط کے ساتھ بسر کی۔

اسی رات اورنگزیب کو ایک اور نقصان اٹھانا پڑا۔ راجا جسونت سنگھ شاہی لشکر کے ہمراہ تو تھا مگر اس کے دل میں بڑا بغض اور نفاق بھرا ہوا تھا۔ اس نے رات کے پہلے حصے میں اپنے ایک محرم راز کو شجاع کے پاس پیغام دے کر بھیجا کہ میں رات کے آخر میں شب خون مار کر لشکر کو تباہ کرتے ہوئے فرار ہو جاؤں گا۔ جب اورنگزیب کو اس حادثے کی اطلاع ہو گی تو وہ لازماً میرے تعاقب میں آئے گا بس اسی وقت تم اپنے بہادر سواروں کو لے کر بادشاہی لشکر پر حملہ کر دینا۔

اس سازش کے مطابق جبکہ چار پانچ گھڑی رات رہ گئی تھی جسونت دوسرے راجپوت سرداروں کو لے کر ایک بہت بڑی فوج کے ہمراہ لشکر سے لوٹ مار کرتے ہوئے روانہ ہو گیا۔

جس نے بھی مزاحمت کی راجپوتوں نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شہزادہ سلطان کا تمام خزانہ بری طرح لوٹ لیا۔ غرض خیمہ شاہی کے اطراف کا کوئی خیمہ ان کی لوٹ مار سے محفوظ نہیں رہا۔

جب وہ کافر اپنا کام کر کے نکل گیا تو اورنگزیب جان بوجھ کر ہاتھی کی سواری چھوڑ کر تخت رواں پر سوار ہوا تا کہ لوگوں کو احساس ہو کہ وہ قطعی خوف زدہ یا پریشان نہیں۔ اس کے بعد اس نے سخت گیر افسر مقرر کر دیے کہ وہ ان تمام امیروں اور سرداروں کو جو اس ہنگامے سے خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے، زبردستی روک دیں۔

رات بھر کے انتظامات کے بعد جب صبح طلوع ہوئی تو اطلاع ملی کہ جسونت سنگھ اکبرآباد کی طرف چلا گیا ہے۔ اورنگزیب قطعی ہراساں نہ ہوا۔ اس نے جسونت کی جگہ میمنہ پر اسلام خاں کو مقرر کیا اور از سرِ نو فوج کی ترتیب اور صف بندی کرائی۔

اورنگزیب کے لشکر سے بھاگ کر آنے والوں کی وجہ سے اس کی قوت کافی بڑھ گئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر فوج کو از سرِ نو ترتیب دیا۔

جب دن اچھی طرح چڑھ گیا تو دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں۔ اس موقع پر شجاع کے لشکر سے سید عالم بارہہ تین مست جنگی ہاتھی لے کر نکلا اور بادشاہی میسرہ پر حملہ کر دیا۔ اس زبردست حملے سے بادشاہی فوج کا بایاں بازو پسپا ہونے لگا۔ اکثر لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس بھگدڑ کا اثر قلب لشکر پر بھی پڑا۔ شجاع کے لشکر میں مبارک باد کا شور مچ گیا۔ اتنی ہمت بڑھ گئی کہ شجاع کی فوج نے ایک بھرپور حملہ بادشاہی دستے پر کر دیا۔ ممکن تھا کہ بادشاہی فوج اس حملے کی تاب نہ لا پاتی کہ اورنگزیب کی بے مثل بہادری کام آئی۔ وہ اپنی جگہ ڈٹ گیا۔ خود تیر کمان لے کر مخالف لشکر پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور اپنے آدمیوں کے حوصلے بڑھاتا رہا۔ اس کی تیر اندازی سے اتنا موقع مل گیا کہ کمک پہنچ سکے۔ دائیں اور بائیں بازو کے سپوت اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچ گئے اور دشمن کی یلغار کو روک لیا۔ بس پھر کیا تھا، اورنگزیب نے ہاتھی آگے بڑھا کر دشمن پر یورش کر دی۔ اسے آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر بھاگتے ہوئے فوجیوں کے پاؤں رک گئے۔ وہ اورنگزیب کی سواری کے اردگرد پروانہ وار جمع ہونے لگے۔ شجاع کی فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ سادات بارہہ کا زور بھی ٹوٹ گیا مگر ان کے تین مست ہاتھی کسی کے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ جس طرف بھی نکل جاتے اور حملہ کرتے، زمین پر صف کی صف بچھا دیتے۔ غضب تو اس وقت ہوا جب ان تین میں سے ایک شاہی سواری کی طرف جھپٹا۔ اورنگزیب نے نہایت عزیمت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیریں ڈلوا دیں اور ایک محافظ سپاہی کو حکم دیا کہ بندوق سے فائر کر کے دشمن ہاتھی کے فیل بان کو گرا دے۔ محافظ نے تاک کر نشانہ باندھا اور فیل بان کو گرا دیا۔ اسی وقت ایک بادشاہی محافظ اس ہاتھی پر سوار ہو گیا اور اسے اپنے قابو میں کر لیا۔ دوسرے دو ہاتھیوں کے فیل بانوں نے یہ منظر دیکھا تو خوفزدہ ہو کر اپنی صفوں کی طرف لوٹ گئے۔

شجاع کی رہی سہی پسپائی اس وقت پوری ہو گئی جب اس کے امیروں نے اپنی شکست کو بھانپ کر شجاع کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لشکر منتشر ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی شجاع کے فرار ہو جانے کی خوش خبری مل گئی۔

فاتح افواج نے بڑھ کر شجاع کی لشکر گاہ پر حملہ کر دیا۔ خزانہ، ہاتھی گھوڑے اور شاہی ساز و سامان سب کچھ لوٹ لیا۔

امراء نے مشورہ دیا کہ شجاع کو فرار کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ اگر فرار ہوا تو یقیناً دارا سے جا کر مل جائے گا لہٰذا اس کا تعاقب جاری رکھا جائے۔ اورنگزیب نے اسی وقت شہزادہ سلطان کو تعاقب پر مامور کر دیا۔

☆☆☆

شہزادہ دارا شکوہ خود تباہ حال تھا، شجاع کی کیا مدد کرتا حالانکہ اس نے عہد باندھا تھا کہ وہ شجاع کی مدد کرے گا۔ وہ لاہور سے فرار ہو کر "بھکر" پہنچ گیا تھا لیکن اس کے پاس لشکر بہت کم رہ گیا تھا۔ جو رہ گیا تھا اس میں سے بھی بھکر پہنچ کر بہت سوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ شجاع کی شکست کے بعد اسے اپنا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنے کل کی عورتوں کو کچھ خزانہ طلائی اور زائد از ضرورت بھاری سامان کے ساتھ بھکر کے قلعے میں چھوڑ دیا اور خود معروف شاہراہ کو چھوڑ کر گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ جنگل اسے کہاں پہنچائے گا۔ اس کے ساتھ مختصر سا لشکر تھا اور خدا کا نام۔

راستے میں دشوار گزار راستوں اور بار بردار جانوروں کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے یا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ ٹھٹھہ تک پہنچتے پہنچتے صرف ہزار سوار اس کے ساتھ رہ گئے۔ بھاگم بھاگ سیوستان کی سرحد میں پہنچنے کے بعد اس نے احمد آباد کا رخ

کیا۔ بادشاہی فوج مسلسل تعاقب میں تھی۔ اس کے لیے دو بھر تھا کہ کسی جگہ سانس لینے کے لیے رکتا۔ بادشاہی لشکر شیخ میر کی قیادت میں برابر تعاقب کر رہا تھا لیکن حال اس کا بھی خراب تھا۔ اس نے گھبرا کر اورنگزیب کو پروانہ بھیجا اور صاف لکھ دیا کہ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ دارا میرے آگے آگے چل رہا ہے لیکن کہاں ہے یہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے بہت سے آدمی تلف ہو گئے ہیں۔ یہی حال رہا تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔

اورنگزیب کو جب یہ دردناک پروانہ ملا تو اس نے شیخ میر کو واپس بلانے کا فرمان جاری کر دیا۔

دارا کو معلوم ہو گیا تھا کہ تعاقب ختم ہو گیا ہے۔ اب اسے کچھ اطمینان ہوا لہٰذا ایک مقام "کچھ" پر پہنچ کر اس نے قیام کر لیا اور لشکر جمع کرنے لگا۔ اس نے وہاں کے زمیندار کو بلایا اور اس کے سامنے جواہرات کی روشنی پھیلا دی۔ وہ اس کا مطیع ہو گیا اور اپنی لڑکی دارا کے بیٹے سپہر شکوہ سے منسوب کر دی۔

دارا کو ایک اچھا ٹھکانا مل گیا تھا۔ زمیندار اس کی خدمت میں مشغول تھا۔ کچھ دن تھکن اتارنے کے بعد جب دارا نے جانا چاہا تو زمیندار نے سواریوں کا بندوبست کر دیا اور اپنی سرحد سے گزار کر اسے احمد آباد کے لیے رخصت کیا۔

سپہر شکوہ نے اب تک باپ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ احمد آباد کیوں جا رہا ہے اور وہاں حفاظت کا کون سا بندوبست تھا لیکن اب ضروری ہو گیا تھا۔

"بابا جانی! اگر گستاخی پر محمول نہ ہو تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ ہم احمد آباد کیوں جا رہے ہیں؟"

"پوچھا ہوا تم نے پوچھ لیا بلکہ مجھے پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہاں کے صوبہ دار شاہ نواز خاں سے ہماری رشتے داری ہے۔ شہزادہ مراد اس کا داماد ہے جسے اورنگزیب نے قید کر دیا ہے۔ اس لیے وہ اس امید پر میری مدد کرے گا کہ اگر میں برسر اقتدار آ گیا تو اس کے داماد کو رہائی مل جائے گی۔"

"اگر اس نے پھر بھی ہماری مدد نہیں کی؟"

"تو اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔ ڈوبنے والا تنکے کو بھی سہارا سمجھ کر اس کی طرف بڑھتا ہے۔ یہی حال میرا ہے۔"

دارا کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ جب وہ احمد آباد پہنچا تو صوبہ دار شاہ نواز خاں اس کے استقبال کے لیے قلعے سے باہر نکل آیا اور ضروری سامان فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا۔ احمد آباد میں مراد بخش کے دس لاکھ روپے اور طلائی و نقروی سامان تھا، اس نے یہ سب دارا کی نذر کر دیا۔

اس دولت سے دارا شکوہ نے فوج کی فراہمی کی خاطر لوگوں کو خلعت اضافہ خطاب اور جواہرات دے کر خوش کر دیا۔ بندرگاہ سورت، کھنبایت، بہروچ اور سیر حاصل پرگنوں پر اپنے آدمیوں کو مقرر کر دیا۔ بیس ہزار سوار بھی فراہم کر لیے۔ اس اثنا میں وہ بیجاپور اور حیدر آباد کے حکام کے نام بھی کمک بھیجنے اور اس کی مدد کرنے کے لیے خطوط بھیج چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ یہ حکمران اس کا ساتھ دیں گے اور وہ عالمگیر سے دو دو ہاتھ کر لے گا۔

اس موقع پر اسے اطلاع ملی کہ راجا جسونت اورنگزیب کی فوج سے فرار ہو گیا ہے۔ یہ وہی جسونت تھا جسے کبھی اس نے اورنگزیب کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ خبر غلط بھی ہو سکتی تھی۔ دارا شکوہ نے اس خبر کی تصدیق کے لیے آدمی دوڑا دیے۔ ابھی پوری طرح تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ خود راجا جسونت کا خط اس کے پاس آ گیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اگر دارا شکوہ جودھپور آ جائے تو اجمیر دور نہیں۔ دونوں کی فوجیں مل کر اجمیر پہنچیں گی۔

دارا شکوہ دکن جانے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن جسونت سنگھ کا خط آنے کے بعد اس نے راجا کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ ایک آراستہ فوج اور بڑا توپ خانہ لے کر احمد آباد سے نکلا۔ ہر منزل پر اسے راجا جسونت کے خطوط ملتے جاتے تھے۔ ان خطوط سے اس کی ہمت بندھتی گئی۔

☆☆☆

اجمیر کا صوبہ دار تربیت خاں اورنگزیب سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا۔ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی تھی کہ اس نے خط کتابت کے بجائے ملاقات کو ترجیح دی تھی۔ یہ درخواست بھی کی تھی کہ یہ ملاقات تخلیے میں ہو۔ اورنگزیب نے اجازت دے دی۔ اورنگزیب تختِ طلائی پر براجمان تھا اور تربیت خاں کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔

"راجا جسونت آپ سے باغی ہو کر دارا شکوہ سے مل گیا ہے۔ دارا شکوہ جودھپور کے لیے روانہ ہو گیا ہے پھر دونوں مل کر اجمیر پہنچیں گے۔ اس کا کچھ ازالہ فرمایئے ورنہ ان دونوں کا مقابلہ کرنا ہمارے لیے مشکل ہو جائے گا۔"

"اس کا ازالہ یہی ہے کہ جسونت سنگھ کی گوشمالی کی جائے۔ ہم ابھی ایک لشکر روانہ کرتے ہیں جو جسونت کو ہمارے قدموں میں لا کر ڈال دے گا۔"

"آپ کی رائے کا پاس ہم سب کی سر آنکھوں پر لیکن

اس غلام کا بھی ایک مشورہ ہے اگر اجازت ہو تو عرض کرے۔"

"اجازت ہے۔"

"یہ وقت جنگ کا نہیں، مصلحت کا ہے۔ دارا جودھپور کے لیے نکل چکا ہے۔ جب تک ہماری فوجیں پہنچیں گی، داراشکوہ پہنچ چکا ہوگا۔ دو دشمنوں سے بیک وقت مقابلہ ہمارے لیے مشکل ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم یہ موقع ہی نہ آنے دیں۔ راجا جسونت سنگھ کے مناصب و اعزاز میں اضافہ کر کے اسے اپنا طرفدار بنا لیا جائے۔ اس نے دارا کا ساتھ نہیں دیا تو وہ مایوس و نامراد ہو کر واپس لوٹ جائے گا۔ اگر مقابلے پر آیا بھی تو اکیلا ہوگا جسے ہماری فوجیں کاٹ کر رکھ دیں گی۔"

"تمہارے مشورے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر اس نے ہماری پیشکش ٹھکرا دی تو کیا یہ ہماری بے عزتی نہیں؟ ایک معمولی راجا ہماری پیشکش ٹھکرا دے۔"

"آپ اس معاملے سے الگ رہیں۔ اس کام کے لیے راجا جے سنگھ کو مقرر کیجیے۔ وہ آپ کا ضمانتی بن کر جسونت سے بات کرے۔ اس کا تعلقہ جودھپور سے قریب ہے، فوراً عمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد اپنی فوجیں بھی روانہ کر دیجیے گا۔"

اورنگزیب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ راجا جے سنگھ کو بذریعہ خط ہدایت کی کہ وہ اپنی طرف سے اس کو خط لکھ دے اور تیز رفتار قاصدوں کے ہاتھ جلد اس کے پاس پہنچا دے۔

راجا جے سنگھ نے حکم نامے پر عمل کیا۔

جب راجا جسونت کے پاس راجا جے سنگھ اور دوسرے خیر خواہوں کے خفیہ خطوط پہنچے تو اس نے ان خطوط کو راز میں رکھا۔

اس وقت وہ جودھپور سے ایک آراستہ فوج لے کر بیس کوس پر داراشکوہ کے استقبال کی نیت سے نکل آیا تھا۔ ان خطوط کے پہنچنے پر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اپنے مقام پر واپس چلا گیا۔

داراشکوہ ایک منزل پر رک کر جسونت کا انتظار کر رہا تھا کہ اسے ساری صورت حال کا علم ہوا۔ پریشانی تو بہت چھوٹا لفظ ہے جو اس پر گزر گئی۔ اس نے کئی خوشامدانہ خطوط لکھے لیکن جسونت سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"کیا تم یہ بھی بھول گئے کہ تم راجپوت ہو؟ راجپوت تو اپنے وچن کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ تم کیسے راجپوت ہو۔ کیا تم میرے احسانات کو بھی بھول گئے؟ تمہیں اکبر آباد کا زمانہ یاد نہیں رہا؟ اب ایسی کیا بات ہو گئی۔ کس نے تمہیں سبز باغ دکھا دیے؟ میرا زمانہ آیا تو میں تمہیں جواہرات میں تول دوں گا۔ اب بھی وقت ہے، میرے پاس چلے آؤ۔"

اس کے جواب میں راجا نے جواب لکھ بھیجا۔

"میں اپنے قول پر قائم ہوں لیکن اس وقت میرا آنا خلاف مصلحت ہے۔ آپ فی الحال اجمیر چلے جائیں۔ دوسرے راجپوتوں کو پیغام بھیج کر اپنے پاس بلائیں۔ جب دو تین اہم راجپوت آپ کے پاس جمع ہو جائیں گے تو میں بھی چلا آؤں گا۔"

داراشکوہ نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور اس کے کہنے کے مطابق اجمیر چلا گیا۔ دارا یہی سمجھ رہا تھا کہ جسونت نے اسے کسی مصلحت کے تحت اجمیر بھیجا ہے۔ اس نے اجمیر پہنچتے ہی اپنے ایک آدمی دے چند کو راجا کے پاس بھیجا اور اسے بڑے سبز باغ دکھائے مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دے چند نے واپس آ کر صاف صاف کہہ دیا۔

"راجا سے امید رکھنا فضول ہے۔ وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے اور اپنی بات سے پھر گیا ہے۔"

کل کا ملازم آج اسے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ وقت بدلنا اسی کو کہتے ہیں۔

اب داراشکوہ کی جسونت سے ساری امیدیں منقطع ہو گئیں۔ عالم مایوسی میں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ اورنگزیب کے قریب پہنچ جانے کی خبر ملی۔ اس نے بھی مقابلے پر کمر باندھ لی مگر اس وقت کھلے میدان میں جنگ کرنا اس کے لیے مفید نہ تھا۔ اجمیر کے نواحی کوہستان میں مورچے باندھ کر محصور ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس سے پہلے کہ اورنگزیب کی فوجیں پہنچیں، وہ کھلے میدان سے کوچ کر کے درّے میں داخل ہو گیا اور راستوں پر پتھر اور گارے کی دیواریں کھڑی کر کے بند کر دیا۔ توپیں نصب کرائیں اور مورچوں پر بندوقچیوں کو متعین کر دیا اور اورنگزیب نے نصف کوس پر جہاں سے گولہ پہنچ سکتا تھا، اپنی لشکر گاہ قائم کر لی اور مورچے باندھنے کا حکم دے دیا اور گولہ باری شروع کر دی۔ داراشکوہ کو قاعدہ یہ تھا کہ وہ بلندی پر تھا۔ اس طرف سے جو گولہ آتا تھا، وہ کارگر ہوتا تھا۔ چار راتیں اسی طرح گزر گئیں۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے اورنگزیب نے اپنے پیادوں کو ایک مقام جو "پیازی" کے نام سے مشہور تھا، کی طرف بھیجا۔ داراشکوہ کو پہلے ہی اندازہ تھا کہ اس طرف

سے حملہ ہوسکتا ہے لہٰذا اس نے اس طرف کافی توپیں اور بندوقیں لگا رکھی تھیں جو مسلسل باڑھ پر باڑھ چلاتی جارہی تھیں۔ شاہی پیادے جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ بہرحال بڑی سعی کے بعد وہ پہاڑی کے اوپر پہنچ گئے۔ وہاں اپنا جھنڈا نصب کردیا۔ داراشکوہ ایک پہاڑی پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی فوج کو بہت غیرت دلائی لیکن پہاڑی پر شاہی جھنڈا لہراتے ہی اس کی فوج نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ دارا کو اپنی شکست کا یقین ہوگیا۔ اس نے رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھایا اور حرم کی عورتوں کو لے کر وہاں سے فرار ہوگیا۔ اس کا بیٹا سپہر شکوہ اس کے ساتھ تھا۔ اب اس کے گھوڑے احمد آباد کی طرف دوڑ رہے تھے۔ تھوڑے سے جواہرات اور اشرفیاں اس کے ساتھ تھیں۔

داراشکوہ حیران و پریشان احمد آباد کی طرف دوڑا چلا جارہا تھا۔ تھوڑے سے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ ابھی... بہ مشکل چار پانچ کوس کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ساتھ کے لوگوں کے دلوں میں بے ایمانی آگئی۔ ہاتھیوں پر لدا قیمتی مال واسباب لوٹ لیا۔ عورتوں کے زیور تک اتار لیے۔ جس کے جو ہاتھ لگا لے کر چلتا بنا۔

بدقسمت داراشکوہ بے سروسامان آٹھ دن بعد احمد آباد کے نواح میں پہنچا۔ آٹھ دن گزر چکے تھے۔ اس کی شکست کی خبریں پہنچ چکی تھیں۔ کون اس کے استقبال کو نکلتا۔ اورنگزیب کے نام کے نقارے بج رہے تھے۔ وہ بہ حسرت و یاس شہر کے دروازے کو دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ دو کوس چلنے کے بعد پرگنہ ''کری'' میں چلا گیا۔ یہاں ایک مشہور راہزن کونجی کولی رہتا تھا۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ ایک طرح سے اپنی حکومت قائم کررکھی تھی۔ وہ اس کے پاس چلا گیا۔

شاہ جہاں کا لختِ جگر شہزادہ داراشکوہ ایک راہزن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

''میں شہزادہ داراشکوہ ہوں۔''

''شہزادے جھوٹ نہیں بولتے۔ شہزادے ہو تو میرے دروازے پر کیوں آئے ہو؟''

''مدد کی درخواست لے کر۔''

''شہزادہ اور میری مدد؟''

''اورنگزیب سے میری جنگ ہوئی تھی جس میں مجھے شکست ہوئی۔ مجھے پناہ کی تلاش ہے۔''

''مہاراج! میں یہ تو نہیں کرسکتا کہ تمہارے لیے اورنگزیب سے ٹکرلوں۔ ہاں اتنا ہے کہ جب تک آپ میرے پاس ہیں کوئی آپ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔''

''میں اقتدار میں آگیا تو تمہیں مالا مال کردوں گا۔''

''میں راہزن ہوں، کوئی راجا مہاراجا نہیں جو لالچ میں آکر کوئی کام کروں۔ جب اقتدار مل جائے تو اپنے گھر سدھاریے۔ اس وقت تک یہ جنگل حاضر ہے۔ یہاں میرے ساتھ رہیے۔''

''میں تمہارے ساتھ کب تک رہوں گا۔ تم مجھ پر اتنی مہربانی کرو کہ گجرات کی حدود سے نکال کر مجھے تعلقہ ''کچھ'' تک پہنچادو۔''

کونجی رضامند ہوگیا اور اسے خفیہ راستوں سے ''کچھ'' تک پہنچادیا۔ جس وقت داراشکوہ احمد آباد آیا تھا ''کچھ'' کے زمیندار نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی تھی اور آئندہ کی توقعات پر بطور پیشکش اپنی لڑکی کو سپہر شکوہ سے نامزد کردیا تھا۔ اب جو داراشکوہ مارا مارا صحرانوردی کرتا ہوا پہنچا تو اس نے صاف آنکھیں پھیرلیں اور ملنے تک نہیں آیا۔

دارا دو تین دن تک زمیندار کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا، آخر مایوس ہوکر ''بھکر'' کی طرف روانہ ہوگیا۔

جب وہ سندھ کی حدود میں داخل ہوا تو فیروز میواتی جو اب تک ہر آڑے وقت میں اس کا ساتھ دیتا رہا تھا، اس کا ساتھ چھوڑ کر دہلی کی طرف فرار ہوگیا۔ یہ صدمہ دارا کے لیے کم نہ تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے ہمت نہ ہاری ''جادپان'' کے علاقے میں داخل ہوگیا۔ ابھی کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ جنگلی قبائل نے اس کا راستہ روک لیا۔ داراشکوہ ان کے لیے اکیلا ہی کافی تھا جبکہ اس کے ساتھ خواجہ سرا بھی تھے۔ شہزادہ ان قبائل سے لڑتا بھڑتا ''مکشیوں'' کی ولایت میں پہنچ گیا۔ یہاں کے سردار نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ اپنے گھر لے گیا اور خوب مہمانداری کی۔ جب کئی دن گزر گئے تو اس نے عرض کیا۔

''شہزادہ عالم! آپ مجھ پر بھاری نہیں لیکن آپ کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ شاہی فوجیں یقیناً آپ کا پیچھا کررہی ہوں گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ایران چلے جائیں۔ وہاں اپنی طاقت جمع کریں اور ہندوستان پر حملہ آور ہوں جس طرح آپ کے اجداد میں بادشاہ ہمایوں نے کیا تھا۔''

دارا یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

''آپ فکر نہ فرمائیں۔ میں خود بدرقہ کے طور پر آپ

کے ساتھ رہوں گا۔"

"میں تیار ہوں۔"

سردار اس کے ساتھ چلا اور اسے بحفاظت قندھار تک پہنچا دیا۔

قندھار پہنچنے کے بعد دارا سے ایک اور غلطی ہوئی۔ اس نے ایران جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ایران جانے کے بجائے "دہاندر" کے زمیندار ملک جیون کے تعلقہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ملک جیون پر اس کے بڑے احسانات تھے۔ ملک جیون بھی خطوط کے ذریعے اپنی بندگی اور وفاداری جتاتا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کا ساتھ ضرور دے گا لیکن سچ ہے کہ برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ ملک جیون کا حال بھی یہی ہوا۔ اس نے بظاہر تو بہت خاطر داری کی لیکن دل ہی دل میں دارا کو گرفتار کرانے کا ارادہ کر لیا اور موقع کی تلاش میں لگا رہا۔ یہ موقع بہت جلد آ جاتا لیکن ایک ایسا حادثہ رونما ہو گیا کہ اسے یہ فیصلہ مؤخر کرنا پڑا۔ دارا شکوہ کی بیوی نادرہ بیگم جو پرویز کی بیٹی تھی اسہال کے عارضے میں فوت ہو گئی۔ وہ مری تو دارا شکوہ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ وہ ٹوٹ تو بہت پہلے چکا تھا، اب بالکل ہی بکھر کر رہ گیا۔ اس نے چند خواجہ سراؤں کو طلب کیا۔

"دیکھو، یہ میری وہ امانت ہے جس کی میں حفاظت نہ کر سکا۔ تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اس کو لاہور لے جاؤ اور حضرت شیخ میاں میر کے مقبرے میں دفن کرو۔ ہمارا آنا ہوا تو فاتحہ کے لیے ضرور آئیں گے۔"

جنازہ روانہ ہوا تو دارا کو محسوس ہوا جیسے ہندوستان میں اب اس کے لیے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ اس نے ایران جانے کی ٹھان لی۔ اس نے ملک جیون کی طرف دیکھا۔

"ملک جیون! تمہاری مہمانداری کا شکریہ۔ اب ہم ایران کا قصد کرتے ہیں۔"

ملک جیون جس موقع کی تلاش میں تھا، دارا نے یہ موقع طشتری میں رکھ کر خود دے دیا۔

"کیا تم ہمارا ساتھ دو گے؟"

"جیون تو آپ کا غلام ہے۔ دنیا کے دوسرے کونے تک آپ کے ساتھ چلے گا۔"

"سچ کہتے ہو؟"

"جیون آپ کے ساتھ ہو گا اور اس کے مسلح سوار بھی۔"

"تو پھر ہم کل ایران کے لیے عازم سفر ہوں گے۔"

ملک جیون نے اطاعت کا اظہار کیا لیکن اس کے دل میں بے ایمانی آ گئی تھی۔ مستقبل کے مفادات اور ترقی کے لالچ میں اس نے ساٹھ سال کے احسانات پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ دارا کی گرفتاری کے صلے میں بیش بہا انعام کے لالچ میں تھا۔

چند کوس تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا لیکن منصوبے کے مطابق ملک جیون نے اپنے آدمیوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیا۔ ایک گروہ سپہر شکوہ کو اپنے حصار میں لے کر چلنے لگا۔ دوسرے گروہ نے دارا کو اپنے حصار میں لے لیا۔ دارا کا ماتھا ٹھنکا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"سرکار! یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر تعاقب کرنے والے اچانک پہنچ جائیں تو انہیں یہ جاننے میں دقت ہو کہ حضور کس حصار میں ہیں۔"

مسلسل رنج و آلام نے دارا کی ایسی مت ماردی تھی کہ اس نے اس دلیل کو مان لیا۔ قافلہ چلتا رہا۔ سپہر شکوہ جس گروہ کے ساتھ آ رہا تھا، وہ اتنی سست روی سے چلا کہ سپہر شکوہ بہت پیچھے رہ گیا۔ اب دونوں باپ بیٹے جدا جدا چل رہے تھے۔

ملک جیون، دارا شکوہ کے ساتھ تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

"حضور! میں ہراول کے طور پر آگے جاتا ہوں۔ کوئی خطرہ ہوا تو گھوڑا پھیر کر لوٹ آؤں گا اور اپنے آدمیوں کو باخبر کر دوں گا۔"

دارا پھر بھی کچھ نہ سمجھا۔

ملک جیون کے جاتے ہی اس کے ساتھ چلنے والے مسلح افراد نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دارا کی آنکھیں اس وقت کھلیں لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ ملک جیون کا بھائی آگے بڑھا اور دارا کو غیر مسلح کر دیا۔

"یہ کیا حرکت ہے۔ جانتے نہیں ہم کون ہیں؟"

"بادشاہ اورنگزیب کے باغی۔"

"اورنگزیب بادشاہ نہیں۔ شہنشاہ شاہ جہاں ابھی زندہ ہیں۔"

"زندہ ہیں مگر قیدی ہیں۔ حکم اورنگزیب کا چلتا ہے۔"

"ہم ملک جیون کے محسن ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں تم یہ حرکت کر رہے ہو۔ وہ محسن کش نہیں ہو سکتا۔ تم ہمیں اس کے پاس لے کر چلو۔"

"ہم یہ سب اسی کے حکم پر کر رہے ہیں۔ پھر بھی تم کہتے ہو تو ہم تمہیں اس کے پاس لے چلتے ہیں۔" دارا نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا لیکن ملک جیون کے بھائی نے

اسے روک دیا۔

''ایک قیدی گھوڑے پر بیٹھ کر ملک جیون کے پاس نہیں جاسکتا۔ گھوڑے سے نیچے اترو۔'' وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اپنی کمر میں بندھی چھوٹی تلوار کو ٹٹولا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اسے زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ سامنے ملک جیون کھڑا تھا۔

''ملک جیون! یہ سب کیا ہے؟''

''اب آپ اتنے سیدھے بھی نہیں ہیں کہ کچھ نہ سمجھے ہوں۔''

''سمجھ تو گئے ہیں کہ تم نے احسان فراموشی کی ہے۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر یہ کہ ابھی تم تیموری خون سے واقف نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے کمر سے بندھی چھوٹی تلوار نکالی۔ چاہتا تھا کہ اسے اپنے پیٹ میں اتار لے لیکن ملک جیون نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ ہوا میں معلق کر دیا۔

''آپ نے مجھ پر بہت سے احسانات کیے ہیں۔ میں آپ کو اتنی آسانی سے کیسے مرنے دوں گا۔'' ملک جیون نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آدمیوں نے آگے بڑھ کر تلوار چھین لی اور اسے رسیوں میں جکڑ دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں سپہر شکوہ بھی قیدی کی شکل میں آ گیا۔ دونوں باپ بیٹوں کو گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر رسیوں اور زنجیروں سے جکڑ کر پہلے سے طے شدہ مقام پر قید کر دیا گیا۔

☆☆☆

راجا جے سنگھ اور بہادر خاں، دارا کے تعاقب پر مقرر ہوئے تھے۔ وہ اجمیر سے اسے تلاش کرتے کرتے سندھ تک آ گئے تھے۔ اس طویل سفر میں انہیں صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ دارا ایران کی سرحد کی طرف روانہ ہوا ہے۔ اب دارا کی تلاش فضول تھی کیونکہ اگر سراغ مل بھی گیا تو ایران سے گرفتار کرنا مشکل تھا۔ ان دونوں کے لشکر بھی بہت تھک چکے تھے۔ آپس میں مشورے ہو رہے تھے کہ اب واپس چلا جائے۔ ابھی واپسی کا قصد نہیں کیا تھا کہ ملک جیون کا قاصد آن پہنچا۔ ملک جیون نے اپنی اس کارگزاری کی اطلاع اس قاصد کے ذریعے پہنچائی تھی۔ بھکر کے فوجدار باقر خاں کے پاس بھی اپنے اس کارنامے کی اطلاع دینے کے لیے خط دے کر ایک تیز رفتار قاصد کو روانہ کر دیا۔ باقر خاں نے اسی وقت تیز رفتار شتر سوار کے ذریعے اپنی عرضداشت ملک جیون کے خط کے ہمراہ بادشاہ کے حضور روانہ کر دی۔

اورنگزیب کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے محرمانِ خاص کو تو بتا دیا مگر دوسری اطلاع کے پہنچنے تک اس خبر کو سب سے پوشیدہ رکھا۔ اپنی کسی بات سے خوشی اور مسرت کا اظہار نہیں کیا اور شادیانے بجانے کا حکم نہیں دیا۔

☆☆☆

دارا کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ سر پر عمامہ ضرور تھا لیکن کلغی نہیں تھی۔ بے ترتیب ڈاڑھی۔ کئی دنوں کا خط بنا ہوا۔ یہی حال سپہر شکوہ کا بھی تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب راجا جے سنگھ اور بہادر خاں اس کے سامنے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی دارا کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن پھر بے بسی سے گردن جھکالی۔ دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شاید دونوں کو ندامت تھی۔

شتر سوار تیار کھڑا تھا۔ اورنگزیب کے نام لکھا گیا خط اس کے حوالے کیا گیا۔ اس خط میں ملک جیون کی کوششوں سے دارا شکوہ کی گرفتاری اور اسے ملک جیون کے ساتھ حضور میں روانہ کرنے کی اطلاع تھی۔

اس خط کے ملتے ہی بادشاہ نے شادیانے بجانے کا حکم دیا کیونکہ اب اسے دارا شکوہ کی گرفتاری کا یقین ہو گیا تھا۔

ملک جیون کو اس کارگزاری کے صلے میں بخت یار خاں کا خطاب مل گیا تھا۔ وہ دوسرے دن دہلی میں داخل ہوا۔ جب وہ شہر کی سڑکوں پر سے گزر رہا تھا تو راہ گیر اور تمام پیشہ ور اشخاص ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے اور اس ''بخت یار'' اور اس کے ہمراہیوں کو گالیاں دینے لگے اور اس پر خس وخاشاک اور نجاست پھینکی۔ مجمعے کی سنگ باری سے اس کے اکثر ساتھی زخمی ہو گئے اور چند آدمی ہلاک بھی ہو گئے۔ کوتوالِ شہر نے بہ مشکل اس مجمعے پر قابو پایا۔

دوسرے دن دارا شکوہ کو قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ قاضی کے فیصلے کے مطابق دارا شکوہ نے حدِ شرع سے تجاوز کر کے تصوف کو بدنام کیا تھا اور الحاد و کفر پھیلانے کا مرتکب بنا تھا لہٰذا قتل کا حکم صادر کیا گیا۔

قتل سے پہلے دارا شکوہ اور سپہر شکوہ کو پابہ زنجیر ہاتھی کی عماری پر بٹھا کر شہر کی سڑکوں سے گزارا تو تمام شہر میں ہنگامہ برپا تھا..... لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ بالاخانوں سے سرکاری آدمیوں پر پتھر اور ڈھیلے پھینکے جاتے تھے۔

دوسرے دن اسے قتل کر کے اس کی لاش کو بازار اور چوک سے گزارا گیا۔ لوگ اس کی لاش کو دیکھ کر بری طرح گریہ وزاری کر رہے تھے۔

دارا کی لاش کو اس تشہیر کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

☆☆☆

اورنگزیب کے بھائیوں میں ابھی دو حریف اور تھے جو زندہ تھے۔ ایک شجاع دوسرا مراد۔ مراد تو قید میں تھا لیکن شجاع مسلسل شکستیں اٹھانے کے بعد بھاگتا پھر رہا تھا۔

جب متعدد لڑائیوں میں اسے پے در پے شکست اٹھانی پڑی تو اس نے بالکل ہتھیار ڈال دیے اور دو کشتیوں میں ساز و سامان کو بھر کر اپنے محل کی عورتوں کے ساتھ فرار ہو گیا۔ بدبختی نے اب بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ بادشاہی افواج تعاقب کرتی ہوئی پہنچ گئیں اور ہاتھیوں پر لدا ہوا سامان لوٹ لیا۔ شجاع بڑی مشکل سے جانگام پہنچا۔ اسے امید تھی کہ راجا خنگ اس کے ساتھ دوستی کا برتاؤ کرے گا لیکن راجا نے آنکھیں پھیر لیں۔ شجاع کو بڑی خفت و ندامت اٹھانی پڑی اور پھر ایسا مفقود الخبر ہوا کہ کسی کو پتا نہ چل سکا کہ وہ کہاں گیا اور اس کا حشر کیا ہوا۔

شہزادہ مراد ہمیشہ اورنگزیب کا وفادار رہا تھا لیکن اس کا صلہ اسے یہ ملا تھا کہ اورنگزیب کی قید میں چلا آ رہا تھا۔ یہ رعایت البتہ کر دی گئی تھی کہ اس کی درخواست پر اس کی محبوبہ سوسن کو اس کے پاس قلعے میں بھیج دیا گیا تھا۔

اس کا بے گناہ قید ہونا خلقِ خدا کو ناگوار تھا اور اس کی رہائی کے لیے برابر کوششیں کی جا رہی تھیں۔ ایک مرتبہ بڑی منصوبہ بندی کے بعد مغلوں نے قلعے کی فصیل پر ایک جگہ کمند لگا دی اور خفیہ طور پر مراد کے پاس اطلاع بھجوا دی اور اسے فرار کے موقع اور وقت سے آگاہ کر دیا۔ مراد سے غلطی یہ ہوئی کہ سوسن کو اس بھید سے آگاہ کر دیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سب خواب غفلت میں پڑے ہوئے تھے کہ اس نے سوسن کو رخصتی کے کلمات کہے۔

"تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ اگر زندگی نے وفا کی اور تقدیر مددگار ہوئی تو پھر ملیں گے۔" سوسن یہ کلمات سن کر آہ و فغاں کرنے لگی۔

"تم مجھے کس کے سپرد کر کے جا رہے ہو؟"

اس کی گریہ وزاری سے محافظ ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے مشعلیں روشن کیں اور وہ کمند ڈھونڈ نکالی۔

یہ اطلاع جب اورنگزیب کو ملی تو اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا مراد کو قید میں رکھنا کسی وقت بھی خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ اگر زندہ رہا تو اس کے حمایتی بڑھتے جائیں گے۔ کسی طرح فتنے کی اس جڑ کا صفایا کیا جائے۔ وہ مراد کے قتل کا کوئی معقول جواز ڈھونڈنے کے لیے مشورے کرتا رہا۔ آخر بعض ہوا خواہوں کے مشورے پر دو بیٹے تلاش کر لیے گئے جن کے باپ کو مراد نے قتل کر دیا تھا۔ اورنگزیب نے انہیں اکسایا کہ وہ اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کر دیں۔ بڑے بیٹے نے تو خون کی دعوے داری سے انکار کر دیا البتہ دوسرے بیٹے نے یہ بات مان لی اور عدالت میں باپ کے خون کا استغاثہ دائر کر دیا۔ قاضی نے معاملے کا جائزہ لیا اور قصاص کے طور پر مراد کے قتل کا فتویٰ جاری کر دیا۔

اورنگزیب کے پاؤں کا یہ آخری کانٹا بھی نکل گیا۔

شاہ جہاں بادشاہ زندہ تھا مگر نظر بندی کے دن گزار رہا تھا۔ اورنگزیب نے اس کی زندگی ہی میں تختِ اقتدار سنبھال لیا تھا۔

اطلاع پہنچی کہ معزول بادشاہ موت و زیست کی کشمکش میں ہے۔ نزع کے عالم میں ہے۔ اورنگزیب نے شہزادہ معظم کو بہ طریق یلغار عیادت و دریافتِ حال کے لیے اکبر آباد روانہ کر دیا۔ وہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ بادشاہ کے رحلت کر جانے کی خبر ملی۔

اورنگزیب باپ کے انتقال کی خبر پا کر اکبر آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ پدر بزرگوار کی قبر پر بہت آنسو بہائے، فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد جہاں آرا کے پاس گیا اور تمام مقرب درباریوں کو حکم ہوا کہ وہ حرم سرا کے دروازے پر جا کر حضرت بیگم کی خدمت میں تسلیم بجا لائیں اور پرسہ دیں۔

اورنگزیب چند دن تک اکبر آباد میں ٹھہرا رہا پھر داروغۂ تخت کو حکم دیا کہ تختِ طاؤس کو جشن کے لیے دارالخلافہ سے مستقر الخلافت (دہلی) پہنچایا جائے۔ اس کے ساتھ محل کی بعض خواتین کو بھی دہلی بھجوا دیا گیا۔

یہ اس کے جلوس کا نواں سال تھا۔

اب نہ دارا تھا، نہ شجاع نہ مراد۔ وسیع و عریض سلطنت تھی جس پر اسے اگلے پچاس سال تک حکومت کرنی تھی۔

شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

"اگر کسی سے خطرہ ہو سکتا ہے تو وہ اورنگزیب ہے۔"

جمال جمشید کا کمزور اور لاغر سا جسم قیمتی اور ملائم کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ وہ نہایت نرم اور گدیلے تکیے کے سہارے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں بھی ویسے ہی تکیے موجود تھے۔ اس کا پرانا، وفادار ملازم ٹرالی پر اس کا پرہیزی ناشتا سجا کر لے آیا تھا اور اب اس کے بیڈ پر وہ فولڈنگ ٹیبل صحیح طریقے سے رکھ رہا تھا جو عموماً مریضوں کو کھانا کھلانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ میز، بیڈ پر اچھی طرح سیٹ ہوگئی تو ملازم نے اس پر ناشتا سجا دیا۔ پھر اس

گہری چال

نجمہ مودی

محبت کرنے والے اگر بے وفائی کے مرتکب ہو جائیں تو بھی کسی حد تک قابلِ برداشت ہے مگر... جب ایک شریکِ حیات اس روش کو اپنا لے تو بہت اذیت سہنا پڑتی ہے۔ وہ جو پہلے ہی عذاب میں مبتلا تھا کہ بے اعتنائی اور بے وفائی کے زخموں سے چُور چُور ہو گیا لیکن یہ سب کچھ کب تک اسے سہنا تھا اب یہ فیصلہ کرنا تھا۔

آفتاب بن جانے والی ایک بے وقعت عورت کی احسان فراموشی

نے بڑی سی کھڑکی کا بھاری اور خوبصورت پردہ سمیٹ دیا۔ کمرے میں دن کا اجالا پھیل گیا۔ اس کھڑکی سے جمال جمشید کو اپنے طویل و عریض اور شاندار بنگلے کا گیٹ، خوبصورت لان کا کافی حصہ حتیٰ کہ سرونٹ کوارٹرز کی ایک سائڈ بھی نظر آتی تھی۔ وہ اپنے ڈرائیوے میں کھڑی گاڑیاں بھی دیکھ سکتا تھا اور اگر گیٹ کھلا ہوتا تو اس کے سامنے یا آس پاس کھڑی گاڑیاں بھی نظر آتی تھیں۔ اس کھڑکی سے باہر کا منظر کافی خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔

''کھڑکی کھول دوں صاحب جی؟'' جمال کے ملازم بشیر نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

''تم چاہتے ہو، مجھے زکام ہوجائے؟'' جمال نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں اور چہرے پر ناگواری تھی۔ جب سے وہ بیمار اور صاحبِ فراش ہوا تھا، اس کے چہرے پر زیادہ تر ایسے ہی تاثرات رہتے تھے۔ خاص طور پر ملازموں سے بات کرتے وقت تو اس کے تاثرات ایسے ہی ہوجاتے تھے۔

''نہیں صاحب جی! میں تو دعا کرتا ہوں کہ آپ بالکل ٹھیک ہوجائیں اور آئندہ کوئی بیماری آپ کے پاس سے بھی نہ گزرے۔'' بشیر نے سر جھکا کا عاجزانہ اور خوشامدانہ سے لہجے میں کہا پھر ایک لمحے کے توقف سے پوچھا۔ ''کوئی اور چیز چاہیے صاحب جی؟''

''نہیں۔'' جمال نے اب ذرا نرم لہجے میں کہا اور بڑا سا نیپکن اپنے گریبان میں اڑا لیا۔ پھر اس نے ایک خوبصورت پلیٹ سے شیشے کا ڈھکنا اٹھایا۔ صفائی اور نفاست سے تلا گیا ایک انڈا اس میں رکھا تھا جس کی زردی کچھ ابھری ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نامعلوم مخلوق کی بڑی سی آنکھ جمال کو تک رہی ہو۔ کم از کم جمال کو یہی محسوس ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ بشیر ابھی تک مؤدبانہ انداز میں کھڑکی کے قریب ہی کھڑا تھا۔

''تم کیا میرے نوالے گننے کے لیے یہاں کھڑے ہو؟'' جمال کے لہجے میں پھر پہلے جیسی چڑچڑاہٹ آگئی۔

''نہیں صاحب جی!'' بشیر نے گویا اس کی چڑچڑاہٹ کا ذرا بھی اثر نہ لیا۔ ''میں چاہ رہا ہوں، مس نورین اپنی ڈیوٹی پر آجائیں تو پھر یہاں سے جاؤں۔ آپ کو یاد ہے نا..... ڈاکٹر حامد صاحب نے ہم سب نوکروں سے کہا تھا کہ آپ کو ایک منٹ کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑنا ہے۔''

''تم ڈاکٹر حامد کے اتنے زیادہ فرماں بردار مت بنو.....'' جمال نے بدستور چڑچڑاہٹ سے کہا۔ ''اور تمہیں میری بھی اتنی پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اگر مرنے لگوں گا تو گھنٹی بجا کر تمہیں بلالوں گا۔ تمہیں اگر مجھے مرتے دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو یقین کرو، تم یہ منظر دیکھنے سے محروم نہیں رہو گے۔''

''صاحب جی! اللہ نہ کرے کہ ہم آپ کو مرتے دیکھیں۔ اس سے پہلے ہمیں ہی موت آجائے تو اچھا ہے۔'' بشیر کے لہجے میں لجاجت تھی۔

''بس..... بس..... زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ میں ابھی جیب سے پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر انعام کے طور پر دے دوں گا۔'' جمال کے چہرے پر اب بھی چڑچڑاہٹ کا تاثر تھا لیکن لہجے میں واضح طور پر نرمی آگئی تھی۔

''اللہ آپ کو زندگی دے صاحب جی! انعام تو ملتے ہی رہتے ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی بات پر عمل ہوتا رہے۔'' بشیر کے لہجے میں اب بھی عاجزی تھی۔

''ڈاکٹر تو اپنی فیس حلال کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ وہ مریض کو، اس کے گھر والوں کو..... حتیٰ کہ نوکروں تک کو اٹینشن رکھتے ہیں اور خود بیگ اٹھا کر آرام سے گھر چلے جاتے ہیں۔'' جمال کے لہجے میں اب نرمی تھی۔ ''تم جاؤ اور مجھے اکیلے میں ناشتا کرنے دو۔ تمہیں اچھا بھلا پتا ہے کہ میں جو تھوڑا بہت کھاتا ہوں، کوئی میرے سر پر کھڑا رہے تو وہ بھی نہیں کھایا جاتا۔''

بشیر گویا بادلِ ناخواستہ کمرے سے رخصت ہوگیا۔ تب جمال نے دوسری پلیٹ کا ڈھکنا اٹھایا۔ اس میں براؤن بریڈ کا ایک سلائس رکھا تھا جسے ٹوسٹر میں سینک کر مزید براؤن کردیا گیا تھا۔ ٹرے میں خوبصورت اور قیمتی ٹی پاٹ بھی موجود تھا۔ جمال کو معلوم تھا کہ اس میں پھیکی چائے اس کی منتظر ہوگی۔ یہی اس کا کُل ناشتا تھا۔ اس سے زیادہ وہ ناشتے میں کچھ لے بھی نہیں سکتا تھا اور ڈاکٹر نے منع بھی کیا ہوا تھا۔

جمال کو اس ناشتے کی کوئی خاص طلب نہیں تھی۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کھڑکی سے اسے جو کچھ نظر آتا تھا، دوسروں کو شاید اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ سب کچھ دیکھتے رہنا جمال کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث تھا۔ بستر تک محدود ہوجانے کے بعد سے یہی اس کا مشغلہ رہ گیا تھا جس میں اس کا دل لگا رہتا تھا۔ اسے کافی حد تک یوں لگتا تھا جیسے اس کے سامنے سنیما اسکرین پر کسی فلم کے مناظر چل رہے ہوں۔ جمال کے لیے ست ٹیمپو کے ان

مناظر میں بھی دلچسپی کا خاصا سامان ہوتا تھا۔ مختلف لوگوں کی نقل و حرکت دیکھتے ہوئے اس کا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ ان سب لوگوں کا اس کھڑکی کی طرف شاید دھیان نہیں جاتا تھا اور انہیں یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ انہیں کہیں سے دیکھا جا رہا ہے۔ خاص طور پر دن میں، کیونکہ دن میں کمرے کے اندر لائٹس آف ہوتی تھیں۔ کھڑکی کا شیشہ ٹنٹڈ تھا۔ دن میں اس سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا لیکن باہر والے اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ البتہ رات کو کمرے میں لائٹس آن ہونے پر باہر والوں کو کسی حد تک اندر کے منظر کی جھلک دکھائی دے سکتی تھی لیکن اس وقت تک جمال کی ہدایت کے مطابق بشیر کھڑکی کا پردہ پھیلا چکا ہوتا تھا۔

جمال کے بنگلے کا لان بہت خوبصورت اور نہایت سرسبز تھا۔ اس کا بل کھاتا ڈرائیوے سفید ماربل کا تھا جس کے دونوں طرف بڑے بڑے گلوبس والے پولز استادہ تھے۔ رنگارنگ پھولوں والے پودوں کی خوبصورت کیاریاں تھیں۔ باؤنڈری وال کے ساتھ پام کے خوبصورت درخت اور ان کے درمیان کمیاب پرندوں کے خوبصورت پنجرے تھے۔ لان پر کبھی کبھی چند مور بھی اٹکھیلیاں کرتے دکھائی دیتے تھے۔ چھ ملازمین صرف لان، ڈرائیوے، پورچ وغیرہ کا خیال رکھنے اور ان کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔ اس وقت بھی ایک مالی پھولدار پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھا۔

گیٹ کھلا تھا اور اس کے قریب، اندر کی طرف جمال کی بیوی شازیہ کی نیلی بی ایم ڈبلیو کار کھڑی تھی جسے شازیہ کا ڈرائیور مجید، پالش سے چمکا رہا تھا جبکہ جمال کا ڈرائیور شاہ زمان دوسری گاڑی میں جمال کی نرس نورین کو اس کے گھر سے لے آیا تھا لیکن ابھی گیٹ کے قریب باہر ہی کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ روزانہ نورین کو اس کے گھر سے لینے اور رات کو چھوڑنے جاتا تھا۔ مہینوں اسی آنے جانے کے دوران دونوں کی شناسائی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ دونوں کی منگنی ہو گئی تھی اور تین چار ماہ بعد وہ شادی کا ارادہ رکھتے تھے۔

دونوں کی شخصیت اور حالات کے درمیان بہت سا فرق تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ دونوں نے، کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود عملیت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر فرق کو نظرانداز کر دیا تھا اور اپنی سماجی ضرورت پوری کرنے سے غرض رکھی تھی۔ شاہ زمان پہاڑی علاقے سے آیا ہوا ایک سرخ و سپید، وجیہہ اور دراز قد نوجوان تھا۔ بھورے بال، نیلی آنکھیں، نہایت متناسب ناک نقشہ..... قسمت یاوری کرتی تو وہ فلمی ہیرو بھی بن سکتا تھا لیکن سردست وہ صرف ڈرائیور تھا اور بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ ہر طرح کی گاڑیاں حتیٰ کہ ٹرک بھی چلا لیتا تھا۔ وہ صرف مڈل پاس تھا لیکن بات چیت کافی شائستگی سے کر لیتا تھا۔

نورین سرو قد اور معمولی حد تک فربہی مائل لڑکی تھی۔ رنگت گندمی تھی۔ اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن وہ ایک کوالیفائیڈ اور اچھی نرس تھی۔ ابھی اسے کسی بڑے سرکاری اسپتال میں ملازمت نہیں مل سکی تھی۔ جمال کے ہاں آنے سے پہلے وہ ایک چھوٹے سے پرائیویٹ اسپتال میں ملازمت کر رہی تھی۔ ایک سال پہلے جب جمال بستر کا ہو کر رہ گیا تھا اور اس نے نرس کی ضرورت کا اشتہار اخبار میں دیا تھا تو امیدواروں میں اسے نورین سب سے معقول لگی تھی۔ جمال نے اسے اس سے کہیں زیادہ تنخواہ پر رکھ لیا تھا جتنی اسے اسپتال میں مل رہی تھی لیکن اس پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ یہاں اس کی ملازمت جمال کی اپنی زندگی سے مشروط تھی۔ جب تک وہ زندہ تھا، تب تک نورین کی ملازمت تھی۔

یہ سن کر نورین نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے اور بہ آوازِ بلند کہا تھا۔ ''یا اللہ! جمال صاحب کو لمبی زندگی عطا فرمانا اور جب تک میں زندہ ہوں، ان کا سایہ میرے سر پر سلامت رکھنا۔ آمین!''

جمال نے محسوس کیا کہ نورین کا یہ انداز شاید ایک قسم کی خوشامد تھی۔ اس نے یہ ظاہر کرنا بہتر سمجھا کہ وہ خوشامد پسند نہیں تھا۔ وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''تمہاری دعا کسی بھکاری کی دعا کی طرح خلوص سے خالی ہے۔''

''آپ کو اس میں خلوص تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔'' نورین فوراً بولی۔ ''یہ دعا میں آپ کے لیے نہیں، اپنے لیے مانگ رہی ہوں۔ ظاہر ہے، آپ سلامت رہیں گے تو میری یہ نوکری برقرار رہے گی جس میں مجھے پہلے سے اچھی تنخواہ ملے گی۔ چنانچہ میرے اپنے لیے تو میری اس دعا میں بڑا خلوص ہے لیکن آپ کو اس کا احساس نہیں ہوگا۔''

جمال اس کی حاضر جوابی سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے پر بدستور ایک خشک مزاج اور آدم بیزار قسم کے انسان والے تاثرات برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اسے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات رکھنے کے لیے اکثر اوقات تو کوشش بھی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ وہ اکثر اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور اس

دوران اس کے چہرے پر ایسے تاثرات خود بخود ہی آجاتے تھے۔ کبھی کبھی اسے اپنے آپ پر ترس بھی آجاتا تھا۔ اس نے زندگی میں بڑی محنت کی تھی اور بہت دولت کمائی تھی لیکن یہ دولت اس کے پاس بڑی تاخیر سے آئی تھی۔ اس وقت تک اس کی عمر اچھی خاصی ہو چکی تھی۔

شادی اس نے اور بھی زیادہ تاخیر سے کی۔ اب اسے احساس ہوتا تھا کہ اس کا شادی کرنا ایک بہت بڑی حماقت تھی۔ اس نے بڑھاپے میں ایک جوان اور نہایت حسین عورت سے شادی کرلی تھی۔ یہ اس کا ایک پرانا خواب تھا کہ اس کی شادی ایسی لڑکی سے ہو جو نہ صرف دیکھنے میں حسین اور پُرکشش ہو، بلکہ اس کے وجود میں جذبوں کے طوفان مقید ہوں۔ اسے بڑھاپے میں بھی بڑی آسانی سے ایسی لڑکی مل گئی لیکن کچھ عرصے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کے اپنے وجود میں تو خواہشوں کے آتش فشاں بڑی تیزی سے سرد ہو رہے تھے۔

پھر قسمت نے اس کے ساتھ ایک اور ستم کیا۔ اچانک ہی اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا اور اس کی وجہ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آئی۔ سب ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے، اپنی اپنی تھیوریاں پیش کرتے رہے لیکن کوئی بھی اسے اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہ بنا سکا۔ وہ انگلینڈ اور امریکا بھی ہو آیا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بھی تاسف سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے فیصلہ سنا دیا کہ اس کی باقی زندگی وہیل چیئر اور بستر پر ہی گزرے گی۔ یہ سن کر اس کے وجود میں گویا گہرا سناٹا اور تاریکی پھیل گئی تھی۔ اس کی دنیا بستر اور وہیل چیئر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

اس نے خود کو اس کشادہ کمرے میں مقید کرلیا اور فرض کرلیا کہ کھڑکی سے اسے جہاں تک کا منظر نظر آتا ہے، بس وہی اس کی کل دنیا تھی۔ کبھی کبھی وہ خود کو آئینے میں دیکھتا تو اسے اپنے آپ پر ترس آتا۔ وہ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے بہ زبانِ خموشی اپنے آپ سے پوچھتا۔ ''جمال جمشید! کیا فائدہ ہوا تمہیں اتنی محنت کرنے اور اتنا امیر ہونے کا.....؟''

اس وقت اسے اپنا ڈرائیور شاہ زمان اپنے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت لگتا جس کی تنخواہ صرف پچیس ہزار تھی، جو اس کے دیے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا، جو ایک عام سی شکل صورت کی لڑکی سے شادی کرنے جا رہا تھا مگر خوبصورت تھا، صحت مند اور مضبوط جسم کا مالک تھا.....

اور.....اور.....

اس نے اپنے خیالات کو بھٹکنے سے باز رکھا اور وال کلاک کی طرف دیکھا۔ نو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے اور نورین بدستور ڈرائیور روے میں کھڑی ہنس ہنس کر شاہ زمان سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ ڈیوٹی کے اوقات کے لحاظ سے اسے نو بجے جمال کے کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ آتے ہی، سب سے پہلے اسے دوائیں دیتی تھی پھر اسے بستر پر ہی چند مخصوص ورزشیں کراتی تھی۔ شاید اسے اپنے ان فرائض کا خیال آ ہی گیا۔ اس نے اپنی سڈول کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، ہاتھ ہلا کر شاہ زمان کو خدا حافظ کہا اور گویا بادلِ ناخواستہ اندر کی طرف آنے لگی۔ شاہ زمان اپنے سرونٹ کوارٹر کی طرف چلا گیا۔

اسی دوران شازیہ کے ڈرائیور مجید نے بی ایم ڈبلیو کو چمکانا بند کیا اور اس میں بیٹھ کر کہیں روانہ ہو گیا۔ شاید شازیہ نے اسے کسی کام سے بھیجا تھا۔ بنگلے کا گارڈ جو زیادہ تر گیٹ کے قریب باہر ہی، درخت کے نیچے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا رہتا تھا اور پاس پڑوس کے آتے جاتے نوکروں سے گپ شپ کرتا رہتا تھا، اس نے باہر سے گیٹ بند کر دیا۔ نورین مستعدی سے قدم اٹھاتی اندر آ رہی تھی۔ وہ تھی تو عام سی شکل صورت کی لڑکی، لیکن مضبوط اور صحت مند دکھائی دیتی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے پھرتی اور مستعدی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ نرسوں والے سفید یونیفارم میں تھی مگر اپنے انداز و اطوار سے وہ کوئی فوجی خاتون معلوم ہوتی تھی۔

پورچ کے قریب پہنچ کر وہ جمال کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جمال کو اندازہ ہو گیا کہ صرف چند سیکنڈ بعد وہ اس کے کمرے تک پہنچ چکی ہو گی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور ناشتا کرنے لگا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق چند لمحے بعد دروازے پر مخصوص دستک ہوئی۔

''کم اِن.....'' جمال نے منہ چلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ یوں سر جھکائے ناشتا کر رہا تھا جیسے اس نے اب تک کھڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ہو۔

نورین مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''گڈ مارننگ سر! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' وہ چہکی۔

''دفع ہو جاؤ.....تم گیارہ منٹ لیٹ آئی ہو۔ تمہیں کون سی پروا ہے میری طبیعت کی۔'' جمال نے غصے اور چڑچڑاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

نورین نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے ایک گھٹنا بیڈ پر رکھ کر اس کے کندھے تھپتھپائے، اس کی شرٹ اور کمبل ٹھیک کیا، ٹشو پیپر سے اس کا منہ صاف کیا، پھر یوں اس کا گال تھپکا جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو۔

''غصہ نہ کیا کریں۔ آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ غصہ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولی اور اس کے لیے چائے کپ میں انڈیلنے لگی۔ ''میں نے پوچھا تھا، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''زندہ ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟'' جمال نے چڑچڑاہٹ کا مظاہرہ جاری رکھا۔

نورین کھڑکی کے قریب جاتے ہوئے بولی۔ ''میں ابھی باہر کھڑی شاہ زمان سے باتیں کر رہی تھی۔ باہر بڑا اچھا موسم ہے۔ کھڑکی کھول دوں؟''

''جو بھی اس کمرے میں آتا ہے، نہ جانے کیوں اسے کھڑکی کھولنے کا شوق چڑھ جاتا ہے۔'' جمال پہلے سے زیادہ غصے سے بولا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے بشیر کمرے میں تھا۔ وہ بھی کھڑکی کھولنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ کیا تم لوگوں کو یاد نہیں رہتا کہ ڈاکٹر نے مجھے ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے کہا ہے۔ کیا تم لوگ چاہتے ہو، میں جلدی مر جاؤں اور تم سب کی جان چھوٹ جائے؟''

''ہرگز نہیں سر!'' نورین نے اس کے غصے کا ذرا بھی اثر لیے بغیر خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''میں تو چاہتی ہوں آپ کم از کم اس وقت تک ضرور زندہ رہیں جب تک میں زندہ ہوں..... اور ہر سال آپ میری تنخواہ ڈبل کرتے رہیں۔''

''میرے ہاتھوں میں طاقت ہوتی تو میں آج ہی تمہارا گلا دبا دیتا۔'' جمال نے کسی ناراض بچے کی طرح اسے گھورا۔ ''تم پتا نہیں کب تک زندہ رہنے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہو۔ ابھی تو تمہیں شاہ زمان سے شادی بھی کرنی ہے۔ مجھے پتا ہے، شادی کے لیے تم ہی دھڑا دھڑ پیسے جمع کر رہی ہو۔ وہ کمینہ تو اپنے آپ کو کنگلا ہی ظاہر کرتا ہوگا۔''

''جی ہاں۔ آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔ مجھے تو ابھی سے اس کے کئی خرچے اٹھانے پڑ رہے ہیں۔'' نورین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''چلیں..... خیر..... اس کی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو اس نظریے کی قائل ہوں کہ میاں بیوی کے پیسے الگ الگ نہیں ہوتے لیکن ایک اور وجہ سے میں تھوڑی تھوڑی فکرمند ہونے لگی ہوں۔'' اس کے لہجے میں سچ مچ تھوڑی سی فکرمندی جھلک آئی۔

''کیسی وجہ؟'' جمال نے اپنی دلچسپی چھپاتے ہوئے بظاہر خشک لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اب احساس ہونے لگا ہے کہ عام سی شکل صورت کی لڑکی کو کسی ہینڈسم مرد سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ہینڈسم مرد اپنی حرکتوں سے اس کے احساسِ کمتری کو بڑھا دیتا ہے۔'' نورین کا لہجہ اچھا خاصا دانشورانہ ہوتا جا رہا تھا۔ ''شاہ زمان کو عورتیں، لڑکیاں بہت لفٹ کراتی ہیں اور یہ کمینہ بھی دانت نکالتا ہوا ہر ایک کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ راستے میں گرلز کالج وغیرہ کے سامنے لڑکیوں کو لفٹ دینے کے لیے گاڑی روک لیتا ہے اور ان چڑیلوں میں سے بھی اکثر ڈرتی نہیں ہیں، فوراً بیٹھ جاتی ہیں۔ شاید میری موجودگی کی وجہ سے بھی وہ بے خوف ہو جاتی ہیں۔ سوچتی ہوں گی کہ شاید یہ فیملی والا آدمی ہے لیکن گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ گویا مجھے بھول ہی جاتی ہیں اور چٹاخ پٹاخ شاہ زمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں اور وہ بھی خوب باچھیں کھلا کر انہیں جواب دیتا ہے اور اپنے بات کرنے کے انداز سے پڑھا لکھا نظر آنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔''

پھر جیسے نورین کو کچھ یاد آیا۔ شاید غیر ارادی طور پر اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ ''کل تو حد ہی ہوگئی۔ ایک بڑے شاپنگ مال کے سامنے شاہ زمان نے گاڑی روک کر دو فیشن ایبل، خوبصورت لڑکیوں سے پوچھا تو وہ یہ کہتے ہوئے جھٹ سے بیٹھ گئیں کہ بس، قریب ہی جانا ہے۔ وہ حالانکہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں لیکن ان میں سے ایک تو راستہ بتانے کے بہانے شاہ زمان پر گری جا رہی تھی۔''

''واقعی؟'' جمال نے قدرے بے یقینی سے پوچھا۔

''سر! میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی؟'' نورین بولی۔ پھر اس کے چہرے پر سرخی اور لہجے میں کچھ تیزی آ گئی۔ ''قسم سے، مجھے اتنا غصہ آ رہا تھا کہ اگر میرے پاس پستول ہوتا تو میں اس لڑکی کو وہیں گولی مار دیتی۔''

''کیا واقعی تم اتنی سی بات پر اس لڑکی کو گولی مار دیتیں؟'' جمال کی آنکھوں میں پہلی بار دلچسپی کی نہایت خفیف سی لہر ابھری۔

''جی سر! میں ایسی ہی لڑکی ہوں۔ بڑی پوزیسیو ہوں میں۔'' نورین قدرے فخریہ سے انداز میں بولی۔ ''اب آپ چاہے اسے اچھا سمجھیں یا برا..... لیکن میں اسی انداز سے سوچتی ہوں کہ شاہ زمان اب صرف میرا ہے۔ اب کوئی لڑکی اس کے قریب آنے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی وہ خود دم ہلاتا ہوا کسی لڑکی کے پیچھے جائے۔ ایسی باتوں پر میرا دماغ ایسا گھومتا ہے کہ مجھے اپنے آپ سے بھی ڈر لگنے لگ

جاتا ہے۔ میں نے شاہ زمان کو بتانے کی کوشش تو کی ہے کہ میں مستقبل میں اس معاملے میں بڑی خطرناک بیوی ثابت ہوسکتی ہوں لیکن وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے نا..... وہ ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ بس، بے پروائی سے دانت نکالتا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ اس چیز سے بڑا لطف اندوز ہوتا ہے کہ اسے لڑکیوں اور عورتوں سے اتنی لفٹ ملتی ہے۔ اسے اگر ان چکروں میں پڑنے کا اتنا شوق تھا تو اسے مجھ سے منگنی نہیں کرنی چاہیے تھی..... اور اگر مجھے پہلے اس چیز کا اندازہ ہوتا یا میرا دماغ اس طرف گیا ہوتا تو میں خود ہی اس سے شادی کے لیے ہامی نہ بھرتی۔"

"چلو..... خیر..... اب تو جو ہونا تھا، سو ہوگیا۔ مستقبل میں تمہیں حالات سے سمجھوتا کر کے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھنا پڑے گا۔" جمال نے قدرے نرم لہجے میں اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"شاہ زمان کو بھی میرے مزاج کے ساتھ سمجھوتا کر کے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھنا پڑے گا۔" نورین کچھ ضدی سے لہجے میں بولی۔ پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا، چونکتے ہوئے بولی۔ "سر! آج تو آپ نے مجھے ایسی باتوں میں لگالیا کہ اگر یہ دو دن بھی چلتی رہیں تو میں بولتی رہوں گی۔ آپ کا ناشتا ختم ہوگیا اور میں نے آپ کو دوائیں ہی نہیں دیں۔"

اس نے جمال کے بیڈ سے مریضوں والی میز ہٹائی، بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھی کئی شیشیوں میں سے چند گولیاں نکال کر جمال کو کھلائیں، ایک بار پھر سینی ٹائزر اور ٹشو پیپرز کی مدد سے اس کا ہاتھ اور چہرہ صاف کیا، اس کی شرٹ اتار کر اس کے کندھوں اور کمر کے کچھ حصے کو کیمیکلز اور اسفنج سے صاف کر کے دوا لگائی اور اسے لانڈری سے آئی ہوئی دوسری شرٹ پہنادی۔

اس دوران جب وہ جمال کے بالکل قریب تھی، جمال نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "تم شاہ زمان سے بہت پیار کرتی ہو نا؟"

نورین کے چہرے پر پہلی بار ہلکے سے شرمیلے پن کے آثار نمودار ہوئے اور وہ اس سے نظر چراتے ہوئے بولی۔ "ظاہر ہے..... انسان جس سے پیار کرتا ہے، اسی کے بارے میں چاہتا ہے نا کہ کوئی اور اس کی طرف ذرا بھی محبت بھری نظر سے نہ دیکھے..... لیکن دیکھیں..... میں نے آپ سے جو باتیں کی ہیں، وہ آپ شاہ زمان کو ہرگز نہ بتایئے گا۔"

"احمق لڑکی!" جمال نے ایک بار پھر پہلے جیسی خفگی اور چڑچڑے پن سے نورین کی طرف دیکھا۔ "تمہارے خیال میں اب میرے پاس یہی کام رہ گیا ہے کہ میں ڈرائیوروں سے اس قسم کی باتیں کرتا پھروں؟ ٹھیک ہے، میں بیڈ تک محدود ہو کر رہ گیا ہوں..... لیکن تمہیں پتا ہے کہ میں یہیں سے اپنے سارے بزنس کو کنٹرول کرتا ہوں، حالانکہ ڈاکٹر مجھے اس سے منع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، بزنس کے بارے میں کوئی بری خبر سن کر میرا بلڈ پریشر بڑھ سکتا ہے جو میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ انہیں کیا پتا کہ کن کن باتوں سے میرا بلڈ پریشر بڑھتا ہے اور نہ ہی انہیں یہ اندازہ ہے کہ اس حالت میں بھی میں کیا کیا برداشت کرسکتا ہوں۔"

"سوری سر..... کہ میں نے ایسی بے وقوفی کی بات کی۔" نورین نے مسکراتے ہوئے بچوں کی طرح اس کا گال تھپتھپایا۔

جمال نے گویا مزید وضاحت کی۔ "اور شاہ زمان سے تو میری ملاقات تو کیا، میرا آمنا سامنا بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ مجھے کون سا گاڑی میں کہیں جانا ہوتا ہے۔ مجھے جس سے ملنا ہوتا ہے یا جس کو مجھ سے کام ہوتا ہے، وہ یہیں میرے پاس آجاتا ہے۔"

"جی سر..... جی سر.....!" نورین نے تائید میں سر ہلایا پھر اسے گویا کوئی خیال آیا۔ "سر! آپ اس بات پر مجھ سے خفا تو نہیں ہیں کہ میں نے آپ کے ڈرائیور سے منگنی کرلی؟" اس نے منت کے سے انداز میں اپنا گرم و گداز ہاتھ جمال کے استخوانی سے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"لو بھلا، میں کیوں ناراض ہونے لگا؟" جمال نے تیوریاں چڑھائیں۔ "میں تو اس پر خوش ہوں۔ یہ تو کچھ اسی قسم کی بات ہے کہ گھر کا معاملہ گھر میں ہی طے ہوگیا۔ آج کل کی لڑکیاں عقلمند اور پریکٹیکل ہیں۔ محبت کے معاملے میں بھی سہولت دیکھتی ہیں۔ تمہیں کتنی سہولت ہوگئی! ملازمت بھی وہیں، محبت بھی وہیں۔"

نورین منہ پر ہاتھ رکھ کر قدرے شرمیلے سے انداز میں ہنسنے لگی۔ پھر منہ سے ہاتھ ہٹا کر سنجیدہ ہو کر، بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "شکر ہے، آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔"

اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ جمال نے یہ پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ دستک دینے والا کون تھا۔ وہ اپنے مخصوص چڑچڑے پن کے ساتھ بلند آواز میں بولا۔ "تم جو کوئی بھی ہو، دفع ہوجاؤ۔"

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور جمال کی بیوی شازیہ اندر آ گئی۔ اس نے گویا جمال کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ وہ جمال کے انداز و اطوار کی عادی تھی۔ نورین اسے دیکھ کر مؤدبانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی لیکن شازیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر بے نیازی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کر دیا۔ بھڑکیلے نارنجی رنگ کے ماڈرن ڈریس میں وہ اپنے غیر معمولی حسن کے ساتھ سرتاپا ایک شعلہ جوالا نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے بال سنہرے ڈائی کیے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں اس پر ہالی وڈ کی کسی حشر ساماں اداکارہ کا گماں گزرتا تھا۔ اب اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کبھی اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال سے کچھ زیادہ تھی لیکن وہ اپنی عمر سے کافی چھوٹی لگتی تھی۔ شاید بچہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی اس کے حسن اور تازگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے آتے ہی کمرا ایک نئی مہک سے بھر گیا۔

اس نے جمال کے بیڈ پر جھک کر اس کے گال تھپتھپائے پھر نورین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیسا ہے تمہارا مریض؟''

نورین کے بجائے جمال نے جواب دیا۔ ''اطمینان رکھو، بس مرنے کے قریب ہے۔ امید ہے یہ خبر سن کر تمہیں بہت خوشی ہوگی۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' شازیہ نے پیار بھرے انداز میں اسے ڈانٹا۔ ''تم میرے ساتھ بات چیت کی شروعات ہی مرنے کے ذکر سے کیوں کرتے ہو؟''

''مجھے یقین ہے، دل ہی دل میں تمہیں میری یہ بات چیت بہت پسند آتی ہوگی اور شاید تم اس پر آمین بھی کہتی ہوگی۔'' جمال اطمینان سے بولا۔

''تمہیں فضول باتیں کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' شازیہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''یہ بتاؤ، رات نیند اچھی آئی؟''

''اچھی یا بری کا کیا سوال؟ نیند آئی ہی نہیں۔'' جمال خشک لہجے میں بولا۔

''جھوٹ مت بولو۔ چہرے سے تو تم کل کے مقابلے میں بہت تازہ دم لگ رہے ہو۔'' شازیہ گہری نظر سے اس کے بیمار اور شکن زدہ چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے تم آئینہ دیکھ کر آ رہی ہو اور ابھی تک تمہاری نظروں میں تمہارا اپنا ہی چہرہ بسا ہوا ہے۔'' جمال نے رکھائی سے کہا پھر اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے ہی

چہرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس بے چارے بیمار اور پھٹکار زدہ چہرے پر تازگی کا کیا کام؟''

''اوہ میرے خدا.....!'' شازیہ نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''بہت بڑے جل کٹڑے ہو تم.....!'' پھر وہ نورین کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''پتا نہیں تم اس شخص کو سارا دن کیسے برداشت کرتی ہو۔''

''پیسوں کی خاطر!'' جمال نے اطمینان سے کہا۔

''جیسے تم مجھے پیسوں کی خاطر برداشت کر رہی ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم بہت زیادہ دولت کے لیے مجھے برداشت کر رہی ہو اور یہ بہت تھوڑے سے پیسوں کے لیے برداشت کر رہی ہے۔''

''تم تو بالکل ایک چڑچڑے اور بدمزاج بچے کی طرح ہوتے جا رہے ہو۔'' شازیہ نے گویا اس کی بات کا ذرا بھی برا منائے بغیر کہا پھر نرس سے پوچھا۔ ''تم نے صاحب کی سب دوائیں انہیں کھلا دیں؟''

نورین کے بجائے جمال نے جواب دیا۔ ''ہاں، کھلا دی ہیں۔ ظاہر ہے، اسے تو اپنی ذمے داری پوری کرنے کی فکر ہوگی۔ وہ نرس ہے، کوئی بیوی تھوڑا ہی ہے۔''

شازیہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مصنوعی غصے سے اسے گھورا پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''تم نہیں بدل سکتے۔ تم اب جیسے ہو گئے ہو، ویسے ہی رہو گے۔''

''اس عمر میں اپنے آپ کو بدلنے کا کیا فائدہ؟'' جمال نے منہ بنا کر کہا پھر گویا ایک نئے زاویۂ نظر سے شازیہ کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''ویسے..... بائے دا وے..... یہ تم آج ہالی وڈ کی سپر اسٹار بن کر کہاں جا رہی ہو؟''

''مجھے اپنی ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں جانا ہے۔ گفٹ خریدنے جا رہی ہوں۔ فی الحال میں نے ڈرائیور کو لانڈری سے کپڑے لانے بھیجا ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا۔ میں تھوڑی دیر میں جاؤں گی اور ایک آدھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔'' شازیہ نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''امید ہے، واپسی پر میں تمہیں زندہ ہی ملوں گا۔'' جمال طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''یقیناً..... اور تم زندہ اس لیے ملو گے کہ مجھ سمیت نہ جانے کتنے لوگ تمہیں زندہ رکھنے کے لیے بڑے جتن کر رہے ہیں۔'' شازیہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

اس کی بات پر جمال نے طنزیہ سے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اسے ہچکی اور کھانسی ایک ساتھ آ گئیں۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ نورین نے جلدی سے ایک خوبصورت تھرماس سے پانی انڈیل کر اسے دیا مگر اس نے آہستگی سے گلاس پیچھے ہٹا دیا اور کھانسی تھمنے پر بولا۔ ''مجھے پانی کی ضرورت ہوگی تو میں خود تھرماس سے لے کر پی لوں گا۔ اب میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوں کہ پانی بھی خود لے کر نہ پی سکوں۔''

''لیکن آپ کو ضرورت کیا ہے سر؟'' نورین نے نہایت نرم اور عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کے اس قسم کے کاموں کے لیے تو مجھے رکھا گیا ہے۔''

''ارے نہیں، بے وقوف لڑکی!'' شازیہ جلدی سے بولی۔ ''تمہیں ان کی چڑچڑاہٹ اور غصہ برداشت کرنے کے لیے رکھا گیا ہے، ورنہ گھر میں نوکروں کی کوئی کمی تھوڑا ہی ہے۔ صاحب کی جلی کٹی باتیں برداشت کرنے کے لیے جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اتنا ہی ان لوگوں کے لیے ان باتوں کو برداشت کرنا ذرا آسان ہوگا۔ ہر ایک کے حصے میں کچھ کم باتیں آئیں گی۔ اگر صاحب کی ساری باتیں کسی ایک کو برداشت کرنی پڑیں تو وہ بے چارہ صاحب سے پہلے مر جائے گا۔''

پھر اس نے بڑی ادا سے ایک ہاتھ کی انگلیاں ہلا کر دونوں کو خدا حافظ کہا اور باہر کی طرف چل دی۔ اس کی چال حشر خیز تھی۔ اس کے جاتے ہی گویا ساری خوبصورتی اور رونق کمرے سے رخصت ہو گئی تاہم ایک دلفریب اور ہلکی سی مہک باقی رہ گئی۔

''اس ڈریس میں آپ کی مسز بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔'' نورین نے تبصرہ کیا۔

''تم بھی اس قسم کے ڈریسز پہنا کرو نا..... خوبصورت لگنے لگ جاؤ گی۔'' جمال نے گویا بڑا قیمتی مشورہ دیا۔

''ہم جیسی لڑکیاں ایسے ڈریس کہاں افورڈ کر سکتی ہیں سر! ایسے ایک ڈریس کی قیمت میری دو مہینے کی تنخواہ سے زیادہ ہوگی..... اور تنخواہ بھی پرانی نہیں..... اب والی..... یعنی ڈبل.....!'' نورین نے ٹھنڈی سانس لی۔

''غم نہ کرو۔ میں تمہیں پیسے دے دوں گا، اس طرح کے دو چار ڈریسز لے لینا..... لیکن یہاں پہن کر مت آ جانا۔ شازیہ فوراً سمجھ جائے گی کہ میں نے پیسے دیے ہوں گے۔ وہ تمہیں گردن سے پکڑ لے گی۔'' جمال نے رازدارانہ سے انداز میں کہا۔ ''وہ ڈریسز تم شادی کے بعد صرف اپنے شوہر کے ساتھ پہن کر باہر جایا کرنا۔''

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ اس کی پیشانی پر شکنوں

میں اضافہ ہوگیا۔ ''لیکن لڑکے کہیں تمہیں دیکھ کر سیٹیاں نہ بجانے لگیں۔ تمہارا شوہر تو جیلیس ہوجائے گا۔ اس کا کسی سے جھگڑا نہ ہوجائے۔'' اس نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''ان میں جیلسی کا مادہ ہی نہیں ہے۔'' نورین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''وہ الٹا خوش ہوں گے اور شاید مجھ سے کہیں گے، اچھا..... اس کا مطلب ہے تم میں بھی تھوڑی بہت خوبصورتی موجود ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا، اس قسم کی باتیں کریں گے وہ۔''

''لیکن تم بتا رہی تھیں کہ تم میں جیلسی کا مادہ بہت زیادہ ہے؟ اس کا مطلب ہے تم تو اسے کسی عورت کے ساتھ دیکھ لو تو شاید گولی مار دو گی؟'' جمال نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔

''شاید نہیں..... یقیناً.....'' نورین نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اور تمہیں معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟'' جمال کا لہجہ اب بھی سرسری تھا۔

''محبت کرنے والوں کو نتیجے کی پروا کب ہوتی ہے۔'' نورین کے لہجے میں واقعی بے پروائی تھی۔

''واہ..... یہ تو اچھا خاصا فلمی ڈائیلاگ بول دیا تم نے۔'' جمال کے بھنچے ہوئے سے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری جسے نورین شاید محسوس بھی نہیں کر پائی۔

''فلمی ڈائیلاگ بھی انسانوں کے جذبات کی ترجمانی ہی کرتے ہیں سر!'' نورین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

جمال پہلو بدل کر بولا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ لڑکیاں اور عورتیں تو اسے بہت لفٹ دیتی ہیں، تمہاری موجودگی کی بھی پروا نہیں کرتیں۔ شادی کے بعد تم کس کس کو گولی مارتی پھرو گی؟''

''شاہ زمان نے وعدہ کیا ہے کہ شادی کے بعد وہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔'' نورین نے بتایا۔

''مردوں کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔'' جمال بولا۔

''سر جی! اعتبار تو عورتوں کے وعدوں کا بھی نہیں ہوتا۔'' نورین ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''بہرحال..... جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔''

کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ جمال اس دوران غیر محسوس طور پر کن انکھیوں سے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ نورین سر جھکا کر شاید کچھ سوچنے لگی تھی۔

جمال کو اس دوران بنگلے کی بغلی دیوار کے ساتھ لگے پام کے چند درختوں کے پیچھے صرف ایک لمحے کے لیے نارنجی لباس کی ایک جھلک نظر آئی۔ شاید کوئی بنگلے کے عقبی دروازے سے نکلا تھا اور لان کے ایسے حصے سے سرونٹ کوارٹرز کی طرف جا رہا تھا جو سارا کا سارا اس کھڑکی سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف پام کے چند درخت دکھائی دیتے تھے اور جانے والے نے انہی کی آڑ لے لی تھی مگر شاید ہوا کے جھونکے کی وجہ سے پودوں اور درختوں کے درمیان جمال کو نارنجی لباس کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ اسے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ جانے والا کہاں جا رہا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' جمال نے اچانک نورین کو مخاطب کیا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور شاید اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آ گئی۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پہلے جمال کی طرف، پھر وال کلاک کی طرف دیکھا اور معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی۔ ''اوہ..... آپ کو طاقت کا شربت دینے کا وقت ہوگیا۔''

''میں نے تمہیں شربت یاد دلانے کے لیے مخاطب نہیں کیا تھا۔ میں تو ویسے ہی، وقت گزاری کے لیے تم سے بات کرنے لگا تھا۔ زیادہ دیر خاموش رہ کر بھی بوریت ہونے لگتی ہے۔ اس گھر میں کوئی بھی نہیں ہے جس سے میں باتیں کر سکوں..... یا پھر یوں کہو کہ گھر میں جو لوگ ہیں، ان سے میرا بات کرنے کو جی نہیں چاہتا..... اور طاقت کے شربت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے معلوم ہے اب کسی بھی شربت سے میرے جسم میں کوئی طاقت نہیں آئے گی۔''

جمال کے لہجے میں اب پہلے جیسی چڑچڑاہٹ نہیں تھی۔

''سر! میں بتاؤں..... آپ وقت گزاری کے لیے کوئی مشغلہ اختیار کر لیں۔ کوئی ایسی ہابی جس میں آپ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے مصروف رہ سکیں۔'' نورین کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی جیسے وہ بڑی دور کی کوڑی لائی ہو یا اس نے بہت ہی دانشوری کی بات کی ہو۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اور کچھ نہیں تو آپ وہ پزل ہی حل کرنا شروع کر دیں جو اخباروں میں آتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں، اخباری معمے فراڈ ہوتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا ایک مرتبہ ہزار روپے کا انعام نکلا تھا اور پیسے میرے اکاؤنٹ میں آ بھی گئے تھے۔ آپ کو تو خیر پیسوں کی ضرورت نہیں، لیکن آپ ذہین آدمی ہیں، معمے حل کرنے میں ایک تو آپ کا وقت اچھا گزرے گا اور جب آپ کا حل صحیح نکلا کرے گا تو

آپ کو خوشی بھی ہوگی۔''

''ہاں..... یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔'' جمال نے تائید میں سر ہلایا۔ ''تم اکثر کوئی نہ کوئی اچھی اور کام کی بات کرتی ہو۔ اسی لیے مجھے تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ باتیں تو میں گھر کے کسی نوکر سے بھی کر سکتا ہوں اور جو کام تم کرتی ہو، وہ بھی گھر کا کوئی نوکر کر سکتا ہے لیکن مجھے ان سے بات کر کے کوفت ہوتی ہے اور میں ان سے اپنے کام بھی بس یونہی، مجبوری میں کراتا ہوں۔ سچ پوچھو تو میں نے تمہیں نرس سے زیادہ، اپنے ساتھ باتیں کرنے والی ایک ساتھی کے طور پر ملازم رکھا ہے۔ بوڑھا اور بیمار آدمی بہت تنہا ہو جاتا ہے۔ کوئی اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اگر کوئی بات کرتا بھی ہے، تو مجبوراً کرتا ہے۔''

''مجھے تو آپ کے ساتھ باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے.....'' نورین کی آنکھوں میں حقیقی دلچسپی کی چمک تھی۔ ''مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ باتیں کر کے بہت مزہ آتا ہے جنہوں نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہوتا ہے، جو عقل کی باتیں کرتے ہیں۔''

''شکر ہے تم نے مجھے عقل کی باتیں کرنے والوں میں شمار کیا.....'' جمال کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ورنہ میری بیوی کے خیال میں تو مجھ سے زیادہ احمق آدمی شاید اس دنیا میں آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔''

نورین نے ایک لمحے کے لیے سر جھکا لیا۔ شاید اس نے اس بات پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ جمال بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور ہاں..... وہ جو تم مشغلے کی بات کر رہی تھیں..... کسی زمانے میں نشانہ بازی میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میں اکثر ویران جگہوں پر جا کر نشانے بازی کی پریکٹس کیا کرتا تھا۔ بہت اچھا نشانہ تھا میرا..... اور کئی طرح کی گنیں تھیں میرے پاس..... اب تو بس یہ ایک پسٹل ہی رہ گیا ہے.....''

اس نے کہنی کے بل ذرا ترچھا ہو کر سائڈ ٹیبل کی دراز سے ایک خوبصورت، مگر خطرناک دکھائی دینے والا پستول نکالا۔ اسے آڑا ٹیڑھا کر کے دیکھا پھر متاسفانہ سے لہجے میں کہا۔ ''ایک مدت سے اس کی تو صفائی بھی نہیں ہوئی۔''

اس نے نورین کی طرف دیکھا۔ وہ غور سے پستول کو دیکھ رہی تھی۔ یکدم جمال کو جیسے کچھ خیال آیا۔ ''تم ایک کام کرو، یہ پستول شاہ زمان کے پاس لے جاؤ۔ اس سے کہنا، ذرا اس کی صفائی کر دے۔ وہ پہاڑی علاقے کا آدمی ہے۔ ہتھیاروں کے استعمال اور ان کی صفائی وغیرہ کے طریقوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوگا۔ میں یونہی، دل کی تسلی کے لیے اس پستول کو یہاں اپنے پاس رکھتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں، یہ صاف ستھری اور کارآمد حالت میں رہے.....''

اس نے پستول نورین کی طرف بڑھایا جس نے بلا جھجک اسے تھام لیا اور قدرے تجسس سے ذرا الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

''ذرا احتیاط سے لے کر جانا۔ اس کا لاک کھلا ہوا ہے۔'' جمال نے تاکید کی پھر گویا اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے ایک چابی نکال کر نورین کی طرف بڑھائی۔ ''اگر تمہیں شاہ زمان کے کوارٹر کا تالا بند ملے، تو خود ہی کھول لینا۔ تم اسے سرپرائز دینا۔''

نورین نے اثبات میں سر ہلایا اور پستول لے کر کمرے سے رخصت ہوگئی۔ چند لمحے بعد جمال نے کھڑکی کے ٹنٹڈ شیشے سے دیکھا، وہ پستول ہاتھ میں لیے لان پر بڑے اعتماد سے چلتی ہوئی شاہ زمان کے کوارٹر کی طرف جا رہی تھی۔ وہ چور راستے سے، درختوں کی آڑ لے کر، چھپ چھپا کر نہیں جا رہی تھی۔

جمال نے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور ایک طویل سانس لی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ بند آنکھوں سے بھی گویا کوئی منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے آنکھیں بند کیے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ جمال نے تب بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کی مسکراہٹ کچھ واضح ہوگئی۔ وہ سوچ رہا تھا، نورین کے ہاتھوں ہونے والا قتل کسی بھی اعتبار سے قتلِ عمد شمار نہیں ہوگا۔ یہ فوری اشتعال کے تحت سرزد ہونے والا قتل ہوگا جس کی سزا بہت کم ہوگی۔ جمال کو یہ بھی امید تھی کہ اسے جن بہترین وکیلوں کی خدمات حاصل رہتی تھیں، وہ نورین کو متوقع سزا سے بھی کم ہی سزا ہونے دیں گے۔ اس دوران وہ نورین کے گھر والوں کا بہت اچھی طرح خیال رکھے گا۔

جمال کو یہ بھی امید تھی کہ اسے اپنی زندگی میں شازیہ کی کوئی خاص کمی محسوس نہیں ہوگی۔ شازیہ نے ایسا کچھ کیا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی کمی محسوس کرتا۔ شازیہ تو صحیح طور پر اسے سمجھ بھی نہیں سکی تھی۔ وہ تو یہ بھی نہیں جان سکی تھی کہ اس کا شوہر بے وفائی کرنے والوں کو بہت سخت سزا دینے کے نظریے کا حامی تھا۔

⌘⌘⌘

حاصل زندگی

طاہر جاوید مغل

ایک دانا کے بقول "خوشی کو مشقت اور تکلیف میں راحت تلاش کرو... ضرور ملے گی" لیکن افسوس وہ تو نیند کو بغیر تھکن کے... ازدواجی خوشیوں کو بغیر ذمے داری اور اخلاقیات کے اور دولت کو بغیر محنت کے حاصل کرنا چاہتا تھا اور بھول گیا کہ جب یہ سب کچھ خواہش کے مطابق مل جائے تو بھی یہ قدرت کا بہت بڑا امتحان ہوتا ہے۔

سب کچھ پا کر بھی بے چین رہنے والے ہوشیار لوگوں کی اذیت

ملتان روڈ پر سفر کرتے ہوئے ساہیوال سے آگے جائیں تو میاں چنوں سے کچھ پہلے ایک سڑک بائیں جانب مڑتی ہے۔ اس ذیلی سڑک پر سفر کر کے دس بارہ کلومیٹر دور ایک پُرفضا گاؤں نوروال آتا ہے۔ وہ نوروال کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ اگست کا مہینا تھا۔ کئی دن کی بارش کے بعد آج نرم چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ وارث احمد ملتان روڈ سے دو تین سواریاں بدل کر یہاں پہنچا تھا۔ آخری سواری ایک خستہ حال تانگا تھی۔ نیم پختہ راستے پر تانگے کے ہچکولوں نے پچپن سالہ وارث احمد کے بدن کی چولیں ڈھیلی کر دی تھیں۔

تانگے پر سے اترنے سے پہلے ہی وارث احمد نے مرشد سرکار کا آستانہ دیکھ لیا۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تھی۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک رہائشی عمارت تھی جس پر دو تین

جھنڈے لہرا رہے تھے۔ عمارت کی دیواروں پر قرآنی آیات اور تصوف سے متعلق شعر وغیرہ بھی لکھے تھے۔ یہی مرشد سرکار کا آستانہ تھا۔ ان سے ملنے کے لیے کئی عقیدت مند یہاں پہنچے ہوئے تھے۔ جو دور سے آئے تھے، ان کی گاڑیاں اور دیگر سواریاں بھی موجود تھیں۔ وارث احمد کا رجحان پیری مریدی کی طرف تو نہیں تھا مگر ایک خاص بات تھی جو اسے لاہور سے چلا کر یہاں لے آئی تھی۔ اس نے ایک روحانی میگزین میں مرشد سرکار کی کہی ہوئی کچھ باتیں پڑھی تھیں۔ ان میں سے ایک بات نے وارث احمد کو بے طرح متاثر کیا تھا۔ وہ بات اس کے ذہن میں جیسے کھب کر رہ گئی تھی۔ مرشد جی نے کہا تھا۔ ''خوشی کو مشقت اور تکلیف میں تلاش کرو، یہ وہیں سے ملے گی۔ ضرور ملے گی۔ جتنی زیادہ خوشی چاہتے ہو اتنی زیادہ تکلیف جھیلنے کے لیے تیار رہو۔''

سائلین کی تعداد زیادہ تھی۔ وارث احمد کی باری شام سے کچھ ہی دیر پہلے آئی۔ وہ ایک خدمت گار کے اشارے پر اٹھا اور حجرے میں داخل ہو گیا۔ مرشد سرکار چٹائی پر بیٹھے تھے اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ حجرے میں آرام و آسائش کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ یہاں تک کے تکیہ یا گدا بھی نہیں تھا جس سے ٹیک لگائی جا سکتی۔ پرانے طرز کی ایک لالٹین نے حجرے میں مدھم روشنی کر رکھی تھی۔

وارث احمد نے اپنی موٹے شیشوں کی عینک کے اندر سے دیکھا۔ مرشد جی ہڈیوں کا ڈھانچا تھے۔ عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ تاہم لمبی سفید ڈاڑھی، کندھوں تک جاتے ہوئے سفید براق بال اور گھنی سفید بھویں اس امر کی نشانیاں تھیں کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں ہیں۔ ان کے چہرے پر جھریوں کا جال سا تھا۔ کھدر کے سفیدی مائل کپڑوں کی طرح سر پر بھی بڑے سائز کا سفید رومال (صافہ) تھا جو ان کے چہرے کی دونوں جانب جھول رہا تھا۔

ادب سے سلام پیش کر کے وارث احمد دوزانو بیٹھ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا جب مرشد سرکار نے بڑے شائستہ انداز میں ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے روک دیا۔ ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح گردش کر رہی تھی۔ یقیناً وہ کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

قریباً دو منٹ بعد انہوں نے اپنی گھنی بھوؤں کی اوٹ سے وارث کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی بوجھل آواز میں پوچھا۔ ''کیسے آئے ہو؟''

''مرشد سرکار! آپ سے ایک سوال پوچھنے کی حسرت لے کر لاہور سے یہاں پہنچا ہوں۔''

''صرف ایک سوال کے لیے اتنی دور سے چلے آئے ہو؟''

''وہ سوال میرے لیے بڑا اہم ہے مرشد سرکار..... میری پوری زندگی اس ایک سوال سے جڑی ہوئی ہے..... اس کا جواب مل جائے تو میرے مرنے سے پہلے میری زندگی کا معما حل ہو جائے۔''

''سوال اہم ہے تو پھر جواب بھی تفصیل سے چاہیے ہوگا۔ اب تو دس پندرہ منٹ میں مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔''

''ٹھیک ہے مرشد سرکار! میں یہاں قیام کر لیتا ہوں۔ ویسے بھی اب رات ہونے والی ہے۔''

وہ چھت سے جھولنے والی ایک زنجیر کا سہارا لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''کل صبح سے پھر لوگوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ تم کل کا دن بھی رک جاؤ یا پھر..... صبح جلدی اٹھ جاؤ تہجد کے وقت۔ فجر کی نماز کے بعد میں اطمینان سے تمہاری بات سن سکوں گا۔''

''جو حکم مرشد سرکار!'' وارث احمد نے ادب سے جھک کر کہا اور الٹے پاؤں چلتا حجرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

آستانے کے قریب ہی چھوٹا سا لنگر خانہ تھا۔ کچھ دکانیں تھیں اور کچھ رہائشی مکانات بھی تھے۔ ان گھروں کے مالکان دور سے آئے ہوئے عقیدت مندوں کو بلا معاوضہ اپنے گھروں میں ٹھہرا بھی لیتے تھے۔ ایسے ہی ایک گھر میں وارث احمد نے قیام کر لیا اور شدت سے، رات گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے مرشد سرکار کے حوالے سے جو کچھ سنا تھا، انہیں ویسا ہی پایا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ غیر معمولی حد تک سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ سخت بستر پر سونا، گرمی سردی میں صرف کھدر کا جوڑا پہننا اور پورے دن میں کھانے کے فقط چار پانچ نوالے لینا ان کا معمول تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ جوانی میں کہیں انہوں نے شادی کی ہوگی مگر اب بیس پچیس سال سے وہ بالکل مجرد زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی باتوں اور ان کی دعاؤں میں بہت اثر تھا۔ کئی بہت پڑھے لکھے اور صاحب حیثیت لوگ ان کے مریدین میں شامل تھے۔ وہ خود دمے کے دائمی مریض تھے مگر ان کی دعاؤں سے بے شمار لاعلاج مریضوں نے شفا پائی تھی۔

وارث احمد نے خود کو خوش قسمت تصور کیا کہ مرشد سرکار نے اسے خصوصی اہمیت دی ہے اور تفصیل سے ملاقات کا وقت عنایت کیا ہے۔ عرصے بعد وارث احمد نے بھی تہجد پڑھی اور پھر مسجد میں فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔

اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ نماز کی امامت مرشد سرکار نے نہیں کی۔ وہ اتنے نحیف ہو چکے تھے کہ کرسی پر بھی... بہ مشکل نماز ادا کر پاتے تھے۔

فجر کے فوراً بعد حجرے کی خوشبودار خاموشی میں لالٹین کی زرد روشنی تھی۔ مرشد سرکار نے حسبِ سابق دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ وارث احمد سر جھکائے دوزانو بیٹھا تھا اور مدھم لہجے میں اپنی کتھا سنا رہا تھا۔

''..... مرشد سرکار! لاہور میں میرا پانچ مرلے کا گھر ہے۔ میں وہاں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے میں گورنمنٹ جاب سے بطور آفیسر ریٹائر ہوا ہوں۔ پچھلے پچیس تیس سال سے زندگی کی گاڑی جیسے تیسے چلتی رہی ہے..... لیکن مرشد سرکار! میں ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ شاید آپ نے ملتان کے کرمانہ خاندان کا نام سنا ہو؟''

وارث احمد نے ذرا توقف کر کے مرشد سرکار کے جواب کا انتظار کیا۔ اس نے اپنا سر بدستور مؤدب انداز میں جھکا رکھا تھا۔

''ہاں، سنا ہے..... تم بولتے رہو۔'' مرشد سرکار کی بھرائی ہوئی مگر ٹھہری ہوئی آواز اس کے کانوں کے پردوں کو مرتعش کر گئی۔

وارث احمد نے کہا۔ ''مرشد سرکار! میں کرمانہ فیملی کا فرد ہوں۔ والدہ میرے لڑکپن میں فوت ہو گئی تھی۔ والد احتشام الدین کرمانہ کی وفات کے بعد ہم دو بھائی وارث اور طائل احمد تھے۔ طائل مجھ سے بڑا تھا۔ ہم دونوں منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے تھے، تاہم میری اور طائل کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہم دونوں ہی اس عالیشان حویلی میں اور اس کی ہر چیز میں برابر کے حصے دار تھے، جو قریباً تین ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی طرح ساٹھ مربع زرعی زمین بھی ہم دونوں ہی کی ملکیت تھی۔ گاڑیاں تھیں، نوکر چاکر تھے، پیسا اتنا تھا کہ حساب کرنا مشکل تھا لیکن مرشد سرکار! مجھے بچپن سے ہی یہ سب کچھ اپنے گلے کے طوق کی طرح لگتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس پیسے پر اور اس کی شان و شوکت پر میرا حق نہیں ہے۔ یہ انگریزوں کی بخشی ہوئی جائداد ہے، جس کا کچھ حصہ نسل در نسل چل کر ہم تک پہنچا ہے اور یہ ہمارے مزارعوں کا خون پسینا ہے جو ہم اپنی تجوریوں میں بھرتے ہیں۔ مرشد! میں اپنے زورِ بازو پر اپنی زندگی گزارنا چاہتا تھا..... اپنی دنیا خود پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایسی دنیا جس میں چاہے کرمانہ خاندان والی جاہ و حشمت نہ ہو لیکن وہ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہو۔ بھائی طائل کے خیالات بالکل برعکس تھے۔ وہ اس شان و شوکت اور آسائش کو اپنا جدی حق سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ محنت مشقت ہمارا میدان نہیں ہے۔ جب اوپر والے نے ہمیں یہ سب کچھ دیا ہے تو پھر اپنی زندگی کو سہل اور پُرآسائش نہ بنانا ہماری بدترین حماقت ہے۔

''میرے اور بھائی کے درمیان لمبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ کسی وقت تو میں بھائی سے جھگڑ پڑتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ محنت اور تکلیف کے بغیر خوشی اور آسائش کا حصول ممکن نہیں ہے اور اگر ایسی خوشی اور ایسی آسائش حاصل کی جائے تو وہ بہت جلد بدترین مصیبت میں بدل جاتی ہے۔ بالکل..... بالکل وہی بات مرشد سائیں! جو آپ کہتے ہیں..... جو آپ سمجھاتے ہیں۔ خوشی کو تکلیف میں تلاش کرو۔ یہ وہیں سے ملے گی، ضرور ملے گی۔''

وارث احمد نے چند لمحے توقف کیا۔ آخرِ شب کی پاک ملگجی خاموشی میں تسبیح کے دانوں کی مدھم ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مرشد سرکار! میرے اور بھائی کے درمیان ایسی ہی ایک تکرار کے دوران میں میرے اندر کا کرب انتہا کو چھو گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں وہی کروں گا جو میں چاہوں گا۔ میں کرمانے کی عالیشان حویلی کو خیرآباد کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔

''سرکار! میں نے گریجویشن کیا ہوا تھا، میں لاہور چلا گیا..... مجھے نوکری کی تلاش تھی۔ میں نے اپنے خاندان کا حوالہ دیا اور نہ ہی کوئی ''لنک'' استعمال کیا، اپنے طور پر کوشش کر کے میں نے محکمۂ صحت میں کلرک کی ملازمت حاصل کر لی۔ میں اپنے زورِ بازو پر آگے بڑھنا چاہتا تھا اور میں بڑھتا رہا۔ مجھ میں جتنی ہمت تھی، میں اس کے مطابق بلکہ اس سے بڑھ کر کوشش کرتا رہا۔ میں نے پھر کبھی ملتان اور کرمانے حویلی کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔''

یہاں پہنچ کر وارث نے چند لمحے توقف کیا پھر مؤدب لہجے میں بولا۔ ''مرشد سرکار! میں آپ سے جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ اپنے اندر کے وہ خیالات بھی آپ پر ظاہر کروں گا جن کو میں کسی بھی اور کے سامنے شاید کبھی بیان نہ کر سکوں۔ آپ کی مہربان ذات سے امید رکھتا ہوں کہ اس جرأت کے لیے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔''

مرشد سرکار نے بدستور ملائم آہنگ میں کہا۔ ''بولتے رہو وارث احمد۔''

وارث نے اپنی نظر کی عینک اتار کر اپنی آنکھوں میں

آئی ہوئی نمی کو پونچھا اور دوبارہ عینک کو اس کی جگہ پر ٹکا کر بولا۔ ''مرشد سرکار! مجھے اعتراف ہے کہ اپنے خاندان کے دوسرے مردوں کی طرح میں بھی حسن پرست تھا۔ تاہم میری حسن پرستی میں کسی طرح کی بے راہ روی کو دخل نہیں تھا۔ ایک چہرہ میرے دل کو بہت بھاتا تھا۔ یہ میری ایک دور کی کزن ہالہ شاہنواز تھی۔ اس کا والد کراچی کا ایک خوش حال تاجر تھا۔ میں ہالہ کو پسند کرتا تھا۔ اس کو محبت یا عشق تو نہیں کہا جاسکتا، ہاں یہ ضرور تھا کہ اپنی دلہن کا تصور جب بھی ذہن میں آتا تھا، ہالہ کا تصور بھی آجاتا تھا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال میرے بھائی طائل کی طرف بھی تھی۔ وہ بھی ہالہ کی پُرکشش شخصیت میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ہالہ میری طرح گریجویٹ تھی جبکہ بھائی طائل صرف میٹرک پاس تھا۔ ویسے بھی اس کی عمر ہالہ سے قریباً دس سال زیادہ تھی۔ میرے اور بھائی کی عمر میں بھی کم وبیش دس سال کا ہی فرق ہے۔ بہرحال جب میں کرمانے حویلی چھوڑ کر لاہور آگیا اور اپنی زندگی خود بنانے کی تگ ودو میں لگ گیا تو بھی ہالہ کا خیال میرے دل ودماغ میں شدت سے موجود رہا۔ مجھے امید تھی کہ اپنی انتھک کوشش سے میں اپنا مقام بنالوں گا اور ایک دن ہالہ کو حاصل بھی کرلوں گا..... لیکن مرشد سرکار..... بہت سی دوسری خواہشوں کی طرح یہ خواہش بھی بس خواہش ہی رہ گئی۔ ایک روز ایک چھوٹی سی اخباری خبر کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ کرمانہ خاندان کے چشم وچراغ طائل کرمانہ کی شادی ان کے اپنے ہی خاندان میں دھوم دھام سے ہوئی ہے..... ملتان میں ہونے والی یہ ایک یادگار تقریب تھی۔ طائل کی دلہن ہالہ شاہنواز ہی تھی۔

''اس واقعے کے بعد دو تین ماہ تک میں دکھ اور پریشانی کا شکار رہا مگر تب ایک بار پھر اپنی زندگی کو ڈگر پر لے آیا۔ اپنے فلسفۂ حیات پر میرا پختہ یقین تھا اور میں اپنی زندگی اس کے مطابق ہی گزارنا چاہتا تھا۔ میں اب سینئر کلرک بن چکا تھا۔ میں نے اپنی جاب کے علاوہ ایک لاہوری دوست کے ساتھ مل کر گارمنٹس کا چھوٹا سا کام بھی کرلیا۔ اس میں فائدہ ہوا اور میں اپنا ذاتی گھر بنانے میں کامیاب ہوگیا..... ہالہ تو میری زندگی سے نکل ہی چکی تھی، اب وقت کے پہیے کو آگے بڑھانا تھا اور زندگی کو رواں رکھنا تھا۔ اپنے ہی آفس میں کام کرنے والی ایک قبول صورت لڑکی زیتون سے میں نے شادی کرلی۔ وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ وہ گھر گرہستی کے تقاضے سمجھتی تھی اور میری مالی استطاعت سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ کسی وقت ہالہ کی یاد تو آتی تھی مگر ایسے ہی جیسے بادلوں میں ایک روشن لکیر سی چمک کر غائب ہوجائے..... پھر یہ روشن لکیر مزید مدھم ہوتی گئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہمارے تین بچے ہوئے۔ دو بیٹیاں اور پھر ایک بیٹا۔

''بیٹا فائز جب پانچ چھ سال کا تھا تو پتا چلا کہ اس کے دل میں سوراخ ہے۔ بیٹے کی اس تکلیف نے ہمیں تین چار سال تک شدید کرب میں مبتلا رکھا۔ دکان ختم ہوگئی اور معاشی حالات مزید خراب ہوگئے۔ بالآخر آپریشن کے بعد وہ صحت یاب ہوا مگر تب تک بڑی بیٹی کی پریشانی نے گھیرلیا۔ ہم نے اس کی منگنی کی تھی اور اس کے سسرال والے اچانک ہی شادی کا پرزور تقاضا کرنے لگے..... تھے۔ میں اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لیے ایک بار پھر اپنی سی کوششوں میں لگ گیا۔ میں نے ٹیوشنز بھی پڑھائیں۔ میڈیکل اسٹورز پر پارٹ ٹائم جاب بھی کیے لیکن حلال روزی کے قصد سے پیچھے نہیں ہٹا۔ بالآخر کوششیں رنگ لائیں اور اللہ کی مہربانی سے بیٹی اپنے گھر کی ہوگئی۔ وہ خوشی اور راحت کا ایک چھوٹا سا دورانیہ تھا لیکن مرشد سرکار! وہ کیا شعر ہے کہ..... ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو..... میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا۔

''اب چھوٹی بیٹی کی شادی کا وقت ہوگیا تھا۔ بیٹے فائز کے تعلیمی اخراجات، الگ دل ودماغ کا بوجھ تھے۔ ان حالات میں میری صابر وشاکر بیوی زیتون نے بھی کمر کسی اور ایک پرائیویٹ جاب کرنے لگی۔ میں کئی مرتبہ روزانہ بارہ گھنٹے تک کام کرتا تھا۔ اس سے میری بینائی پر فرق پڑا۔ پھر ایک روز اچانک آنکھوں کے سامنے بھنور سے ناچنے لگے۔ سر میں سخت درد بھی ہوتا تھا۔ ڈاکٹرز کو دکھایا تو انہوں نے کالے موتیے کی طرح کا ایک مرض بتایا۔ آنکھ کی پتلیوں کا اندرونی پریشر بہت بڑھ جاتا تھا۔ نظر ختم ہونے کا شدید اندیشہ تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ فی زمانہ علاج کتنے مہنگے ہیں۔ جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی، دو تین ماہ میں ختم ہوگئی۔ ان دنوں کچھ ایسے مواقع بھی آئے جب ہم نے فاقے کیے یا پھر نمک مرچ کے ساتھ روٹی کھائی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ مشکل وقت بھی آخر گزر گیا۔ میری آنکھوں کا ایک آپریشن ہوا اور بیماری ایک جگہ پر رک گئی۔ انہی دنوں میری دوسری بیٹی بھی اپنے گھر کی ہوئی۔ اس سال بیٹے فائز نے کمپیوٹر سافٹ ویئر کی تعلیم مکمل کی۔ اسے اسلام آباد میں ایک مناسب جاب مل گئی۔ تین چار سال پہلے ہم نے اس کی شادی کردی۔ اب وہ ایک مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔ اپنی بیوی اور دو بچوں کے

ساتھ اسلام آباد میں مقیم ہے۔ ہم میاں بیوی لاہور میں اپنے پانچ مرلے کے گھر میں رہتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ابھی تک صحت دے رکھی ہے، اپنی زندگی کی گاڑی خود کھینچنے کے قابل ہیں۔ تاہم کبھی کبھی سوچتا ہوں، اس عمر میں بھی اپنی روزی اپنے ہاتھوں سے کمانا پڑتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر رہا ہوں۔ صبح کا نکلا کبھی کبھی رات نو دس بجے گھر پہنچتا ہوں۔ میری بیوی نے اب بھی کچن سنبھال رکھا ہے اور گھر کے دیگر کام کرتی ہے..... ایسے وقت میں، میں اپنا موازنہ طائل بھائی سے کرتا ہوں مرشد سرکار..... میں سخت محنت مشقت والی زندگی گزار کر وہ حاصل نہ کر سکا جو طائل بھائی نے فراغت اور بے عملی کی زندگی گزار کر حاصل کیا۔ ان کی اور میری روداد حیات میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اب بھی ہے۔"

مرشد سرکار نے ایک طویل ہنکارا بھرا اور کسی سوچ میں کھو گئے۔ حجرے کی واحد کھڑکی سے باہر اب رات کا اندھیرا بتدریج اجالے میں بدل رہا تھا۔ پرندوں کی مدھم چہچہاہٹ اندر تک پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو کم کر دی اور وارث احمد کی طرف دیکھ کر بولے۔

"تم دوبارہ کبھی کرمانے حویلی میں نہیں گئے؟"

"نہیں سرکار! کرمانے حویلی تو دور کی بات ہے، میں کبھی ملتان کی حدود میں بھی داخل نہیں ہوا۔ میں اپنا ہر تعلق توڑ کر وہاں سے نکلا تھا اور جب ہالہ بھی بیاہ کر حویلی کی زینت بن گئی تو میں نے قسم کھالی کہ اب کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔ کرمانہ فیملی میں اب تک کسی کو پتا نہیں چل سکا کہ میں کہاں اور کس حال میں ہوں۔ صرف ایک بار..... ایسا ہوا کہ میرے بچپن کے ایک دوست افضال احمد نے مجھے میرے آفس سے باہر نکلتے دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ یہ آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے۔ افضال احمد کو مجھ پر اور مجھے اس پر پورا بھروسا تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا، اس نے بھی مجھ سے عہد کیا کہ وہ میرے راز کو ہمیشہ راز رکھے گا..... مرتے دم تک ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہیں لائے گا۔ کبھی کبھار افضال کے ذریعے ہی مجھے حویلی کے حالات معلوم ہوتے رہے ہیں اور عیش و عشرت کی وہ داستانیں مجھ تک پہنچتی رہی ہیں جن کا مرکزی کردار بھائی طائل رہے ہیں۔"

مرشد سرکار نے کہا۔ "میں تم سے ان داستانوں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا کیونکہ تمہاری باتوں سے مجھے کافی کچھ اندازہ ہو گیا ہے..... بہرحال طائل اب کہاں ہے؟"

"میری اطلاعات کے مطابق پچھلے چودہ پندرہ سال سے وہ بیرونِ ملک ہے۔ کینیڈا میں بھی ہماری کچھ پراپرٹی موجود ہے۔ اپنی بیوی کے گزرنے کے بعد سے وہ وہیں پر ہے۔"

"بیوی سے تمہاری مراد وہ لڑکی ہالہ ہے؟"

"جی سرکار! کوئی بیس سال پہلے اس کی وفات ہو گئی تھی، چالیس سے کچھ ہی اوپر ہو گی اس کی عمر۔ اسے بھی شوہر کی عیاشیوں اور من مانیوں نے ہی اتنی جلدی آخری منزل تک پہنچا دیا۔ اس..... سے طائل کے دو بچے پیدا ہوئے تھے، دونوں ہی کم سنی میں فوت ہو گئے۔ ویسے تو ہالہ کی موجودگی میں بھی بھائی طائل کو اپنی راتیں رنگین رکھنے میں کوئی جھجک نہیں تھی مگر اس کے بعد تو وہ ہر من مانی کے لیے آزاد تھا۔ کرمانے حویلی میں شراب و شباب کی محفلیں بڑے تواتر سے جمتی رہی ہیں۔ طائل بھائی نے اپنی زندگی میں وہ سب کچھ حاصل کیا جو وہ چاہتا تھا بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر۔ ہالہ ابھی زندہ ہی تھی جب طائل بھائی اپنے ایک منیجر کی حسین و جمیل لڑکی زلفت پر بے طرح فدا ہو گیا تھا۔ وہ شادی شدہ تھی مگر بھائی طائل شکست کھانا نہیں جانتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اسے اپنے عقد میں لا کر ہی رہا۔ اب وہ زلفت بھی اس کے ساتھ ہی کینیڈا میں ہے۔ میرے دوست افضال کے ایک عزیز نے اسے دو تین سال پہلے اوٹاوا میں دیکھا تھا..... اوٹاوا، کینیڈا کا ایک بڑا شہر ہے۔"

مرشد سرکار سر کو جھکا کر کچھ دیر گہرے مراقبے میں رہے۔ وہ مشت استخواں تھے مگر حرکات و سکنات میں ایک روحانی توانائی تھی۔ اپنی بھرائی ہوئی گمبھیر آواز میں بولے۔

"وارث کرمانہ! کیا تم اپنا سوال دہرانا پسند کرو گے؟"

وارث نے ناک پر اپنی عینک درست کی اور دوزانو بیٹھے بیٹھے بڑے عجز سے کہا۔ "مرشد سرکار! سوال تو وہی ہے جو آپ کے فرمان سے نکلتا ہے۔ خوشی کو مشقت اور تکلیف میں تلاش کرو، یہ وہیں سے ملے گی..... مرشد سرکار! میں نے کبھی آپ کا فرمان نہیں سنا تھا مگر میری ساری زندگی اسی فرمان کے تحت گزری ہے۔ مشقت، تکلیف اور دکھ..... لیکن مجھے خوشی نہیں ملی اور اگر کبھی ملی بھی تو ایسے جیسے سمندر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ جو دیکھتے ہی دیکھتے آلام کی لہروں میں گم ہو گیا۔ میرے بھائی طائل کی زندگی بالکل برعکس رہی۔ وہاں خوشیوں کا سمندر تھا اور دکھ کے کسی چھوٹے سے جزیرے نے پانیوں سے سر نکالا بھی تو معدودے چند لمحوں کے لیے، پھر شادمانی کی لہروں نے اسے ڈھانپ لیا۔ ایسا کیوں ہوا مرشد سرکار؟ یہ جگ بیتی نہیں ہے۔ میں اپنی آپ

بیتی بیان کر رہا ہوں۔ ہڈ بیتی سنا رہا ہوں..... آپ کا فرمان سنے بغیر میں اس پر یقین رکھتا تھا۔ یہ یقین میری اپنی ذات کے اندر سے اٹھتا تھا مگر اس یقین نے مجھے کیا دیا ہے مرشد سرکار؟" وارث چپ ہو گیا۔ اس کی جھکی ہوئی پلکوں پر دو آنسو اٹکے ہوئے تھے۔

ایک لمبے توقف کے بعد مرشد سرکار نے اپنا استخوانی ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر کھدر کا سفید رومال درست کیا۔ ایک نظر وارث کو دیکھ کر بولے۔ "بہت ناشکرے ہو وارث احمد..... بہت ناشکرے ہو۔"

وارث سرتاپا کانپ گیا۔

وہ بولے۔ "جو فرد بھی یہ کہتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں صرف دکھ ہی دیکھے، ایک سو ایک فیصد غلط کہتا ہے۔ قدرت کے پاس ایک بہت حساس ترازو ہے۔ کوئی بھی ذی نفس جب اپنی زندگی مکمل کرتا ہے تو قدرت کے ترازو میں اس کی خوشیوں اور دکھوں کا وزن برابر ہوتا ہے۔ وزن کے چھوٹے سے چھوٹے اور حقیر سے حقیر پیمانے کے مطابق بھی یہ برابری موجود ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس الوہی مساوات کا شعور نہیں رکھتے۔ خوشی اور راحت کا تعلق دل سے ہوتا ہے، اسباب سے نہیں۔ ایک مثال دیتا ہوں تمہیں۔ تمہارے بھائی نے اپنی من پسند کزن سے شادی کی۔ اس شادی کے علاوہ بھی وہ راجا اندر کی طرح خوش اندام و خوبرو عورتوں کے جھرمٹ میں رہا..... یہ ظاہری اسباب ہیں، یہ خوشی نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ اپنی عام شکل کی مگر محبت کرنے والی بیوی کے پہلو میں تمہاری گزاری ہوئی ایک رات، تمہارے بھائی کی ان گنت رنگین راتوں سے زیادہ خوش کن اور راحت افزا ہو۔"

وارث احمد ذرا چونک کر مرشد سرکار کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بولے۔ "تم ناشکری کر رہے ہو وارث کرمانہ..... تمہارے بھائی نے اپنے سامنے وسیع دسترخوان بچھائے اور اپنی لذت کام و دہن کے انصرام میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر تنگدستی اور غربت کے دنوں میں تم نے شدید بھوک کے عالم میں جو روٹی نمک مرچ لگا کر کھائی، اس کی لذت ان دسترخوانوں کے سامنے ہیچ ہے، مجھے یقین ہے وہ ہیچ ہے۔ تم ناشکری کر رہے ہو وارث کرمانہ۔"

وہ پھر چونک کر مرشد کی طرف دیکھنے لگا۔

انہوں نے بات جاری رکھی۔ "تم تھکن سے چور ہو کر سو گئے۔ تم نے راحت اور سکون کے وہ سپنے دیکھے جنہوں نے تمہاری روح کو بالیدگی دی۔ دوسری طرف ممکن ہے کہ تمہارا بھائی راتوں کے آخری پہر تک اپنے آرام دہ بیڈ روم میں کانٹوں کے بستر پر لوٹتا رہا ہو۔ میں پھر کہوں گا، تم ناشکری کر رہے ہو وارث کرمانہ۔"

وارث نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔ جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔

"وارث احمد! خوشی کو ظاہری حالات اور واقعات کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ تم نے اپنے بیٹے کی بیماری سے جنگ کی..... تم نے اس کے لیے شفا پائی، بے نظیر خوشی پائی، جو شفا اور بے نظیر خوشی تمہیں پچاس ساٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے مل گئی، وہ کوئی دولت مند مہنگے علاج پر پچاس ساٹھ لاکھ خرچ کر کے حاصل کر پاتا۔ دولت بھی خوشی کا کوئی پیمانہ نہیں ہے وارث کرمانہ..... تم ناشکری کر رہے ہو۔"

وارث احمد کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک دھندلی چھاننا شروع ہو گئی تھی۔

مرشد سرکار اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں تسبیح کو گردش دیتے رہے۔ سر جھکائے بیٹھے رہے اور جیسے انسانی نگاہ سے آگے کی چیزیں دیکھتے رہے۔ حجرے میں روشنی کچھ بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے لالٹین بجھا دی۔ ان کے ہاتھ پر جھریاں تھیں اور ایک ایک ہڈی نمایاں نظر آتی تھی۔ یہ مجاہدے، سخت کوشی اور فاقہ کشی کی علامتیں تھیں۔ انہوں نے وارث کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب تمہیں اس طائل کا تھوڑا سا حال بھی بتاؤں؟"

"طائل..... طائل..... آپ طائل بھائی کو جانتے ہیں؟"

"کچھ کچھ..... کرمانے حویلی کے کچھ لوگ میرے پاس آتے رہتے ہیں۔" مرشد سرکار نے انکشاف کیا۔

وارث احمد ہمہ تن گوش تھا..... کئی سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بس ہاتھ باندھے سر نہوڑائے بیٹھا تھا۔

وہ بولے۔ "جو کچھ نظر آتا ہے، وہ ہمیشہ ہوتا نہیں ہے۔ میں طائل کرمانہ سے ملا ہوں، میں نے اس کی روح کے اندر جھانکا ہے، بہت گہرائی تک۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ شادی کے بعد دو سال کے اندر ہی خوش شکل بیوی ہالہ کی طرف اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ وہ وسیع و عریض کرمانے حویلی کے ایک کمرے میں کسی بیکار چیز کی طرح پڑی رہتی تھی۔"

"مم..... مجھے نہیں پتا مرشد سرکار..... میرے دوست افضال نے مجھے کبھی کوئی ایسی بات نہیں بتائی۔ ویسے بھی حویلی کے اندر کی باتیں باہر کم ہی نکلتی ہیں۔"

مرشد جی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تمہیں پتا ہی ہوگا تمہارے والد کی وفات کے بعد طائل احمد کھل کھیلنے کے لیے آزاد ہوگیا تھا۔ حویلی کے اندر بہت سی جوان اور خوبصورت ملازمائیں رکھی گئی تھیں۔ آئے دن شہر سے خوبرو طوائفوں کو بھی موج میلے کے لیے بلایا جاتا تھا۔''

وارث احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہارے بھائی نے خود کو عیش و عشرت میں غرق کردیا۔ وہ ہر وقت صنفِ نازک کے حصار میں رہنے لگا تھا۔ نت نئی عورتوں کا حصول اس کے لیے اتنا آسان تھا کہ اس کی ہر شب نئے ڈھنگ سے گزرتی تھی۔ تم جانتے ہی ہو، کسی بھی چیز کی زیادتی اور فراوانی اس کی قدر کو کم کردیتی ہے..... کم کرتی چلی جاتی ہے۔ تین چار برس تک ہمہ وقت عورتوں کے نرغے میں رہنے کے بعد یکا یک طائل احمد کا دل بھر گیا۔ خوبرو لڑکیاں اس کی دسترس میں تھیں۔ ہر وقت اس کے ایک اشارے کی منتظر رہتی تھیں مگر اسے ان میں کوئی رغبت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ انسان اپنی فطرت میں بے حد کج رو اور ناقابلِ فہم بھی ہے۔ جو نہیں ملتا اسی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی سفلی خواہشات کی آبیاری کے لیے غیر ملکی عورتوں کا حصول شروع کردیا۔ کوئی تھائی لینڈ سے آئی، تو کوئی انگلینڈ سے..... کسی وقت وہ خود بھی بیرونی دورے پر نکل گیا۔ پھر یہ مشغلہ بھی دلچسپی اور لذت کھونے لگا۔ عورتیں اسے گوشت کے بے جان لوتھڑوں کی طرح لگتیں جو اس کے اردگرد بکھرے رہتے تھے۔ مگر اسی دوران میں اس پر انکشاف ہوا کہ ایک ناقابلِ حصول چیز اس کی عالیشان حویلی کے اندر ہی موجود تھی۔ یہ اس کے ادھیڑ عمر منیجر صداقت علی کی بیٹی زلفت تھی۔ بہت حسین و جمیل اور خوش اندام، مگر وہ شادی شدہ تھی۔ وہ اس کی پہنچ سے دور تھی اور جتنی دور تھی، اتنی ہی اس کی طلب طائل احمد کے اندر بڑھتی جارہی تھی۔ قدرت اسی طرح مادر پدر آزاد لوگوں کو اپنے اختیار کے شکنجے میں کستی ہے۔ سب کچھ موجود ہوتے ہوئے بھی ان کے لیے کچھ موجود نہیں ہوتا۔ طائل احمد، زلفت سے قریباً بیس سال بڑا تھا پھر بھی وہ اس کی طلب میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔ وہ طلب جسے وہ اپنے تئیں عشق کہتا تھا۔ اپنے اردگرد حسن و شباب کے سارے جمگھٹے اس کے لیے مستقل طور پر بیکار ہوگئے۔ وہ غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ زلفت کا خاوند کرمانہ فیملی کے وفادار ملازموں میں سے تھا۔ اس کی ذمے داری باغات کی پیداوار سے متعلق تھی۔''

دادوں کا پردادا درخت

مغربی افریقا کے تپتے صحراؤں میں انتہائی سنسان اور غیر آباد علاقے میں صنوبر کا ایک ایسا قوی الجثہ درخت پایا جاتا ہے جو 130 فٹ اونچا ہے جبکہ اس کا قطر 65 فٹ ہے۔ اس درخت پر گزشتہ 4000 سال سے باقاعدہ نئے پتے نکلتے ہیں اور یہ سال بھر ہرا بھرا رہتا ہے۔

خاندان

ایک دن استاد نے شاگرد سے پوچھا۔ ''تم کون سے خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟''

شاگرد نے جواب دیا۔ ''جانوروں کے!''

استاد۔ ''وہ کس طرح؟''

شاگرد۔ ''میری ماں مجھے الو کہتی ہیں۔ میرے ابو مجھے گدھا کہتے ہیں اور میرے دادا مجھے چیتا کہتے ہیں۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

مرشد سرکار نے ذرا توقف کرکے وارث احمد سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ ''عورت'' کے بعد تمہارے بھائی کا دوسرا بڑا شوق کیا تھا؟''

''اچھا کھانا پینا سرکار۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مرشد سرکار نے کہا۔ ''اور تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ کچھ لوگوں کی طرح تمہارا بھائی بھی دکھ اور پریشانی کے عالم میں زیادہ کھاتا تھا۔ زلفت سے دوری کے بعد اس نے اس دوسرے شوق سے اپنا غم غلط کرنا شروع کردیا۔ اپنی لذت کام و دہن کے لیے اس نے اپنا دسترخوان مزید وسیع کرلیا۔ ہر چیز جو اس کا نفس طلب کرتا تھا یا جو اس کے دماغ میں آتی تھی، اس کے دسترخوان یا اس کی ڈائننگ ٹیبل پر سج جاتی تھی۔ ان دو تین برسوں میں اس نے کھایا اور بہت کھایا..... یہاں تک کہ لذیذ ترین کھانے بھی اسے بُرے لگنے لگے۔ تمہیں شاید پتا ہی ہو وارث احمد، ڈرائی فروٹ میں سے کاجو اس کو محبوب ترین تھا مگر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ کاجو کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ درحقیقت ہر قسم کی خوراک کی لذت کا تعلق تو بھوک اور

کیابی سے ہوتا ہے۔ جب بھوک نہ ہو اور سامنے پسندیدہ اشیائے خورونوش کے انبار پڑے رہتے ہوں تو پھر بہترین نعمتیں بھی اپنی لذت کھو دیتی ہیں۔ لذت کام و دہن کی سزا سب سے پہلے معدے کو ہی بھگتنا پڑتی ہے۔ طائل احمد نے اپنا معدہ برباد کرلیا۔ اسے السر ہوگیا تھا..... پرہیزی کھانوں پر آگیا تھا۔ جو کچھ تم کھاتے رہے ہو وارث احمد، شاید وہ بھی اسے نصیب نہیں تھا۔ مگر تم ٹھیک کہتے ہو، یہ باتیں حویلی کے اندر کی باتیں ہیں عام لوگوں کو معلوم نہیں۔''

وارث یہ سب کچھ بے حد حیرت کے عالم میں سن رہا تھا۔ کوئی اور یہ باتیں کہتا تو شاید وارث کو یقین ہی نہ آتا مگر مرشد سرکار کی باتیں سیدھی دل میں اترتی تھیں۔ وہ بولے۔

''تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ..... تمہارے بھائی کا تیسرا بڑا شوق کیا تھا؟''

وارث نے کہا۔ ''گھومنا پھرنا، دنیا کی سیاحت، نت نئی جگہیں دیکھنا۔''

''بے شک۔'' مرشد سرکار نے تائید کی۔ ''جن دنوں وہ زلفت کے لاحاصل عشق میں مبتلا تھا، اس نے حالات سے فرار کے لیے سیاحت کا طویل پروگرام بنایا۔ وہ اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا۔ پورے ایک برس تک دنیا کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔ روپیہ پانی کی طرح بہاتا رہا۔ سننے اور جاننے والوں کے لیے یہ یقیناً ایک قابلِ صد رشک صورتِ حال ہی ہوگی لیکن یہاں بھی اسے خوشی اتنی ہی ملی جس کا وہ حق دار تھا۔ وہ سیر نہیں کررہا تھا، بس بھاگ رہا تھا۔ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری جگہ۔ اس دوران میں اس کا رابطہ زلفت سے بھی تھا۔ وہ کسی بھی طرح اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ اسے شوہر سے طلاق لینے پر مجبور کرتا تھا مگر اس کا انکار حتمی تھا اور شاید یہ انکار تھا ہی نہیں، یہ تو قدرت کی طرف سے تمہارے بھائی کے لیے ایک لامتناہی سزا تھی۔ وہ اپنی ساری دولت اور شان وشوکت، حسین وجمیل زلفت کے قدموں میں ڈھیر کرنے پر آمادہ تھا، اسے اپنی جائز بیوی بنانا چاہتا تھا مگر زلفت کسی بھی طور اپنے محبت کرنے والے شوہر سے بے وفائی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ طائل احمد سے بارہا کہہ چکی تھی، میں آپ کی رعایا اور آپ کی دسترس میں ہوں۔ آپ میرے ساتھ جو چاہے سلوک کرسکتے ہیں لیکن مجھے میری مرضی سے حاصل نہیں کرسکتے اور یہی بات طائل احمد کی جان کا روگ تھی۔ وہ اسے اس کی مرضی اور چاہت سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی شان وشوکت کے زور سے توڑنا اور فتح کرنا چاہتا تھا۔ وہی سب کچھ جو اس طرح کے کاموں میں ہوتا ہے۔''

''اور مرشد سرکار..... بالآخر اس نے یہ سب کچھ کرلیا۔''

''ہاں، بالآخر اس نے کرلیا۔'' مرشد سرکار نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''سنا ہے سرکار کہ زلفت کے سلسلے میں طائل بھائی آخرکار اپنی اصلیت پر اتر آیا تھا۔ طائل بھائی نے زلفت کے خاوند شیراز کو دباؤ اور لالچ کے زور سے زلفت سے دور کردیا۔ شیراز نے بے وفائی کی۔ ڈیڑھ دو کروڑ روپیہ حاصل کیا اور کینیڈا کی شہریت بھی۔ وہ زلفت کو طلاق دے کر چلا گیا۔''

''تم اسے بے وفائی نہیں کہہ سکتے وارث احمد..... یہ ایک مجبور شخص کی اٹل مجبوری تھی۔ وہ کیا کرتا، اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ زلفت بے شک اپنی رضامندی سے طائل کی بیوی بن گئی، کرمانے حویلی میں چھوٹی مالکن کی حیثیت اختیار کرگئی مگر اپنے خاوند شیراز کی یاد وہ کبھی ذہن سے نہ نکال سکی۔ ہاں، اس طرح کے کاموں میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ وہی صدیوں پرانا قصہ ہے۔ بااختیار کی طاقت اور بے اختیار کی مجبوری اور پھر سمجھوتا..... کہانی وہی رہتی ہے انداز بدل جاتے ہیں، تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔''

''لیکن پیر و مرشد..... گستاخی معاف..... جو کچھ بھی ہے طائل بھائی نے زلفت کو حاصل تو کرلیا۔ اس کے جسم وجاں کا مالک تو بن گیا۔''

''ہاں، یہ تو بے شک ہوگیا۔'' مرشد سرکار نے کہا۔ ''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ.....'' ان کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔۔۔ ہوا کے ایک جھونکے سے اس کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا جو مرشد سرکار کے سرہانے کی طرف تھی۔ باہر بادل تھے جن کی وجہ سے اجالا ابھی تک پوری طرح اپنی چمک دمک نہیں دکھا سکا تھا۔ مرشد سرکار نے ہاتھ بڑھا کر پٹ بند کرنا چاہا تو ان کا رخ کھڑکی کی طرف ہوگیا۔ پہلی بار وارث احمد نے انہیں پوری روشنی میں دیکھا۔ اس کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اسے سفید بالوں کے درمیان گھرے ہوئے جھریوں بھرے چہرے پر شناسائی کی جھلک سی نظر آئی۔ اس نے موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور اس کی رگوں میں خون سنسنا کر رہ گیا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پارہا تھا۔

''آ..... آپ..... آپ؟'' وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر ششدر لہجے میں بولا۔

مرشد سرکار نے اب کھڑکی کا پٹ بند کر کے رخ دوبارہ وارث احمد کی طرف کر لیا تھا۔ وہ ٹھہری نظروں سے وارث کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''تمہاری نظر واقعی کمزور ہو چکی ہے..... مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہو چکی ہے وارثی..... اپنے بڑے بھائی کو ہی نہیں پہچان سکے۔''

وارث احمد سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ آج قریباً 35 برس بعد اپنے بھائی طائل احمد کو دیکھ رہا تھا۔ طائل احمد، وارث سے صرف دس سال بڑا تھا مگر اس وقت یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس سے پچیس تیس سال بڑا ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچا، جھریوں بھرا چہرہ، گھنی سفید بھویں..... وارث کو اپنی نگاہوں پر یقین نہیں ہوا۔

کتنی ہی دیر بعد وہ خود کو سنبھال کر اٹھا۔ بھائی کے بالکل سامنے پہنچ کر دوزانو بیٹھا، اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور پھر یکایک ہچکیوں سے رونے لگا۔

''یہ سب کیا ہے طائل بھائی..... میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میرے علم میں تو یہی تھا کہ..... آپ کہیں جا چکے ہیں..... آپ کینیڈا میں ہیں، وہیں رہائش اختیار کر لی ہے لیکن آپ..... آپ..... یہ کیا حالت بنا لی ہے آپ نے بھائی؟''

مرشد سرکار نے وہیں بیٹھے بیٹھے وارث احمد کو تھوڑا سا کھینچ کر اپنے گلے سے لگایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''میں اپنی اس حالت سے مطمئن ہوں وارثی۔ میں نے اپنے لیے یہ زندگی خود منتخب کی ہے..... اور..... زندگی اب ہے بھی کتنی؟ کسی بھی وقت اوپر والے کا بلاوا آ جائے گا۔ جو بھی وقت ہے، اسے مخلوقِ خدا کی خدمت میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ دونوں بھائی ایک سادہ سے کھانے کے بعد ایک کمرے میں فرشی بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک الماری میں بہت سی دینی کتابیں رکھی تھیں۔ یہاں بھی لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ کمرے میں پنکھا بھی نہیں تھا مگر کھڑکی سے آنے والی صاف ہوا اس کمی کو پورا کر رہی تھی۔ دونوں بھائیوں کے درمیان بہت سی باتیں ہوئی تھیں (وارث کو معلوم ہوا تھا کہ حویلی اور زمینوں کا سارا انتظام و انصرام اب ان کے تایا زاد بھائی حاجی صالح احمد کے پاس ہے) طائل احمد نے چھوٹے بھائی وارث سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ اس کی یہاں آستانے میں موجودگی کے بارے میں کسی کو کبھی کچھ نہیں بتائے گا۔ وارث احمد نے یہ عہد کر لیا تھا۔ طائل نے بڑی عاجزی کے ساتھ چھوٹے بھائی کو بتایا کہ وہ پچھلے آٹھ دس سال سے شدید خواہش رکھتا تھا کہ کبھی اس سے (وارث سے) ملاقات ہو جائے۔ قدرت نے کیسا سبب پیدا کیا کہ وہ خود چل کر اس دور دراز جگہ پر پہنچ گیا۔ طائل نے رقت آمیز لہجے میں چھوٹے بھائی سے اپنی زیادتیوں اور غلطیوں کی معافی بھی مانگی اور اس کے منہ سے کہلوایا کہ اس نے اسے صدقِ دل سے معاف کر دیا ہے۔

گفتگو کے دوران، وارث احمد کا دھیان ایک بار پھر زلفت کی طرف چلا گیا، وہ بولا۔ ''طائل بھائی! میری معلومات کے مطابق زلفت آج کل کینیڈا میں ہے۔ وہاں وہ کس کے ساتھ ہے؟''

جواب حیران کن تھا۔ طائل نے کہا۔ ''اپنے پہلے خاوند شیراز کے پاس۔ وہ دونوں محبت کرتے تھے۔ میرے بے حد اصرار پر ہی انہوں نے پھر سے نکاح کیا۔ ایک جید عالم سے میں نے اس سلسلے میں مکمل صلاح مشورہ کیا تھا۔''

''مگر زلفت تو..... آپ کے نکاح میں تھی؟''

''صرف نکاح میں تھی وارثی۔ وہ پانچ برس میرے ساتھ رہی اور میں اس سے اتنا ہی دور رہا جتنا مشرق سے مغرب ہے اور یہ سب کسی پلاننگ کے تحت نہیں تھا..... میں نے کہا ہے نا وارث! خوشی اور ہوتی ہے، ظاہری حالات اور اسباب اور ہوتے ہیں۔ مجھ جیسے بے لگام لوگوں کو قدرت انوکھے طریقوں سے اپنے دائرۂ اختیار میں لاتی ہے۔ کبھی ضد، کبھی نفرت، کبھی محبت، کبھی محبت کی طلب، ایسی ہی کیفیات انسانی اختیار کو محدود کر کے اسے سمندر میں بھی پیاسا رکھتی ہیں..... بالآخر میں نے زلفت کو طلاق دے دی تھی۔''

وارث احمد ہکا بکا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔

طائل احمد نے کہا۔ ''وارثی! میں نے لذت کو بغیر بھوک کے حاصل کرنا چاہا، نیند کو بغیر تھکن کے..... ازدواجی خوشیوں کو بغیر اخلاقیات کے، دولت کو بغیر محنت کے۔ مجھے ان میں سے کچھ نہ ملا اور ملا تو بس اتنا ہی جتنے کا میں حق دار تھا۔ تم مجھ سے بہت بہتر رہے ہو وارثی..... بہت بہتر۔''

وارث احمد کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ صبح والے بادل چھٹ چکے تھے۔ کھلتی ہوئی چاندنی میں، حجرے کے سامنے ایک بورڈ پر ''مرشد سرکار'' کا کہا ہوا مقولہ جلی حروف میں دکھائی دے رہا تھا۔ ''خوشی کو مشقت اور تکلیف میں تلاش کرو۔ یہ وہیں سے ملے گی، ضرور ملے گی۔''

⌘⌘⌘

شہ زور

اسما قادری

قسط : 2

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندو تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنونِ حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرفِ غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

معاذ بیک ویو مرر پر درج تحریر دیکھ کر سن رہ گیا۔

''اپنی سانسیں گننا شروع کردو۔ بہت جلد تم خود کو زمین کے نیچے پاؤ گے۔'' سیاہ رنگ کے باریک مارکر سے آئینے پر لکھی یہ تحریر یقیناً دھمکی تھی اور وہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ دھمکی کس کی طرف سے دی گئی ہے۔ اس دھمکی نے اس کی یہ خوش فہمی بھی دور کردی تھی کہ اس روز بشریٰ کی مدد کرتے ہوئے کامران اور سلطان نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ دونوں اسے پہچان گئے تھے لیکن فوری طور پر کوئی ردِعمل شاید اس لیے ظاہر نہیں ہوسکا تھا کہ دونوں ہی زخمی تھے۔ کامران پیر میں لگنے والی گولی کی وجہ سے کافی دنوں کے لیے بستر کا محتاج ہوگیا تھا اور سلطان اس سے اپنے دانت تڑوانے کے بعد فوری طور پر کسی کو شکل دکھانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ کامران کے بارے میں تو اسے اندازہ تھا کہ وہ ابھی کچھ اور عرصہ یونیورسٹی نہیں آسکے گا لیکن شاید سلطان آگیا تھا یا پھر اس نے اپنے کسی دوست کی مدد سے یہ کام کروایا تھا۔

کچھ دیر اس بات پر غور کرنے کے بعد اس نے اپنے شانے اچکائے اور لاک کھول کر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس کی فطری بے نیازی اور بے خوفی نے اسے چند لمحوں سے زیادہ اس دھمکی پر توجہ دینے کی زحمت نہیں دی تھی اور وہ خود سے جو ہوگا دیکھا جائے گا، کہتا ہوا بائیک پارکنگ سے نکال لے گیا تھا۔ ابھی وہ مین گیٹ سے کافی فاصلے پر تھا کہ اس نے ایک کھلی جیپ کو بالکل اچانک ہی راستے کے درمیان ترچھا ہوکر کھڑا ہوتا ہوا دیکھا۔ دھمکی آمیز الفاظ ابھی تک اس کی بائیک کے عقبی آئینے پر درج تھے۔ ایسے میں اس کے لیے اندازہ لگانا کیا مشکل ہوسکتا تھا کہ اس طرح اس کے راستے میں حائل ہونے والے لوگ کون ہوسکتے ہیں۔ خطرے کا احساس ہونے کے باوجود اس نے اپنی بائیک نہیں روکی۔ وہ فطری طور پر نڈر تھا اور یہ گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ اسے دھمکانے والے یوں کھلم کھلا اور اس کا راستہ روکے کھڑے ہوں اور وہ راستہ بدل جائے۔ وہ ایسی بزدلی دکھاتا تو وہ لوگ مزید شیر ہوجاتے اور یہ خود اس کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔ خطرے سے بھاگنے کے بجائے سامنے آکر اس کا مقابلہ کرلینا ہی بہتر تھا چنانچہ وہ اپنی بائیک کو اسی رفتار سے چلاتا رہا۔

اب جیپ میں سوار افراد کے چہرے واضح ہوگئے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سلطان خود بیٹھا ہوا تھا اور دانت نکوسے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے منہ میں پورے دانت دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کسی ماہر دندان ساز نے اس میں پیدا ہونے والے عیب کو دور کردیا ہے۔ آدمی کے پاس پیسا ہو تو ایسے ہی اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کا انتظام کرلیا کرتا ہے لیکن بہرحال کوئی بھی شے ہمیشہ پردوں کے پیچھے چھپی نہیں رہتی۔ سچ کو کبھی نہ کبھی سامنے آنا ہوتا ہے لیکن کامی اور سلطان جیسے قبیل کے لوگوں کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آسکتی تھی۔ سلطان کے سامنے پسنجر سیٹ پر ان ہی کے گروپ کا ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ معاذ کو اس کا نام معلوم نہیں تھا لیکن وہ اسے کئی بار کامی اور سلطان کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ وہ سلطان سے بھی زیادہ کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتا ہوا شاہ کا وفادار ہونے کا حق ادا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

فاصلے سے ان ساری باتوں کو نوٹ کرلینے کے باوجود معاذ نے اپنی بائیک کی رفتار کم نہیں کی۔ اس کے لیے اچھی بات یہ تھی کہ اسے ان دونوں ہی کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا۔ اس جگہ شاید وہ ہتھیار استعمال کرنے کے متحمل بھی نہیں ہوسکتے تھے۔ گیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور گیٹ پر سیکیورٹی اہلکاروں کے ساتھ ساتھ رینجرز کے جوان بھی موجود ہوتے تھے۔ ان کی موجودگی میں کھلم کھلا ہتھیار استعمال کرکے بچ جانا آسان نہیں تھا اور اسی نکتے نے معاذ کے اعتماد کو آخری لمحے تک متزلزل نہ ہونے دیا تھا۔ اب وہ جیپ سے اتنے کم فاصلے پر تھا کہ حقیقت میں وہ لوگ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھے۔ معاذ نے یہ بھی نوٹ کرلیا تھا کہ جیپ رکی ہوئی ضرور ہے لیکن اس کا انجن اسٹارٹ ہے۔ جیپ اور اس کی بائیک کے درمیان فاصلہ مشکل سے ایک گز رہ گیا تھا تب جیپ اچانک حرکت میں آئی اور اس کے راستے سے ہٹ گئی۔ معاذ اپنی بائیک آگے نکالتا چلا گیا۔

''پاگل کے بچے..... خوامخواہ اپنی دولت اور طاقت کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔'' معاذ کے کانوں نے یہ جملہ سنا اور اس نے پہلی بار نوٹ کیا کہ ایک دوسری بائیک بھی اس سے ذرا ہی پیچھے چلی آرہی تھی۔ اس بائیک پر دو لڑکے سوار تھے اور ان میں سے ایک نے بلند آواز میں اپنے ساتھی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ معاذ نے یہ نہیں سوچا کہ ان لڑکوں کی وجہ سے سلطان اس کے راستے سے ہٹ گیا تھا۔ وہ پہلے ہی یہ بات سمجھ چکا تھا کہ اس جگہ سلطان اس پر حملہ نہیں کرسکتا۔ وہ اس کے ساتھ صرف چوہے بلی کا کھیل کھیلنے کی کوشش کررہا تھا اور شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ اس طرح وہ معاذ کے اعصاب پر دباؤ ڈال سکے گا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ

اس نے اپنی اس حرکت سے معاذ کے اندر کے سرکش اور ضدی شخص کو جگا دیا ہے جو اپنی ضد اور سرکشی میں کچھ اور بھی زیادہ مضبوطی سے ان کے مقابل ڈٹ جائے گا۔

☆☆☆

''تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے بشریٰ! کامی اور سلطان جس قبیل کے لوگ ہیں، ان کے لیے اپنی بے عزتی برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا اور ہم نے تو انہیں اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے۔'' اگلے دن پھر وہ یونیورسٹی میں بشریٰ کے مقابل بیٹھا اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت کینٹین میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے کولڈ ڈرنکس رکھی ہوئی تھیں۔ معاذ نے پہلے بشریٰ کو کل ملنے والی دھمکی اور سلطان کی حرکت کے بارے میں آگاہ کیا پھر اسے مشورہ دینے لگا۔

''کیا آپ کل کے واقعات سے ڈر گئے ہیں؟'' اس کے مشورے کے جواب میں بشریٰ نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''ڈر..... مائی فٹ۔ میں ایسے اوچھے لوگوں سے نہیں ڈرتا ہوں۔ میں صرف تمہارے لیے فکرمند ہوں۔'' اس کے سوال پر معاذ نے گویا برا مان کر اسے گھورا۔

''آپ کی فکرمندی کے لیے شکریہ معاذ صاحب لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نہ تو اس قسم کے لوگوں سے ڈرتی ہوں اور نہ ہی ان کی پروا کرتی ہوں۔ اگر مجھے اس طرح کے لوگوں سے ڈرنا ہے تو پھر مجھے اس فیلڈ میں ہی نہیں جانا چاہیے جو میں نے اپنے لیے منتخب کی ہے۔ ابھی تو صرف آغاز ہے۔ ابھی میری تعلیم ادھوری ہے اور میں نے باقاعدہ طور پر اس فیلڈ کو جوائن نہیں کیا ہے۔ جب میں فل ٹائم جاب کے طور پر اس فیلڈ میں آؤں گی تو مسائل اور بھی بڑھ جائیں گے۔ مجھے ان سارے مسائل کو جو یقیناً اس سے بہت بڑے بڑے ہوں گے، فیس کرنا ہوگا اور آپ ابتدا ہی میں مجھے ڈرا رہے ہیں۔ میں تو اس معاملے کو اپنی ٹریننگ کے ایک حصے کے طور پر دیکھ رہی ہوں۔ بڑے لوگوں کا دباؤ، موت کی دھمکیاں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ہماری فیلڈ کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اگر ہم ان چیزوں سے ڈرنے لگے تو کام کیسے کریں گے۔ ابھی آپ نے خود کہا ہے کہ یہ اوچھے لوگ ہیں اور آپ ان سے نہیں ڈرتے ہیں تو پھر مجھے کیوں ان سے ڈرانا چاہتے ہیں؟ کیا اس لیے کہ میں ایک لڑکی ہوں؟ لیکن آپ مجھے کوئی عام لڑکی نہیں سمجھیں۔ میں گلزار عاصم جیسے صحافی کی بیٹی ہوں جن کی دیانت داری اور بہادری کی دنیا مثال دیتی ہے۔ میں اپنے بابا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بہت آگے تک جانا چاہتی ہوں اور آپ مجھے آغاز میں ہی ڈرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے معاذ صاحب کہ جن لوگوں سے آپ خود نہیں ڈرتے، ان سے مجھے ڈرا رہے ہیں اور یقیناً اس لیے ڈرا رہے ہیں کہ میں ایک لڑکی ہوں لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے۔ اب لڑکیاں پہلے کی طرح ڈرپوک اور بے عمل نہیں رہی ہیں۔ آج کی عورت ہر میدان میں خود کو مرد کے مقابلے میں منوا رہی ہے اور.....''

''میں تمہیں ڈرا نہیں رہا، صرف محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔'' وہ شاید عورت اور مرد کے حوالے سے لمبی تقریر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن معاذ نے درمیان میں اس کی بات کاٹ کر اسے تقریر کو مزید طول دینے سے روکا۔

''محتاط رہنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ احتیاط ہی احتیاط میں، میں گھر میں چھپ کر بیٹھ جاؤں؟ یونیورسٹی آنا اور اپنے دیگر کاموں سے باہر نکلنا چھوڑ دوں یا پھر اپنے لیے بلٹ پروف جیکٹ اور چار چھ گارڈز کا بندوبست کرلوں؟ تو عرض یہ ہے میرے عزیز خیرخواہ کہ میرے لیے ان میں سے کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ اپنی تعلیم اور دیگر کاموں کے لیے میرا گھر سے باہر نکلنا ناگزیر ہے۔ ویسے بھی میرے اندر ایک سیلانی روح ہے اور باہر کوئی کام نہ بھی ہو تو میں دو تین دن بھی گھر میں بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔ ایک جگہ بند ہو کر بیٹھنے سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ رہی دوسری احتیاطی تدبیر کی بات تو آپ بتائیں کہ ہمارے جیسے عام سے لوگوں کو کون بلٹ پروف جیکٹیں، گاڑیاں اور گارڈز فراہم کرتا ہے۔ خود ہماری تو یہ سارا انتظام کرنے کی اوقات نہیں ہے اور جو صاحب اختیار ہیں، ان کے لیے ہماری جانیں اتنی قیمتی نہیں ہیں۔ فرض کریں بابا کی ناموری اور شہرت کچھ کام دکھا دے تو تب بھی زیادہ سے زیادہ ایک عدد بلٹ پروف جیکٹ کا انتظام ہو سکتا ہے اور اس کی کوالٹی کی کوئی گارنٹی نہیں دے گا۔ آپ کو شاید علم ہو کہ ہمارے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اس قسم کی ناکارہ بلٹ پروف جیکٹوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے جن کی فراہمی پر پتا نہیں کس کس نے کتنا مال بنایا ہے اور بے چارہ غریب سپاہی بہ دستور اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھر رہا ہے۔'' اس بار معاذ کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ایک پیدائشی مقرر ہے اور ہر صورت میں تقریر کر سکتی ہے اس لیے اسے اس کام سے روکنا سوائے حماقت کے کچھ نہیں چنانچہ اس بار اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔

"تو آپ کہہ رہے تھے کہ مجھے محتاط رہنا چاہیے۔ اگر اس احتیاط پسندی کے ذیل میں آپ کے پاس کوئی تدبیر وترکیب ہو تو مجھے ضرور بتائیں۔ میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔" معاذ کو خاموش پا کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی اور زچ کرنے والے انداز میں اس سے پوچھنے لگی۔ مسکراتے ہوئے بلاشبہ وہ بہت خوبصورت لگتی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی معاذ نے یہ بات نوٹ کرلی تھی کہ مسکراہٹ اس کے سارے وجود کو جگمگا دیتی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے شیشے کے شوکیس میں رکھے ہوئے جڑاؤ زیورات روشنی سے جگمگا جاتے ہیں۔ اس کی مسکراہٹ گویا کوئی بڑی سی مرکری ٹیوب لائٹ تھی جو اس کی خوبصورتی کو کچھ اور اجاگر کردیتی تھی لیکن اس وقت وہ بشریٰ کی مسکراہٹ سے تھوڑا سا جھنجلا گیا اور دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑتے ہوئے بولا۔

"معاف کردو بی بی! میرے اگلے پچھلوں کی توبہ جو آئندہ میں نے تمہیں ایسا کوئی احمقانہ مشورہ دینے کی کوشش کی۔"

"یہ تو غلط بات ہے۔ کوشش تو انسان کو کرتے رہنا چاہیے۔ جو لوگ کوشش نہیں کرتے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔" ناصحانہ لہجے میں اس سے یہ بات کہتے ہوئے وہ بظاہر بالکل سنجیدہ تھی لیکن مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی اور دو قمقمے سے تھے جو اس کی آنکھوں میں روشن ہوگئے تھے۔ معاذ بس اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے بشریٰ سے کہیں زیادہ خوبصورت لڑکیاں دیکھی ہوئی تھیں اور وہ کوئی غیر معمولی خوبصورت لڑکی نہیں تھی لیکن اس کی مسکراہٹ غیر معمولی تھی اور اس مسکراہٹ کے لیے معاذ کے ذہن میں صرف "روشنی" کا لفظ آتا تھا۔

"خاموش کیوں ہوگئے؟ شاید میری باتوں کا بُرا مان گئے۔ میں تو بس ایسے ہی مذاق کررہی تھی ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت خلوص سے احتیاط کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اپنے طور پر میں ممکنہ حد تک احتیاط کرتی بھی ہوں۔ آپ نے میرے پاس پسٹل تو دیکھا ہی ہے، اس کے علاوہ میں نے تھوڑا بہت ہاتھ پیر چلانا بھی سیکھا ہوا ہے اور ضرورت پڑنے پر اچھے خاصے آدمی کو بھی اناٹفیل کرسکتی ہوں اس لیے آپ سے یہی کہوں گی کہ میرے لیے اتنے زیادہ پریشان نہ ہوں۔" اب وہ سچ مچ سنجیدہ ہوچکی تھی۔ معاذ نے ایک گہری سانس لی اور کولڈ ڈرنک کا آخری گھونٹ پی کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں، اب مجھے اجازت دیجیے۔" وہ واقعی سمجھ گیا تھا کہ جن باتوں کو بشریٰ نے ابھی مذاق قرار دیا تھا، وہ ہی حقیقت تھیں۔ بھلا وہ کس قسم کی احتیاط کرسکتی تھی؟ یہاں تو ہر وہ شخص جو معاشرے میں پھیلی گندگی کی طرف اشارہ کرتا تھا، خطرے میں تھا اور ستم یہ تھا کہ ایسے قیمتی لوگوں کے تحفظ کا خیال رکھنے کے بجائے ان کی حفاظت کے لیے سخت اقدامات کیے جاتے تھے جن کی وجہ سے ہر طرف یہ گندگی پھیلی ہوئی تھی۔

"ارے، رے..... آپ تو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئے۔ حالانکہ ابھی ابھی میں نے احتیاطی تدبیر کے طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اکیلے جانے کے بجائے آپ سے لفٹ لے لوں۔ مجھے ذرا سہراب گوٹھ کی طرف جانا ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ سے جانے میں خاصا وقت لگ جائے گا۔ آپ بائیک پر شارٹ کٹ مار کر ذرا جلدی پہنچا سکتے ہیں۔ اگر زیادہ زحمت نہ ہو تو اس غریب بندی کے لیے یہ تکلیف اٹھالیں۔" معاذ کو جانے کے لیے پر تولتے دیکھ کر وہ جلدی جلدی اس سے درخواست کرنے لگی۔

"غریب بندی کی وہ ایف ایکس کہاں ہے جس پر وہ اکثر اپنی سہیلیوں کو بھی لادلاد کر آتی جاتی دکھائی دیتی ہے؟" معاذ نے اسے گھورا۔ وہ بشریٰ سے شناسائی کے بعد کئی بار اسے اس کی ذاتی گاڑی میں آتا جاتا دیکھ چکا تھا۔

"وہ بے چاری سیکنڈ ہینڈ ایف ایکس اکثر بیمار ہوکر بغرض علاج ورکشاپ پر کھڑی رہتی ہے اور مجھے دوستوں کو لفٹ کی زحمت دینی پڑتی ہے۔ اب جبکہ آپ میرے دوستوں کے حلقے میں شامل ہوگئے ہیں تو آپ کو اس طرح کی زحمتیں اٹھانے کے لیے تیار رہنا ہی پڑے گا۔"

اس نے مزے سے معاذ کو جواب دیا تو اس کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ دوستوں کو مایوس کرنا اس کی فطرت نہیں تھی اور وہ اس سے دوستی کی دعوے دار تھی۔ ذرا دیر بعد وہ دونوں یونیورسٹی سے روانہ ہوچکے تھے۔ پبلک ٹرانسپورٹ سے جانے کی صورت میں یونیورسٹی سے نیپا چورنگی پہنچ کر راشد منہاس روڈ پر سفر کرتے ہوئے سہراب گوٹھ جانا پڑتا تھا اور راستہ طویل ہونے کی وجہ سے زیادہ وقت لگتا تھا۔ بشریٰ کی فرمائش پر معاذ نے ایک شارٹ کٹ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ لوگ پُررونق علاقے کو چھوڑتے ہوئے بتدریج ویرانے کی طرف جانے لگے۔

"بائی داوے، یہ تمہیں سہراب گوٹھ کی سمت جانے کی کیا سوجھی؟ اس علاقے میں تو اکیلی خواتین بہت کم نظر آتی ہیں۔ تمہیں وہاں کیا کام ہے؟" وہ ٹریفک کے شور سے دور

ہوئے تو معاذ کو اس سے پوچھنے کا خیال آیا۔

''ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں ہی جا رہی ہوں۔ آپ تو جان ہی چکے ہیں کہ میں جو بھی لکھوں، پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کرتی ہوں پھر لکھتی ہوں۔'' اس نے چہرے پر آ جانے والی ایک لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے جواب دیا۔

''اب وہاں کس نے قبضے کی زمین پر جعلسازی سے ہاؤسنگ پروجیکٹ شروع کر دیا جو تم وہاں دوڑ پڑیں۔'' معاذ کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بُرا منائے بغیر بولی۔

''میں کوئی ہر وقت بلڈرز کے پیچھے تھوڑی پڑی رہتی ہوں۔ اس وقت تو میں ایک نئے اسائنمنٹ پر کام کر رہی ہوں۔ لوگوں میں بڑھتے ہوئے منشیات کے استعمال پر تحقیق کر رہی ہوں میں آج کل۔ مجھے کسی نے سہراب گوٹھ کی قریبی آبادی میں کسی بندے کا ریفرنس دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں مجھے کافی معلومات فراہم کر سکتا ہے تو میں اس وقت اس بندے سے ہی ملنے جا رہی ہوں۔''

''تم بھی بڑی عجیب لڑکی ہو۔ کوئی سیدھا سادہ کام تمہیں سمجھائی نہیں دیتا۔ خطرناک موضوعات کا انتخاب کرتی ہو پھر اس پر کام کرنے کے لیے خطرناک جگہوں پر خطرناک لوگوں سے ملنے بھی چل پڑتی ہو۔ تم اسی طرح سینگ اٹھا کر بھاگتی لوگوں کو ٹکریں مارتی پھرو گی تو نوجوانی میں ہی شہید صحافی کا ٹائٹل حاصل ہو جائے گا۔ ابھی تو تمہاری تعلیم مکمل نہیں ہوئی اور تم پارٹ ٹائم صحافی ہو۔ مکمل صحافی بننے کے بعد جانے کیا گل کھلاتی پھرو گی۔ اتنے خطرناک صحافی تو گلزار عاصم صاحب بھی نہیں ہوں گے۔'' اس کا مقصد جان کر معاذ اس کے بارے میں تبصرہ کرنے لگا۔

''خطرناک تو وہ بھی ہیں لیکن ان کا میدان ذرا مجھ سے مختلف ہے۔ وہ زیادہ تر سیاسی تبصرے اور تجزیے کرتے ہیں اور بڑے لوگوں کی پول پٹیاں کھولتے ہیں۔ میں عوامی مسائل اور پریشانیوں میں زیادہ دلچسپی لیتی ہوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی دھوکے سے کسی کی زمین ہتھیا لے، کسی کو گھر کے نام پر متنازعہ جگہ پر ایسا مکان بنا کر دے دے کہ جس کے چھن جانے اور اپنی عمر بھر کی کمائی ڈوب جانے کا ڈر انسان کی سانسوں کو تنگ کرنے لگے، کسی کا بچہ نشے کا عادی بن کر ماں باپ کے سارے خواب چکنا چور کر دے یا کسی کو صرف اس لیے گولی مار دی جائے کہ اس نے بہت چاہت سے خریدا گیا قیمتی موبائل فون یا اپنی پیاری بائیک کسی لٹیرے کے حوالے کرنے میں مزاحمت کی تھی۔ ہمارے لوگوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے معاذ اور میں قلم ہاتھ میں پکڑتی ہوں تو خود کو اس ظلم کے خلاف لکھنے سے باز نہیں رکھ پاتی۔ میں اپنے ہم وطنوں کے لیے، مسلم امہ کے لیے، انسانیت کے لیے اپنے دل میں بہت درد اور فکر رکھتی ہوں اس لیے جب کسی نازک موضوع پر کام کر رہی ہوتی ہوں تو اپنے لیے ڈرنا اور فکرمند ہونا بھول جاتی ہوں۔ فطری طور پر مجھے بھی زندگی سے پیار ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ڈر ڈر کر جینا تو زندگی کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے اور مجھے اپنی زندگی کو ایسے ضائع کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مرنا تو آدمی کو ایک دن ہے ہی تو شہید صحافت کا ٹائٹل حاصل کر لینے میں کیا حرج ہے؟ ہماری بھی داستان تو ہو گی داستانوں میں۔''

اس نے معاذ کے تبصرے کے جواب میں اتنے جوش سے دلائل دیے کہ وہ خاموش ہو گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ سب کہتے ہوئے بشریٰ کا چہرہ تمتما رہا ہو گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے تمتماتے ہوئے سرخ چہرے کو دیکھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا مشکل تھا۔ اس نے عقبی آئینے کی مدد لینے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی اس کی نظر ایک سرخ شیراڈ پر پڑ گئی۔ اس گاڑی کو اس نے یونیورسٹی روڈ پر بھی دیکھا تھا لیکن ٹریفک کے رش میں توجہ نہیں دی تھی۔ پھر وہ شارٹ کٹ کے لیے یونیورسٹی روڈ سے دائیں جانب مڑے تھے تب بھی اس گاڑی کی جھلک نظر آئی تھی لیکن اس کے دل میں یہی خیال آیا تھا کہ وہ گاڑی نزدیکی آبادی میں کہیں جا رہی ہو گی لیکن وہ یہاں اس ویران راستے پر بھی ان کے پیچھے تھی۔ گمان کیا جا سکتا تھا کہ شیراڈ والے یا والوں نے بھی شارٹ کٹ کے لیے اس ویران اور کچے پکے راستے کا انتخاب کیا تھا لیکن جانے کیوں معاذ کھٹک سا گیا اور اسے خطرے کی بو سی محسوس ہونے لگی۔ شاید یہ گزشتہ یوم ملنے والی دھمکی کا اثر تھا کہ اسے وہ گاڑی مشکوک نظر آ رہی تھی۔ شک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیراڈ نے ایک بار بھی ان سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ باتوں کا آغاز ہو جانے پر معاذ نے خراب راستے پر اپنا دھیان بٹ جانے کے ڈر سے رفتار تھوڑی سی ہلکی کر دی تھی اور شیراڈ کے ڈرائیور کے پاس موقع تھا کہ وہ ان سے آگے نکل جاتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو معاذ کا شک کرنا بجا تھا کہ شیراڈ ان کے تعاقب میں ہے۔ اس شک کی تصدیق کے لیے معاذ نے بائیک کی رفتار کافی کم کر لی۔ ردعمل میں شیراڈ کی رفتار بھی کم ہو گئی۔

''اس رفتار پر جانے سے بہتر ہے کہ ہم پیدل چلنا

شروع کردیں۔'' اتنی کم رفتار ہوجانے پر بشریٰ نے جل کر رائے دی لیکن اس کی توجہ بشریٰ پر نہیں شیراڈ پر تھی۔ اس کے گلاسز ٹنٹڈ تھے اس لیے وہ یہ جاننے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا کہ شیراڈ میں کتنے لوگ سوار ہیں؟ البتہ یہ بات اس نے فوراً ہی نوٹ کرلی تھی کہ شیراڈ کا اگلا، بائیں جانب کی کھڑکی کا شیشہ بتدریج نیچے ہورہا ہے پھر اس نے اس کھلی کھڑکی سے ایک ہاتھ میں دبا پسٹل برآمد ہوتے دیکھا۔ فوری ردِعمل کے طور پر اس نے بائیک کی رفتار بڑھائی اور زور سے چیخا۔

''بشریٰ سنبھل کر بیٹھو۔'' اگلے ہی لمحے ایک گولی سنسناتی ہوئی ان کے قریب سے گزری۔ اس دوران میں معاذ رفتار مزید بڑھا چکا تھا اور اس کی بائیک گولی ہی کی رفتار سے اس کچے پکے راستے پر دوڑی چلی جارہی تھی۔ راستہ ناہموار ہونے کی وجہ سے اس رفتار پر بائیک بری طرح اچھل رہی تھی۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے بشریٰ نے دونوں ہاتھوں سے معاذ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ ذرا تکلف سے اس کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھتے ہوئے بائیں ہاتھ سے کیریئر پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن جب جان پر بنی ہو تو انسان ان ساری باتوں کو بھول جاتا ہے۔ دو پہیوں کی یہ سواری ویسے ہی خطرناک سمجھی جاتی ہے کہ دوسری سواریوں کے مقابلے میں اس کے حادثے سے دوچار ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اور اس وقت تو وہ جس رفتار سے، جس طرح کے راستے پر دوڑ رہی تھی اس نے صورت حال کو اور بھی نازک بنا دیا تھا۔ یہ معاذ کی مہارت تھی کہ اس نے ایسی صورتِ حال میں بھی بائیک کو بہت اچھی طرح سنبھالا ہوا تھا اور وہ کسی حادثے سے بچے ہوئے تھے۔

رفتار بڑھنے کے بعد بھی ان پر پیچھے سے مزید دو فائر ہوچکے تھے اور گولیاں ان کے دائیں بائیں سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھیں۔ معاذ کے رفتار بڑھانے کے بعد شیراڈ کی رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اور دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ مسلسل کم ہوتا جارہا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ان پر شیراڈ سے مسلسل اور کسی بڑے ہتھیار سے فائر نہیں کیے جارہے تھے ورنہ اس کھلی جگہ پر بچ نکلنا بہت مشکل ہوجاتا۔ ابھی تک ان پر صرف تین فائر ہوئے تھے اور تینوں ہی سے وہ محفوظ رہے تھے۔ شیراڈ والوں کے پاس یقینی طور پر پسٹل ہی واحد ہتھیار تھا اور گولیوں کی محدود تعداد کی وجہ سے وہ مسلسل فائر کرنے سے گریز کررہے تھے، اب ان کا زور درمیانی فاصلہ کم کرنے پر تھا اور معاذ کی پوری کوشش کے باوجود یہ فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ نزدیک سے زیادہ بہتر نشانہ لے کر فائر کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے اس لیے اسے اپنے اور بشریٰ کے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر کرنی پڑے گی۔ ہاتھ پیر کی لڑائی کی بات ہوتی تو وہ تین چار بندوں سے بھی آسانی سے نمٹ سکتا تھا لیکن یہاں معاملہ آتشیں ہتھیار کا تھا جس کی بے رحمی کے آگے بڑے سے بڑے جی دار کی پیش نہیں چلتی اور چند انچ کی گولی چھ، ساڑھے چھ فٹ کے شہ زور کو بھی لمبا لٹا دیتی ہے۔

راستے کی ناہمواری کے باعث معاذ کو راستے پر توجہ مرکوز رکھنی پڑ رہی تھی کہ کہیں کسی بڑے پتھر وغیرہ سے ٹکرا کر بائیک اپنا توازن ہی نہ کھو بیٹھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے بچاؤ کے لیے اطراف کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ آگے دور دور بنے چند مکانات کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ انہیں ان مکانات میں سے کسی میں پناہ میسر آجاتی تو شیراڈ والوں سے بچا جاسکتا تھا لیکن ان کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ کسی مکان کے سامنے رک کر اس کا دروازہ کھلواتے اور پھر مکینوں سے پناہ کے لیے درخواست کرتے۔ اتنی دیر میں تو شیراڈ ان کے سر پر پہنچ جاتی اور ان کے لیے اپنا بچاؤ ناممکن ہوجاتا، چنانچہ پہلے دو مکانات کے سامنے سے وہ بائیک آگے نکالتا چلا گیا۔ تیسرا مکان بہت بڑا اور عالیشان تھا۔ مکان کی دیواریں بہت اونچی تھیں جن پر کیا گیا سرخ رنگ مغلیہ طرزِ تعمیر کی یاد دلا رہا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ تقریباً تین فٹ چوڑی کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں مختلف اقسام کے پودے اور بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ بیلیں دیوار پر چڑھی ہوئی تھیں اور ان پر لگے مختلف رنگوں کے پھولوں کی وجہ سے مکان کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ فی الحال معاذ کو مکان کی خوبصورتی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ مکان صرف اس وجہ سے اس کی توجہ کا مرکز بنا تھا کہ اس نے اس کے بڑے سے سیاہ آہنی گیٹ کے دونوں پٹوں کو کھلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گیٹ کے دونوں پٹ بیک وقت کھل رہے تھے اور درمیان میں اتنا خلا پیدا ہوچکا تھا کہ اس میں سے بائیک آسانی سے گزر سکتی تھی۔

معاذ کے پاس مزید سوچنے سمجھنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ طوفانی رفتار میں بھاگتی اپنی بائیک کو اس خلا سے گزار کر اندر گھستا چلا گیا۔ اسی پل شیراڈ سے چوتھا فائر ہوا اور گولی آہنی گیٹ سے ٹکرا کر اچٹ گئی۔ گیٹ یقینی طور پر

بہت مضبوط تھا چنانچہ زوردار آواز اور فضا میں چند چنگاریاں سی چھوٹنے کے سوا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس چوتھے فائر کے بعد شیراڈ والے رکے نہیں تھے اور گاڑی آگے بھگا کر لیتے چلے گئے تھے۔ معاذ نے مکان کے طویل ڈرائیوے پر بائیک کو روک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا سا گیٹ دوبارہ تیزی سے بند ہو رہا تھا۔ بند ہوتے ہوئے گیٹ سے وہ بھاگتی ہوئی شیراڈ کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ اگلے ہی لمحے اسے ان دو کلاشنکوف بردار افراد کی طرف متوجہ ہونا پڑا جن کی آنکھوں اور چہروں کے تاثرات خوفناک تھے اور انہوں نے اپنی کلاشنکوفیں اس پر اور بشریٰ پر تان رکھی تھیں۔ معاذ کی تیز نظروں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ گیٹ کھولنے اور بند کرنے کے لیے اس کے دونوں اطراف میں کوئی موجود نہیں تھا اور یقیناً گیٹ کے ساتھ ہی بنے ہوئے گارڈ روم سے اسے کھولنے کا کوئی خودکار انتظام موجود تھا۔ ان کو گھیرے میں لینے والے دونوں گارڈز بھی اسی گارڈ روم سے نکل کر بھاگتے ہوئے ان کے قریب پہنچے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد چار ہوگئی۔ نئے آنے والے دو میں سے ایک اس پراڈو سے اترا تھا جس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا اور یقیناً جس کے باہر نکلنے ہی کے لیے گیٹ کھولا جا رہا تھا۔ دوسرا گارڈ مکان کی مرکزی عمارت کے بائیں پہلو سے نمودار ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک عدد کلاشنکوف موجود تھی۔ پراڈو سے برآمد ہونے والا گارڈ البتہ خالی ہاتھ تھا لیکن اس نے بغلی ہولسٹر پہن رکھا تھا جس میں یقینی طور پر ایک خطرناک مشین پسٹل موجود تھا۔

''خوچہ تم کون اے اور اِدر کیا کرنے کے واسطے آیا اے؟'' گارڈ روم سے برآمد ہونے والے گارڈز میں سے ایک نے ان سے سوال کرنے میں پہل کی جبکہ باقی تینوں اس انداز میں ان کی طرف دیکھتے رہے جیسے ان کی اس حرکت پر ابھی انہیں ثابت نگل جائیں گے۔

''سوری خان صاحب! ہم کسی غلط نیت سے اس مکان میں نہیں گھسے ہیں۔ ایکچوئلی مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پیچھے کچھ غنڈے لگ گئے تھے اور ان سے بچنے کے لیے ہمیں مجبوراً اس مکان میں پناہ لینی پڑی۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ وہ ہم پر فائرنگ کر رہے تھے۔ اگر میرا ساتھی اپنی بائیک اس مکان کے اندر لانے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو ہم ان غنڈوں کی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہوتے۔''

بشریٰ جو بائیک سے نیچے اتر کر کھڑی ہو چکی تھی، جلدی جلدی وضاحت دینے لگی۔ معاذ نے اس کا ساتھ دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرح کی صورتِ حال میں کسی خاتون کا بات کرنا زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے۔ مخاطب اگر مرد ہو تو خواتین انہیں کسی بھی بات پر قائل یا متاثر کرنے میں خاصی کامیاب رہتی ہیں۔ بشریٰ کی وضاحت کے ردعمل میں اس نے خود کو گھیرے میں لینے والے افراد کے تناؤ میں واضح کمی آتی ہوئی محسوس کی، ساتھ ہی اس نے یہ بھی نوٹ کر لیا کہ پراڈو سے اتر کر آنے والے گارڈ نے باقی گارڈز کو ہاتھ کی خفیف سی جنبش سے اشارہ کیا تھا اور خود تیزی سے مڑ کر دوبارہ پراڈو کی طرف چلا گیا تھا۔

معاذ نے خود بھی ہلکی سی گردن موڑ کر اس طرف دیکھا۔ رنگین شیشوں کی وجہ سے وہ اندر سوار افراد میں سے کسی کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ اندر سے انہیں دیکھا جا رہا ہے۔ یہ احساس اسے ابھی نہیں ہوا تھا۔ بائیک روکنے کے بعد سے ہی وہ اس بات کو محسوس کر رہا تھا لیکن یہ کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔ وہ جس انداز میں اس مکان میں داخل ہوئے تھے، اندر والوں کو ان کی طرف سے متجسس اور مشکوک نظروں سے دیکھنے کا پورا پورا حق تھا لیکن پھر بھی جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اسے بہت خاص نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ کون.....؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اسے بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ پراڈو کی طرف جانے والا گارڈ پچھلے دروازے کے پاس جا کر رکا تو کھڑکی کا شیشہ نصف سے بھی کچھ کم نیچے کھسک گیا۔ گارڈ بصد احترام اندر موجود ہستی سے بات کرنے لگا۔ یقیناً وہ اندر موجود ہستی کو ان دونوں کی یہاں موجودگی کے سبب سے آگاہ کر رہا تھا۔ بات مکمل کر کے وہ خاموش ہوا تو اس کے انداز سے ظاہر ہونے لگا کہ اب وہ توجہ سے کسی کی بات سن رہا ہے۔ آدھا منٹ سے بھی کم عرصے میں اس نے اپنے سر کو مؤدبانہ جنبش دی اور دوبارہ ان کی طرف آنے لگا۔

''آپ لوگوں کو میرے ساتھ ڈرائنگ روم تک چلنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔ مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو احترام سے اندر بٹھاؤں۔'' ان کے قریب پہنچ کر اس نے مہذبانہ لہجے میں ان تک پیغام پہنچایا۔ حلیے سے وہ گارڈ ہی لگتا تھا لیکن اس کی چال ڈھال اور بات چیت میں جو قرینہ تھا، وہ سے اچھا تعلیم یافتہ شخص ظاہر کر رہا تھا۔

''ہمیں یہیں سے اجازت مل جاتی تو اچھا ہوتا۔ میری ساتھی کو ایک ضروری کام سے کسی جگہ پہنچنا تھا اور ہم نے وقت کی بچت کے خیال سے ہی اس شارٹ کٹ کو

اختیار کیا تھا کہ اس مصیبت میں پڑ گئے۔'' معاذ کو اب یہاں کچھ عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی اس لیے وہ مزید یہاں رکنے سے گریز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے آپ پر کسی کی نظروں کے ارتکاز کا احساس اب بھی اسے ہو رہا تھا جس سے وہ کچھ بے اطمینانی سی محسوس کر رہا تھا۔

''کوشش ہوگی کہ آپ کا زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔ اصل میں خان پیلس کی اپنی کچھ روایات ہیں اور یہاں اس بات کو گوارا نہیں کیا جاتا کہ گھر آئے مہمانوں کو بغیر خاطر مدارت کے رخصت کر دیا جائے۔'' اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ معاذ اس کی بات سن کر دھیرے سے ہنس دیا اور بولا۔

''مہمان کہاں کے جناب! ہم تو یوں ہی بلائے ناگہانی کی طرح یہاں ٹپک پڑے ہیں۔ ہماری خاطر مدارت تو کسی طور آپ کے لیے لازم نہیں ہے۔''

''مہمان نہ سہی، خود کو پناہ گزین ہی سمجھ لیجیے۔ خان پیلس کی چار دیواری نے آپ کو پناہ دی ہے تو اب کسی طور یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کے تحفظ کا اطمینان کیے بغیر آپ کو یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔ فی الوقت تو خدشہ ہے کہ کہیں وہ غنڈے آگے کسی جگہ آپ لوگوں کے منتظر ہوں اور فوراً باہر نکلنے کی صورت میں آپ لوگ دوبارہ مصیبت میں پھنس جائیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ لوگ کچھ وقت یہاں گزار کر روانہ ہوں۔ یہاں سے ہمارے گارڈز بھی آپ کو کسی محفوظ مقام تک چھوڑ کر آسکتے ہیں۔ اصل میں یہ علاقہ عام آبادی سے کچھ ہٹ کر ہے اس لیے گزرنے والے لوگوں کو بعض اوقات پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں موجود چند گھروں کے افراد بہادر بھی ہیں اور سب نے گھروں پر حفاظت کا مناسب انتظام بھی کر رکھا ہے اس لیے کراچی جیسے بڑے اور پُرشور شہر میں مزے سے پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔'' نرم لہجے میں بولتے ہوئے اس کا پیہم اصرار جاری تھا۔ لگتا تھا اوپر سے پُرزور حکم ملا ہے۔ معاذ نے کچھ بے بسی کے عالم میں مشورہ کرنے کے انداز میں بشریٰ کی طرف دیکھا تو اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور بولی۔

''اگر یہ ہم جیسے بن بلائے مہمان کی میزبانی پر اتنے مصر ہیں تو ہمیں انکار کر کے ان کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ ویسے بھی ان کے دلائل میں دم ہے۔ میں خود بھی مناسب نہیں سمجھتی کہ ہم فوری طور پر باہر نکلیں اور دھر لیے جائیں۔ ہمیں اتنی دیر تو یہاں رکنا چاہیے کہ وہ لوگ ہماری طرف سے مایوس ہو جائیں۔''

''آیئے، اندر تشریف لے چلیں۔'' انہیں ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھنے کی دعوت دینے والے گارڈ نے بشریٰ کی رائے سنی تو ایک بار پھر مہذبانہ لہجے میں بولا۔ باقی گارڈز اس کے اشارے پر پہلے ہی وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ وہ معاذ اور بشریٰ کو اپنی راہنمائی میں مرکزی عمارت کے اندر، ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم کی وسعت اور آرائش خیرہ کن تھی۔ فرش پر بچھے غالیچوں اور دیواروں پر موجود مینا کاری و پچی کاری کے نمونوں سے لے کر فرنیچر، شوپیسز اور پینٹنگز تک ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ اس ڈرائنگ روم کی آرائش و زیبائش میں لاکھوں روپے خرچ کیے گئے ہوں گے۔ باہر سے دیکھنے پر بھی انہیں یہ مکان عالیشان ہی لگا تھا لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر سے جتنا نظر آ رہا تھا، وہ اندر کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔ اتنے قیمتی ساز و سامان کے ساتھ ایسے علاقے میں رہنے والے اگر محافظوں کی فوج کے ساتھ رہ رہے تھے تو ٹھیک ہی رہ رہے تھے۔

ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی اپنی جگہ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے وہ دونوں ایک معطر جھونکے کا احساس ہونے پر چونکے۔ ڈرائنگ روم اگرچہ پہلے ہی ائرفریشنر سے مہک رہا تھا لیکن تازہ خوشبو کا یہ احساس بالکل ہی جدا تھا۔ خوشبو کی سمت کا تعین کرتے ہوئے دونوں نے بیک وقت اپنے دائیں جانب دیکھا تو انہیں فوراً ہی وہ ہستی نظر آ گئی جس کے وجود سے وہ انوکھی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک پچیس چھبیس سالہ عورت تھی جس کے بے تحاشا حسن نے ڈرائنگ روم کی خوبصورتی کو ماند کر دیا تھا اور اب وہاں اس کے سوا کوئی دوسری شے قابلِ دید محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ عورت نے اسکن ٹائٹ پینٹ کے اوپر نہایت چست آدھے بازوؤں کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اتنے متناسب جسم کی مالک تھی کہ کہیں ایک انچ بھی فاضل گوشت کی موجودگی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دبلا ہونے کے خبط میں مبتلا ڈائٹنگ کی ماری خواتین کی طرح سوکھی سڑی بھی نہیں تھی۔ اس کا جسم مخصوص مقامات پر مناسب حد تک بھرا ہوا تھا اور سانسوں کی آمد و رفت سے پیدا ہونے والا زیر و بم کسی کی بھی سانسیں اتھل پتھل کر دینے کا سبب بن سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں اور بال شہد رنگ کے تھے اور چمپئی رنگت میں کچھ ایسا سنہرا پن تھا کہ اس پر کسی سونے کی گڑیا کا گمان ہوتا تھا۔ ترشے ہوئے ہونٹ، ستواں ناک اور بڑی بڑی غزالی آنکھوں کے ساتھ وہ بے داغ حسن کی مالک تھی۔ اس

کی ٹھوڑی پر بائیں جانب موجود قدرے موٹا سا تل دولتِ حسن پر دربان کے فرائض انجام دے رہا تھا یا حسن کی تجلیوں کو مزید نمایاں کر رہا تھا، اس بات کا فیصلہ کرنا ذرا مشکل تھا۔

ان دونوں سے نظریں چار ہونے پر وہ اخلاقاً مسکرائی تو اس کے حسن کو مزید چار چاند لگ گئے پھر وہ سج سج چلتی ان کی طرف بڑھنے لگی تو گویا اس کے ہر قدم پر بجلیاں سی گرنے لگیں۔ حقیقت میں وہ ان عورتوں میں سے تھی جو سراپا قیامت ہوتی ہیں۔ وہ دونوں اس کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ان کے مقابل پہنچ کر ہاتھ سے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی پھولوں سے لدی کسی لچکیلی شاخ کی طرح لہراتی ہوئی نرم و دبیز صوفے پر بیٹھ گئی۔ ان سے گفتگو کرنے والا گارڈ بھی تیزی سے اس صوفے کی پشت پر آ کھڑا ہوا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر نکل گیا تھا اور اب اپنی مالکن کے پیچھے پیچھے دوبارہ اندر آیا تھا۔ معاذ اور بشریٰ اس حسنِ مجسم کے نظارے میں اتنے محو تھے کہ پہلے گارڈ کی اس کے پیچھے موجودگی کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔

''میرا نام سونیا خان ہے۔ میں اپنے شوہر داراب خان کے ساتھ یہاں رہتی ہوں۔ میں اس وقت کہیں باہر جانے کے ارادے سے نکل ہی رہی تھی کہ آپ دونوں آندھی طوفان کی طرح وارد ہو گئے۔ میرے سیکریٹری کم گارڈ حامد نے مجھے بتایا کہ آپ چند غنڈوں سے بچنے کے لیے ایسا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے تو میں نے سوچا کہ مجھے آپ شریف لوگوں سے ملاقات کر کے معلوم کرنا چاہیے کہ آپ کو کسی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے..... لیکن میرے خیال میں کسی اور بات سے پہلے تعارف کا مرحلہ مکمل ہو جانا چاہیے۔ کیا میں اپنے خوبصورت مہمانوں سے ان کے نام پوچھ سکتی ہوں؟'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ باری باری ان دونوں کو دیکھا۔ معاذ نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سونیا کی نظریں کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گئی ہوں۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ یہی وہ آنکھیں تھیں جو پراڈو میں سے بھی اسے مستقل دیکھ رہی تھیں۔ اب درمیان میں رنگین شیشوں کی آڑ نہیں تھی تو وہ اسے مستقل اور یک ٹک نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اس کے دیکھنے میں کوئی ایسی بات تھی کہ معاذ کو مرد ہوتے ہوئے بھی الجھن سی ہو رہی تھی۔

''میرا نام بشریٰ گلزار ہے اور یہ میرے یونیورسٹی فیلو معاذ ہیں۔ ہم دونوں آپ کے شکر گزار ہیں کہ نہ صرف ہمیں آپ کے گھر میں پناہ ملی بلکہ آپ نے ہمیں معزز مہمانوں کی طرح عزت بھی دی۔ بہر حال ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں کہ ایک تو ہم کسی بیل کی طرح منہ اٹھائے آپ کے گھر میں آ گھسے، دوسرے ہماری وجہ سے آپ کا پروگرام خراب ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں آپ کا مزید وقت خراب نہیں کرنا چاہیے اور جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ اصل میں تو ہم باہر سے ہی رخصت ہو جانا چاہتے تھے لیکن آپ کے سیکریٹری کم گارڈ کے بے حد اصرار پر ہمیں رکنا پڑا۔'' معاذ کو خاموش دیکھ کر بشریٰ نے قرینے سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے رخصت ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔

''اوہ نو..... آپ لوگوں کو اتنے تکلف سے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی خاص کام سے باہر نہیں جا رہی تھی بلکہ اصل میں تو میں بوریت سے گھبرا کر باہر نکل رہی تھی کہ کچھ دیر کسی شاپنگ سینٹر میں ٹائم کٹ جائے گا اور پھر موڈ ہوا تو واپسی میں کسی فرینڈ کے گھر چلی جاؤں گی۔ داراب آج کل آؤٹ آف کنٹری ہیں تو میں بہت بور ہو رہی ہوں حالانکہ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن میں اس لیے نہیں گئی کہ وہ اپنی بزنس میٹنگز میں بزی ہو جائیں گے تو میں بور ہوتی رہوں گی لیکن اب سوچ رہی ہوں کہ یہاں رہ کر بور ہونے سے بہتر تھا کہ میں ان کے ساتھ جا کر ہی بور ہو لیتی۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ دھیمے سروں میں ہنسی۔ وہ صورت کے ساتھ ساتھ بڑی خوبصورت اور کھنک دار آواز کی بھی مالک تھی اور اس کی ہنسی بھی بہت مترنم تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے اسے بے پناہ نواز کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ حسن کے ساتھ ساتھ اس کے پاس ثروت بھی تھی اور کسی ایک شخص کے پاس اتنی بہت سی نعمتیں ایک ساتھ کم ہی ہوتی ہیں۔ اگر اتفاق سے ہوں تو عموماً ایسے لوگ مغرور اور نخریلے ہوتے ہیں لیکن وہ بڑی خوش اخلاق اور خوش گفتار بھی تھی جو اجنبیوں سے بھی اتنی اچھی طرح پیش آ رہی تھی۔ اس کی خوش اخلاقی کا ایک اور ثبوت بھی ان کے سامنے آ گیا۔ ڈرائنگ روم کے جس اندرونی دروازے سے وہ اور اس کا سیکریٹری حامد اندر داخل ہوئے تھے، اسی دروازے سے ایک تقریباً پینتیس چالیس سالہ عورت ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ٹرالی خورد و نوش کی اشیا سے بھری ہوئی تھی۔ بے شمار اسنیکس کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے اور گرم دونوں طرح کے مشروبات بھی موجود تھے کہ مہمانوں کو ان کی پسند کے مطابق

پیش کیے جاسکیں۔ ملازمہ سروس کے لیے وہیں موجود رہی اور سونیا بے حد اصرار کے ساتھ انہیں ایک ایک چیز کھانے کی ترغیب دیتی رہی۔ نہ نہ کرتے بھی انہیں بہت کچھ کھانا پڑا کہ جہاں میزبان اتنے اخلاق سے اتنا زیادہ اصرار کر رہا ہو، وہاں مہمان کے لیے انکار کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے۔

کھانے پینے کے سلسلے کے دوران وہ ان دونوں سے ان کے بارے میں چھوٹے چھوٹے سوالات بھی کرتی رہی۔ بشریٰ کے والد گزار عاصم کے حوالے پر وہ بہت خوش ہوئی کہ اسے اتنے بڑے صحافی کی بیٹی سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ گفتگو میں اس نے معاذ اور بشریٰ دونوں کو یکساں توجہ سے نوازا لیکن معاذ محسوس کرتا رہا کہ وہ اس کی طرف خاص انداز سے دیکھ رہی ہے۔ بہر حال سونیا کی خوش اخلاقی کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے لیے دیے انداز کو ترک کرنا پڑا تھا اور بشریٰ کے ساتھ ساتھ وہ بھی گفتگو میں برابر سے حصہ لیتا رہا تھا۔ سونیا نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ اس کا شوہر داراب خان امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے اور ان کی شادی کو صرف دو سال کا ہی عرصہ گزرا ہے۔ فی الحال ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور سونیا کے سسرالی رشتے دار بھی گاؤں میں رہتے تھے اس لیے داراب کی غیر موجودگی میں وہ شدید تنہائی اور بوریت کا شکار ہو جاتی تھی۔ اتفاق سے سونیا کا میکا بھی ایک دوسرے شہر میں تھا اس لیے یہاں اس کے زیادہ وسیع تعلقات نہیں تھے۔

آدھے پون گھنٹے کی اس ملاقات میں ان کے درمیان اتنی بے تکلفی ہو چکی تھی کہ آپس میں سیل نمبرز کے تبادلے بھی ہو چکے تھے اور سونیا ان سے یہ وعدہ بھی لے چکی تھی کہ فرصت ملنے پر وہ پھر کسی دن خان پیلس کا چکر ضرور لگائیں گے۔ دورانِ گفتگو سرسری طور پر ان غنڈوں کے بارے میں بھی بات ہوئی تھی جن سے بچ کر معاذ اور بشریٰ نے خان پیلس میں پناہ لی تھی اور جنہوں نے ان پر ایک فائر بھی کیا تھا۔ معاذ نے سونیا کے سامنے ان غنڈوں سے متعلق مکمل لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے یہ رائے دی تھی کہ یہ اسٹریٹ کرائم کی ایک کوشش تھی اور وہ لوگ اسے اور بشریٰ کو روک کر انہیں لوٹنا چاہتے تھے لیکن اس نے بائیک نہیں روکی اور خان پیلس کے کھلے دروازے سے اندر گھس گیا تو جھنجلاہٹ میں وہ لوگ گیٹ پر ہی ایک فائر مار کر بھاگ گئے۔ پچھلے تین فائرز کا اس نے سونیا سے ذکر ہی نہیں کیا تھا، اسے امید نہیں تھی کہ ان بلند و بالا مضبوط دیواروں کے اندر کافی فاصلے پر ہونے والے وہ فائرز سنے گئے ہوں گے۔

اگر کسی نے گولیاں چلنے کی آواز سنی بھی تھی تو کراچی جیسے ہنگامہ خیز اور امن و امان کی خراب صورتِ حال سے دوچار شہر میں دو تین فائروں کی طرف کوئی توجہ ہی کہاں دیتا تھا۔ لوگوں کے لیے یہ ایک روٹین کی بات ہو گئی تھی۔ اسٹریٹ کرائمز کا بھی یہ حال تھا کہ ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور متاثر ہو چکا تھا اس لیے کوئی بھی نیا پیش آنے والا واقعہ لوگوں کے لیے نیا پن نہیں رکھتا تھا۔ سونیا نے بھی اس حوالے سے لگے بندھے دو تین جملے ادا کیے اور پھر موضوع بدل دیا۔

ایک گھنٹے کے قریب وقت گزار کر وہ لوگ وہاں سے روانہ ہونے لگے تو ان کے منع کرنے کے باوجود ایک کھلی جیپ میں دو گارڈز ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ ان گارڈز نے کافی دور تک انہیں چھوڑا اور اس دوران اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ کوئی مشکوک گاڑی ان کا پیچھا نہیں کر رہی ہے پھر واپس پلٹ گئے۔

''میں بھی یہیں اتر کر وین سے گھر چلی جاتی ہوں۔ پہلے ہی آپ کا خاصا وقت ضائع ہو گیا ہے۔'' بشریٰ نے معاذ سے کہا۔

''اب تو وقت ضائع ہو ہی گیا ہے تو بہتر ہے میں تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا دوں۔'' معاذ نے بائیک روکے بغیر اسے جواب دیا۔ بشریٰ نے بھی اپنی بات پر دوبارہ اصرار نہیں کیا اور کچھ دیر کے توقف کے بعد بولی۔

''کیا خیال ہے، ہم پر یہ حملہ کامی اور سلطان کی طرف سے ہوا تھا؟''

''حال میں تو ان ہی لوگوں سے دشمنی پالی ہے۔'' اس نے جیسے بشریٰ کے شک کی تائید کی۔

''لیکن وہ گاڑی ان کی نہیں تھی۔ میں نے کبھی ان میں سے کسی کو سرخ شیراڈ استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' بشریٰ نے نکتہ اٹھایا۔

''ان کے باپوں کے پاس حرام کا بہت مال ہے۔ گاڑی بدل کر لے آنا ان کے لیے کون سا مسئلہ ہے۔'' معاذ نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

''اس کا ایک مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ آج ہم پر حملہ کرنے کی پلاننگ سے ہی آئے تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصل میں ہم میں سے کون ان کا نشانہ تھا۔ یہ تو اتفاق ہی تھا کہ آج ہم ایک ساتھ یونیورسٹی سے نکلے ورنہ یہ ہمارا معمول تو نہیں ہے۔'' بشریٰ اب بالکل کسی منجھے ہوئے صحافی کی طرح باریک بینی سے سوالات اٹھا رہی تھی۔

''کل ملنے والی دھمکی کی روشنی میں تو میں یہی سوچ

سکتا ہوں کہ ان کا نشانہ میں تھا۔'' معاذ نے جواب دیتے ہوئے عقبی آئینے پر نظر ڈالی۔ کل گھر جانے سے قبل اس نے بڑی محنت سے آئینے پر لکھی اس تحریر کو مٹایا تھا کہ گھر والوں خصوصاً امی کی نظر اس تحریر پر پڑ گئی تو وہ بہت پریشان ہو جائیں گی۔

''جب سے یزدانی بلڈرز والوں کا بھانڈا پھوٹا ہے، دھمکیاں مجھے بھی مسلسل مل رہی ہیں۔ بس میں نے آپ سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔'' بشریٰ نے گویا اس کے سامنے اعتراف کیا۔

''خیر، اس بات سے زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا کہ آج کا حملہ کس کے لیے پلان کیا گیا تھا۔ ہم دونوں ہی ان کی ہٹ لسٹ پر آچکے ہیں اور وہ ہم دونوں ہی کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر وہ خوش ہوئے ہوں کہ ایک ساتھ ہی دونوں سے نمٹ لیں گے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں خان پیلس میں پناہ لینے کا موقع مل گیا ورنہ شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔'' معاذ نے اپنی رائے کا اظہار کیا جس سے بشریٰ کو بھی اختلاف نہیں تھا۔

''کاش ہم شیراڈ کا نمبر نوٹ کر پاتے تو اس واقعے کی ایف آئی آر ہی کٹوا دیتے۔ یزدانی بلڈرز والوں پر اپنے کالم کے حوالے سے شک کا اظہار تو میں اب بھی کر سکتی ہوں۔''

''رہنے دو یار! یہ ایف آئی آر وغیرہ۔ مجھے یقین ہے کہ ہم نمبر نوٹ بھی کر لیتے تو وہ جعلی ہی نکلتا۔ حملے کے حوالے سے بھی ہمارے پاس سوائے اپنے الزام کے کوئی ثبوت نہیں ہے سونیا خان کو ہم نے اصل بات بتا دی ہوتی تو شاید وہ گواہی دے دیتی لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ لوگ عام طور پر اس قسم کے معاملات سے الگ رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ جن لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑا ہے، وہ خاصی اونچی پارٹی ہیں اور پولیس ایسے لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کرتی۔ تم نے جو اتنی محنت کر کے اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر یزدانی بلڈرز والوں کے خلاف اتنی تحقیق کی ہے، اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ بس ٹاک شوز کے لیے میڈیا والوں کو ایک موضوع مل گیا ہے جو جلد ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ ہماری پولیس یا کسی دوسرے متعلقہ محکمے کے تو کان پر جوں تک نہیں رینگے گی کہ خود اس معاملے کی تحقیق کر کے یزدانی بلڈرز کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں۔ یہ پاکستان ہے بشریٰ صاحبہ اور ہم پاکستان کے جس سب سے بڑے شہر میں رہ رہے ہیں یہاں عوام کی شکایات پر کان دھرنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ عام آدمی کو تو یہاں اپنا شناختی کارڈ گم ہو جانے کی ایف آئی آر کٹوانے کے لیے بھی پہلے رشوت دینی پڑتی ہے۔ تم بچی پکی صحافی ہونے اور ایک بڑے صحافی کی بیٹی ہونے کے ناتے ایف آئی آر آسانی سے کٹوانے میں کامیاب ہو جاؤ گی لیکن اس کی حیثیت رسمی کارروائی سے زیادہ نہیں ہوگی پھر کیا ضرورت ہے اپنا وقت ضائع کرنے کی۔'' یہ شاید پہلا موقع تھا کہ معاذ کو بشریٰ کے سامنے اتنی طویل بات کرنے کا موقع ملا تھا ورنہ تو عموماً وہ ہی بولتی چلی جاتی تھی۔

''یہ سب باتیں بھی جانتی ہوں لیکن یہ تو نہیں ہوسکتا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے بندہ سچ بولنا اور حق کا اظہار کرنا ہی چھوڑ دے۔ اس معاشرے میں کم از کم چند لوگوں کو تو اپنے حصے کی ذمے داری ادا کرتے رہنا چاہیے۔'' وہ بولی تو اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

''میں تمہیں سچ اور حق کے اظہار سے نہیں روک رہا ہوں۔ میں خود اس بات کا قائل ہوں کہ انسان کو اپنے دائرے میں رہتے ہوئے جدوجہد جاری رکھنا چاہیے بلکہ میرا یہ ماننا بھی ہے کہ مٹھی بھر ایمان دار لوگوں کی وجہ سے ہی یہ ملک اب تک سلامت بھی ہے ورنہ بدعنوان اور سازشی ٹولے نے تو اس ملک کا بیڑا غرق کرنے میں کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی ہے۔ میں تو تمہیں صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان لوگوں سے امید لگانے کی کوشش نہ کرو جن کا کچھ نہ کرنا طے ہے۔ یہاں حالات ایسے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے ہمیں خود کرنا ہے۔'' اس نے بشریٰ پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ باتوں کے دوران میں وہ لوگ راشد منہاس روڈ سے گزر کر شارع فیصل پر بائیں جانب مڑ چکے تھے۔

''معاذ! ہمارے پیچھے ریڈ شیراڈ آرہی ہے۔'' اچانک ہی بشریٰ نے اسے اطلاع دی تو وہ چونک کر بیک ویو مرر میں دیکھنے لگا۔ واقعی سیاہ شیشوں والی سرخ شیراڈ کچھ فاصلے سے ان کے پیچھے تھی۔ خان پیلس سے روانہ ہونے کے بعد نیپا چورنگی تک ان کے ساتھ سونیا خان کے گارڈز کی گاڑی تھی پھر بھی وہ اپنے اطراف سے چوکنا رہا تھا اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ سرخ شیراڈ یا کوئی دوسری مشکوک گاڑی تو ان کے پیچھے نہیں آرہی ہے۔ پھر راشد منہاس روڈ پر بھی اس نے اپنے تعاقب کی طرف سے ہوشیار رہنے کی کوشش کی تھی اور مطمئن ہو گیا تھا کہ کوئی گاڑی خاص طور پر ان کے پیچھے نہیں ہے۔ کچھ بشریٰ سے باتوں میں مصروف ہو جانے کے باعث بھی اس کی توجہ بٹ

گئی تھی اس لیے اسے پتا نہیں چل سکا تھا کہ سرخ شیراڈ کب دوبارہ ان کا تعاقب شروع کر چکی ہے۔ اتنا اندازہ بہرحال اسے تھا کہ یونیورسٹی روڈ اور راشد منہاس روڈ پر ان کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا اور شارع فیصل پر آنے کے بعد ہی سرخ شیراڈ دوبارہ ان کے پیچھے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ وہیں کہیں موجود ان کا انتظار کر رہے تھے۔ گویا انہیں یقین تھا کہ وہ لوگ یہاں سے ضرور گزریں گے۔

معاذ کی اپنی رہائش گلبرگ کے علاقے میں تھی اور سرخ شیراڈ کے یہاں انتظار کرنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اصل میں وہ لوگ بشریٰ کے پیچھے تھے۔ معاذ نے اندازہ لگایا کہ آج کے تعاقب کا تعلق کامی اور سلطان سے ہونے والی ان کی جھڑپ سے نہیں ہے۔ یہ شاید بشریٰ کے یزدانی بلڈرز والوں کے خلاف لکھنے کا ردعمل تھا۔ ان جیسے لوگوں کے لیے یہ معلوم کرنا کونسا مشکل تھا کہ بی۔ گلزار کے نام سے لکھنے والی اصل میں یونیورسٹی کی ایک طالبہ بشریٰ گلزار ہے۔ انہیں اس کی رہائش گاہ کے بارے میں علم ہونا بھی بعید از امکان نہیں تھا اسی لیے وہ ایک بار ناکام ہونے کے بعد یہاں گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے۔

بشریٰ کی جان خطرے میں محسوس کر کے معاذ کے اعصاب تن گئے اور وہ کوشش کرنے لگا کہ سرخ شیراڈ اور ان کے درمیان فاصلہ رہے۔ بائیک جیسی چھوٹی سواری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ آرام سے ٹریفک میں اپنے لیے راستہ بنا رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ انہیں بڑی گاڑیوں کی آڑ میسر رہے تاکہ شیراڈ والوں کے لیے انہیں نشانہ بنانا آسان نہ ہو۔ ویسے بھی شارع فیصل جیسی معروف شاہراہ پر کسی گاڑی سے فائر کر کے فرار ہو جانا آسان نہیں تھا۔ معاذ بہرحال رسک نہیں لے سکتا تھا اس لیے ناتھا خان کا پل پار کر کے کالونی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے بھی اس نے اپنی حکمتِ عملی کو برقرار رکھا۔ ڈرگ روڈ کی طرف سے آتے ہوئے یہاں بہت سے قدرے تنگ گلیوں والے رہائشی مکانات کے علاوہ کچھ کشادہ محلے بھی موجود تھے۔ بشریٰ کا گھر دوسو گز کے پلاٹ پر بنا ہوا تھا لیکن گلی خاصی کشادہ تھی اور معاذ جب پہلی بار اسے اس کے گھر چھوڑنے گیا تھا تو اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ علاقے کے دوسرے حصوں کی نسبت اس کا محلہ زیادہ صاف ستھرا تھا۔ شاید وہاں رہنے والے گلزار رعاصم صاحب ہی کی طرح سفید پوش لیکن تعلیم یافتہ اور باشعور لوگ تھے۔

شاہ فیصل کالونی کے داخلی راستے کے ساتھ ساتھ چلتی طویل ریلوے لائن کی وجہ سے علاقے میں داخلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا اس لیے چند سال پہلے ایک اوور ہیڈ برج تعمیر کر دیا گیا تھا۔ کالونی گیٹ سے آگے جا کر بائیں ہاتھ پر یہ برج شروع ہوتا تھا اور گھومتا ہوا شارع فیصل کو پار کر کے ایک شاپنگ سینٹر کے قریب اترتا تھا۔ معاذ اس پل کے قریب پہنچا تو اس نے اپنی بائیک کی رفتار کچھ اور بھی بڑھا دی اور تیزی سے بائیک کو پل پر لے گیا۔

''شیراڈ ہمارے پیچھے نہیں آ رہی، وہ سیدھی نکل گئی ہے۔'' بشریٰ نے اسے اطلاع دی اور ساتھ ہی تبصرہ کیا۔

''ہوسکتا ہے یہ کوئی دوسری گاڑی ہو۔ اتنے بڑے شہر میں کوئی ایک ہی تو سرخ شیراڈ نہیں ہوگی۔''

''میرے اندازے کے مطابق یہ وہی گاڑی تھی۔ مصروف شاہراہ کی وجہ سے انہوں نے فائر کرنے سے گریز کیا ہوگا۔ ویسے بھی جہاں تک میرا اندازہ ہے، وہ ہمیں ہلاک کرنے سے زیادہ خوفزدہ کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جب ہم پر فائرنگ کی جا رہی تھی تب بھی انہوں نے ہمیں براہِ راست نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ اس کھلی اور ویران جگہ پر یہ کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں تھا۔ اب بھی ہمارے پیچھے آنے کے بعد یوں اچانک پیچھا چھوڑ کر آگے نکل جانے کا مقصد یہی سمجھ آتا ہے کہ وہ ہمیں بلکہ تمہیں یہ جتانا چاہتے ہیں کہ وہ بہت بااختیار ہیں اور جب جو چاہے کر سکتے ہیں لیکن فی الحال ڈھیل دے رہے ہیں۔ مجھے یہ یزدانی بلڈرز والا معاملہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ سنا ہے انہوں نے جس بندے کی زمین پر قبضہ کیا ہے تمہارے برپا کیے گئے ہنگامے کی وجہ سے اسے بھی اطلاع مل گئی ہے اور وہ معاملے کی تحقیق کے لیے خود پاکستان واپس آ رہا ہے۔ یزدانی بلڈرز والے پہلے ہی تم پر خار کھائے بیٹھے ہوں گے، اس اطلاع کے بعد انہوں نے ردعمل میں تمہیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی ہوگی، تمہارے پاس ان کی جعلسازی کے تمام ثبوت موجود ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اصل مالک عدالت میں ان کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے پہلے تم سے مدد مانگے۔ اس لیے وہ تمہیں دھمکانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ تم اس معاملے میں مزید اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ اور خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ جاؤ۔'' معاذ کے تیز ذہن نے بڑی پھرتی سے حالات کا تجزیہ کر لیا تھا۔

''مجھے بھی اسی طرح کا شک ہو رہا ہے، بہرحال دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ بلی آخرکار تھیلے سے باہر آ ہی

جائے گی۔'' بشریٰ نے حیرت انگیز طور پر اس کے تجزیے پر بہت اختصار سے تبصرہ کیا۔ شاید وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ معاذ نے بھی اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پل ختم ہونے کے بعد وہ بائیک کو بشریٰ کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر ڈال چکا تھا۔ چند منٹ کا یہ راستہ خاموشی سے طے ہوا۔

''اندر آجائیں معاذ۔ اپنی پسند کے مطابق ٹھنڈا، گرم جو چاہیں پی کر جایئے گا۔'' ڈور بیل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بشریٰ نے اسے دعوت دی۔

''نہیں بابا! پہلے ہی میں لیٹ ہوگیا ہوں، ویسے بھی سونیا خان کی خاطر مدارت کے بعد مزید کسی چیز کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی ہے۔ مجھے آج تجربہ ہوا ہے کہ زبردستی کے مہمانوں کی طرح کبھی کبھی زبردستی کے میزبان بھی گلے پڑجاتے ہیں۔'' معاذ نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو بشریٰ ہنس دی اور شوخی سے بولی۔

''زبردستی کی سہی، میزبان اگر سونیا خان جیسی ہستی ہو تو بندہ بور نہیں ہوتا اور آپ پر تو وہ ذرا زیادہ ہی مہربان نظر آرہی تھی۔ آپ کے لیے بڑی مٹھاس تھی اس کی نظروں میں۔ گھر جاکر سات لال مرچوں سے اپنی امی سے نظر اتروا لیجیے گا، کہیں نظر ہی نہ لگ گئی ہو آپ کو سونیا خان کی۔''

''میری فکر چھوڑو اور جاکر اپنی جان کا صدقہ دو۔ بال بال بچ کر نکلی ہو آج۔'' معاذ نے جواباً اسے گھورتے ہوئے مشورہ دیا اور تیزی سے بائیک نکال کر لے گیا۔ اس نے بشریٰ کے گھر کا گیٹ کھلتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اب اس کا ذہن خود بخود سونیا خان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ غضب کی دلکش خاتون تھی اور یقینی طور پر ایک پُرتعیش زندگی گزار رہی تھی۔ شادی شدہ بھی تھی لیکن جانے کیوں اس کی نظروں میں ایک دعوت سی تھی۔ معاذ نے اس چیز کو اپنا وہم بھی سمجھنا چاہا تھا لیکن بشریٰ کے الفاظ نے ثابت کردیا تھا کہ جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا، وہ وہم نہیں تھا۔ سونیا خان اس سے خصوصی التفات برت رہی تھی۔ اس نے اسی وقت اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ سونیا خان کی پُرزور دعوت کے باوجود دوبارہ کبھی اس کے گھر کا رخ نہیں کرے گا اور وہ فون پر بھی رابطہ کرے گی تو اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرے گا۔ اسے اعتراف تھا کہ سونیا خان زہد شکن حسن وادا کی مالک تھی اور ایسی خطرناک عورت سے میل ملاقات رکھنا اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ اسے بہت زیادہ نیک یا پارسا ہونے کا دعویٰ نہیں تھا لیکن اس کا یہ ماننا تھا کہ کردار صرف عورت ہی نہیں مرد کا بھی ہوتا ہے اور کردار کی حفاظت ہر دو فریق پر لازم ہے۔

☆☆☆

''کیسے ہو معاذ؟''

''ویری ڈیشنگ اینڈ ہینڈسم۔'' اس نے خاص انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے شوخی سے جواب دیا تو ثوبیہ ہنس دی۔ اس کی خوبصورت ہنسی پر معاذ کو بے ساختہ ہی بشریٰ کا خیال آیا۔ وہ بھی بے پناہ خوبصورت ہنسی کی مالک شخصیت تھی اور ثوبیہ سے بات کرتے ہوئے معاذ کو احساس ہوا تھا کہ دو بالکل مختلف شخصیت کی مالک لڑکیوں میں ان کی ہنسی مشترکہ خصوصیت ہے۔ بشریٰ کے نقش ونگار اور رنگت سے ذرا مغربیت جھلکتی تھی، اس کے بال چھوٹے تھے اور لباس کے معاملے میں وہ قدرے بے پروا سی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں ثوبیہ مکمل طور پر مشرقی حسن کی مالک تھی۔ گہرے سیاہ چمکتے بالوں اور آنکھوں والی ثوبیہ کے کمر سے بھی نیچے جاتے ہوئے گھنے بالوں پر ایک عالم فدا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر موجود لمبی اور گھنی پلکوں کی جھالر کتنوں کے دلوں کو مسخر کرلینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی رنگت گلابی اور جلد شیر خوار بچوں کی طرح نرم ونازک سی تھی۔ وہ اپنی بے حد خوبصورت کھڑی ناک میں ہیرے کی لونگ پہنا کرتی تھی اور سمجھ نہیں آتا تھا کہ لونگ اس کی ناک کی خوبصورتی میں اضافہ کررہی ہے یا اس کی ناک میں آکر لونگ کی قسمت جاگی ہے۔ اس کے بھرے بھرے گلابی ہونٹوں پر شبنم میں گلاب کی ادھ کھلی کلی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ اپنی راج ہنس جیسی گردن میں سونے کی ایک باریک سی زنجیر پہنا کرتی تھی جس کی لمبائی اتنی تھی کہ بس کالربون تک ہی آپاتی تھی اور زنجیر میں موجود موتی کی شکل کا چھوٹے چھوٹے نگ جڑا لاکٹ کالربون کے پاس بننے والے ہلکے گڑھے میں پڑا اپنی چھب دکھاتا رہتا تھا۔

ثوبیہ کو پہننے اوڑھنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ وہ ایک حد میں رہتے ہوئے فیشن کے مطابق لباس پہنتی تھی اور اس کے لباس میں مشرقیت کا رنگ نمایاں ہوتا تھا، خصوصاً وہ دوپٹے بہت بڑے اور سلیقے کے ساتھ اوڑھتی تھی۔ تو یہ معاذ تھا جس نے اتنے بے تحاشا حسن کی مالک ثوبیہ اور بشریٰ کے درمیان ایک قدرِ مشترک ڈھونڈ نکالی تھی، بس فرق تھا تو یہ کہ ثوبیہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کی خوبصورت ہنسی اور مسکراہٹ بھی اس کے بے تحاشا حسن میں مدغم ہوجاتی تھی جبکہ بشریٰ خوبصورت ضرور تھی لیکن یہ خوبصورتی بے تحاشا نہیں تھی مگر جب وہ ہنستی

تھی تو ایک دم سے جگمگا اٹھتی تھی۔

''کیا ہوا؟ کیا خود ہی اپنی سحر انگیز شخصیت کے سحر میں ڈوب کر رہ گئے؟'' ثوبیہ اور بشریٰ کا آپس میں تقابل کرتا وہ سوچوں میں گم سا ہو گیا تھا۔ ثوبیہ نے چھیڑنے والے انداز میں اسے ٹوکا تو اس کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔ وہ آنکھوں میں شریر سی مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ آپس میں ویڈیو کال کے ذریعے بات کر رہے تھے اس لیے ایک دوسرے کا ہر تاثر اچھی طرح جان سکتے تھے۔

''میری شخصیت کی سحر انگیزی کا ذکر چھوڑو۔ میں نے اس حوالے سے قصے سنانا شروع کیے تو وہ آج کی تاریخ میں ختم نہیں ہوں گے، بس اتنا جان لو کہ دس بیس تو روزانہ یونہی پٹ سے راہ میں گر کر جان دے دیتی ہیں، باقی کتنی اپنی جگہ ہی تڑپ کر رہ جاتی ہیں اس کا میں نے کبھی حساب رکھنے کی کوشش نہیں کی۔'' اس نے بڑے بے نیازانہ انداز میں ثوبیہ کو جواب دیا۔

''اوئی اللہ! اس کا مطلب ہے کراچی میں تو لڑکیوں کا قحط پڑتا جا رہا ہوگا۔ تم جاؤ تو تھوڑی لاہور سے درآمد کروالو۔'' جان بوجھ کر آنکھیں پھیلاتے ہوئے اس نے حیرت اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

''لاہور سے ایک لڑکی درآمد کروانے پر غور تو ہوتا رہتا ہے لیکن میں ہی ڈرتا ہوں کہ کہیں ساری زندگی کڑی گولیاں نگلتے اور بازوؤں میں سوئیاں چبھواتے نہ گزارنی پڑے۔''

اس نے شوخی سے ثوبیہ کو چھیڑا تو اس کے گلابی رخساروں کا گلابی پن کچھ اور بھی بڑھ گیا اور گھنی پلکیں فوراً ہی جھک کر گلابی رخساروں پر سایہ فگن ہو گئیں۔ وہ میڈیکل کی طالبہ تھی اور علینہ کی وجہ سے جانتی تھی کہ علینہ سمیت گھر کے دیگر افراد بھی اسے معاذ کی دلہن بنانے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن باقاعدہ رشتہ ڈالنے کے لیے معاذ کے برسرِ روزگار ہو جانے کے منتظر ہیں۔ خود اس کی تعلیم بھی ابھی جاری تھی اس لیے اس سلسلے میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا جا رہا تھا۔ رشتے اس کے بہت آتے تھے لیکن اس نے صاف الفاظ میں گھر والوں سے کہہ رکھا تھا کہ تعلیم مکمل ہونے تک وہ ایسے کسی جھنجٹ میں پڑنا پسند نہیں کرے گی۔ اصل میں خود اس کے دل میں معاذ کے لیے پسندیدگی کے جذبات تھے اور وہ اتنی مہلت حاصل کرنا چاہتی تھی کہ معاذ بھی تعلیم مکمل کر کے سیٹل ہو جائے۔ معاذ سے اس کی اچھی دوستی ضرور تھی لیکن معاذ نے کبھی کھل کر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا، بس کبھی کبھار ایسے ہی ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی باتیں کر لیا کرتا تھا جو اس کے دل کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔

''یہ تو بتاؤ کہ آج تمہیں میری طرف سے کیا تشویش لاحق ہو گئی تھی کہ تم نے اپنا قیمتی وقت خرچ کرتے ہوئے مجھ غریب کو فون کر ڈالا ورنہ تو سننے میں یہی آتا ہے کہ موصوفہ سے زیادہ مصروف خاتون پورے پاکستان میں کوئی اور نہیں ہے۔'' اس نے ثوبیہ کے شرمانے کو محسوس کر کے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ ثوبیہ کے حوالے سے اپنے جذبات کے بارے میں وہ خود بھی کلیئر نہیں تھا۔ وہ جتنی ذہین اور حسین لڑکی تھی، اس سے تو ہر شخص ہی متاثر ہو سکتا تھا۔ اسے بھی وہ اچھی لگتی تھی لیکن اسے جیون ساتھی بنانے کے معاملے میں وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ اصل میں ابھی اس حوالے سے اس نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کی بے چین روح اسے اکساتی تھی کہ وہ عام لوگوں سے ہٹ کر کچھ کر کے دکھائے۔ تعلیم، نوکری اور پھر شادی والی سیدھی ڈگر پر چلتے چلے جانے پر اس کا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ ثوبیہ سمیت کسی کو بھی اپنا پابند نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ثوبیہ بھی ایک سنجیدہ اور بردبار لڑکی تھی اور اس نے کبھی کھل کر معاذ کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن کہتے ہیں نا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے تو ثوبیہ کی بھی کسی نہ کسی ادا سے اس کے جذبات کا اظہار ہو ہی جاتا تھا جیسے وہ ابھی اس کے چھیڑنے پر شرمائی تھی اور معاذ نے خود پر ایک بوجھ سا پڑتا ہوا محسوس کیا۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ جب وہ اپنے جذبات کے معاملے میں کلیئر نہیں ہے تو اسے ثوبیہ سے اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کر کے اس کے جذبات میں ہلچل مچانے کی غلطی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی لیے اس نے موضوعِ گفتگو بدل دیا تھا اور اس سے اس کے فون کرنے کا سبب پوچھ رہا تھا۔

''ایسی کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ بس رات کچھ عجیب و غریب خواب آتے رہے تھے اور مجھے ایسا لگا تھا کہ شاید تم کسی پریشانی یا تکلیف میں ہو تو میں نے سوچا کہ چلو فون کر کے خیریت معلوم کر لوں۔'' اس کے پوچھنے پر ثوبیہ نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا تو معاذ اپنی جگہ دنگ رہ گیا۔ دور بیٹھے کسی شخص کو کچھ بھی بتائے بغیر اگر یہ علم ہو جائے کہ آپ کسی مشکل یا تکلیف میں ہیں تو اس شخص کے جذبے کی شدت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ تو دل کا دل سے بہت ہی خاص رابطہ ہوتا ہے جو مادی اسباب کے بغیر بھی دوسرے کے بارے میں الہام سا ہونے لگتا ہے۔ ثوبیہ اس سے اس حد

تک دلی وابستگی رکھتی ہے اس کا تو اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔

''کیا ہوا، چپ کیوں ہو گئے؟'' معاذ کو خاموش پا کر ثوبیہ نے اسے ٹوکا۔

''تم نے خواب میں کیا دیکھا تھا جو پریشان ہو گئیں؟'' معاذ نے اس سے پوچھا۔

''یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ کہتے ہیں برے خواب کسی کو نہیں سنانے چاہئیں ورنہ ان کی تعبیر سامنے آجاتی ہے۔'' اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

''اُف! میڈیکل کی اسٹوڈنٹ اور اتنی غیر سائنسی باتیں۔ میں تمہیں اتنی قدامت پسند لڑکی نہیں سمجھتا تھا۔'' معاذ نے جان بوجھ کر اس کی بات سے اختلاف کیا۔

''تم مجھے قدامت پسند کہہ سکتے ہو لیکن میں بعض معاملات میں عقلی اور سائنسی دلائل کے مقابلے میں دل کی گواہی ماننے کی قائل ہوں۔ عقل اور سائنس دھوکا بھی دے جاتے ہیں لیکن دل کی گواہی ہمیشہ سچ نکلتی ہے۔'' اس نے برا منائے بغیر معاذ کو جواب دیا۔

''بہرحال..... تم میری طرف سے اطمینان رکھو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور مزے سے اپنی موج مستی میں لگا ہوا ہوں۔ تصدیق کے لیے چاہو تو اپنے ماموں جان سے رابطہ کر سکتی ہو، وہ تمہیں بتائیں گے کہ تمہارا یہ نکما کزن ان کے لیے کتنا بڑا دردِ سر ہے جسے وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے حساب سے ''سدھانے'' میں ناکام ہیں۔'' وہ جان بوجھ کر لاابالی پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ثوبیہ سمیت وہ کسی کو بھی اپنے حوالے سے تشویش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کامی اور سلطان والے چکر میں جو گڑبڑ چل رہی تھی، کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

''ماموں جان اپنے حساب سے ٹھیک ناراض ہوتے ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ تم اپنی ذہانت اور صلاحیت کو ضائع کر رہے ہو۔ تمام والدین کی طرح ان کی بھی یہ فطری خواہش ہے کہ تم کسی اعلیٰ مقام پر پہنچو لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ تمہارے اندر جو بے چین روح ہے، وہ تمہیں ان کی اس خواہش کی تکمیل نہیں کرنے دیتی۔ جس دن انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ تم ذرا مختلف شخصیت کے مالک ہو اور تم سے اس قسم کی توقع رکھنا تم پر ظلم کرنے کے مترادف ہے تو وہ خود اپنی خواہش سے دستبردار ہو جائیں گے۔ تمہیں ان کی باتوں پر زیادہ دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ تو طے ہے کہ مختلف لوگوں کو عموماً اسی قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' آج تو ثوبیہ اسے حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

وہ آپس میں کزنز تھے اور مختلف شہروں میں رہنے کے باوجود ان کے درمیان اچھی دوستی تھی لیکن وہ اس حد تک اسے سمجھتی تھی، اس بات کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

''میں دل برداشتہ نہیں ہوتا اور اپنے حساب سے ابو کو ہینڈل کر ہی لیتا ہوں لیکن اس بات کا مجھے بھی بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ اکیلے خود مشکل کا شکار نہیں ہوتے، ان کے ساتھ رہنے والے بھی مشکل میں مبتلا رہتے ہیں..... اس لیے ہم جیسوں سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔'' اس نے باتوں باتوں میں ثوبیہ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

''دنیا میں کچھ لوگ مشکل پسند بھی ہوتے ہیں۔'' ثوبیہ نے برجستہ اسے جواب دیا۔ اس جیسی ذہین لڑکی معاذ کی بات کا مطلب نہ سمجھتی، یہ کیسے ممکن تھا۔ اس بار معاذ نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اس موضوع کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ ثوبیہ نے بھی مزید بات نہیں بڑھائی اور دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے سلسلہ منقطع کر دینے کے بعد بھی معاذ لاشعوری طور پر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ ثوبیہ جیسی ہمہ صفت لڑکی کی زندگی کے سفر میں اس کے ساتھ شریک ہونے کی خواہاں تھی تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایک طرح سے وہ اسے اپنی خوش قسمتی بھی قرار دے سکتا تھا لیکن وہ کیا کرتا کہ ابھی اس کا اپنا مستقبل دھند میں لپٹا ہوا تھا اور اس غیر یقینی صورتِ حال میں وہ ثوبیہ کو آس کی ڈور نہیں تھما سکتا تھا۔

☆☆☆

''بلی تھیلے سے باہر آگئی ہے۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میرے پاس یزدانی بلڈرز والوں کی طرف سے فون آیا تھا۔ بات کرنے والے نے اپنا تعارف تو نہیں کروایا لیکن اس کے الفاظ ہی اس کا تعارف تھے۔''

''کیا کہہ رہا تھا وہ شخص؟'' بشریٰ کی اطلاع پر معاذ کے کان کھڑے ہوئے۔ اتفاق سے یہ دونوں ہی کافری پیریڈ تھا اس لیے انہیں ملاقات کا موقع مل گیا تھا اور وہ سرسبز قطعۂ گھاس پر بیٹھے ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔

''کہنا کیا ہے، بس بڑے ٹھنڈے لہجے میں دھمکی دے رہا تھا کہ شیراڈ والوں کا نشانہ اتنا خراب نہیں تھا کہ کوئی کل کا لونڈا موٹر بائیک کے کرتب دکھا کر بچ نکلتا۔ نہ ہی ہمارے پاس اسلحے کی کوئی کمی ہے کہ کسی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو صرف ایک پسٹل کا ہی استعمال کافی سمجھتے۔ ہم تو سرِعام تمہیں بھون ڈالتے اور کوئی ہمیں روکنے والا نہیں ہوتا

وغیرہ۔ میں نے اس سے کہا کہ اس رحم دلی کا شکریہ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ اتنی مہربانی کیوں کی کہ صرف گولیاں ہی چلائیں اور جان بخشی کر دی؟ تو وہ ہنسنے لگا پھر بولا کہ ہم خوامخواہ کی خون ریزی پسند نہیں کرتے اور کوشش کرتے ہیں کہ اس کے بغیر ہی کام چل جائے، اب یہ دوسری پارٹی پر ہوتا ہے کہ ہمارے سمجھانے پر سمجھ جائے۔ میں نے پوچھا کہ جناب مجھ غریب کو کیا سمجھانا چاہتے ہیں تو بولا کہ بات بالکل سیدھی ہے۔ تم یزدانی بلڈرز والے معاملے میں جتنی ٹانگ اڑا چکی ہو، اسے کافی سمجھو اور اپنی ٹانگ واپس کھینچ لو۔ آگے کے معاملات میں تم چپ رہو گی تو ہم بھی جو کچھ ہو چکا بھول جائیں گے لیکن اگر تم نے ہماری بات نہیں مانی تو ہم بھی سود سمیت سارا وصول کر لیں گے۔'' بشریٰ نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''یعنی میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ یہ یزدانی بلڈرز والوں ہی کی بدمعاشی تھی۔ کامی اور سلطان نے تو شاید اپنے بڑوں کو کچھ بتایا ہی نہیں ہوگا۔ کم از کم اپنی بدمعاشی کے بارے میں تو بالکل بھی نہیں بتایا ہوگا۔ ان کی جو بے عزتی ہوئی اور گت بنی اس کی اصل وجہ تو وہ بتانے کے لائق نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے طور پر ہمارے خلاف کوئی کارروائی کریں گے تو بھی اتنی کھلم کھلا نہیں اسی لیے مجھے شک تھا کہ یہ یزدانی بلڈرز والوں کی طرف سے تمہیں ڈرانے دھمکانے کی ایک کوشش ہے۔'' سن کر معاذ نے تبصرہ کیا۔

''آپ کا دوسرا اندازہ بھی ٹھیک تھا۔ وہ لوگ زمین کے اصل مالک قیوم صدیقی کے وطن واپس آنے سے گھبرا گئے ہیں۔ اتفاق دیکھیں کہ دھمکی والے فون کے فوراً بعد میرے پاس قیوم صدیقی کی کال آ گئی۔ اتفاق سے وہ پہلے ہی پاکستان آنے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے اسی لیے کسی کے بھی اندازوں سے بہت پہلے وہ پاکستان پہنچ چکے ہیں اور انہوں نے یہاں ایک قابل وکیل کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔ زمین کی ملکیت کے حوالے سے ان کے پاس جو ثبوت ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ یزدانی بلڈرز والوں کی جعلسازی کے ثبوت بھی شامل کرنا چاہتے ہیں اسی لیے انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور پوچھ رہے تھے کہ کیا میں ان کی مدد کرنا پسند کروں گی؟''

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟'' معاذ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''آف کورس میں نے ہاں کر دی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں حق کا ساتھ دینے کی کتنی زیادہ قائل ہوں۔'' بشریٰ نے جھٹ سے جواب دیا اور مزید بتانے لگی۔

''کل میں قیوم صاحب کی خواہش پر ان کے ساتھ ان کے وکیل سے ملنے جا رہی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ خود مجھے گھر سے پک کر لیں گے۔''

''تم نے انہیں بھی بتا دیا ہوگا کہ تمہاری گاڑی ورکشاپ میں کھڑی ہے۔'' معاذ شوخی سے ہنسا۔

''وہ تو بتانا ہی تھا۔ میرے کسی بھی شناسا سے یہ بات زیادہ عرصے مخفی نہیں رہتی کہ کار کے نام پر میرے پاس جو ایک عدد چار پہیوں والا ڈبا ہے، وہ چلتا کم اور ورکشاپ پر زیادہ کھڑا رہتا ہے۔ اس لیے میں اکثر دوستوں سے لفٹ کی محتاج رہتی ہوں۔'' معاذ کی بات کا برا منائے بغیر اس نے ہنس کر جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے مجھے آج بھی تمہیں لفٹ دینی پڑے گی۔'' معاذ نے اسے گھورا۔

''دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ ایک ''بے کار'' بندی کی دعائیں مل جائیں گی۔'' اس نے مظلوم شکل بنائی۔

''کہیں آج بھی تمہارا اپنے فیچر وغیرہ کے چکر میں سہراب گوٹھ کی طرف جانے کا پروگرام تو نہیں ہے؟'' معاذ نے جان بوجھ کر تشویش کا اظہار کیا۔

''نہیں، وہاں نہیں جانا، فی الحال اس بات کا انتظام کر لیا گیا ہے کہ وہ بندہ خود ہی آ کر مجھ سے ملاقات کر لے گا اور بعد میں اگر میں ضرورت محسوس کروں گی تو خود وہاں کا وزٹ کر لوں گی۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم ایسی ضرورت ضرور محسوس کرو گی۔ میں تمہاری ٹائپ پہچان گیا ہوں۔ تم ان لڑکیوں میں سے ہو جن کے دماغ کے کچھ پرزے ڈھیلے ہوتے ہیں۔'' معاذ اس چھوٹی سی لڑکی کے اخلاص سے مختصر عرصے میں ہی متاثر ہو چکا تھا لیکن جان بوجھ کر اس سے ایسی باتیں کر رہا تھا۔

''آپ نے میری ٹائپ بالکل ٹھیک پہچانی ہے معاذ صاحب! مجھے واقعی وہاں جائے بغیر چین نہیں آئے گا۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ میں ایک بار پھر اسی راستے سے آپ کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دوں جس پر سونیا خان کا گھر ہے۔ اچھا ہے اسی بہانے آپ اس کے در دولت پر حاضری دے دیجیے گا۔ وہ تو ویسے بھی دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھی ہوگی۔'' اس نے شوخ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا تو اس کی شخصیت حسب معمول جگمگا اٹھی۔ اس جگمگاہٹ نے ایک پل کے لیے معاذ کی توجہ کھینچی لیکن فوراً ہی اس نے توجہ ہٹائی اور منہ بنا کر بولا۔

''شٹ اپ! میں کسی کی بیوی پر نظر رکھنا پسند نہیں کرتا۔''

''لیکن کسی کی بیوی کی نظریں تو آپ پر ہیں نا۔'' وہ اب بھی باز نہیں آئی۔

''فضول باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تمہاری کلاسز کب آف ہوں گی۔ میں تو آج دو بجے تک فارغ ہو جاؤں گا۔'' معاذ موضوع بدل کر بالکل سنجیدہ ہو گیا۔

''آپ نے شاید میری لفٹ والی بات کو سنجیدہ سمجھ لیا۔ تھینک یو سو مچ! آج یہ کارِ خیر راحیلہ کے ذمے ہے۔ آپ آرام سے اپنے پروگرام کے مطابق آتا جاتا کرتے رہیں۔'' وہ بھی اس بار قدرے سنجیدہ ہوئی۔

''اوکے، اب میں چلتا ہوں۔ کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے اور اس سے پہلے مجھے لائبریری سے ایک بک بھی ایشو کروانی ہے۔'' معاذ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوکے بائے۔'' وہ اپنے بیگ کی زپ کھول کر اندر جھانکنے لگی۔ معاذ نے چند قدم آگے بڑھائے لیکن پھر اس کے پکارنے پر پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

''اپنا خیال رکھیے گا معاذ۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور فوراً ہی نظریں پلٹا کر دوبارہ اپنے بیگ کے اندر جھانکنے میں مصروف ہو گئی لیکن اس کے اس ایک پل کے دیکھنے ہی نے معاذ کو ٹھٹکا دیا تھا۔ اس ایک نظر میں جو تحریر درج تھی وہ اسے سناٹے میں لے آئی تھی۔ پہلے تو بیہ اور اب یہ..... اسے اپنا دماغ سن ہوتا ہوا محسوس ہوا اور بڑی مشکل سے خود کو حرکت میں لاتے ہوئے بوجھل قدموں سے لائبریری کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے بدن میں تو کسی آزاد پنچھی کی سی روح تھی اور وہ آزاد پنچھی پیروں میں بیڑیاں پڑنے کے ڈر سے بڑی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''تو تم نے طے کر لیا ہے کہ تم ہر صورت قیوم صدیقی کا ساتھ دو گی؟'' گلزار عاصم نے گہری نظروں سے بشریٰ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آف کورس بابا! اس معاملے میں سوال کرنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ قیوم صدیقی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور میرے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے تو مجھے لازمی ان کا ساتھ دینا چاہیے۔'' بشریٰ کے سامنے کوئی فائل کھلی ہوئی تھی جس کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے گلزار عاصم کی بات کا جواب دیا۔

''کیا یہ بہت ضروری ہے بیٹا! میرا مطلب ہے تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ تمہارے کیے گئے انکشافات کے نتیجے میں قیوم صدیقی اور حکومت دونوں کو خبر ہو گئی کہ یزدانی بلڈرز والے کیا کر رہے ہیں۔ اب تم ان لوگوں کو یزدانی والوں سے نمٹنے دو اور خود ایک طرف ہو جاؤ۔ تمہارا مستقل اس معاملے سے جڑا رہنا ضروری تو نہیں ہے۔'' گلزار عاصم کافی مضطرب محسوس ہو رہے تھے۔ اس بار بشریٰ نے فائل پر سے سر اٹھایا اور حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے بابا! کوئی پرابلم ہے کیا؟'' اس کے دیکھنے پر وہ اس سے نظریں چرانے لگے تھے۔ اس لیے اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ ان سے پوچھنے لگی۔

''پرابلم تو کچھ نہیں ہے بیٹا لیکن اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے پریشان ہونا تو ایک فطری سی بات ہے۔ یزدانی بلڈرز والے خطرناک لوگ ہیں۔ ان کے حوالے سے دبی زبان میں ہی سہی، پہلے بھی کچھ قصے سننے میں آتے رہے ہیں۔ اس قسم کے خطرناک لوگوں سے تمہارا ٹکراؤ مجھے مضطرب کر رہا ہے۔'' گلزار عاصم کا لہجہ ان کی بے بسی کی چغلی کھا رہا تھا۔

''یہ آپ کہہ رہے ہیں بابا! آپ جو کہ ایک نڈر، بے باک اور راست گو صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔'' بشریٰ کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''میں صرف صحافی ہی تو نہیں ہوں۔ میں ایک باپ بھی تو ہوں۔'' ان کی نظریں قدرے شرمندہ شرمندہ سی تھیں۔

''اگر آپ ایسے کم ہمت باپ تھے تو آپ کو مجھے اس فیلڈ میں آنے کی اجازت ہی نہیں دینی چاہیے تھی۔ آپ کو چاہیے تھا کہ میری پرورش ایسے خطوط پر کرتے کہ میں صحافت کے بجائے ہوم اکنامکس، ایجوکیشن یا اسی قسم کے کسی دوسرے سیدھے سادے سبجیکٹ میں ماسٹرز کرتی اور کسی تعلیمی ادارے میں بھرتی ہو کر لگی بندھی زندگی گزارتی رہتی۔ آپ کیوں بچپن سے مجھے راست گوئی، حق گوئی اور وطن پرستی وغیرہ کے اسباق پڑھاتے رہے؟''

اس کے انداز میں بیک وقت دکھ، غصے اور خفگی کے جذبات جھلک رہے تھے۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو بیٹا! ابھی تم ناتجربے کار ہو۔ اتنے بڑے بڑے مگرمچھوں سے نمٹنے کے لیے تمہاری عمر اور تجربہ دونوں بہت کم ہیں پھر بھی میں نے تمہیں اس کیس پر کام کرنے سے نہیں روکا تھا لیکن اب تمہیں آؤٹ آف وے جا کر قیوم صدیقی کی مدد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود اس کے پاس بھی اپنی ملکیت کے حوالے سے ثبوت وغیرہ موجود ہوں گے تو وہ خود اس معاملے سے نمٹ لے گا۔''

''پلیز بابا خاموش ہو جائیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب آپ کہہ رہے ہیں۔'' وہ چیخ ہی تو پڑی۔

''بشریٰ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے گلزار! آپ جیسا آدمی ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے۔ ہم نے اپنی بیٹی کی تربیت جن خطوط پر کی ہے ہمارے پاس اس سے ایسی ڈیمانڈ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' عائشہ جو گلزار عاصم کی فرمائشی چائے لے کر آئی تھیں اور بہت خاموشی سے باپ بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھیں، بول پڑیں۔

''تم ویسے تو اس پر اتنی روک ٹوک کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہو اور آج میں نے ایک بات سے روکا تو تم اس کی حمایتی بن بیٹھیں؟'' انہوں نے بیوی سے شکوہ کیا۔

''میں اسے جن معاملات میں روکتی ٹوکتی ہوں، وہ بالکل مختلف ہیں۔ میں اسے ان حدود و قیود میں رکھنے کی کوشش کرتی ہوں جو ایک مسلمان عورت پر لاگو ہوتی ہیں لیکن سچ اور حق کا ساتھ دینا تو ہمارے دین کے اولین اسباق میں سے ہے، میں اپنی بیٹی کو اس سے کیسے روک سکتی ہوں؟'' عائشہ کے الفاظ نے بشریٰ کو خوش کر دیا اور وہ فوراً ان سے لپٹ گئی۔

''سو سویٹ ممی! آپ نے تو میرا دل خوش کر دیا۔''

''میری رائے اپنی جگہ ہے لیکن تم بہر حال اپنے بابا کی اجازت ضرور لے لینا۔'' عائشہ نے نرمی سے اسے سمجھایا تو اس نے سوالیہ نظروں سے گلزار عاصم کی طرف دیکھا۔

''تمہاری ممی کی بات کے بعد میرے پاس انکار کی گنجائش ہی کہاں ہے۔'' گلزار عاصم نے ہتھیار ڈال دیے۔

''میرے اتنے بہادر بابا کو کرنا بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔'' اس نے فوراً ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اچھا بس زیادہ بٹرنگ مت کرو اور ریڈی ہو جاؤ۔ میرے خیال میں قیوم صدیقی تمہیں لینے کے لیے آتا ہی ہوگا۔'' انہوں نے شفقت سے کہا لیکن ان کی آنکھوں میں اب بھی تشویش کے رنگ تھے۔ بشریٰ نے یہ رنگ نہیں دیکھے اور زیر مطالعہ فائل کے صفحات ترتیب سے رکھنے کے بعد اپنا ہینڈ بیگ چیک کرنے لگی کہ آیا اس میں تمام ضروری چیزیں موجود ہیں یا نہیں۔ گلزار عاصم اس دوران خاموشی سے بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے رہے جبکہ عائشہ واپس کچن میں چلی گئی تھیں۔ گاڑی کے ہارن کے فوراً بعد ہی ڈور بیل کی آواز سنائی دی تو وہ لوگ سمجھ گئے کہ قیوم صدیقی آ چکا ہے۔ بشریٰ اپنے پاس موجود فائل اور اپنا ہینڈ بیگ لے کر باہر کی طرف بڑھی۔ گلزار عاصم بھی بے ساختہ ہی اس کے پیچھے چل پڑے۔ حسب توقع دروازے پر قیوم صدیقی ہی موجود تھا۔ وہ پچاس پچپن سال کا ایک گورا چٹا آدمی تھا اور تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے گلزار عاصم سے مصافحہ کیا اور بشریٰ کو جلد واپس گھر پہنچانے کی یقین دہانی کروانے کے بعد اسے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔

''تھینک یو سو مچ انکل گرل کہ تم میرے ساتھ۔ کو آپریٹ کرنے کے لیے راضی ہو گئیں۔ ویسے تم میرے اندازے سے بہت زیادہ کم عمر ہو۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ اتنا زبردست کام کرنے والی لڑکی اتنی کم عمر ہوگی۔'' راستے میں اس نے بشریٰ سے کہا۔

''اصل میں، میں نے ہوش سنبھالتے ہی طے کر لیا تھا کہ چھوٹی سی ایک لڑکی ہوں پر کام کروں گی بڑے بڑے..... اس لیے چھوٹی عمر میں بڑے کام کرنے لگی ہوں۔'' بشریٰ نے اپنی فطری بے ساختگی سے جواب دیا تو وہ ہنسنے لگا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''تم نے صرف بڑا کام نہیں کیا ہے بلکہ ایک بڑے کام میں آنے والی رکاوٹ کا بھی بروقت بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ یزدانی بلڈرز والوں نے جس زمین پر قبضہ کر رکھا ہے، وہ میں نے ہاسپٹل کی تعمیر کے لیے خرید کر ڈالی ہوئی تھی۔ میں ایک ہارٹ سرجن ہوں اور اپنے کیریئر کے بالکل اسٹارٹ میں ہی امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے اپنی قابلیت میں بھی اضافہ کیا اور پیسا بھی بہت کمایا۔ یہ سب میں یہاں رہ کر نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ بات میرے دماغ میں رہی کہ مجھ پر اپنے وطن کا قرض ہے اور مجھے یہ قرض اتارنے واپس آنا ہے۔ یہاں ایک اچھے ہاسپٹل کی تعمیر کا منصوبہ برسوں سے میرے دل میں پل رہا ہے اور اس بار میں اسی لیے پاکستان آ رہا تھا کہ ہاسپٹل کی تعمیر کے لیے ابتدائی کارروائی کا آغاز کر سکوں۔ نیٹ پر تمہاری تیار کردہ رپورٹ پڑھی تو معلوم ہوا کہ کوئی میرے خواب پر شب خون مار چکا ہے۔ میں تو پہلے ہی آ رہا تھا، اس خبر کے بعد فوراً ہی آ گیا۔ یہاں ایک دوست کے توسط سے ایک اچھے وکیل سے رابطہ ہو گیا ہے اور اس نے بہت امید دلائی ہے کہ فیصلہ میرے حق میں ہی ہوگا۔'' قیوم صدیقی بتا رہا تھا اور وہ ذرا سا اس کی طرف رخ کیے توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کھڑکی سے اطراف سے گزرتا ہوا ٹریفک بھی اسے دکھائی دے رہا تھا۔

پچھلے دنوں پیش آنے والے واقعات اور ملنے والی دھمکیوں کے بعد گھر سے باہر وہ اپنے اطراف سے باخبر اور چوکنا رہنے کی کوشش کرتی تھی اور اس وقت بھی لاشعوری طور

پر ہی اس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں تاہم گفتگو پر توجہ مرکوز ہونے کی وجہ سے وہ پوری طرح چوکنا نہیں تھی اسی لیے ان دو موٹر سائیکل سواروں پر بالکل آخری لمحات میں اس کی نظر پڑی جو دائیں طرف سے اچانک ہی نمودار ہوئے تھے اور ان کی گاڑی کے بالکل ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔ موٹر سائیکل چلانے والے لڑکے نے سر پر ہیلمٹ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل بالکل نظر نہیں آ رہی تھی جبکہ اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے کا چہرہ بھی بڑے بڑے سن گلاسز اور گھنی ڈاڑھی میں خاصا چھپا ہوا تھا۔ پیچھے والے لڑکے کے ہاتھ میں بشریٰ نے نائن ایم ایم پسٹل کی جھلک دیکھی اور اضطراری طور پر جھکتے ہوئے چیخی۔

''جھک جائیں قیوم صاحب۔'' اس کے الفاظ فائرنگ کے شور میں دب گئے اور اس نے اپنے بائیں بازو میں لوہے کی گرم سلاخ سی گھسنے کی تکلیف کے علاوہ بھی جسم کے مختلف حصوں پر ایک قیامت سی ٹوٹتی ہوئی محسوس کی لیکن پھر جلد اس کے محسوسات نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تاریکی کی دبیز تہ تھی جو اسے ہر احساس سے بیگانہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

معاذ، عالم شاہ اور دو تین مزید لڑکے ایک قطار میں موجود بینچیں لگا رہے تھے۔ ان کے بالکل سامنے چارپائی پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز بدرو پہلوان جانچتی ہوئی نظروں سے ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس جائزے کے دوران ہی اس نے لسی کا ایک فل سائز گلاس خالی کیا تھا اور وہ گلاس چارپائی کے نیچے ہی لڑھکا مکھیوں کے ہجوم میں چھپا ہوا تھا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ بدرو کے استغراق میں قطعی مخل نہیں ہو رہی تھی اور وہ پوری توجہ سے لڑکوں کے متحرک جسموں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے حکم پر ان سب نے ایک ایک لنگوٹ کسنے کے علاوہ کچھ نہیں پہنا ہوا تھا اور مشقت کے پسینے سے ان کے جسم چمک رہے تھے۔ اپنے اپنے طور پر وہ سب ہی کڑی محنت کر رہے تھے لیکن بدرو کی تجربہ کار نگاہیں دیکھ سکتی تھیں کہ معاذ اور عالم شاہ کے علاوہ باقی لڑکوں کا سانس اب بری طرح پھولنے لگا تھا اور وہ جلد ڈھنے والے تھے۔ اپنے شاگردوں میں اسے معاذ اور عالم شاہ بہت پسند تھے لیکن ان دونوں میں سے بھی وہ معاذ کو زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ معاذ محنتی ہونے کے علاوہ قدرتی طور پر بھی زیادہ باصلاحیت ہے۔ اسے اپنی غیر موجودگی میں ہونے والے معاذ اور عالم شاہ کے مقابلے کے بارے میں بھی علم ہو چکا تھا اور اس مقابلے کو دیکھے بغیر بھی وہ بتا سکتا تھا کہ مقابلہ بہت شاندار رہا ہوگا۔ معاذ کی برتری بھی اس کے نزدیک حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ اس لڑکے میں کوئی الگ جذبہ، جنون اور شعلہ سا محسوس کرتا تھا اور جانتا تھا کہ ایسے لوگ دوسروں سے ہمیشہ سبقت لے جاتے ہیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ معاذ کو ایک مکمل پہلوان، ایک پیشہ ور پہلوان کے روپ میں ڈھال دے لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ شہری ماحول کا پڑھنے لکھنے والا یہ لڑکا اور بھی بہت سے شوق رکھتا تھا اور پہلوانی کے گُر سیکھنا اس کے بہت سے مشاغل میں سے ایک مشغلہ تھا۔

''معاذ..... معاذ! بہت بری خبر ہے۔ بشریٰ گلزار کو کسی نے ٹارگٹ کلنگ کا شکار بنایا ہے۔ ٹی وی پر نیوز چل رہی ہے۔'' بدرو کی محویت اور استغراق کو ایک تیز آواز نے توڑا۔ بہت جوش سے معاذ کو یہ اطلاع دینے والا حنین تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی معاذ کا متحرک جسم ایک پل کو ساکن ہوا اور پھر وہ تیزی سے بھاگتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ قمرو کے پکوان ہاؤس پر ایک ٹیلی ویژن سیٹ مسلسل چلتا رہتا تھا اور معاذ اپنے حلیے کی پروا کیے بغیر اسی طرف دوڑا تھا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے اسمارٹ فون پر بھی یہ خبر دیکھ سکتا ہے۔ وہ پسینے سے شرابور، صرف ایک لنگوٹ پہنے چلتے ہوئے ٹی وی کے سامنے کھڑا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی اسکرین پر دکھائے جانے والے مناظر کی طرف متوجہ تھے لیکن ان کے لیے یہ ایک معمول کی خبر تھی۔ ان میں سے کوئی بھی معاذ جیسی کیفیت سے نہیں گزر رہا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر ایک تباہ شدہ گاڑی، خون کے دھبے اور چند پولیس والے کارروائی کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی نیوز اینکر ہیجانی لہجے میں بتا رہا تھا۔

''شارع فیصل پر اسٹار گیٹ کے قریب ٹارگٹ کلنگ کا ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ واقعے میں امریکا ریٹرن ہارٹ سرجن قیوم صدیقی اور مشہور صحافی گلزار عاصم کی بیٹی بشریٰ گلزار کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق قیوم صدیقی کو ایک گولی سر اور دوسری گردن میں لگی اور وہ موقعے پر ہی ہلاک ہو گئے جبکہ بشریٰ گلزار کے بازو میں ایک گولی لگی ہے لیکن ان کی حالت بھی سخت تشویش ناک ہے۔ واقعے کے وقت قیوم صدیقی گاڑی چلا رہے تھے۔ ان کو گولی لگنے کی وجہ سے گاڑی قابو سے باہر ہو گئی اور ایک ٹرک سے ٹکرا کر بری طرح تباہ ہو گئی۔ بشریٰ گلزار کو زیادہ چوٹیں اسی حادثے میں لگی ہیں۔ انہیں فوری طور پر جناح اسپتال منتقل کیا جا چکا ہے جہاں ان کی حالت تشویش ناک بتائی

جارہی ہے۔'' نیوز اینکر بولتا جارہا تھا اور معاذ کی سماعتوں میں جیسے کوئی کھولتا ہوا لاوا انڈیلتا جارہا تھا۔ رہ رہ کر جوش اور جذبے سے بھری من موہنی سی بشریٰ کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اس کی عمر کم تھی لیکن خواب بڑے بڑے تھے۔ اس کے اندر حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ جہاد بالقلم کرنے کا عزم دل میں لے کر میدان میں اتری تھی اور شہید صحافت بننے کو بھی تیار تھی لیکن اتنی جلدی..... ابھی تو اس نے باقاعدہ اپنے کیریئر کا آغاز بھی نہیں کیا تھا، ابھی تو اس کی تعلیم بھی نامکمل تھی..... ابھی تو وہ زمین سے نازک کونپل کی صورت پھوٹی تھی، ابھی تو اس کونپل کی پوری طرح نمو بھی نہیں ہوئی تھی اور ظالموں نے اسے بری طرح روند ڈالا تھا۔ وہ جو گلزار عاصم جیسے دیانت دار صحافی کی اکلوتی بیٹی تھی اور جس کے حوالے سے انہوں نے جانے کتنے خواب دیکھے تھے، کسی کی فرعونیت کا نشانہ بن کر موت وزیست کے درمیان لٹکی ہوئی تھی۔ معاذ جوں جوں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس کا دل اس کے سینے میں ڈوبتا جارہا تھا۔

''معاذ!'' کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا تو وہ جیسے کسی گہری کھائی سے باہر آیا اور پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ عالم شاہ تھا۔

''چلو، ہم ہاسپٹل چلتے ہیں۔'' عالم شاہ کے نہایت ہمدردی سے کہنے پر اسے احساس ہوا کہ واقعی اسے اس وقت ہاسپٹل جانا چاہیے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ لباس وغیرہ کی تبدیلی کے مرحلے سے گزر کر عالم شاہ کی گاڑی میں ہاسپٹل جارہے تھے۔ وہاں انہوں نے لوگوں کے ایک چھوٹے سے ہجوم کے درمیان گلزار عاصم کو دیکھا۔ ان کا چہرہ زرد تھا اتنا زرد کہ لگتا تھا خون کا ایک قطرہ بھی ان کے جسم میں باقی نہ رہا ہو۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک آدمی تسلی دینے والے انداز میں ان کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر سادہ سے شلوار قمیص میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ خاتون نے بڑی سی سفید چادر اس انداز میں اوڑھی ہوئی تھی کہ ان کی پیشانی مکمل طور پر چھپ گئی تھی اور صرف آنکھیں، ناک اور ہونٹ ہی نظر آرہے تھے۔ ان چند نقوش اور رنگت کو دیکھ کر اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ اہلِ مغرب میں سے ہیں۔ بشریٰ کی بھوری آنکھیں یقیناً ان ہی سے مشابہ تھیں۔ اس وقت ان بھوری آنکھوں سے لڑی کی صورت آنسو بہہ رہے تھے لیکن یہ آنسو بے آواز تھے اور وہ سر کو ذرا سا جھکائے زیرِلب کچھ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ شاید کوئی ایسا وظیفہ، ایسا کوئی اسم، ایسی کوئی دعا جو انہیں ان کی بیٹی لوٹا دے۔ ان کے ساتھ ہی ایک لڑکی ان کا بازو تھام کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سسکیوں کے ساتھ زار و قطار رو رہی تھی۔ معاذ اسے یونیورسٹی میں بشریٰ کے ساتھ دیکھ چکا تھا اس لیے اسے پہچاننے میں مشکل نہیں ہوئی کہ وہ بشریٰ کی قریبی سہیلی راحیلہ ہے۔ ان تینوں چہروں کے علاوہ بھی وہاں اردگرد جتنے چہرے موجود تھے، ان پر تشویش اور دکھ کے تاثرات درج تھے اور کسی کے بتائے بغیر بھی وہ جان سکتے تھے کہ بشریٰ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔

''بشریٰ گلزار کی حالت اب کیسی ہے؟'' سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی عالم شاہ نے وہاں کھڑے لوگوں میں سے ایک شخص سے پوچھا۔ معاذ میں تو یہ سوال کرنے کی بھی جرأت نہیں تھی۔ وہ بے بسی کی کیفیت میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر خاموش کھڑا ہوگیا تھا۔

''ڈاکٹرز اپنی پوری کوشش کررہے ہیں لیکن کوئی واضح بات بتانے سے قاصر ہیں۔ بہت زیادہ زخم آئے ہیں۔ کئی فریکچرز ہیں، سر پر بھی چوٹ لگی ہے جس کی طرف سے ڈاکٹرز نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بھی مسئلہ ہے۔ جان پہچان والے چند لوگ خون کا عطیہ دے رہے ہیں لیکن ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ ابھی مزید خون کی ضرورت پڑے گی۔'' اس شخص نے مختصراً ساری تفصیل بتادی۔

''چلو ہم بھی چل کر خون دیتے ہیں۔'' حسین جوان کے پیچھے پیچھے بائیک پر آیا تھا اور معاذ کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا، اس گفتگو کو سن کر معاذ کے دل کی بات بولا۔ ان تینوں نے وہاں سے ہٹتے ہوئے دیکھا کہ میڈیا کے لوگوں نے گلزار عاصم کو گھیر لیا ہے اور ان سے اس حادثے کے بارے میں جاننے کی کوشش کررہے ہیں۔ شاید کوئی ایسی بات، کوئی ایسا جملہ جو ان کے چینلز سے نشر ہونے والی خبروں کو مزید چٹپٹا اور مسالے دار بنا سکے، حالانکہ جانتے اور سمجھتے وہ بھی تھے کہ اس سب کے پیچھے کون ہوسکتا ہے لیکن کون ایسا سچ بول کر اپنے سر مصیبت مول لیتا؟ وہ گلزار عاصم کی زبان سے ہی کوئی ایسا جملہ اگلوانا چاہتے تھے جس کو بنیاد بنا کر اپنی مرضی کے راگ چھیڑ سکیں لیکن انہوں نے غم اور پریشانی کے ان جان لیوا لمحات میں بھی بردباری سے کام لیا اور صرف اتنا بولے۔

''فی الحال میں اس حادثے کے پس منظر سے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اپنی بیٹی کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہوں اور سب لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کی زندگی

اور صحت کے لیے دعا کریں۔'' ان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو قابو میں رکھے ہوئے تھے۔ شاید وہ اپنا ایک بہادر صحافی کا امیج برقرار رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ ایک باپ بھی تو تھے جن کی اکلوتی اولاد موت اور زندگی کے درمیان لٹکی ہوئی تھی۔ دل میں گہرا دکھ محسوس کرتا ہوا معاذ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا۔ خون کا عطیہ دینے کے مراحل سے گزر کر دوبارہ وہاں آنے میں انہیں خاصا وقت لگا تھا لیکن واپس آ کر بھی انہیں یوں ہی محسوس ہوا کہ جیسے اس جگہ کا منظر اپنی جگہ ٹھہر سا گیا ہو۔ شاید کچھ چہروں کی کمی اور زیادتی کی تبدیلی پیش آئی تھی لیکن چہروں کا تاثر ہنوز وہی تھا جو دل کو تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ پوچھنے پر یہی معلوم ہوا کہ بشریٰ گلزار ہنوز آپریشن تھیٹر میں ہے اور ڈاکٹرز اس کی طرف سے کوئی حتمی یقین دہانی نہیں کروا رہے ہیں۔ وہاں بیٹھنے کے لیے خالی کرسیاں موجود نہیں تھیں اس لیے وہ تینوں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ لیب میں خون دینے کے بعد انہیں جوس پینے کے لیے دیا گیا تھا لیکن ہلکی ہلکی سی نقاہت بہرحال محسوس ہو رہی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے کچھ اور لمحات چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھے پھر عالم شاہ دھیمے لہجے میں معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''سوری معاذ! میں یہاں تمہیں چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہتا لیکن مجبوری ہے کہ مجھے جانا ہوگا۔ آج ابا جی کو گاؤں سے آنا ہے اور مجھے ہر حال میں ان کے استقبال کے لیے گھر پر موجود ہونا چاہیے۔ میں کوشش کروں گا کہ فون پر تم سے رابطے میں رہوں۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میرے ساتھ حسین ہے لیکن نہیں، حسین کو بھی اپنے گھر واپس جانا ہوگا۔ اس کا گھر کافی دور ہے، بہتر ہے یہ بھی ابھی روانہ ہو جائے۔ بس کسی طرح میری بائیک یہاں پہنچانے کا انتظام کر دینا۔ وہ وہیں بدرو استاد کے اکھاڑے پر کھڑی ہوگی۔'' عالم شاہ سے بات کرتے کرتے وہ حسین کی طرف رخ موڑ گیا تھا اور اب اس سے بات کر رہا تھا۔ جس وقت وہ لوگ ہاسپٹل کے لیے نکلے اس کی کیفیت کے پیش نظر عالم شاہ نے اسے اپنی گاڑی میں ہی بٹھا لیا تھا کہ مبادا وہ خود بائیک چلانے کی صورت میں کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے۔

''میں کہیں نہیں جا رہا۔ میں تمہارے ساتھ یہیں رکوں گا۔ گھر پر فون کر کے اطلاع دے دوں گا کہ آج معاذ کے گھر پر رکا ہوا ہوں تو کسی کو تشویش نہیں ہوگی۔'' حسین نے اپنا فیصلہ سنایا تو عالم شاہ نے اطمینان کا اظہار کیا اور بولا۔

''یہ بالکل ٹھیک فیصلہ ہے تم یہیں رہو۔ معاذ کی بائیک پہنچانے کا مسئلہ نہیں ہے لیکن بہتر ہے کہ یہ خود بائیک نہ چلائے اور جب بھی گھر واپس جانا چاہے، تم اپنی بائیک پر ہی اسے ساتھ لے چلو۔''

''میں اب ٹھیک ہوں یار! بشریٰ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے پر فوری ردعمل کے طور پر کچھ ڈسٹرب ہو گیا تھا لیکن اب میں سنبھل چکا ہوں۔ تم لوگ میرے لیے اتنا پریشان نہ ہو۔'' معاذ نے دخل دے کر انہیں ٹوکا۔

''ٹھیک ہے، تم سنبھل چکے ہو لیکن کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ اگر میں بھی تمہارے ساتھ یہاں رک جاؤں۔'' حسین نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا تو وہ خاموش ہو گیا۔ عالم شاہ ان دونوں سے مصافحہ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہاں بہت آوازیں تھیں اور ایک بڑے اسپتال کی مخصوص گہما گہمی نظر آ رہی تھی لیکن پھر بھی آس پاس منڈلاتی موت کی آہٹ سے دل گھبرا رہا تھا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ دعا مانگ رہا تھا کہ کسی طرح وہاں منڈلاتی موت واپس لوٹ جائے۔ معاذ کی نظریں کئی بار گلزار عاصم سے ملی تھیں لیکن نہ تو وہ ان کے قریب گیا تھا اور نہ ہی انہوں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ بشریٰ کی زندگی کی نوید مل جانے کی امید کے سوا گویا ہر شے بے معنی ہو گئی تھی۔ ایک سناٹا اور خوف سا تھا جو دلوں پر طاری تھا۔ اس سناٹے میں وہاں وارد ہونے والے ایک شخص کے چہرے نے ہلچل مچائی۔ وہ سلطان تھا جو اپنے دو چیچوں کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی معاذ کے اعصاب تن گئے اور مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ دوستوں کے معاملے میں جذباتی لڑکا تھا اور بشریٰ اس کی دوست تھی۔ اس کے قتل کی سازش میں ملوث ٹولے کے ایک فرد کو وہاں دیکھ کر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور عقاب کی طرح جھپٹ کر سلطان کا گریبان پکڑ لیا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی؟ تماشا دیکھنے آئے ہو؟'' خون آشام نظروں سے سلطان کو گھورتے ہوئے وہ بری طرح غرایا۔ سلطان کو اس سے ایسی حرکت کی امید نہیں ہوگی اس لیے وہ چند لمحوں کے لیے بالکل ساکت رہ گیا پھر اس کے ہاتھ سے اپنا گریبان چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے غصے سے بولا۔

''چھوڑو میرا گریبان۔ یہ کیا بے ہودہ حرکت ہے۔ بشریٰ تمہاری طرح میری بھی یونیورسٹی فیلو ہے اور میں اس کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔''

''خیریت نہیں، تم یہ معلوم کرنے آئے ہو کہ اس کے مرنے میں اور کتنی دیر لگے گی؟'' معاذ دھیمی آواز میں پھنکارا۔ جذبات میں ہونے کے باوجود اس نے محسوس کرلیا تھا کہ ان کے اطراف لوگوں کا ہجوم جمع ہونے لگا ہے اور وہ بہرحال لوگوں کے ہاتھ کوئی موضوع نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

''لگتا ہے تمہارا دماغ الٹ گیا ہے جو ایسی فضول بکواس کر رہے ہو۔'' سلطان نے اس کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑوانے کی ایک اور ناکام کوشش کی اور اسی کے انداز میں پھنکارا۔ اس کے لیے یہ شرمندگی کی بات تھی کہ وہ معاذ سے اپنا گریبان چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا اس لیے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا لیکن عوامی جگہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ ہنگامہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ورنہ وہ اور اس کے ساتھی جس قماش کے لوگ تھے، ایسی صورتِ حال میں انہیں ہتھیار نکالتے ہوئے دیر نہیں لگتی تھی۔ حقیقتاً عام لوگوں سے بھی زیادہ اسے وہاں موجود میڈیا کے افراد کی فکر تھی اس لیے اپنے ساتھیوں کو بھی اشارہ کردیا تھا کہ وہ تحمل سے کام لیں۔

''یہ کیا کر رہے ہو معاذ! چھوڑو اسے خوامخواہ تماشا بن جائے گا۔'' حسین جو اس اچانک صورتِ حال پر کچھ سٹپٹا گیا تھا، معاذ کے قریب آکر اسے سرگوشی میں سمجھانے لگا۔

''میں یہاں اس شخص کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔'' معاذ کے لہجے میں اب بھی سختی تھی۔

''اسے چھوڑ دو معاذ! اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہوجائے گی۔'' اچانک ہی ایک ہاتھ اس کے دائیں شانے پر آکر ٹکا اور اس نے اپنی پشت پر ایک نرم سی آواز سنی۔ اس آواز میں جانے کیسی تاثیر تھی کہ معاذ کا ہاتھ خود بخود سلطان کے گریبان سے ہٹ گیا اور اس نے رخ موڑ کر اپنی مخاطب ہستی کو دیکھا۔ وہ بشریٰ کی والدہ تھیں جن کی آنکھیں رو رو کر متورم ہو چلی تھیں لیکن وہ اسے یقین دہانی کروا رہی تھیں کہ بشریٰ ٹھیک ہوجائے گی۔

''ہیلو آنٹی! میں سلطان ہوں، بشریٰ کا یونیورسٹی فیلو۔ میں اس کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔'' سلطان بھی یقیناً سمجھ گیا تھا کہ وہ بشریٰ کی والدہ ہیں اس لیے بہت سعادت مند بنا ان سے مخاطب تھا۔

''آپ کی آمد کا شکریہ بیٹا! بشریٰ ابھی سیریس کنڈیشن میں ہے اور ڈاکٹرز کوئی واضح بات نہیں بتا رہے۔ آپ اس کی بہتری کے لیے دعا کرو۔'' انہوں نے نہایت رسان سے سلطان کو جواب دیا اور معاذ کی طرف متوجہ ہوکر اس سے بولیں۔

''آؤ معاذ! ہم باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' معاذ نے ایک معمول کی طرح ان کی بات پر عمل کیا اور ان کے پیچھے چل پڑا۔ باقی لوگ وہیں کھڑے رہ گئے۔ بہت کم لوگ تھے جو اس صورتِ حال کو سمجھ سکے ہوں گے لیکن یہ کھوج لگانے کا موقع بھی نہیں تھا اس لیے آپس میں چہ میگوئیاں کرنے سے آگے بات نہیں بڑھی۔ ادھر معاذ اور بشریٰ کی والدہ عائشہ باہر لان میں ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے اور عائشہ اس سے کہہ رہی تھیں۔

''میں تم سے ملنا چاہتی تھی معاذ لیکن اندازہ نہیں تھا کہ ان حالات میں تم سے ملاقات ہوگی۔ بشریٰ ذہنی طور پر اپنے بابا سے زیادہ قریب ہے اور اکثر ان کی شہ پر اپنی ہر بات منوالیتی ہے لیکن اپنے خاص خاص دوستوں کے بارے میں مجھے بتائے بغیر اسے چین نہیں آتا۔ تم اس کے نئے دوست ہو لیکن میں نے اس کی زبان سے سب سے

مت کرو

(1) غریبوں کے سامنے اپنی دولت کی باتیں مت کرو۔

(2) کمزور کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار مت کرو۔

(3) بیمار کے سامنے اپنی صحت و تندرستی کا اظہار مت کرو۔

(4) قیدی کے سامنے اپنی آزادی پر فخر کا اظہار مت کرو۔

(5) رنجیدہ و افسردہ کے سامنے اپنی خوشیوں کا ڈھنڈورا مت پیٹو۔

(6) بے اولاد کے سامنے اپنی اولاد کی کامیابیوں اور فرمانبرداریوں کے قصے مت بیان کرو۔

(7) یتیم کے سامنے اپنے ماں باپ کے قصے مت سناؤ۔

نصیحت

جو آج مفت کی نصیحت قبول نہیں کرے گا۔ کل اسے افسوس بہت مہنگے داموں خریدنا پڑے گا۔ (افلاطون)

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدرآباد

زیادہ تمہارا ذکر سنا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ تم کئی بار گھر تک آئے بھی لیکن دروازے سے ہی واپس چلے گئے اس لیے میں خواہش کے باوجود تم سے نہیں مل سکی۔ بہرحال میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم بشریٰ کے دوستوں میں ایک بہترین اضافہ ہو۔''

''بشریٰ اتنی اچھی لڑکی ہے کہ اچھے دوست ملنا اس کا حق ہے۔ اس سے سینئر ہونے کے باوجود میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں اور اسے قابلِ تقلید سمجھتا ہوں۔ دنیا میں اس جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور ان کم لیکن خاص لوگوں کی اس دنیا کو ابھی بہت ضرورت ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ اللہ اسے ضرور ہمیں لوٹا دے گا۔'' معاذ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ بولتے ہوئے اس کی آواز بھیگنے لگی ہے۔ زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی کہ وہ بشریٰ کی آنکھوں میں تحریر جذبے پڑھ کر گھبرا سا گیا تھا اور اب خود اسے لگ رہا تھا کہ کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں بھینچ رکھا ہو۔ وہ اس کے لیے اپنے جذبوں کا تعین بے شک نہیں کر سکا تھا لیکن یہ بہرحال طے ہو گیا تھا کہ وہ اتنی غیر اہم نہیں ہے کہ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑے۔

''انشاء اللہ وہ زندہ رہے گی۔ میں تمہیں یہی بات سمجھانا چاہ رہی تھی۔ مجھ سے اور گلزار سے اس کے معاملات چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کچھ باتوں کا وہ ہماری پریشانی کے خیال سے ذکر نہیں کرتی لیکن موجودہ معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا چکا تھا۔ دھمکیاں براہِ راست بشریٰ کو بھی ملی ہوں گی۔ مجھے گلزار نے اس حادثے کے بعد بتایا کہ ان کے پاس بھی ایک فون کال آئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو روکیں۔ اپنے اصولوں کے برخلاف ایک باپ کی محبت سے مجبور ہو کر گلزار نے اسے روکنے کی تھوڑی سی کوشش بھی کی تھی لیکن میں نے اس کی سفارش کی۔ ہم نے بھی اسے حق پر ہوتے ہوئے خاموش رہنا سکھایا ہی نہیں تو اب کیسے اسے روک سکتے تھے۔ یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ ظالم اتنی جلدی اور ... اوچھی حرکت کریں گے۔ بہرحال ابھی ہماری امید زندہ ہے کہ ہماری بشریٰ ایک بار پھر سچ بولنے کے لیے اٹھے گی، البتہ وہ بے چارہ آدمی قیوم صدیقی ظالموں کے ظلم کا نشانہ بن گیا جس کے قتل پر دہائی دینے کے لیے بھی شاید کوئی پاکستان میں موجود نہیں ہے۔'' ان کے لہجے میں ایک اجنبی کے لیے جس کا ساتھ دینے کے چکر میں ان کی بیٹی موت کے منہ میں چلی گئی تھی، تاسف در آیا تو معاذ حیرت و رشک سے اس عورت کو دیکھنے لگا جس کے نقوش میں مغربیت کی واضح جھلک تھی لیکن جو سرتاپا مشرق کے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی اور جو اردو بھی اتنی روانی سے بولتی تھی کہ اس پر اہلِ زبان ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

''تمہارا موبائل بج رہا ہے معاذ!'' انہوں نے اسے احساس دلایا تو وہ اپنے فون کی طرف متوجہ ہوا اور اسے جیب سے نکالا۔ اس کی امی کی کال آ رہی تھی۔

''کہاں ہو معاذ! ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچے؟'' وہ فکرمندی سے اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''سوری امی! مجھے آپ کو فون کرنے کا خیال نہیں رہا۔ اصل میں ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور میں اسی کے چکر میں ہاسپٹل میں ہوں۔'' اس نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

''یا اللہ خیر! کس دوست کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور کیسے؟ تم خود تو ٹھیک ہو نا؟'' سعیدہ بیگم فوراً گھبرا گئیں۔

''جی امی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ گھر آؤں گا تو آپ کو باقی تفصیلات سے آگاہ کروں گا۔ فی الحال مجھے اجازت دیجیے۔'' اس نے امی کو تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

''معاذ، اب گھر جاؤ بیٹا! ماں کو پریشان کرنا ٹھیک نہیں ہے۔'' عائشہ اس کی گفتگو سن چکی تھیں اس لیے اسے نرمی سے نصیحت کی۔

''گھر تو جانا ہی ہے، بس بشریٰ کی طرف سے کوئی تسلی بخش خبر مل جائے۔'' اس نے نظریں جھکا کر انہیں جواب دیا۔

''تم مجھ سے رابطے میں رہنا، میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی رہوں گی۔ اسے اس وقت یہاں کسی بھی فرد کی موجودگی سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔ تم بس اسے دعا میں یاد رکھنا۔'' ان کی آنکھوں کی نمی گواہی دے رہی تھی کہ اندر سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں لیکن پھر بھی بڑے حوصلے سے کام لے رہی تھیں۔

''دعا تو میں مسلسل کر رہا ہوں لیکن یہاں سے جانے کو میرا دل نہیں مان رہا۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

''میرے کہنے پر گھر چلے جاؤ۔ میں ایک ماں ہوں اور ایک ماں ہی یہ بات جانتی ہے کہ اولاد صحیح سلامت گھر واپس لوٹ آئے تو دل میں کیسی ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ یہ گھڑیاں، یہ لمحے مجھ پر بہت سخت ہیں معاذ لیکن میں چاہتی ہوں کہ تمہاری ماں کے دل میں ٹھنڈک پڑ جائے اس لیے میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم گھر واپس چلے جاؤ۔'' بولتے ہوئے ان کی آواز معمولی سی رندھ گئی تھی، اس بار معاذ انکار نہیں کر سکا۔ آپس میں موبائل نمبرز کے تبادلے کے بعد،

کچھ دیر میں ہی وہ حسین کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

معجزے اس دنیا میں ہی رونما ہوتے ہیں۔ بشریٰ کی زندگی بچنے کا معجزہ بھی رونما ہو گیا تھا۔ وہ بہت مشکل سے زندگی کی طرف لوٹ کر آئی تھی لیکن آ گئی تھی۔ زندگی بچ جانے کے باوجود وہ ایک لمبے عرصے کے لیے بستر کی محتاج تھی۔ اس کے ایک ہاتھ اور ایک پیر میں فریکچرز تھے، دائیں جانب کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ جسم کے مختلف حصوں پر کئی گہرے زخم آئے تھے جن سے بے تحاشا خون بہا تھا اور جن کے مندمل ہونے میں ابھی خاصا وقت لگنا تھا۔ گولی کے زخم نے دائیں بازو کو جو نقصان پہنچایا تھا، اس کے اثرات زائل ہونے میں بھی خاصا وقت درکار تھا۔ ڈاکٹرز کو سب سے زیادہ تشویش اس کے سر کی چوٹ کی طرف سے تھی۔ قیوم صدیقی کی گاڑی قابو سے باہر ہونے کے بعد بائیں جانب سے گزرتے ہوئے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ اسی تصادم کے نتیجے میں اس کا سر کسی چیز سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا اور بے تحاشا خون بہنے کے ساتھ ساتھ وہ بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹرز اس چوٹ کی طرف سے شدید تشویش کا شکار رہے تھے اور ایم آر آئی اور سی ٹی اسکین سمیت متعدد ٹیسٹ کروا کر انہوں نے یہ اطمینان کیا تھا کہ چوٹ شدید ہونے کے باوجود نہ تو اس کے دماغ کو کوئی نقصان پہنچا تھا اور نہ ہی کوئی کلاٹنگ وغیرہ ہوئی تھی۔ اس کی زندگی بچ گئی تھی اور امید تھی کہ ہر ہونے والے نقصان کا مداوا ہو جائے گا اور وہ جلد یا بدیر ایک بار پھر زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جائے گی۔

معاذ ہر روز اس کی عیادت کے لیے اسپتال جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو عیادت کے لیے آنے والوں کا ایک تانتا سا بندھا رہتا تھا لیکن دھیرے دھیرے آنے والوں کی تعداد کم ہونے لگی تھی۔ صرف معاذ تھا جو اپنی ڈھیروں مصروفیات کے باوجود روزانہ اسپتال میں حاضری دینا فرض سمجھتا تھا۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق اسپتال پہنچا ہوا تھا اور بشریٰ اور اس کی والدہ سے ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف تھا کہ ایک جوڑے کی آمد نے اسے حیران کر دیا۔ وہ سونیا خان اور اس کا شوہر داراب خان تھے۔ داراب خان بالکل ہی سونیا کا الٹ تھا۔ وہ جتنی حسین اور نازک تھی، وہ اتنا ہی موٹا اور بھدا تھا۔ اس کی چوڑائی اتنی زیادہ تھی کہ لمبے قد کے باوجود وہ کچھ فٹ بال نما انسان دکھائی دیتا تھا۔ ناک موٹی اور پھیلی ہوئی تھی، ہونٹ بھی موٹے تھے اور ان پر ان سے بھاری بھرکم مونچھیں جھکی ہوئی تھیں۔ آنکھیں نہ جانے بہت چھوٹی تھیں یا پھر بے حد پُرگوشت چہرے کی وجہ سے اندر دھنسی ہونے کے باعث چھوٹی محسوس ہو رہی تھیں۔ شکر تھا کہ اس کی رنگت صاف تھی ورنہ شاید بچے اسے کوئی جن بھوت سمجھ کر اس سے ڈر جاتے۔ اب بھی اپنے پہلو میں موجود حسن و جمال کا پیکر سونیا خان کے ساتھ چلتا وہ کوئی دیو ہی محسوس ہو رہا تھا۔

''ہم بہت پہلے عیادت کے لیے آتے لیکن اتفاقاً حادثے والی صبح ہی میں اور داراب دبئی چلے گئے تھے اور کل ہی واپس آئے ہیں۔'' سلام دعا اور خیر خیریت پوچھنے کے مراحل سے گزرنے کے بعد سونیا خان نے معذرت خواہانہ انداز میں تاخیر سے عیادت کے لیے آنے کا سبب بتایا۔

''کوئی بات نہیں۔ آپ سب کی دعاؤں سے بشریٰ موت کے منہ سے واپس آ گئی ہے، ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ باقی دنیاداری کے تقاضے تو انسان نبھاتا ہی رہتا ہے۔'' عائشہ نے اخلاق سے اسے جواب دیا۔

''آنٹی! یہ سونیا خان وہی خاتون ہیں جن کے گھر ایک بار ہم نے غنڈوں کی فائرنگ سے بچنے کے لیے پناہ لی تھی۔'' روزانہ آمدورفت کے باعث معاذ کی عائشہ سے بہت دوستی ہو گئی تھی اور وہ تقریباً تمام واقعات ہی ان کے ساتھ ڈسکس کر چکا تھا اس لیے اس واقعے کا بھی حوالہ دے کر سونیا خان کے تعارف کو مکمل کیا۔

''بشریٰ کی اس حالت کو دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس روز تم لوگوں نے جو مجھے اسٹریٹ کرائم وغیرہ کی کہانی سنائی تھی، وہ بس ایک بہانہ تھا اور اس روز بھی تم لوگ ایک قاتلانہ حملے سے بچے تھے۔'' سونیا خان نے معاذ کو گھورتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس کا شوہر داراب اس کے برابر میں خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا اور یقیناً صرف بیوی کی فرمائش پر وہاں آیا تھا۔

''ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب بھی بشریٰ جس حادثے کا شکار ہوئی ہے، اس میں اصل نشانہ یہ نہیں تھی۔ اصل نشانہ وہ صاحب تھے جو اس روز موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ بشریٰ تو صرف ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے زد میں آ گئی۔'' معاذ نے تیزی سے اس کے خیال کی تردید کی۔ ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ فی الحال اس موضوع پر کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بشریٰ کے خطرے سے باہر آنے تک تو کسی کو کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا لیکن بعد میں جب خیال آیا اور معلومات حاصل کی گئیں تو پتا چلا کہ حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی سے کوئی قاتل، کوئی

ڈاکیومنٹ یہاں تک کہ قیوم صدیقی اور بشریٰ کے موبائلز تک نہیں ملے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ لمبے ہاتھوں والوں نے اپنے اثر رسوخ سے یہ ساری چیزیں غائب کروادی تھیں۔ اس پر غضب یہ ہوا تھا کہ گھر پر کسی کے موجود نہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بشریٰ کے لیپ ٹاپ سمیت لکھنے پڑھنے سے متعلق کئی اہم چیزیں چرالی گئی تھیں اور حقیقتاً اس وقت وہ لوگ بالکل خالی ہاتھ تھے۔ ان کے پاس کوئی ایک چیز یا ثبوت ایسا نہیں تھا جس کی بنیاد پر کوئی دعویٰ کیا جاسکتا۔

قیوم صدیقی کی بیوہ اپنے نوجوان بیٹے کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے پاکستان آئی تھی اور شوہر کی تدفین کروا کر خاموشی سے واپس لوٹ گئی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس چکر میں پڑ کر شوہر کے بعد بیٹے کو کھونے کی قطعی ہمت نہیں رکھتی ہے۔ میڈیا میں دبے الفاظ میں قیوم صدیقی کے قتل اور یزدانی بلڈرز والے کیس کے درمیان ربط کا ذکر چھیڑا گیا تھا لیکن زیادہ گہرائی میں جانے کی کسی نے زحمت نہیں کی تھی۔ قیوم صدیقی کی بیوہ نے تو میڈیا والوں سے ملاقات سے صاف انکار کردیا تھا، وہ بشریٰ کو دیکھنے اسپتال بھی نہیں آئی تھی اور گلزار عاصم سے صرف فون پر خیریت معلوم کرلی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی دباؤ کے زیر اثر ہے۔ شاید اسے دھمکی دی گئی تھی اس لیے وہ شوہر کی تدفین کے بعد خاموشی سے واپس امریکا لوٹ گئی تھی۔ ان حالات میں اگر گلزار عاصم یا ان کی فیملی کی طرف سے کچھ کہا بھی جاتا تو اس کی حیثیت الزام تراشی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پولیس کو بھی انہوں نے اپنے بیان میں صرف یہ بتایا تھا کہ بشریٰ قیوم صدیقی کے ساتھ کیوں اور کس مقصد کے لیے جارہی تھی۔ باقی پولیس کا فرض بنتا تھا کہ وہ تحقیق کرتی لیکن ان کی طرف سے ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ غیبی ہاتھ تھے جو اپنی مرضی سے ڈوریاں ہلا رہے تھے اور ان ساری زبانوں کو خاموش کروا دیا تھا جو اس سلسلے میں کچھ کہہ سکتے تھے۔ گلزار عاصم نے بھی بشریٰ کی صحت یابی تک مصلحتاً خاموش رہنے کا فیصلہ کیا تھا جبکہ بشریٰ مکمل طور پر ہوش میں آنے کے بعد اس عزم کا اظہار کرچکی تھی کہ وہ صحت یاب ہوکر دوبارہ اس کیس پر کام کرے گی۔ معاذ نے موجودہ حالات کے پیش نظر ہی سونیا خان کے خیال کی سختی سے تردید کردی تھی۔

''چلو جو بھی بات ہے، ہمارے لیے یہ اہم ہے کہ بشریٰ کی جان بچ گئی ہے۔ یہ مکمل طور پر صحت یاب ہوجائے تو میں خان پیلس میں تم لوگوں کی شاندار دعوت کروں گی۔ ویسے تم چاہو تو اس سے پہلے، اکیلے بھی آسکتے ہو۔ تمہاری میزبانی کرکے ہمیں خوشی محسوس ہوگی۔ کیوں داراب؟'' اپنی مسکراہٹ کی بجلیاں معاذ پر گراتے ہوئے سونیا نے آخر میں شوہر سے تائید چاہی۔

''وائے ناٹ ہنی! تمہارے دوستوں کے لیے خان پیلس کے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں۔'' اس نے شاید مسکرا کر لاڈلی بیوی کی تائید کرنے کی کوشش کی تھی لیکن محسوس ایسا ہوا تھا کہ دیو نے دانت نکوسے ہوں۔ وہ دونوں چند منٹ مزید وہاں بیٹھ کر رخصت ہوئے تو معاذ نے جیسے سکون کی سانس لی۔ سونیا خان کی دعوت دیتی نظریں اس کے اعصاب کے لیے بڑا امتحان ثابت ہوتی رہی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد عائشہ تو ایک طرف بیٹھ کر تلاوت کرنے لگیں جبکہ معاذ، بشریٰ کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''پھر کب جارہے ہیں آپ خان پیلس سونیا خان کی میزبانی کا لطف اٹھانے؟'' بشریٰ نے اسے اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیا اور شرارت بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر اس سے دریافت کیا۔

''لاحول ولاقوۃ۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے خوامخواہ وہاں جانے کی۔'' معاذ چڑا۔

''وہ بے چاری اتنے خلوص سے دعوت دے کر گئی ہے اور آپ لاحول پڑھ رہے ہیں۔ سچ کہوں تو مجھے لگتا ہے وہ یہاں میری عیادت کے لیے نہیں بلکہ آپ سے ملاقات کے لیے ہی آئی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے تو یہ ایسا ہی کوئی سلسلہ تھا۔'' پٹیوں اور پلاستر میں لپٹے جسم کے ساتھ بستر پر لیٹے ہونے کے باوجود اس کی شوخی قائم تھی۔

''اسے الہام ہوا تھا نا کہ اس وقت میں ہاسپٹل میں پایا جاؤں گا۔'' معاذ نے اس کے خیال کی تردید کے لیے دلیل دی۔

''الہام بھی ہوسکتا ہے۔ آدمی کے دل میں سچی لگن ہو تو الہام بھی خودبخود ہی ہونے لگتے ہیں۔'' وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

''دیکھو لڑکی! تمہارے اندر مزید ٹوٹ پھوٹ کی گنجائش نہیں ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اس قسم کی گفتگو ترک کردو جس پر اشتعال میں آکر میں کراٹے کا کوئی وار یا بدو پہلوان سے سیکھا گیا کوئی داؤ لگا کر تمہارے خاموش رہنے کا بندوبست کرنے پر مجبور ہوجاؤں۔'' معاذ نے اسے تنبیہہ کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر خود ہی موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

''چلیں چھوڑیں اس بات کو، یہ بتائیں یونیورسٹی میں کیا حالات ہیں؟ سلطان یا کامی میں سے کسی سے دوبارہ آپ کا ٹکراؤ تو نہیں ہوا؟''

''سب ٹھیک چل رہا ہے یار! وہ لوگ بھی آج کل حیرت انگیز طور پر خاموش ہیں اور سامنا ہو بھی جائے تو میری راہ نہیں روکتے۔ دو دن سے کامی بھی یونیورسٹی آنا شروع ہو چکا ہے۔ بہترین علاج کی بدولت اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے لیکن سننے میں آیا ہے کہ ابھی ڈاکٹروں نے کچھ عرصے احتیاط کی ہدایت کر رکھی ہے۔ خیر چھوڑو اس بور موضوع کو اور ایک اطلاع سنو! اگلے ہفتے ہمارا ڈیپارٹمنٹ کیرتھر نیشنل پارک کی سیر کے لیے جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ اِدھر اُدھر کے لوگ بھی شامل ہوں، بہرحال امید ہے کہ ہم ایک اچھا ٹرپ کر کے آئیں گے۔ مجھے اس طرح کی جگہوں پر جانے کا بہت شوق ہے جہاں انسانوں کی دخل اندازی کم سے کم ہو اور فطرت کی حکمرانی نظر آئے۔ پچھلے سال میں دوستوں کے ایک گروپ کے ساتھ لال سوہانرا نیشنل پارک گیا تھا، کئی شمالی علاقوں میں بھی جا چکا ہوں لیکن کراچی سے اتنا قریب ہونے کے باوجود کیرتھر نیشنل پارک جانے کا موقع اب مل رہا ہے اور میں اس ٹرپ کے حوالے سے کافی ایکسائٹمنٹ فیل کر رہا ہوں۔''

''میری طرف سے اس ٹرپ کے لیے نیک خواہشات ہیں۔ مجھے تو ابھی لمبے عرصے کے لیے بستر پر رہنا ہے، آپ گھومنے جائیں اور وہاں سے ڈھیر ساری فوٹوز اور ویڈیوز بنا کر لائیں تاکہ میں بستر پر لیٹے لیٹے اس ٹرپ کو انجوائے کر لوں۔'' بشریٰ کی بات پر وہ پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا پھر اس کی دلجوئی کے لیے بولا۔

''انشاء اللہ کچھ عرصے بعد تم اس لائق ہو جاؤ گی کہ اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جا سکو۔ اس وقت ہم ایک بار پھر دوستوں کے ساتھ مل کر ٹرپ ارینج کر لیں گے۔ اگر تم کہو تو میں بھی ابھی نہیں جاتا۔ ہم ساتھ ہی چلیں گے۔''

''میرا یہ مقصد نہیں تھا معاذ! آپ جائیں۔ آپ وہاں جا کر انجوائے کریں گے تو بھی مجھے خوشی ملے گی۔ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی۔ میرا مقصد آپ کو روکنا نہیں تھا۔ اللہ نے چاہا تو ہم پھر کبھی ساتھ چلیں گے۔''

''بشریٰ ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا! تم دل پر کوئی بوجھ لیے بغیر گھومنے جاؤ۔ یہ بہت تیزی سے امپروو کر رہی ہے۔ ایک دو دن میں اسے گھر شفٹ کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ جلد یہ دوبارہ اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرنے اور دیگر سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لائق ہو جائے گی پھر مناسب وقت دیکھ کر تم دوست مل کر کوئی پروگرام ارینج کر لینا۔'' عائشہ تلاوت سے فارغ ہو کر ان کے قریب چلی آئی تھیں اور ان کی آپس کی گفتگو سن کر انہوں نے معاذ کو تسلی دی تھی۔ معاذ کو لگا کہ اب اگر وہ ٹرپ پر جانے میں کسی تردد کا اظہار کرے گا تو بشریٰ اپنے دل پر بوجھ محسوس کرے گی اس لیے فوراً ہی ہامی بھر لی لیکن اسے احساس تھا کہ اس ٹرپ پر اسے بشریٰ کی کمی بہت محسوس ہو گی۔

☆☆☆

''ہم نوری آباد سے آگے موٹروے M-9 پر سفر کر رہے ہیں اور میں اس سفر میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔'' یہ پہلا میسج تھا جو اپنی روانگی کے بعد اس نے بشریٰ کو بھیجا تھا۔ توقع کے مطابق اسے اس سفر میں بشریٰ کی یاد آ رہی تھی اس لیے نہیں کہ وہ اس کے بغیر انجوائے نہیں کر سکتا تھا بلکہ اس لیے کہ اسے اندازہ تھا کہ اگر بشریٰ اس سفر پر ان کے ساتھ ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔ وہ تھرل اور ایڈونچر کو پسند کرنے والی لڑکی تھی اور یہ سفر اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ ٹور پر ان کے ساتھ گنتی کی چند لڑکیاں ہی جا رہی تھیں۔ کچھ نے تو خود ہی دشواریوں کا سن کر کانوں کو ہاتھ لگا لیے تھے اور کچھ کو گھروں سے اجازت نہیں ملی تھی۔ بشریٰ کے ساتھ یہ دونوں مسئلے نہیں تھے لیکن فی الحال تو وہ بے چاری بستر سے بھی اٹھنے سے قاصر تھی۔ دو دن پہلے اسے اسپتال سے گھر منتقل کر دیا گیا تھا اور معاذ اس وعدے کے ساتھ اس سے الوداعی ملاقات کر کے آیا تھا کہ جہاں جہاں سے ممکن ہو گا وہ اسے پیغامات اور تصویریں وغیرہ بھیجتا رہے گا۔ اپنے اس میسج کے ساتھ بھی اس نے موٹروے (جسے عرف عام میں سپر ہائی وے کہا جاتا ہے) کی ایک تصویر سینڈ کر دی تھی۔ وہ گروپس کی شکل میں فور وہیل گاڑیوں پر سفر کر رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس سفر میں سلطان بھی اپنے گروپ کے ساتھ موجود ہے۔ کامی البتہ ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ یونیورسٹی آنا بے شک شروع کر چکا تھا لیکن اپنی ٹانگ کے مسئلے کی وجہ سے اس ٹور کے لیے بہرحال مس فٹ تھا۔ اسے کامی اور سلطان کے جانے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کی طرف سے مکمل خاموشی تھی تو وہ بھی خاموش رہ کر انتظار کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کیے ہوئے تھا۔ بشریٰ نے البتہ ٹور کے دوران بھی اسے محتاط رہنے کی نصیحت کی تھی جو سفر شروع ہوتے ہی اس کے ذہن سے نکل چکی تھی اور وہ پوری طرح راستے کے نظاروں میں مصروف تھا۔ ان کی

پجیرو سپر ہائی وے کے موڑ سے کراچٹ (Karchat) سینٹر جانے والے راستے پر آئی تو وہ مزید سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی معلومات کے مطابق اس موڑ سے کراچٹ سینٹر تک 80 کلومیٹر کا فاصلہ تھا جس کے درمیان چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی پڑتے تھے۔ یہ بہت ہی ناہموار اور مشکل راستہ تھا جسے فور وہیل کے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

''ہم کراچٹ سینٹر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں نہیں بتا سکتا کہ یہ میرے لیے کتنا ایکسائٹنگ ہے۔'' یہاں سے اس نے بشریٰ کو دوسرا میسج کیا تھا اور پھر دوربین آنکھوں سے لگا کر اردگرد کا منظر دیکھنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ راستہ واقعی سخت ناہموار تھا اور فور وہیل کے باوجود جھٹکے لگ رہے تھے لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ تو پجیرو میں اپنے ساتھ موجود اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی بے نیاز تھا اور ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں کے راستے دماغ میں نقش کر لینا چاہتا تھا۔ کیرتھر نیشنل پارک جانے والوں کے لیے وہاں دلچسپی کی کئی چیزیں تھیں۔ سب سے مشہور تورنی کوٹ کا تاریخی قلعہ تھا جو پارک کے شمال مشرق میں موجود تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا تاریخی قلعہ ہے جو تعمیراتی فن کا ایک نمونہ ہے۔ اس کی بلند اور چوڑی دیواروں کو دیوار چین سے بھی تشبیہ دی جاتی تھی۔ لڑکیوں کا زور اس قلعے تک جانے پر تھا۔ قلعے تک جانے کے لیے سن (Sunn) سے انڈس ہائی وے پر بغیر فور وہیل کے بھی سفر ممکن تھا لیکن لڑکوں کو اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ رنی کوٹ کے قلعے کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ وہ لوگ آخر میں وہاں ضرور جائیں گے لیکن لڑکوں کی اصل دلچسپی ان راستوں پر ہی سفر میں تھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی ڈرائیو کا مزہ یہاں کے علاوہ پورے سندھ میں کہیں نہیں مل سکتا۔ لڑکے ایک تھرلنگ سفر میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ انہیں عددی برتری بھی حاصل تھی اس لیے کراچٹ سینٹر جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

کیرتھر نیشنل پارک جانے والوں کے قیام کے لیے ایک دوسرا سینٹر کھار (Khar) بھی تھا جو پارک کی حدود میں ہی موجود حب ڈیم کے قریب تھا۔ حب ڈیم کی وجہ سے تقریباً 32 مربع میل کے علاقے میں ایک جھیل پھیلی ہوئی تھی اور اس سینٹر پر پرندوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد کثرت سے آتے تھے لیکن کہا یہی جاتا تھا کہ کراچٹ سینٹر پہنچ کر پارک کی سیر کرنے کا بالکل الگ مزہ ہے۔ یہاں زیادہ وسیع لینڈ اسکیپ، پہاڑوں اور جنگلی حیات کے علاوہ آرکیالوجیکل ایریکشن بھی تھی۔ سینٹر سے آگے لونگ کے مقبرے تھے جو تعمیراتی فن کے اعتبار سے مکلی کے مقبروں سے مشابہ قرار دیے جاتے تھے۔ معاذ کو سب سے زیادہ دلچسپی پہاڑی بکرے کی نسل آئی بیکس سے تھی۔ اس بکرے کی نسل کا تحفظ ہی کیرتھر نیشنل پارک کے قیام کا بنیادی مقصد تھا کیونکہ کہا جاتا تھا کہ کیرتھر کا آئی بیکس اس نسل کا جدامجد ہے۔ معاذ نے تصویروں میں اس شاندار بکرے کو دیکھا تھا لیکن وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ سنا تھا کہ بہت مشکل سے اس کی دید ہوتی ہے اور معاذ مشکل پسند تھا۔

کراچٹ سینٹر جانے والے راستے میں پڑنے والے ایک گاؤں سے ان لوگوں نے انڈے اور تازہ مکھن خریدا۔ باقی کھانے پینے کا سامان اور پانی کی وافر مقدار ان کے ساتھ تھی۔ کیرتھر کے خشک اور گرم ماحول میں پانی کی بڑی مقدار ساتھ رکھنے پر زور دیا جاتا تھا اس لیے اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں یہاں آئے تھے۔ اکتوبر سے مارچ تک کا عرصہ سیاحوں کے لیے بہترین قرار دیا جاتا تھا اس لیے امید تھی کہ انہیں سخت موسم کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن احتیاطی تدابیر اپنی جگہ تھیں۔

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے نباتات کی خوشبو بھی بڑھتی جارہی تھی۔ شہر کے ہنگاموں سے دور بالکل الگ جگہ پر وہ سب ہی جیسے اپنے آپ میں گم ہوگئے تھے۔ جب منظر بول رہے ہوں تو کسی اور کا بولنا بھلا نہیں لگتا۔ معاذ کے گروپ کے سارے لڑکے سمجھدار اور باشعور تھے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اس لیے کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ البتہ انہوں نے اپنے قریب سے گزرنے والی پجیرو سے بلند ہوتے موسیقی کے شور اور بے ڈھنگے قہقہوں کو خوب اچھی طرح سنا۔ ایک ناگوار سی نظر اس پجیرو پر ڈالنے پر معاذ کو پتا چلا کہ اس پجیرو میں سلطان اور اس کے ساتھی سوار ہیں۔ پجیرو خراب اور ناہموار راستے کے باوجود ان کی گاڑی کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی تھی اور یقیناً اس میں ڈرائیور کی مرضی سے زیادہ سلطان اور اس کے دوستوں کا دخل رہا ہوگا۔ ایسی بے ہودہ حرکات کرنے اور دوسروں پر اپنا زور چلانے میں وہ لوگ ماہر تھے۔ خیر گزری کہ اس واحد بدمزگی کے علاوہ وہ آرام سے سینٹر تک پہنچ گئے۔ یہاں سیاحوں کے لیے ریسٹ ہاؤس اور کاٹیجز بنے ہوئے تھے۔ وہ NOC لے کر آئے تھے اور سینٹر پر ان کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ساتھ ریسٹ ہاؤس میں بکنگ ہوچکی تھی۔ انتظامیہ

کے کچھ لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ ان میں وائلڈ لائف کے محکمے کا ایک افسر بھی تھا جو ان کے ساتھ آئے ہوئے اساتذہ وغیرہ کو اپنے ساتھ لے گیا جبکہ طلبہ کی بھی کمروں تک راہنمائی کر دی گئی۔

وہ اچھا خاصا طویل سفر کر کے آئے تھے اس لیے سب ہی فریش ہونے لگے۔ اس کے بعد کھانا کھایا گیا اور کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے آرام کا وقفہ دیا گیا۔ اپنے ٹور کو زیادہ سے زیادہ پُرلطف بنانے کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ریسٹ ہاؤس میں قیام رکھنے کے بجائے آگے جا کر کیمپنگ کریں گے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے ساتھ خیمے لے کر آئے تھے۔ آرام کے وقفے کے بعد وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ سفر اب بھی جیپوں میں ہی کیا جا رہا تھا۔ جیپوں کے ڈرائیورز ہی گائیڈ کا فریضہ بھی انجام دے رہے تھے۔ ان گائیڈز سے انہیں بہت سی معلومات حاصل ہو رہی تھیں اور وہ سحر زدہ سے اپنے سامنے پھیلے وسیع لش گرین لینڈ اسکیپ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ مون سون کا سیزن گزرنے کے بعد یہاں آئے تھے اس لیے پورا علاقہ سبزے سے لہلہا رہا تھا اور نہایت حسین منظر تھا۔ ان ہی منظروں کے درمیان انہوں نے کیمپنگ کا فیصلہ کیا اور خیمے لگائے جانے لگے۔ معاذ اور حنین اس سے پہلے لال سوہانرا نیشنل پارک بھی جا چکے تھے اس لیے انہیں ایسے کاموں کا تجربہ تھا لیکن ان میں سے زیادہ تر لڑکے ناتجربہ کار تھے۔ ان کے گائیڈ کم ڈرائیور اس سلسلے میں ان کی مدد اور راہنمائی کرتے رہے اور کچھ دیر میں ہی رنگ برنگے خیموں کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہو گیا۔ وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ، اپنے اپنے طور پر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مشروبات وغیرہ کا سلسلہ بھی چل رہا تھا لیکن سخت ہدایت تھی کہ کہیں بھی معمولی سی گندگی نہ ہونے پائے۔ سورج ڈھلنے تک وہ لوگ اپنے گائیڈز کی راہنمائی میں گھومتے رہے۔ سب نے ہی دل بھر کر تصویریں اور سیلفیز بنائیں۔ زیادہ تر طلبہ اپنے اسمارٹ فون ہی استعمال کر رہے تھے البتہ کچھ کے پاس کیمرے وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔

وہ لوگ واپس خیموں میں لوٹ کر آئے اور رات کے کھانے کا انتظام کیا جانے لگا تو جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا۔ ایک سندھی گائیڈ نے سندھی لوک گیت چھیڑا تو سماں سا بندھ گیا۔ سلطان اور اس کے دوست تو باقاعدہ رقص کرنے لگے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ اپنی جگہ بیٹھے تالیاں بجاتے اور ویڈیو بناتے رہے اور یوں جب ایک مصروف اور خوشگوار دن کے اختتام پر وہ سب سونے کے لیے لیٹے تو بہت تھکے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سوں کے لیے کسی خیمے میں رات گزارنے کا یہ پہلا تجربہ تھا اور شاید کچھ بے چینی بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر تھکن نے نیند کو غالب آنے کا موقع دے دیا۔ معاذ بھی جلد ہی سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو بہت سویرا تھا اور ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ حنین سمیت اس کے باقی ساتھی ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ اس کا مزید سونے کا موڈ نہیں بنا تو خاموشی سے جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔ یہ لانگ بوٹ تھے اور اس علاقے میں ان کا استعمال ضروری تھا کیونکہ یہاں سانپوں کی بڑی تعداد پائی جاتی تھی اور غلطی سے کسی سانپ پر پیر پڑنے کی صورت میں وہ ڈس بھی سکتا تھا۔ وہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن کر سویا تھا اور انہیں بدلنے کے چکر میں نہیں پڑا تھا۔ یوں بھی اس کا زیادہ دور تک جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ یہیں آس پاس رہ کر کیرتھر کی صبح کا استقبال کرنا چاہتا تھا۔

خیمے سے باہر نکلتے ہی فرحت بخش ہوا کا ایک جھونکا اس سے آ کر ٹکرایا تو اندر تک سرشاری پھیل گئی۔ وہ ایک خوشگوار سے احساس کے ساتھ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ سب ہی بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے بے خبری کی نیند سو رہے تھے اور کہیں، کسی بھی خیمے میں کسی کے جاگنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے نتھری ہوئی تازہ ہوا میں سانس لینا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بہت صبح کا وقت تو شہر کی آلودہ فضا میں بھی باقی دن کے مقابلے میں خاصا فرحت بخش لگتا تھا اور کیرتھر کی کھلی فضاؤں میں تو اس وقت کی بات ہی الگ تھی۔ ہوا میں بسی نباتات کی خوشبو کے ساتھ مٹی کی مہک مل کر جو احساس پیدا کر رہی تھی، اس کا تجربہ ہر ایک کو نہیں ہو سکتا۔ اس تجربے سے وہی لطف اندوز ہوتے ہیں جو اپنی لگی بندھی زندگی کے معمولات سے نکل کر کچھ عرصے ایسے کسی مقام پر گزارنے کی جرأت کر پاتے ہوں جہاں فطرت براہِ راست انسان سے ہمکلام ہوتی ہے۔ اسے بھی فطرت کی سرگوشیوں نے سحر زدہ کر دیا تھا اور وہ جو خیموں کے آس پاس ہی رہنے کا ارادہ رکھتا تھا، بے خودی کے عالم میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، روشنی بھی بتدریج بڑھ رہی تھی اور مناظر واضح ہوتے جا رہے تھے لیکن یہ ابھی بہت واضح نہیں تھے اور ہلکی سی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ دور سے آتی پرندوں کی آوازیں ہوا کی سرسراہٹ سے ہم آہنگ ہو کر عجب سُر چھیڑے ہوئے

تھیں۔ ایسے میں اس کا سحر زدہ ہو جانا حیران کن نہیں تھا۔ وہ یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو۔ ناہموار راستے پر اوپر کی طرف چڑھنا ایک مشکل عمل ہوتا ہے لیکن اسے اپنے جسم کو مشقت میں ڈالنے کی عادت تھی اس لیے ابھی تک معمولی سا بھی سانس نہیں پھولا تھا۔ مناظر ذرا اور واضح ہوئے تو اس نے اپنے ٹراؤزر کی جیب میں پڑا اسمارٹ فون نکال لیا اور مختلف قابلِ توجہ مقامات پر رک کر فوٹو گرافس اور سیلفیز لینے لگا۔ ذرا سا اور آگے بڑھا تو افق سے طلوع ہوتے سورج نے اپنی طرف توجہ کھینچ لی۔

ابھی سورج اس حد تک بلند نہیں ہوا تھا کہ اس کی کرنوں کی تمازت بدن میں اتر کر گرمی کا احساس پیدا کرتی۔ ابھی تو اس کی کرنیں نہایت نرمی سے پھیل کر مناظر کو سنہرا پن عطا کر رہی تھیں۔ بلند ہوتے سورج کے ذرا دائیں سمت نظر پڑی تو وہ مبہوت رہ گیا۔ وہاں وہ موجود تھا۔ ترچھے زاویے پر جمے بڑے سے پہاڑی پتھر پر نہایت عمدگی سے توازن قائم کیے سورج کی اولین کرنوں میں نہاتا وہ سنہرا سا محسوس ہو رہا تھا لیکن معاذ کی تیز نظریں اس کی بھوری پشت، سفید شکم اور پہلوؤں پر موجود سیاہ بالوں کی پٹی کو دیکھ سکتی تھیں۔ وہ سندھی پہاڑی بکرا تھا جس کے خوبصورت اور بڑے بڑے سینگوں کے سرے کسی تلوار کی دھار کی طرح پتلے تھے اور ٹھوڑی پر ڈاڑھی نما بال نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً صبح سویرے غذا کے حصول کے لیے نکلا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اکیلا نظر آ رہا تھا حالانکہ اس کا شمار ریوڑ پسند حیوانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے تنہا ہونے کی وجوہات پر غور کرنے کے بجائے معاذ مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں بنانے لگا۔ وہ بہت تیز حسیات کا مالک تھا اور اپنے اطراف میں ہونے والی کسی بھی تبدیلی کو فوراً محسوس کر لیتا تھا لیکن اس وقت وہ اتنا محو تھا کہ اپنے آس پاس کچھ آہٹیں سن کر بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور اپنے کام میں مشغول رہا۔ جس وقت وہ آئی بیکس کے خوبصورت سینگوں اور گولڈن براؤن آنکھوں کو فوکس کر کے اس کے چہرے کا کلوز اپ لے رہا تھا، اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ چونک کر پلٹا، اس سے قبل ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ بہترین زاویے سے تصویریں بنانے کے چکر میں وہ ایک ایسے پتھر پر جا کھڑا ہوا تھا جس کا سائز اتنا چھوٹا تھا کہ اسے بس قدم جمانے ہی کی جگہ مل سکی تھی۔ سر پر وار ہونے سے اس کا توازن بگڑا تو پتھر بھی اپنا توازن کھو بیٹھا اور اپنی جگہ سے لڑھک گیا۔ قدرتی طور پر معاذ بھی اپنی جگہ سے لڑھکتا چلا گیا۔ ہاتھوں سے کسی پتھر یا چٹان وغیرہ کو پکڑنے کی کوشش میں اس نے اپنا موبائل ہاتھ سے چھوڑ دیا لیکن وہ اتنی تیزی سے لڑھک رہا تھا کہ کسی بھی شے کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی اس کی یہ کوشش بچاؤ کی ایک فطری سی خواہش کے تحت تھی ورنہ اس کے سر پر اتنی زوردار ضرب لگائی گئی تھی کہ دماغ چکرا کر رہ گیا تھا اور حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ ساتھ چھوڑتے ان حواس کے باوجود وہ اپنے جسم پر آنے والے ان زخموں کو محسوس کر سکتا تھا جن کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ نیچے لڑھکتے ہوئے نکیلے پتھر، کانٹے دار جھاڑیاں اور نہ جانے کیا کیا اس کی راہ میں آ کر اسے زخمی کر رہے تھے۔

لڑھکنے کا عمل ختم ہوا تو وہ دھپ سے پتھریلی زمین پر گرا اور اس کے زخموں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ پہلو کے بل گرا تھا اور سر سمیت اپنے جسم کے مختلف حصوں سے بہتے سیال مادے کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کا خون ہے جو رگوں میں دوڑتا پھرے تو زندگی بخشتا ہے اور باہر نکل آئے تو زندگی روٹھنے لگتی ہے لیکن وہ اپنی روٹھتی زندگی کو منانے کے لیے ذرا بھی جدوجہد کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی آنکھیں کوشش کے باوجود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسے میں اس نے اپنے بہت قریب سرسراہٹ سی محسوس کی اور پھر ایک پھنکار سنائی دی۔ اس پھنکار کو سن کر غنودگی میں جاتے اس کے ذہن کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور سارے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کے اندر کسی نے سرگوشی کی کہ اسے اپنی جان بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ شاید اس نے حرکت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کوشش کے نتیجہ خیز ثابت ہونے سے قبل ہی دو سوئیاں سی اس کی کلائی میں گڑ گئیں اور کلائی سے اٹھنے والی درد کی لہر سارے جسم میں سرایت کرتی ہوئی اس سے اس کے ہوش و حواس چھین کر لے گئی۔ وہ، جس کی آنکھوں میں بے شمار خواب تھے اور دل کچھ کر دکھانے کی امنگ سے بھرا ہوا تھا، کیرتھر کی پتھریلی زمین پر اپنے سارے خوابوں اور امنگوں سے دور جانے لگا۔ جانے کتنی دور..... اس دوری سے واپسی کی کوئی راہ تو فی الحال وہاں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لینے لگا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

سراغ

شاکر لطیف

بہت اذیت ناک ہوتے ہیں وہ لمحات جب کوئی کسی کی کُل متاع کو لُوٹ کا مال سمجھ کر لے اُڑے اور پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھے... اور ایسے میں خالی ہاتھ رہ جانے والے کے پاس سوائے آنسوئوں اور ملال کے کچھ نہیں بچتا جو آخری پل تک ساتھ نباہتے ہیں... یہی حال اس کا بھی تھا جو شرافت کا لبادہ اوڑھے انتقام کی تمام تر بدصورتیوں کو چھپائے اس قاتل کی تلاش میں تھا جو اس کے صاف ہاتھوں پر خون کی سرخی لگا گیا تھا۔

انتہائی سمجھ داری کا مظاہرہ کرنے والے ایک

سراغ رساں کی کارستانی

اس وقت دوپہر ایک بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ پولیس کی دو کاریں ہوٹل گولڈ اسٹار کے مین گیٹ پر آ کر رکیں تو اگلی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر براجمان سارجنٹ مارٹن کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس کے خاص ماتحت افسر گیری نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا۔ دوسری کار میں موجود دیگر ماتحت عملہ بھی گاڑی سے باہر آ چکا تھا۔

سارجنٹ مارٹن نے تعریفی نگاہوں سے ہوٹل کی

عمارت کا جائزہ لیا۔ دس منزلہ اس ہوٹل کی عمارت کو انتہائی نفیس اور خوبصورت گرینائٹ کے پتھر سے مزین کیا گیا تھا۔ پوری عمارت پر ایک ہی رنگ اور قسم کے پتھر کا استعمال کیا گیا تھا جس کی وجہ سے خوبصورتی کے ساتھ ساتھ سادگی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

''آؤ'' سارجنٹ مارٹن نے گیری اور دیگر ماتحتوں سے کہا اور پھر ہوٹل کے مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ آج پولیس کو ہوٹل کے منیجر مسٹر براؤن کی جانب سے فون کر کے اطلاع دی گئی تھی کہ ہوٹل میں رہائش پذیر کارلوس نامی ایک شخص کا قتل ہو گیا ہے اور اس کا قاتل سیموئل نامی ایک نوجوان ہے جو قتل کے بعد ہوٹل سے فرار ہو گیا ہے۔ سارجنٹ مارٹن ہوٹل کے مالک لارڈ ٹھوتھی کو بھی جانتا تھا۔ لارڈ ٹھوتھی کا شمار شہر کے انتہائی بااثر اور امیر افراد میں ہوتا تھا۔ وہ ہوٹل گولڈ اسٹار کے علاوہ بھی کئی ہوٹلوں کے مالک تھے۔ اس وقت وہ شہر سے باہر تھے تاہم سارجنٹ مارٹن اور ان کے درمیان فون پر بات ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ہوٹل میں ہونے والے اس قتل کو لے کر تشویش کا شکار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کے ہوٹل کی ساکھ متاثر ہو سکتی ہے۔ انہیں بھی اس واقعے کی اطلاع ہوٹل منیجر مسٹر براؤن کی جانب سے فون پر دی گئی تھی جس کے بعد انہوں نے سارجنٹ مارٹن سے فون پر بات کی تھی۔ بہرحال اب سارجنٹ مارٹن ہوٹل گولڈ اسٹار پہنچ چکا تھا تاکہ لاش کے آس پاس سے ضروری شواہد اکٹھے کرنے کے بعد اسے پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کیا جا سکے۔ لارڈ ٹھوتھی اسے فون پر بتا چکے تھے کہ انہوں نے ہوٹل منیجر مسٹر براؤن کو سختی سے تاکید کر دی ہے کہ پولیس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے۔

ہوٹل کے گیٹ پر تقریباً ساٹھ سے پینسٹھ سال کے ایک بوڑھے شخص نے سارجنٹ مارٹن اور اس کی ٹیم کا استقبال کیا۔ یہ مسٹر براؤن تھے، گولڈ اسٹار ہوٹل کے بہت پرانے منیجر مسٹر براؤن ویسے تو عمر رسیدہ شخص تھے مگر جسمانی طور پر خاصے صحت مند تھے۔ چونکہ لارڈ ٹھوتھی نے انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ پولیس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے اس وجہ سے شاید وہ ہوٹل کے مین گیٹ پر پہلے سے ہی موجود تھے۔

''فون پر آپ سے زیادہ بات نہیں ہو سکی، آپ نے بس اتنا بتایا کہ آپ کے ہوٹل کے ایک کسٹمر کو سیموئل نامی کسی شخص نے قتل کر ڈالا ہے۔ مقتول کا نام آپ نے کارلوس بتایا تھا۔ آپ نے سیموئل نامی شخص کو کس بنا پر قاتل قرار دے دیا؟ کیا آپ نے اسے قتل کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟'' سارجنٹ مارٹن نے مصافحے کے بعد منیجر مسٹر براؤن کے ہمراہ ہوٹل کی لابی کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''سیموئل بھی کل رات ہی ہمارے ہوٹل آیا تھا۔ اسے میں نے ہی قاتل قرار نہیں دیا بلکہ پوری ہوٹل انتظامیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے یہ قتل کرتے ہوئے کسی نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، چند وجوہات کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔'' مسٹر براؤن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''میں ابھی تک ان وجوہات سے لاعلم ہوں۔'' سارجنٹ مارٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا خاص ماتحت گیری اس کے ساتھ جبکہ پولیس کا دیگر عملہ پیچھے چل رہا تھا۔ کسی نے سارجنٹ مارٹن اور منیجر براؤن کی گفتگو میں مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی، ویسے بھی وہ سارجنٹ مارٹن کی فطرت سے واقف تھے۔ وہ جب اپنی تفتیش کے سلسلے میں کسی سے گفتگو کر رہا ہوتا تھا تو ایسے وقت اسے کسی تیسرے کی مداخلت سخت ناگوار گزرتی تھی۔

سارجنٹ مارٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایک گھاگ اور ذہین پولیس افسر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس کے کھاتے میں بہت کم ایسے کیس تھے جو اس نے سلجھائے بغیر چھوڑ دیے ہوں۔ وہ جب کسی کیس کی تفتیش کا آغاز کرتا تو پھر وقت بالکل ضائع نہیں کرتا تھا۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا اور مسٹر براؤن سے ملتے ہی سوالات شروع کر دیے تھے۔

مسٹر براؤن نے مفاہمانہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا ''سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آج صبح ہوٹل کی لابی میں سیکڑوں افراد کی موجودگی میں سیموئل اور مقتول کارلوس کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ تلخ کلامی سے شروع ہونے والے اس جھگڑے نے چند ہی ثانیوں میں جسمانی تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے درمیان میں پڑ کر انہیں بمشکل ایک دوسرے سے الگ کیا۔ وہ دونوں ہوٹل انتظامیہ کے سمجھانے پر اپنے اپنے کمروں میں تو چلے گئے مگر جاتے جاتے بھی ایک دوسرے کو سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکیاں دیتے رہے۔ کارلوس کا کمرا ساتویں فلور پر ہے۔''

''ایسے جھگڑے تو آئے روز ہوتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی دوسرے فریق کو قتل ہی کر ڈالے۔ کیا سیموئل اور کارلوس پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے؟''

سارجنٹ مارٹن نے پُرخیال لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ نہیں۔'' مسٹر براؤن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت ہوٹل کی لابی میں تو موجود نہیں تھا مگر جہاں تک مجھے پتا چلا ہے کہ وہ دونوں ہوٹل کی لابی میں چلتے ہوئے اتفاقی طور پر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔ اس جسمانی ٹکر کے نتیجے میں کارلوس زمین پر جا گرا تھا جس کے بعد دونوں میں تلخ کلامی ہوئی اور پھر نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ بظاہر چلتے چلتے آپس میں ٹکرا جانا معمولی سی بات ہے۔ دونوں چاہتے تو اس بات کو اگنور کر کے آگے بڑھ سکتے تھے مگر شاید دونوں ہی خاصے انا پرست اور غصیلے واقع ہوئے تھے مگر سیموئل پر شک اس وجہ سے مزید گہرا ہو جاتا ہے کہ کارلوس کے قتل کے بعد وہ ہوٹل سے فرار ہو گیا ہے۔ اگر وہ قاتل نہیں تھا تو پھر اس کے ہوٹل سے اچانک بھاگنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے اس جگہ رک کر خود کو پولیس کے سامنے کلیئر کرنا چاہیے تھا۔''

''ہوں.....'' سارجنٹ مارٹن نے مسٹر براؤن کا جواب سن کر ہنکارا بھرا۔ بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی تھی کہ یہ قتل کی ایک سیدھی سادی واردات ہے جو نفرت، عداوت اور انتقام جیسے جذبات سے مغلوب ہو کر سرانجام دی گئی تھی۔ قتل کے بعد سیموئل نامی شخص کا ہوٹل سے فرار ہونا اس رائے کو تقویت دیتا تھا کہ کارلوس کو اسی نے قتل کیا ہے۔

''مسٹر براؤن کارلوس کی لاش تو آپ نے دیکھی ہی ہو گی۔ اسے کس چیز سے قتل کیا گیا ہے؟'' سارجنٹ مارٹن نے دوبارہ سوال کیا۔

''جی، میں نے کارلوس کی نبض چیک کر کے اور اس کی موت کی تصدیق کرنے کے بعد ہی پولیس کو اطلاع دی تھی مگر اس کے ماتھے پر بنے سوراخ کو دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے گولی ماری گئی ہے۔ سوراخ بہت چھوٹا سا ہے۔'' مسٹر براؤن نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا کسی نے گولی کے چلنے کی آواز سنی تھی؟'' سارجنٹ مارٹن نے پوچھا۔

''نہیں۔'' مسٹر براؤن نے جواب دیا۔ ''ویسے بھی ہمارے ہوٹل کے کمرے ساؤنڈ پروف ہیں۔ گولی چلنے کی آواز باہر سنائی دے ہی نہیں سکتی۔ لارڈ ٹموتھی نے پرائیویسی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہر کمرے کو جدید سائنسی خطوط پر ساؤنڈ پروف بنوایا ہے۔ اسی لیے ہمارے رومز کا کرایہ بھی عام ہوٹلوں سے تقریباً دوگنا زیادہ ہے۔'' مسٹر براؤن نے جواب دیا۔

سارجنٹ مارٹن نے اس بار کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سب اب ہوٹل کی لابی میں داخل ہو چکے تھے۔ لابی میں رش تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ سارجنٹ مارٹن کو اندازہ تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ جیسے ہی ہوٹل میں قتل کی خبر پھیلی ہو گی، بہت سے لوگ ہوٹل سے خوفزدہ ہو کر چیک آؤٹ کر گئے ہوں گے۔

''لابی میں کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ کارلوس اور سیموئل کے جھگڑے کی فلم تو موجود ہو گی؟'' سارجنٹ مارٹن نے لابی میں لگے کیمرے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لابی کے ساتھ ساتھ ہوٹل کے ہر فلور پر بھی کیمرے نصب ہیں مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ اس سلسلے میں آپ کو ان کیمروں سے کوئی مدد نہیں مل پائے گی۔'' مسٹر براؤن نے جواب دیا تو سارجنٹ مارٹن بے اختیار چونک اٹھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ یہ کیمرے بہت عرصے پہلے نصب کیے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ کیمرے تو ویسے ہی خراب ہو چکے تھے۔ اس لیے دو دن پہلے لارڈ ٹموتھی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہوٹل میں نصب ان تمام کیمروں کی جگہ اب نئے اور جدید کیمرے نصب کیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں کام شروع ہو چکا ہے۔ ریکارڈنگ روم کا تمام سامان بھی تبدیل کیا جانا ہے۔ ابھی نیا سامان نہیں آیا مگر ریکارڈنگ روم کا پرانا سامان نیلام کر دیا گیا ہے۔ اس لیے فی الحال یہ کیمرے بس ڈیکوریشن پیس کے طور پر ہی نصب ہیں۔'' مسٹر براؤن نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''پھر تو واقعی ان کیمروں سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔'' سارجنٹ مارٹن نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

اب وہ سب ہوٹل کی لفٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ لفٹ کے ذریعے ساتویں فلور پر پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہ لگی۔ کارلوس گیارہ نمبر کمرے میں قتل ہوا تھا۔ کمرے کے باہر ہوٹل انتظامیہ کے کچھ افراد بھی موجود تھے۔

''میں نے سختی سے ہوٹل انتظامیہ کے کسی بھی فرد کو اندر داخل ہونے سے منع کر رکھا ہے تاکہ غلطی سے کوئی ثبوت ضائع نہ ہو جائے۔'' مسٹر براؤن نے کہا تو سارجنٹ مارٹن نے ایسے انداز میں سر ہلایا جیسے اسے مسٹر براؤن کا یہ اقدام پسند آیا ہو۔

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے سارجنٹ مارٹن

اور اس کے ساتھیوں نے اپنے ہاتھوں پر ربڑ کے دستانے چڑھائے اور پھر وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ فی الحال صرف پولیس کے افراد ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ ہوٹل منیجر مسٹر براؤن کو بھی باہر ہی رکنا پڑا۔ کارلوس کی لاش کمرے کے وسطی حصے میں زمین پر سیدھی پڑی تھی۔ اس کے ماتھے پر بنے چھوٹے سے سوراخ کو دیکھتے ہی سارجنٹ مارٹن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مقتول کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

کارلوس کی لاش دیکھ کر سارجنٹ مارٹن کو اس کی عمر کا تعین کرنے میں بھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ چالیس کے قریب ایک مضبوط اور کڑیل جسامت کا شخص تھا۔ اس کی گرانڈیل جسامت دیکھ کر یہ کہا جا سکتا تھا کہ اگر قاتل اسے گولی سے بچنے کا موقع دے دیتا اور مقابلہ جسمانی تصادم تک جا پہنچتا تو وہ اتنی آسانی سے مار کھانے والا نہیں تھا۔ مگر سارجنٹ مارٹن کو اس بات پر بھی ہلکی سی حیرانی تھی کہ مسٹر براؤن کے مطابق جب سیموئل اور کارلوس کی ہوٹل کی لابی میں اتفاقیہ ٹکر ہوئی تو کارلوس زمین پر جا گرا۔ اصولی طور پر تو اس پہاڑ نما آدمی سے ٹکرا کر سیموئل کو زمین پر گرنا چاہیے تھا۔ شاید سیموئل بھی جسمانی طور پر خاصا کڑیل تھا یا پھر دونوں کی ٹکر کسی ایسی پوزیشن میں ہوئی تھی کہ کارلوس اپنے ہی زور میں زمین پر جا گرا تھا۔

سارجنٹ مارٹن کے ساتھ آئے ہوئے پولیس والوں نے اب کمرے کی دیواروں اور کارلوس کی لاش کے آس پاس مخصوص اسپرے کرنے کے بعد فنگر پرنٹس اٹھانے کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کیا جانا تھا۔ سارجنٹ مارٹن باقی کا کام اپنے ماتحت گیری کی نگرانی میں چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے گیری کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ فون کر کے ایمبولینس منگوا لے تاکہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کیا جا سکے۔

''مسٹر براؤن! آپ ہوٹل انتظامیہ کے افراد کو باری باری بلائیں۔ میں ان سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں وہ رجسٹر بھی دیکھنا چاہتا ہوں جس میں مسافروں کی آمد کا اندراج کیا جاتا ہے۔ سیموئل نے اس میں بہ وقتِ اندراج اپنا پتا اور فون نمبر وغیرہ تو درج کیا ہوگا؟''

''جی بہتر..... میں ہوٹل اسٹاف کے تمام افراد سے آپ کی ملاقات کا بندوبست کرتا ہوں اور رجسٹر بھی لے آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے مسٹر براؤن جیسے ہی جانے کے لیے پلٹے، راہداری میں کسی کے چلانے کی آواز سن کر بے اختیار ٹھٹک گئے۔

''کس نے مارا ہے میرے بھائی کو۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔'' ایک گرانڈیل شخص زور زور سے چلاتا ہوا اسی جانب آ رہا تھا مگر جیسے ہی اس کی نگاہ سارجنٹ مارٹن پر پڑی، وہ اپنی جگہ پر اس طرح رک گیا جیسے چابی والے کھلونے کی چابی یک بیک ختم ہو جاتی ہے۔ سارجنٹ مارٹن بھی اس شخص کو حیرت بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا تاہم اس کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات بھی ابھر آئے تھے۔

''ریمنڈے تم؟'' قدرے توقف کے بعد سارجنٹ مارٹن نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ''تو کیا کارلوس تمہارا بھائی تھا؟ تمہیں کیسے پتا چلا کہ کارلوس کو قتل کر دیا گیا ہے؟''

''اس ہوٹل میں میرا ایک جاننے والا موجود ہے اسی نے مجھے اس بارے میں اطلاع دی ہے۔'' ریمنڈے نامی اس شخص نے جواب دیا تاہم اس کا لہجہ خاصا جارحانہ تھا۔

سارجنٹ مارٹن نے اس کے جواب پر کسی خاص حیرت کا اظہار نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ قتل ایسی واردات کی خبر چھپائی نہیں جا سکتی۔ ایسی خبر بڑی تیزی سے پھیلتی ہے۔ ہوٹل میں بھی جیسے ہی یہ خبر پھیلی، اس وقت کسی نے ریمنڈے کو اطلاع کر دی ہوگی۔ جو کارلوس کو بطور ریمنڈے کے بھائی پہچانتا تھا اور شاید اسے سیموئل اور کارلوس کے جھگڑے کا بھی علم تھا۔ بہرحال اب ریمنڈے خود اس جگہ آ چکا تھا۔

سارجنٹ مارٹن ریمنڈے کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ریمنڈے کا شمار اس شہر کے چند نامی گرامی غنڈوں میں ہوتا تھا اور اس کا سارجنٹ مارٹن سے بہت پرانا واسطہ رہا تھا۔ ریمنڈے کے کھاتے میں مرڈر کے کیس بھی تھے مگر کسی کیس میں بھی اسے سزا نہیں ہو سکی تھی۔ وہ قانون میں موجود سقم کے سہارے خود کو بے گناہ قرار دلوانے میں کامیاب رہتا تھا اور پھر اس جیسے خطرناک آدمی کے خلاف کوئی گواہی دینے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

وہ ایک بددماغ و بدمزاج انسان کے طور پر مشہور تھا اور سارجنٹ مارٹن کو یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ اگر ریمنڈے کو واپس جانے پر مجبور نہ کیا گیا تو وہ ہوٹل میں کوئی نیا ہنگامہ بھی کھڑا کر سکتا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ سختی سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ سارجنٹ مارٹن ایک پرانا اور تجربہ کار پولیس آفیسر تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ریمنڈے جیسے غنڈوں سے کیسے نمٹنا ہے۔ ''دیکھو ریمنڈے!'' سارجنٹ مارٹن نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس بات کا تو علم نہیں تھا کہ کارلوس نامی مقتول تمہارا بھائی ہے۔ بہرحال اب وہ اس

دنیا میں نہیں رہا۔ ہمیں اس کے مرڈر کے سلسلے میں سیموئل نامی ایک شخص پر شک ہے۔ بہتر ہے کہ تم پولیس کی تفتیش میں رکاوٹ مت بنو۔"

"مجھے تمہاری تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔" ریمنڈے نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اپنے بھائی کے قاتل سے خود بدلہ لے لوں گا اس سیموئل کو تو میں عبرت ناک موت ماروں گا..... ایسی موت کہ اس کی روح بھی صدیوں تک بلبلاتی رہے گی۔"

"سیموئل پر ابھی صرف شک ہے۔" سارجنٹ مارٹن نے اس بار نرم لہجے میں اس سے کہا۔ "ابھی یہ بات کنفرم نہیں کہ کارلوس کا قاتل وہی ہے۔"

"وہی قاتل ہے۔" ریمنڈے پُرزور لہجے میں بولا۔ "مجھے علم ہو چکا ہے کہ اس کا آج ہوٹل کی لابی میں کارلوس کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا۔ بہرحال اسے تو میں ڈھونڈ ہی لوں گا۔ تم میرے بھائی کی لاش میرے حوالے کردو تاکہ میں اس کی آخری رسومات ادا کرنے کا بندوبست کرسکوں۔"

"ریمنڈے! بہتر ہے کہ تم قانون سے تعاون کرو۔" سارجنٹ مارٹن کا لہجہ بات کرتے ہوئے سخت ہوگیا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ فی الحال ڈیڈ باڈی تمہارے حوالے نہیں کی جاسکتی تاہم پوسٹ مارٹم کے بعد لاش تمہارے حوالے کردی جائے گی۔"

"پہلے میرے بھائی کو قتل کردیا گیا، اب اس کی لاش کی بھی چیر پھاڑ کی جائے گی۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔" ریمنڈے غصے سے دہاڑتے ہوئے بولا۔

"ریمنڈے! ہوش میں آؤ ورنہ میں تمہیں پولیس کے کام میں مداخلت کرنے کے جرم میں گرفتار بھی کرسکتا ہوں۔" سارجنٹ مارٹن نے باقاعدہ ریمنڈے کو گرفتاری کی دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ ریمنڈے کچھ دیر تک ہونٹ چباتے ہوئے اسے غصے سے گھورتا رہا اور پھر پیر پٹختے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے سارجنٹ..... تم اپنا کام کرلو اور میں اپنا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس حرامزادے سیموئل تک تم پہلے پہنچتے ہو یا میں۔" یہ کہتے ہوئے ریمنڈے واپسی کے لیے مڑ گیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

"ریمنڈے سیموئل پر ابھی صرف شک ہے، کوئی بے وقوفی مت کرنا ورنہ تم مجھے بھی اچھی طرح جانتے ہی ہو۔" سارجنٹ مارٹن نے ہانک لگائی مگر ریمنڈے اس کی بات شاید سن ہی نہیں سکا تھا کیونکہ وہ راہداری سے دوسری طرف مڑ چکا تھا۔

"مسٹر براؤن! آپ ہوٹل اسٹاف اور رجسٹر وغیرہ کے سلسلے میں میری ہدایات پر عمل کریں۔" سارجنٹ مارٹن نے قریب کھڑے مسٹر براؤن کو مخاطب کیا جو بڑے حیرت بھرے انداز میں اس کے اور ریمنڈے نامی شخص کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔

"جی بہتر۔ ویسے یہ شخص تو شکل سے ہی خاصا خطرناک لگ رہا تھا۔" مسٹر براؤن نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سارجنٹ مارٹن نے حلق سے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ شہر کے ایک خطرناک غنڈے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ کارلوس نامی مقتول اسی کا بھائی ہے اور اب سیموئل نامی اس مشکوک شخص کی گرفتاری اور بھی ضروری ہوگئی ہے کیونکہ اگر ریمنڈے ہم سے پہلے اس تک پہنچ گیا تو یہ واقعی سیموئل کو قتل کرڈالے گا۔"

مسٹر براؤن نے اس بار جواباً یوں سر ہلایا جیسے وہ سارجنٹ مارٹن کی باتوں سے سو فیصد متفق ہو اور پھر وہ راہداری میں آگے بڑھ گئے تاکہ سارجنٹ مارٹن کی ملاقات ہوٹل اسٹاف سے کروائی جاسکے۔

☆☆☆

سارجنٹ مارٹن اپنے ماتحت گیری کے ہمراہ کافی دیر تک ہوٹل میں موجود رہا اور ہوٹل کے عملے سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اس دوران میں کارلوس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردیا گیا۔

سارجنٹ نے لاش کے ہمراہ پولیس کے دیگر عملے کو بھی روانہ کردیا تھا۔ اس لیے اب وہ اور اس کا خاص ماتحت گیری ہی ہوٹل میں رہ گئے تھے۔ شام کا ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیلنا شروع ہوا تو سارجنٹ مارٹن اور گیری بھی باقی تفتیش اگلے دن کے لیے ملتوی کرتے ہوئے ہوٹل سے باہر آگئے۔ مسٹر براؤن انہیں ہوٹل کے مین گیٹ تک چھوڑنے آئے اور پھر واپس مڑ گئے۔

سارجنٹ مارٹن نے ہوٹل کا انٹری رجسٹر چیک کرنے کے ساتھ ساتھ ہوٹل اسٹاف کے عملے سے بھی پوچھ گچھ کرلی تھی تاہم اس کی ملاقات ہوٹل کے سارے عملے سے نہیں ہوسکی تھی کیونکہ رات کی ڈیوٹی والے زیادہ تر افراد صبح دس گیارہ بجے اپنی ڈیوٹی آف کرکے چلے گئے تھے۔ ان میں وہ افراد بھی تھے جنہوں نے سیموئل اور کارلوس کا جھگڑا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے سارجنٹ مارٹن کا خیال تھا کہ

پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے کے بعد ایک بار ان افراد سے بھی مل لے گا جن سے آج اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ویسے ابھی تک کے حالات و محرکات اسی جانب اشارہ کر رہے تھے کہ یہ قتل سیموئل نامی شخص نے ہی کیا ہے۔ اس کا کارلوس سے ہونے والا جھگڑا، ایک دوسرے کو سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکیاں اور پھر ہوٹل انتظامیہ کو مطلع کیے بغیر ہوٹل سے فرار اس شک کو تقویت دینے کے لیے کافی تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی حسبِ معمول ڈرائیونگ سیٹ اس کے خاص ماتحت گیری نے سنبھال لی تھی اور وہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اب .... مین روڈ پر لے آیا تھا۔ جبکہ سارجنٹ مارٹن فرنٹ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا اس کی فراخ پیشانی پر شکنوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔

''سر! میرے خیال میں یہ قتل کی سیدھی سادی سی واردات ہے جو انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر سرانجام دی گئی ہے۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان گیری بولا۔

''بظاہر تو ایسا ہی لگ رہا ہے مگر کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا نظر آ رہا ہے۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔

''کون سی باتیں سر؟'' گیری نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سیموئل اور کارلوس کا جھگڑا ہوا تھا، دونوں ایک دوسرے کو سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکیاں بھی دیتے رہے اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کارلوس کی لاش کمرے کے دروازے سے کافی دور اندر وسطی حصے میں موجود تھی، ایسا صرف اسی صورت ہو سکتا ہے جب کارلوس نے سیموئل کو کمرے کے اندر داخل ہونے کی اجازت دی ہو۔ جس طرح دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا تھا ایسی صورت میں کارلوس، سیموئل کو کمرے میں داخل ہونے کی اجازت کیسے دے سکتا تھا؟ اگر سیموئل نے اسے مارا ہوتا تو پھر وہ کارلوس کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتا اور دروازہ کھلتے ہی اسے گولی مار دیتا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ لاش کمرے کی اندرونی جانب موجود ہے۔ گویا قاتل کارلوس کے ساتھ نہ صرف کمرے کے اندر آیا بلکہ کمرے کے دروازے کو بھی اندر سے بند کیا تاکہ ساؤنڈ پروف کمرے سے گولی چلنے کی آواز بھی کسی کو سنائی نہ دے سکے۔'' بات کرتے ہوئے سارجنٹ مارٹن کے چہرے پر پھیلا شکنوں کا جال مزید گہرا ہو گیا۔

''سر! یہ بھی ممکن ہے کہ کارلوس نے کمرے کا دروازہ بند ہی نہ کیا ہو اور سیموئل کو اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا ہو۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا ہو اور پھر دروازے کو بند کر کے اس نے کارلوس کو گولی ماری ہو۔'' گیری نے رائے دی۔

''ایسی صورت میں سیموئل کے دروازہ بند کرنے سے پیدا ہونے والی کھٹکے کی آواز یقیناً کارلوس کو چوکنا کر دیتی اور یقیناً وہ خود کو بچانے کی کوشش بھی کرتا مگر کمرے میں مجھے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے جس سے لگتا ہو کہ مقتول نے مرنے سے پہلے کوئی مزاحمت کی ہو۔ کمرے کا تمام سامان بھی ترتیب کے ساتھ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مقتول کو آخری وقت تک احساس نہیں ہو سکا کہ اس کے سامنے موجود شخص اسے قتل کرنے والا ہے۔'' سارجنٹ مارٹن نے پُرخیال لہجے میں گیری کو جواب دیا۔

''سر! ایسا بھی تو ممکن ہے جب سیموئل کے دستک دینے پر کارلوس نے دروازہ کھولا... تو سیموئل نے اس سے کہا ہو کہ وہ اس سے معذرت کرنے آیا ہے جس پر کارلوس نے بھی کھلے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کمرے میں بلا لیا جس کے بعد سیموئل نے اسے اچانک گولی مار کر قتل کر دیا ہو۔'' گیری پُرزور لہجے میں بولا۔

''کارلوس اتنے کھلے دل کا مالک ہوتا تو لابی میں معمولی سی بات پر سیموئل سے جھگڑا ہی نہ کرتا۔ بہرحال جب تک سیموئل کی گرفتاری عمل میں نہیں لائی جاتی، کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ ہوٹل کے رجسٹر میں سیموئل کا موبائل نمبر بھی درج ہے جو کہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ ذرا نمبر ملا کر دیکھتے ہیں۔ ویسے اس بات کے امکانات بہت کم ہیں کہ اب اس نے اپنا نمبر آن رکھا ہوگا۔ ممکن ہے، اس خوف سے کہ ہم اس کے موبائل نمبر کے ذریعے اس کی لوکیشن نہ ٹریس کر لیں، وہ اب تک اپنے سیل فون سے بھی چھٹکارا حاصل کر چکا ہو۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ مارٹن نے اپنا سیل فون نکالا اور پھر اپنے ہاتھوں میں پہلے سے موجود ایک چھوٹی سی ڈائری سے سیموئل کا نمبر دیکھ کر ملا دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح چونک اٹھا۔

''ارے اس کا سیل فون آف نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ مارٹن نے اپنے سیل فون کے لاؤڈ اسپیکر کا بٹن پریس کر دیا تاکہ دوسری طرف اگر کوئی فون اٹینڈ کرے تو گیری بھی ان کے درمیان ہونے والی بات چیت سن سکے۔

''ہیلو.....'' چند لمحوں بعد ہی دوسری طرف سے فون اٹینڈ کر لیا گیا۔

''کیا آپ مسٹر سیموئل بول رہے ہیں؟'' سارجنٹ مارٹن نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

''جی ہاں، میں سیموئل ہی بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا تو سارجنٹ مارٹن نے معنی خیز نگاہوں سے گیری کی جانب دیکھا جو ڈرائیونگ کی وجہ سے سامنے نظریں جمائے ہوئے تھا تاہم فون پر ملنے والے جواب سے اس کے بشرے پر بھی حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ ایک پولیس والا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ کسی کو قتل کرنے کے بعد قاتل نہ اپنا فون آن رکھتا ہے اور نہ کسی کا فون اٹینڈ کرتا ہے۔ مبادا پولیس، فون کے ذریعے اس تک نہ پہنچ جائے مگر یہاں تو سارا معاملہ ہی الٹا تھا۔

''مسٹر سیموئل! کیا میں آپ سے فوری طور پر مل سکتا ہوں؟ میرا نام سارجنٹ مارٹن ہے اور مجھے کارلوس نامی ایک شخص کے مرڈر کے سلسلے میں آپ سے فوری ملاقات کرنی ہے۔''

''یہ کارلوس کون ہے؟'' سیموئل کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

''کارلوس وہی شخص ہے جس کے ساتھ آج ہوٹل گولڈ اسٹار کی لابی میں آپ کا جھگڑا ہوا تھا۔''

''اوہ..... تو کیا اس شخص کو قتل کر دیا گیا ہے؟'' سیموئل کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا اور ہمارا جھگڑا بھی بس اتفاقیہ طور پر ٹکرانے سے ہوا تھا ورنہ اس سے پہلے میں اسے جانتا بھی نہیں تھا۔''

''مسٹر سیموئل! میں آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں کہاں آؤں؟'' سارجنٹ مارٹن نے کہا۔

''میں اس وقت چاہوں بھی تو آپ سے نہیں مل سکتا کیونکہ میں شہر سے باہر ہوں۔ دراصل میرا ڈیری فارمنگ کا ایک چھوٹا سا بزنس ہے۔ میں اس سلسلے میں شہر سے باہر ہوں۔'' سیموئل نے جواب دیا۔

''مسٹر سیموئل! شاید آپ کو معاملے کی سنگینی کا پوری طرح ادراک نہیں ہے۔ آپ کارلوس کے قتل کے سلسلے میں فی الحال واحد مشکوک آدمی ہیں۔ آپ کا ہوٹل سے اچانک بغیر اطلاع فرار بھی آپ پر شک کو تقویت دیتا ہے۔'' سارجنٹ مارٹن نے اس بار خاصے سخت لہجے میں کہا۔

''میں پولیس کے سامنے پیش ہونے کو تیار ہوں۔'' سیموئل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ شاید سارجنٹ مارٹن کے لہجے نے اسے اپنی پوزیشن کا احساس دلا دیا تھا۔

''دراصل مجھے میرے سیل فون پر میرے ڈیری فارم کے ملازمین نے اچانک اطلاع دی کہ فارم ہاؤس کے چند جانور اچانک کسی بیماری کی وجہ سے ہلاک ہو گئے ہیں اور خدشہ ہے کہ اس پراسرار بیماری سے مزید جانور بھی ہلاک ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس ڈیری فارم پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا ہے۔ میں فارم کے پالتو مویشیوں کی ہلاکت افورڈ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے جیسے ہی مجھے اطلاع ملی، میں بوکھلاہٹ میں ہوٹل انتظامیہ کو اطلاع دیے بغیر ہی اپنی گاڑی نکال کر اپنے فارم کی جانب روانہ ہو گیا۔ جس وقت میری اور کارلوس کی لڑائی ہوئی تھی، اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی میں ہوٹل سے نکل گیا تھا۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کارلوس کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے فرار ہو گئے ہوں۔'' سارجنٹ مارٹن نے کہا۔

''جناب! میرا اور اس کا جھگڑا بس وقتی اشتعال کے تحت ہوا تھا۔ میں یہاں آنے کے بعد اس جھگڑے کو بھول بھی گیا تھا اور پھر مجھے کارلوس نامی اس شخص کے روم نمبر کا بھی علم نہیں تھا کہ میں جا کر اسے قتل کر دیتا۔'' سیموئل نے جواب دیا۔

''آپ کا روم کون سے فلور پر واقع تھا؟'' سارجنٹ مارٹن نے سوال کیا تو دوسری طرف سے سیموئل نے فلور نمبر بھی بتا دیا۔

''مسٹر سیموئل! کیا آپ کوئی ایسا گواہ پیش کر سکتے ہیں جس نے ہوٹل سے آپ کی روانگی کا وقت نوٹ کیا ہو؟ کارلوس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کی موت کے وقت کا تعین ہو جائے گا۔ اگر آپ ثابت کر دیں کہ آپ کارلوس کی موت کے وقت ہوٹل میں موجود نہیں تھے تو آپ ہماری طرف سے آزاد ہوں گے۔'' سارجنٹ مارٹن نے کہا۔

''میرے اور کارلوس کے جھگڑے کا حتمی وقت تو مجھے یاد نہیں ہے۔'' سیموئل کی پُرسوچ آواز سنائی دی۔ ''تاہم میرا خیال ہے کہ اس وقت گیارہ بجے کا وقت ہوا تھا۔ ہوٹل پارکنگ پر مامور شخص باقاعدہ ایک رجسٹر پر کار کی انٹری اور ایگزٹ ہونے کا وقت نوٹ کرتا ہے۔ میں جب وہاں سے گاڑی لے کر نکلا تھا تو اس وقت میری کار کے نکلنے کا وقت بھی نوٹ کیا گیا تھا۔''

سیموئل کا جواب سن کر سارجنٹ مارٹن نے ایک بار پھر معنی خیز نگاہوں سے اپنے ماتحت گیری کی جانب دیکھا اور پھر سیموئل سے کہا۔ ''مسٹر سیموئل! میں کل دس بجے کے قریب آپ کے گھر آؤں گا اور آپ کو ہر صورت اس وقت اپنے

گھر پر ہی موجود ہونا چاہیے۔ ویسے ہوٹل میں کمرا لیتے وقت آپ نے کوائف کا اندراج کروایا تھا اور اس میں اپنے گھر کا جو ایڈریس لکھا ہے، وہ تو درست ہے نا؟''

''میں نے کوائف کا اندراج کرواتے وقت تمام معلومات... درست دی تھیں..... بس ہوٹل چھوڑتے وقت مجھے انتظامیہ کو اطلاع دینا یاد نہیں رہا۔ اپنے نقصان کے بارے میں سن کر میں ضرورت سے زیادہ بوکھلا گیا تھا۔'' سیموئل نے جواب دیا تو سارجنٹ مارٹن نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''گیری! مجھے نہیں لگتا کہ سیموئل اس مرڈر میں ملوث ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم شروع سے ہی غلط سمت پر چل رہے ہیں۔'' سارجنٹ مارٹن نے اپنے ماتحت افسر سے کہا۔

''سر! یہ بھی ممکن ہے کہ سیموئل اب پولیس کو ڈاج دینے کی کوشش کر رہا ہو اور یہ قتل اسی نے کیا ہو۔ اس وقت تو بوکھلاہٹ میں وہ ہوٹل سے فرار ہو گیا تھا مگر بعد میں اسے خیال آ گیا ہو کہ اس طرح وہ پکڑا جائے گا۔ اس لیے بھاگنے کے بجائے پولیس کا سامنا کر کے بچنے کی کوشش زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی ہمارے پاس ایسا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں ہے جس نے سیموئل کو یہ مرڈر کرتے دیکھا ہو۔ اور وہ کارلوس کے قتل سے بھی انکاری ہے.....'' گیری نے کہا تو سارجنٹ مارٹن کے چہرے پر ایک بار پھر شکنوں کے جال سا پھیل گیا۔

''گیری! مجھے کل تک سیموئل کے موبائل کا ریکارڈ مل جانا چاہیے۔ اگر اسے واقعی اس کے ڈیری فارم سے کال کی گئی تھی اور وہ ہوٹل سے ادھر گیا تھا تو اس کے موبائل فون کی آج کی لوکیشن سے بہ آسانی اس کے جھوٹ اور سچ کا پتا چل جائے گا۔ مسٹر براؤن نے مجھے قریباً ایک بجے اس مرڈر کی اطلاع دی تھی اور سیموئل کے مطابق وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہی ہوٹل سے نکل گیا تھا۔ اب پوسٹ مارٹم رپورٹ اور بھی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ مسٹر براؤن نے جب کارلوس کی لاش دریافت کر کے ہمیں اطلاع دی تو وہ وقت تو ہمارے پاس نوٹ ہو گیا... مگر مسٹر براؤن نے کارلوس کے قتل ہونے کے کتنی دیر بعد اس کی لاش دریافت کی تھی، اس کا پتا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کارلوس کی موت کے وقت کا تعین ہونے کے بعد ہی لگے گا۔'' قدرے توقف کے بعد سارجنٹ مارٹن نے تجزیہ کیا تو گیری نے کوئی جواب دینے کے بجائے جواباً سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

''اس کے علاوہ پارکنگ رجسٹر میں سیموئل کی گاڑی کے نکلنے کا وقت بھی اب بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔'' سارجنٹ مارٹن نے کہا۔ ''کارلوس کی موت کا وقت اور سیموئل کی گاڑی کے نکلنے کا وقت اس معاملے کو مزید کلیئر کر دے گا۔ اگر سیموئل کی گاڑی نکلنے کے وقت کا واقعی ہوٹل میں اندراج ہوا ہے تو پھر کیمرا سسٹم بند ہونے کے باوجود ہمیں اس کے ہوٹل چھوڑنے کے حتمی وقت کا علم ہو جائے گا۔''

''سر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر پہلے اس بات کی تصدیق ہو جانی چاہیے کہ سیموئل سچ بول رہا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس نے اپنا فون اس لیے بند نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پولیس اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گی اگر ایسے وقت اس کا فون بند ہوا تو پولیس کا اس پر شک یقین میں بدل جائے گا۔'' گیری نے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ ہمیں مغالطے میں مبتلا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''ہو سکتا ہے تمہاری بات درست ہو مگر مجھے اس کا بااعتماد لہجہ سن کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ اس قتل میں ملوث نہیں۔'' سارجنٹ مارٹن جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال اس سے ملاقات کے بعد ہی میں کوئی حتمی رائے قائم کر سکوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے موبائل پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔ اس کے ماتحت گیری کو اندازہ نہیں تھا کہ سارجنٹ مارٹن کس کا نمبر ملا رہا ہے مگر جیسے ہی دوسری طرف سے فون اٹینڈ کرنے پر سارجنٹ مارٹن نے مسٹر براؤن کا نام لیا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ سارجنٹ مارٹن نے ہوٹل منیجر کا نمبر ملایا ہے۔

''مسٹر براؤن! میں سارجنٹ مارٹن بول رہا ہوں۔ مجھے آپ سے چند معلومات درکار ہیں۔'' وہ مسٹر براؤن کے فون اٹینڈ کرتے ہی تیز لہجے میں بولا۔

''جی سارجنٹ! آپ بتائیں کہ آپ کو کس قسم کی معلومات درکار ہیں۔'' دوسری طرف سے مسٹر براؤن نے مفاہمانہ لہجے میں جواب دیا۔

''مسٹر براؤن! ہماری فون پر سیموئل سے بات ہو گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے کارلوس کے جھگڑے کے بعد ایک کاروباری ایمرجنسی کی وجہ سے فوراً ہی ہوٹل چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنی گاڑی پر وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس کا کارلوس کے مرڈر سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسے تو کارلوس کے مرڈر کا علم بھی ہمارے فون کرنے کے بعد ہوا ہے۔''

''مگر پھر وہ ہوٹل سے بغیر اطلاع کے چلا کیوں گیا تھا؟'' دوسری طرف سے ہوٹل منیجر مسٹر براؤن کی الجھی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں نے اسی سلسلے میں آپ کو فون کیا ہے۔ سیموئل کا

کہنا ہے کہ ہوٹل پارکنگ سے گاڑی نکالتے وقت پارکنگ پر موجود شخص نے ایک رجسٹر میں اس کی کار کے نکلنے کا وقت نوٹ کیا تھا۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ پارکنگ پر آپ نے کس کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی؟'' سارجنٹ مارٹن نے پوچھا۔

''صبح کے وقت ڈگلس نامی ایک نوجوان کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ پارکنگ کے وقت ایک رجسٹر میں کار کے داخل ہونے اور خارج ہونے کا وقت نوٹ کیا جاتا ہے۔ مجھے پہلے اس کا خیال ہی نہ رہا تھا۔''

''مسٹر براؤن! آپ وہ رجسٹر چیک کریں اور پھر مجھے انفارم کریں کہ سیموئل نے درست کہا ہے یا نہیں۔ کار پارکنگ کے اندراج کے وقت اس کا نام اور گاڑی کا نمبر درج ہوگا۔ کیا گاڑی نکلتے وقت بھی یہ اندراج موجود ہے؟ سیموئل رات گئے تک اپنے گھر واپس آجائے گا۔ میں صبح دس بجے اس سے ملنے جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ سیموئل اس مرڈر میں ملوث نہیں ہے ابھی تک ہم اسے قتل کی ایک سیدھی سادی واردات ہی سمجھ رہے تھے مگر سیموئل نے جس طرح کارلوس کے قتل سے انکار اور پولیس کے سامنے پیش ہونے پر رضامندی ظاہر کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا ہم اب تک سمجھ رہے تھے۔ بہرحال، آپ فی الحال ڈگلس سے معلومات حاصل کریں اور پھر مجھے مطلع کردیں...... گڈبائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مسٹر براؤن کا جواب سنے بغیر ہی فون منقطع کردیا۔

گیری خاموشی سے کار ڈرائیو کررہا تھا اور اگلے دس منٹ تک کار میں خاموشی کے یہ لمحات برقرار رہے۔ سارجنٹ مارٹن بھی اپنے خیالوں میں کھویا رہا مگر پھر موبائل فون کی گھنٹی نے اسے چونکنے پر مجبور کردیا۔

''مسٹر براؤن کی کال ہے۔'' اس نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکال کر دیکھتے ہوئے کہا اور پھر سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو مسٹر براؤن! کیا آپ نے معلومات حاصل کرلی ہیں؟''

''جی ہاں......'' دوسری طرف سے مسٹر براؤن کی ...... آواز سنائی دی۔ ''میں نے ڈگلس سے معلوم کرلیا ہے اور اس کے علاوہ میں آپ کو ایک اور بات بھی بتانا چاہتا ہوں۔''

''کونسی بات؟'' سارجنٹ مارٹن نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میری ڈگلس سے بات ہوئی ہے، اس نے رجسٹر بھی چیک کیا ہے۔ سیموئل کی کار کا ہوٹل سے نکلتے وقت کا اندراج رجسٹر میں موجود ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت درج ہے اور دوسری بات جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہوٹل کے کاؤنٹر پر ریمنڈ سے آیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر موجود ریسپشنسٹ سے سیموئل کا ایڈریس جاننے کی کوشش کی تھی تاہم اس نے اسے اس بارے میں کسی قسم کی معلومات فراہم نہیں کیں جس پر وہ واپس تو چلا گیا ہے مگر جاتے جاتے دھمکی دے کر گیا ہے کہ وہ سیموئل کو تو کسی صورت زندہ نہیں چھوڑے گا مگر ہوٹل انتظامیہ کو بھی دیکھ لے گا۔''

''آپ ریمنڈ سے کی فکر نہ کریں، اسے اب میں دیکھ لوں گا۔ آپ بس اپنے آس پاس نظر رکھیں۔ اگر سیموئل نے یہ قتل نہیں کیا تو ممکن ہے کہ کارلوس کا اصل قاتل اب بھی ہوٹل میں ہی موجود ہو۔ بادی النظر میں اس کے امکانات کم ہی ہیں کہ وہ قاتل اب بھی ہوٹل میں موجود ہو۔ بہرحال کل سیموئل سے بات چیت کرنے کے بعد میں آپ سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔ مجھے اب ہوٹل کے عملے سے ازسرنو پوچھ گچھ کرنا ہوگی' پہلے میں اسے قتل کی سیدھی سادی واردات سمجھ رہا تھا مگر اب مجھے سب سے دوبارہ پوچھ گچھ کرنی ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ جب آپ نے لاش دیکھنے کے بعد مجھے فون کیا تھا تو اس وقت تقریباً ایک بجے کا وقت تھا۔ کیا آپ نے لاش دیکھنے کے فوراً بعد ہی پولیس کو فون کردیا تھا؟'' سارجنٹ مارٹن نے مسٹر براؤن سے باقاعدہ سوال کرتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' مسٹر براؤن نے جواب دیا۔ ''میں نے کارلوس کی موت کی تصدیق کرتے ہی پولیس کو مطلع کردیا تھا اور میرے مطلع کرنے کے تقریباً بیس پچیس منٹ بعد ہی آپ لوگ ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ میں ہوٹل کے کسٹمرز سے یہ پوچھنے کے لیے...... کہ انہیں ہمارے ہوٹل میں کوئی تکلیف تو نہیں، ہوٹل کے کمروں میں جاتا رہتا ہوں۔ کارلوس کے کمرے میں بھی میں اسی سلسلے میں گیا تھا' میرے بار بار دستک دینے کے بعد بھی دروازہ نہ کھولا گیا تو میں نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا اور پھر دروازہ کھلا دیکھ کر مجھے لگا کہ شاید کارلوس کمرے میں موجود ہی نہیں ہے اور باہر جاتے ہوئے دروازہ لاک کرنا بھی بھول گیا ہے۔ وہ کمرے میں موجود ہے یا نہیں، یہ دیکھنے کے لیے میں اندر داخل ہوا تھا۔ باقی کے حالات میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں نے کارلوس کی لاش دیکھنے کے بعد سب سے پہلے کمرے میں موجود فون سے ہی پولیس کو مطلع کیا اور پھر ہوٹل کی سیکیورٹی کو طلب کرنے کے ساتھ ساتھ ہوٹل مالک لارڈ ٹموتھی کو بھی

اطلاع دے دی تھی۔''

''ٹھیک ہے مسٹر براؤن..... اب کل ملاقات ہوگی۔ آپ ریمنڈے کی فکر مت کریں، اس نے آپ کے ہوٹل میں آکر باقاعدہ دھمکی دی ہے۔ اب میں اسے گرفتار کرنے کا حق رکھتا ہوں کیونکہ میرے پاس قانونی جواز موجود ہے۔ پہلی دفعہ میں نے اسے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ اس کا بھائی قتل ہوا ہے اس لیے اس کا جذبات میں آکر مشتعل ہوجانا فطری سی بات تھی۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ مارٹن نے فون منقطع کردیا۔

''گیری! مجھے میرے گھر ڈراپ کردو آج میں ٹیکسی پر پولیس اسٹیشن آیا تھا۔ میری کار میری بیوی لے گئی تھی۔ اسے کہیں دور جانا تھا۔ میں اب کل ہی پولیس اسٹیشن آؤں گا مگر تمہیں ایک کام کرنا ہے۔''

''کون سا کام؟'' گیری نے چونک کر پوچھا۔

''ریمنڈے کو فی الحال گرفتار کرلو۔ وہ سیموئل کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی رہائش گاہ کے بارے میں پتا چلا لے اور کوئی سنگین اقدام اٹھا لے۔'' سارجنٹ مارٹن نے جواب دیا۔

''سر! آپ بے فکر رہیں۔ مجھے اس کے ذاتی کلب کے بارے میں علم ہے اور ریمنڈے شام کو وہیں پایا جاتا ہے۔ آپ کو ڈراپ کرنے کے بعد میں پولیس اہلکاروں کے ہمراہ اس کے کلب کی جانب روانہ ہوجاتا ہوں۔'' گیری نے جواب دیا تو اس بار سارجنٹ مارٹن نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

گیری نے اسے گھر ڈراپ کردیا اور خود روانہ ہوگیا۔ گھر کے پورچ میں اپنی کار دیکھ کر سارجنٹ مارٹن کو اندازہ ہوگیا کہ اس کی بیوی واپس آچکی ہے۔ اس رات سارجنٹ مارٹن دیر تک جاگتا رہا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ جب وہ ذہنی طور پر الجھ جاتا تو اسے نیند ذرا دیر سے ہی آتی تھی۔ اس کیس نے بھی اسے ذہنی طور پر خاصا الجھا دیا تھا۔ اس بات کا تو اسے یقین ہوچکا تھا کہ سیموئل کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم پھر بھی کوئی حتمی رائے کل سیموئل سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد ہی قائم کی جاسکتی تھی۔ سارجنٹ مارٹن اس پہلو پر بھی غور کررہا تھا کہ کہیں کسی نے ریمنڈے سے انتقام لینے کے لیے اس کے بھائی کا خون تو نہیں کیا۔ ریمنڈے اس شہر کے چند نامی گرامی غنڈوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے بہت سے افراد پر مظالم ڈھائے تھے۔ اس پر قتل کے مقدمات بھی بنے تاہم عدم ثبوت کی وجہ سے وہ بری ہوگیا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ اس کے ماضی کے کسی دشمن نے ہی ایسا کیا ہوتاہم سارجنٹ مارٹن یہ بھی جانتا تھا کہ اس بات کے امکانات خاصے کم ہیں کہ کسی نے ریمنڈے سے بدلہ لینے کے لیے ایسا کیا ہو کیونکہ ایسے کسی بھی شخص کا اصل ٹارگٹ ریمنڈے ہوتا نہ کہ کارلوس۔

کافی دیر تک مغز ماری کرنے پر اسے دماغی تھکاوٹ محسوس ہونے لگی جس کی وجہ سے اس پر نیند کا غلبہ بھی طاری ہونے لگا اور پھر اگلے چند ہی ثانیوں میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوچکا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو ساڑھے نو بجے کا وقت ہوچکا تھا۔ آج دس بجے اسے سیموئل سے بھی ملنا تھا اس لیے وہ کافی پی کر پولیس اسٹیشن روانہ ہوگیا تاہم پولیس اسٹیشن پہنچ کر اس نے دفتر میں بیٹھنے کے بجائے گیری کو فون کرکے باہر بلا لیا۔ وہ اب فوری طور پر سیموئل کی طرف روانہ ہونا چاہتا تھا۔ مارٹن فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھا تو..... گیری نے کار آگے بڑھا دی۔

''سر! فی الحال ریمنڈے کو گرفتار نہیں کیا جاسکا۔'' گیری نے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں پولیس ٹیم کے ہمراہ کل شام ہی اس کے کلب گیا تھا مگر وہ کلب میں نہیں تھا۔ اس کے فلیٹ پر بھی تالا لگا ہوا ہے۔ آس پاس کے افراد سے پوچھ گچھ کے بعد پتا چلا ہے کہ وہ اپنے فلیٹ میں کم ہی آتا ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت اپنے کلب میں ہی گزرتا ہے۔''

''ہوں۔'' سارجنٹ مارٹن نے ہنکارا بھرا۔ ''بہتر تھا کہ اسے گرفتار کرلیا جاتا ورنہ وہ شخص جذبات میں آکر کوئی انتہائی قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ بہرحال، سیموئل کے فون ریکارڈ کے بارے میں کیا معلومات حاصل ہوئی ہیں؟''

''سر! اس بارے میں، میں معلومات حاصل کرچکا ہوں۔ کل جس وقت آپ اور اس کے درمیان بات چیت ہوئی تھی، وہ اپنی موبائل لوکیشن کے مطابق اس شہر سے بہت دور تھا۔ اس لیے اب اس حد تک تو اس کی بات سچ محسوس ہوتی ہے کہ وہ ہوٹل سے اپنے ڈیری فارم جانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔'' گیری نے جواب دیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ اس مرڈر میں ملوث نہیں ہے۔ اس سے ہونے والی ملاقات کے بعد یہ معاملہ مزید کلیئر ہوجائے گا۔'' سارجنٹ مارٹن پُرخیال لہجے میں بولا۔

تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ سیموئل کے اس پتے پر پہنچ گئے جو اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں کرا لیتے وقت لکھوایا تھا۔ سیموئل کا گھر خاصا خوبصورت اور عام آبادی

سے قدرے ہٹ کر واقع تھا۔ گھر کی عقبی جانب تاحد نگاہ درخت ہی درخت نظر آرہے تھے، گویا چھوٹا سا جنگل تھا۔ پورچ میں کھڑی کار دیکھ کر سارجنٹ مارٹن کو اندازہ ہو گیا کہ سیموئل واپس آچکا ہے۔ گیری نے کار سڑک کے کنارے روکی اور پھر وہ دونوں گاڑی سے اتر کر سیموئل کے گھر میں داخل ہو گئے۔ پورچ کے ساتھ ایک چھوٹا سا آہنی جنگلا بھی موجود تھا تاہم اس میں نصب آہنی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس جنگلے کی وجہ سے سڑک سے بھی پورچ کا سارا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اسی لیے سارجنٹ مارٹن کو سیموئل کی کار دکھائی دے گئی تھی۔ وہ گیری کے ہمراہ چلتا ہوا گھر کے اندرونی دروازے تک پہنچ گیا اور پھر اس نے بیل بجادی۔

مکان کے اندر بجتی گھنٹی کی آواز انہیں دروازے پر بھی سنائی دے رہی تھی تاہم سارجنٹ مارٹن کے دو تین بار بیل بجانے کے باوجود بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔

سارجنٹ مارٹن نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ اس نے گیری کی جانب دیکھا اور پھر اندر داخل ہونے کے لیے پورا دروازہ کھول دیا۔ بیل دینے کے باوجود دروازہ نہ کھلنے سے اسے یہ شک تو ضرور ہوا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے مگر اس کا یہ شک فوراً ہی یقین میں بدل جائے گا، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

دروازے کی اندرونی جانب ایک شخص اوندھے منہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اگرچہ سارجنٹ مارٹن اور گیری نے ابھی تک سیموئل سے ملاقات نہیں کی تھی مگر زمین پر پڑے اس شخص کو دیکھ کر انہیں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ سیموئل کے علاوہ بھلا کون ہو سکتا تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی سارجنٹ مارٹن نے پھرتی سے ریوالور نکال لیا۔ گیری نے بھی اس کی تقلید کی۔ سارجنٹ مارٹن نے زمین پر پڑے اس شخص کی گردن پر ہاتھ رکھا اور پھر اس ..... کی نبض بھی چیک کی۔

''یہ مر چکا ہے۔'' وہ اپنی تسلی کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''گیری! پورے گھر کو چیک کرو۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ اس کا قاتل فرار ہو چکا ہے مگر پھر بھی احتیاط سے ہر کمرے کو چیک کرو۔ یہ بھی ممکن ہے کوئی ڈاکو وغیرہ ہو اور اب بھی گھر کے کسی کمرے میں موجود ہو۔''

''سر! اس کے سر کے آس پاس زمین پر خون ہے، میرے خیال میں اسے بھی گولی مار کر قتل کیا گیا ہے۔'' گیری نے کہا تو سارجنٹ مارٹن نے دوبارہ جھک کر زمین پر پڑے اس شخص کی لاش کو سیدھا کر دیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ یہ سیموئل ہی ہے۔ گیری کا اندازہ ٹھیک تھا۔

مرنے والے شخص کے عین ماتھے پر چھوٹا سا گول نشان یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے ریوالور سے نشانہ بنایا گیا ہے۔

''سر! میرا خیال ہے کہ اسے ریمنڈے نے مارا ہے۔ ایک وہی شخص سیموئل کی موت کی وجہ بن سکتا ہے۔ میں ذرا گھر کا جائزہ لے لوں۔'' یہ کہتے ہوئے گیری اپنا ریوالور سنبھالتے ہوئے مکان کی اندرونی جانب چلا گیا جبکہ سارجنٹ مارٹن نے کوٹ کی جیب سے اپنا سیل فون نکال لیا تاکہ پولیس کی دیگر نفری بلا کر لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کیا جا سکے۔ اس کے سرکل میں یکے بعد دیگرے دو افراد قتل ہو گئے تھے اور یہ اس کے لیے بڑی تشویش کی بات تھی۔ سیموئل کے بارے میں تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس نے کارلوس کو قتل نہیں کیا تھا مگر خود سیموئل کو کس نے قتل کیا؟ فی الحال ریمنڈے ہی ایک ایسا شخص تھا جو سیموئل کی جان لینے کے درپے تھا۔ ہوٹل منیجر مسٹر براؤن اسے مطلع کر چکے تھے کہ ریمنڈے نے کل کس طرح ہوٹل کے کاؤنٹر سے سیموئل کے ایڈریس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ریمنڈے کو کسی طرح سیموئل کا پتا معلوم ہو گیا تھا اور اس نے سارجنٹ مارٹن کی آمد سے پہلے ہی یہاں پہنچ کر سیموئل کو جان سے مار ڈالا تھا۔ اگرچہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ملنے سے پہلے سارجنٹ مارٹن سیموئل کی موت کا حتمی وقت نہیں جان سکتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ اسے مرے ہوئے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا ہی ہوا تھا۔ سیموئل شاید اس کا انتظار کر رہا تھا اس لیے قاتل کی آمد پر بھی یہ سمجھتے ہوئے اس نے دروازہ فوراً کھول دیا ہوگا کہ باہر سارجنٹ مارٹن آیا ہے اور اس کے اسی مغالطے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قاتل نے اسے دروازے پر ہی شوٹ کر دیا تھا۔ آس پاس کے گھر اس مکان سے قدرے ہٹ کر واقع تھے، شاید اسی لیے دھماکے کی آواز پر کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ قاتل نے سائیلنسر لگا ریوالور استعمال کیا ہو۔

ابھی تک کے حالات و واقعات سے تو یہی لگ رہا تھا کہ سیموئل کا قاتل ریمنڈے ہے۔ تاہم مرنے والے کی حتمی شناخت ابھی نہیں ہوئی تھی۔ سارجنٹ مارٹن اور گیری نے سیموئل کے گھر سے ملنے والی لاش کو دیکھ کر یہ قیاس کر لیا تھا کہ مقتول سیموئل ہی ہے۔

پولیس کی نفری اور ایمبولینس طلب کرنے کے بعد سارجنٹ مارٹن نے جھک کر زمین پر پڑی ڈیڈ باڈی کی تلاشی لینا شروع کر دی، چند ثانیوں میں ہی وہ لاش کے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک نفیس بٹوا برآمد کرنے میں

کامیاب ہوگیا۔ بٹوے میں کرنسی نوٹوں کے ساتھ ساتھ ایک ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود تھا جس پر چسپاں تصویر سے شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ زمین پر پڑی لاش سیموئل کی ہی ہے۔

''سر! کوئی نہیں ہے۔'' کچھ دیر بعد گیری نے واپس آتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائنگ روم کی ٹیبل پر اسکاچ کی بوتل اور شیشے کا ایک گلاس موجود ہے۔ شاید سیموئل سونے سے پہلے شراب نوشی کر رہا تھا۔''

''گیری! اس ریمنڈے کو آج ہر صورت میں گرفتار ہوجانا چاہیے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ سیموئل کو ریمنڈے نے ہی مارا ہے مگر کارلوس کا قاتل کون ہے، اس بارے میں ہم دونوں ابھی تک اندھیرے میں ہیں۔ یہ مرنے والا سیموئل ہی ہے۔''

''سر! میں نے تو اسے کل ہی گرفتار کرلینا تھا مگر وہ ہمارے ہتھے نہیں چڑھ سکا۔'' گیری نے جواب دیا۔

''یہ بہت برا ہوا۔ اگر ریمنڈے کل گرفتار ہوجاتا تو شاید آج ہم سیموئل کو مردہ حالت میں دریافت نہیں کرتے۔ سیموئل بھی دیکھنے میں کارلوس کا ہم عمر ہی لگتا ہے۔ کارلوس کی طرح یہ بھی خاصا کڑیل جسامت کا مالک ہے... مگر اپنی زندگی سے ہی ہاتھ دو بیٹھا۔'' سارجنٹ مارٹن نے سیموئل کی لاش کو تاسف بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا۔

''سر! میرے خیال میں پولیس کی نفری اور ایمبولینس آگئی ہے۔'' گیری نے باہر گاڑیوں کی آواز اور ایمبولینس کا سائرن سن کر کہا۔ ''غالباً آپ نے فون کیا ہے۔''

''اب تم ان کے ساتھ مل کر فنگر پرنٹس اور دیگر شواہد اکٹھے کرنے کا کام سرانجام دو، میں ذرا اس علاقے کے رہائشیوں سے سیموئل کے بارے میں معلومات حاصل کرلوں۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ مارٹن باہر نکل آیا۔ باہر پولیس کی دو گاڑیاں موجود تھیں جن میں فنگر پرنٹس اٹھانے والی ٹیم کے تربیت یافتہ افراد بھی موجود تھے۔ سارجنٹ مارٹن تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔

''اندر چلے جاؤ۔ گیری لاش کے پاس موجود ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ سارجنٹ مارٹن تقریباً دو گھنٹے تک اہلِ علاقہ سے سیموئل کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اس دوران اس کی ملاقات ہارڈی نامی ایک شخص سے بھی ہوئی جو سیموئل کا رشتے دار تھا۔ اس سے سارجنٹ مارٹن کو مقتول سیموئل کے بارے میں کافی اہم معلومات بھی مل گئیں۔ ہارڈی کے مطابق وہ سیموئل کا کزن تھا اور اس وقت سیموئل کے زندہ رشتے داروں میں سب سے قریبی بھی۔ کیونکہ سیموئل اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ہارڈی نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ قریبی رشتے دار ہونے کی وجہ سے اب سیموئل کی جائداد کا بھی وہی حق دار ہے اور..... پوسٹ مارٹم کے بعد ڈیڈ باڈی بھی وہی وصول کرے گا تاکہ اس کی آخری رسومات ادا کرسکے۔ ہارڈی اپنی ظاہری وضع قطع سے ہی جرائم پیشہ لگتا تھا اور اس علاقے کے دیگر رہائشیوں نے بھی سارجنٹ کو یہی بتایا کہ ہارڈی چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہتا ہے اور سیموئل بھی اپنی زندگی میں اسے منہ نہیں لگاتا تھا۔ ہارڈی کی شہرت اپنی جگہ تھی مگر اس سے سارجنٹ کو سیموئل کی زندگی کے بارے میں کافی اہم معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ہارڈی کی رہائش گاہ بھی اسی علاقے میں تھی۔

ہارڈی نے جس طرح یہ دعویٰ کیا تھا کہ سیموئل کی موت کے بعد اب وہ اس کی جائداد کا وارث ہے، اس کے بعد ریمنڈے کے ساتھ ساتھ وہ بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہوچکا تھا۔ مگر ہارڈی سے ہی حاصل ہونے والی معلومات کے بعد ایک اور شخص بھی اس لسٹ میں شامل ہوگیا تھا اور اب سارجنٹ مارٹن کو یقین تھا کہ وہ جلد ہی قتل کی ان پیچیدہ وارداتوں کی حقیقت جان لے گا۔ ہارڈی سے ہونے والی اس ملاقات میں اس پر ایک نیا انکشاف ہوا تھا۔ بہرحال پھر بھی وہ کوئی واضح رائے قائم کرنے سے پہلے پوری تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ ہارڈی ایسا شخص نہیں تھا کہ اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کرلیا جاتا۔ اب ریمنڈے سے بھی ایک ملاقات ضروری ہوچکی تھی۔ ریمنڈے کو سیموئل سے پُرخاش تھی، اس نے کل ہوٹل میں دوبارہ جاکر سیموئل کا پتا جاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ بدلے کی آگ میں جل رہا تھا اور سیموئل کو اپنے بھائی کارلوس کا قاتل بھی سمجھ چکا تھا۔ سارجنٹ مارٹن ریمنڈے جیسے آدمیوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر سیموئل ریمنڈے کے سامنے آجاتا تو ریمنڈے سے کسی بھی سنگین اقدام کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اگر سارجنٹ مارٹن کی ملاقات آج سیموئل کے ایک رشتے دار سے نہ ہوئی ہوتی تو اس کا شک سو فیصد ریمنڈے پر ہی جاتا مگر ہارڈی نے اسے کچھ ایسا بتایا تھا جس کے بعد وہ اس قتل کے بارے میں ایک نئے زاویے سے سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اہلِ علاقہ سے اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ صبح تقریباً آٹھ نو بجے کے درمیان کافی افراد نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی مگر چونکہ سیموئل کے گھر کی عقبی

جانب واقع چھوٹے سے جنگل میں اکثر اوقات پرندوں کا شکار کھیلا جاتا ہے اور اس سلسلے میں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں..... اس لیے اس بار بھی فائر کی آواز سن کر کسی نے جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سیموئل کے گھر کے باہر اب علاقے کے لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سیموئل کے قتل کی خبر پورے علاقے میں پھیل گئی تھی اور سارجنٹ مارٹن جانتا تھا کہ جلد ہی یہ خبر میڈیا تک بھی پہنچ جائے گی جس کے بعد اعلیٰ حکام کی جانب سے اس پر قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں دباؤ بھی بڑھ جائے گا۔ کارلوس کے معاملے میں اس پر پہلے ہی خاصا پریشر تھا۔ اسے اب جلد از جلد اس کیس کو حل کرنا تھا۔

سیموئل کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ فنگر پرنٹس اٹھانے والی ٹیم بھی اپنا کام ختم کر چکی تھی۔ سیموئل کے مکان کو عارضی طور پر سیل کرنے کے بعد سارجنٹ مارٹن، گیری کے ہمراہ پولیس اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہ آج صبح سیموئل سے ملنے کے لیے اس جگہ آیا تھا مگر اس کی ملاقات جیتے جاگتے سیموئل کے بجائے اس کی لاش سے ہوئی تھی۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر سارجنٹ مارٹن اپنے آفس میں چلا گیا۔ گیری کو اس نے چند پولیس اہلکاروں کے ہمراہ ریمنڈے کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیا تھا۔

گیری کی واپسی تقریباً دو گھنٹے کے بعد ہوئی۔ پچھلی بار وہ ریمنڈے کو گرفتار نہیں کر پایا تھا مگر اس بار وہ کامیاب لوٹا تھا۔ ریمنڈے کو پوچھ گچھ کے لیے بنائے گئے مخصوص کمرے میں بٹھانے کے بعد اس نے سارجنٹ مارٹن کو آ کر اس کے بارے میں بتایا تو سارجنٹ مارٹن اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''گیری! میں اس سے اکیلے ملوں گا۔'' سارجنٹ مارٹن نے کہا تو گیری نے اثبات میں سر ہلا دیا جبکہ سارجنٹ آگے بڑھ گیا۔

''کیسے ہو ریمنڈے۔'' پوچھ گچھ کے لیے مخصوص کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کرسی پر بیٹھے ریمنڈے کو مخاطب کیا اور پھر خود بھی اس کے سامنے موجود ایک خالی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''سارجنٹ، یہ سب کیا ہے؟'' ریمنڈے برہم لہجے میں بولا۔ ''مجھے میرے کلب سے کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ میرا جرم بھی تو بتاؤ۔ تمہارے اس پولیس آفیسر نے ابھی تک مجھے میرے وکیل سے بات کرنے کی اجازت بھی نہیں دی۔''

''تمہیں اپنے وکیل سے بات کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔'' سارجنٹ مارٹن ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

''مگر مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟'' ریمنڈے کا لہجہ بدستور غصیلا تھا۔

''تم نے قتل کیا ہے ریمنڈے۔'' سارجنٹ مارٹن نے مختصر جواب دیا۔

''قتل..... کس کا؟'' ریمنڈے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''کیا میرا کوئی پرانا کیس کھولا گیا ہے؟ شاید تم بھول گئے ہو کہ مرڈرز کے تمام الزامات پر میں عدالت سے عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو چکا ہوں۔''

''مجھے افسوس ہے کہ تم عدالت سے بری ہو گئے مگر تم قانون میں موجود سقم..... کا فائدہ اٹھانے میں ماہر ہو۔ اس لیے پچھلی بار بچ گئے تھے مگر اس بار میں تمہیں بچنے کا موقع نہیں دوں گا۔'' سارجنٹ مارٹن نے تیز لہجے میں کہا۔

''سارجنٹ! بہتر ہے کہ تم مجھے میرے جرم سے آگاہ کر دو یا پھر مجھے اپنے وکیل سے بات کرنے کی اجازت دو۔'' ریمنڈے اس بار قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''تم نے کل ہوٹل گولڈ اسٹار میں دوبارہ جا کر سیموئل کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اور جب ہوٹل انتظامیہ نے سیموئل کا پتا بتانے سے انکار کر دیا تو تم نے انہیں سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔'' سارجنٹ مارٹن نے ریمنڈے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قدرے جارحانہ لہجے میں کہا۔

''تو کیا مجھے دھمکیوں کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے؟'' ریمنڈے نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''مگر ابھی تو تم مجھ پر قتل کا الزام لگا رہے تھے؟''

''اتنے بھولے مت بنو۔'' سارجنٹ مارٹن اپنا جارحانہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ''آج صبح سیموئل کو اس کے گھر میں گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے اور یہ کام تمہارے علاوہ کون کر سکتا ہے۔ تم ہی وہ شخص ہو جسے اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کی بڑی جلدی تھی۔''

''میرا سیموئل کی موت سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی موت کی خبر سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ اسے مارنے والا جو کوئی بھی تھا، میں اسے اپنا محسن ہی کہوں گا۔'' ریمنڈے نے سادہ سے لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تمہارا وہ محسن تمہارا بھیجا ہوا کوئی کرائے کا قاتل بھی ہو سکتا ہے۔'' سارجنٹ مارٹن زہر خند لہجے میں بولا۔

''تم اگر یہ عدالت میں ثابت کر سکتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' ریمنڈے نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''بہر حال کل رات میں اپنے کلب میں ہی سویا تھا اور صبح بھی وہیں تھا۔ میں گرفتاری سے قبل اپنے کلب سے باہر نکلا ہی نہیں۔ اس بات کی گواہی میرے کلب کا اسٹاف بھی دے گا۔''

''تمہارے ملازمین بھی تمہاری طرح جرائم پیشہ افراد ہیں۔ میں محض ان کی گواہی پر یقین نہیں کرسکتا۔'' سارجنٹ مارٹن نے کہا۔

''تو پھر جیسے چاہو اپنی تسلی کرلو۔'' ریمنڈے نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری پولیس تو مجھ پر وہ مرڈر بھی ثابت نہیں کرسکی جو میں نے کیے تھے۔ تو یہ مرڈر تو میں نے کیا ہی نہیں، اسے کیسے ثابت کرلو گے؟''

ریمنڈے غصے اور جھلاہٹ میں جو بول گیا تھا، اس کا احساس اسے بھی فوری طور پر ہوگیا تھا۔ وہ غلطی سے سارجنٹ مارٹن کے سامنے اس بات کا اعتراف کر بیٹھا تھا کہ وہ اپنے ان سابقہ مقدمات میں قصوروار تھا جن میں عدالت نے اسے بری کر دیا تھا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے اپنے ہونٹ ایسے بھینچ لیے جیسے کبھی نہ بولنے کی قسم کھالی ہو۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر سارجنٹ مارٹن بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''تم نے انجانے میں یہ اعتراف کرلیا ہے کہ قتل کے جن مقدمات میں تم بری ہوئے ہو، ان میں تم قصوروار تھے اور وہ قتل تم نے ہی کیے تھے۔'' سارجنٹ مارٹن ہنستے ہوئے بولا۔

''ویسے میری عادت ہے کہ میں تفتیش کے وقت کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلالیا تھا، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ تم سیموئل کے قتل کے سلسلے میں اب مشکوک افراد میں سرفہرست نہیں ہو۔ میں تو بس تم سے اپنی تسلی کے لیے پوچھ گچھ کر رہا تھا مگر تم نے اپنے سابقہ جرائم کا اعتراف کر کے ایک نیا پینڈورا باکس کھول دیا ہے۔ اب میں تمہیں باقاعدہ گرفتار کرتا ہوں اور عدالت میں تمہارے اس اعترافِ جرام کے بعد تمہارے وہ تمام کیس ری اوپن کرنے کی استدعا بھی پولیس کی جانب سے کی جائے گی جن میں تم عدم ثبوت کی بنا پر بری ہوگئے تھے۔''

''تم بچوں والی باتیں کر رہے ہو سارجنٹ۔'' ریمنڈے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں عدالت میں تمہارے سامنے کیے جانے والے اپنے اعتراف سے منحرف نہیں ہوں گا؟''

''تم چاہ کر بھی ایسا نہیں کر پاؤ گے۔'' سارجنٹ مارٹن نے ناصحانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس مخصوص روم میں ہر جگہ خفیہ کیمرے نصب ہیں۔ تمہاری ایک ایک بات ریکارڈ ہوچکی ہے۔ کبھی کبھی بہت چالاک اور کائیاں مجرم سے بھی ایسی غلطی کا ارتکاب ہوجاتا ہے جو اسے قانون کے آہنی شکنجے میں پھنسا دیتی ہے۔ تم بھی ایک ایسی ہی غلطی کا ارتکاب کر چکے ہو۔ بہر حال اب تم اس کمرے سے باہر نہیں جاسکتے۔ کچھ دیر بعد تمہیں اپنے وکیل سے بات کرنے کی بھی اجازت دے دی جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ مارٹن اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

ریمنڈے خاموشی سے ہونٹ بھینچے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ شاید اسے بھی احساس ہوگیا تھا کہ وہ انجانے میں اپنے منہ سے ایسے الفاظ نکال بیٹھا ہے جو اب اس کے گلے کا پھندا بن جائیں گے مگر اب وہ بے بس تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

سارجنٹ مارٹن کمرے سے نکل کر ایک اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کمرے میں گیری کے ساتھ ساتھ کچھ اور افراد بھی موجود تھے جو کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''سر! آپ کی اور ریمنڈے کی تمام بات چیت کی ویڈیو ریکارڈ کرلی گئی ہے مگر اس نے سیموئل کے قتل کا تو اعتراف نہیں کیا۔'' گیری نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

''میرے خیال میں اس نے سیموئل کو قتل کیا بھی نہیں ہے۔'' سارجنٹ مارٹن نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں سیموئل کے قاتل تک بھی جلد ہی پہنچ جاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ کارلوس کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ آئی ہے یا نہیں؟''

''سر! کارلوس کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ تو کل ملے گی اور سیموئل کی بھی ایک دن کے فرق سے مل جائے گی تاہم دونوں کے سروں میں جو گولیاں ماری گئی ہیں، ان کے فارنسک ٹیسٹ کی رپورٹ شاید آج ہی مل جائے۔''

''او کے ٹھیک ہے۔ میں گھر جارہا ہوں۔ ریمنڈے کو لاک اپ میں بند کردو اور اس کے سابقہ مقدمات ری اوپن کرنے کے لیے استدعا کی درخواست تیار کرو۔ ساتھ اس ویڈیو کی کاپی بھی منسلک کردینا۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ مارٹن کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ ذرا دیر سے پولیس اسٹیشن پہنچا تاہم اپنے روم میں آکر کرسی پر براجمان ہوتے ہی اس نے فوراً گیری کو طلب کرلیا۔ گیری چند ثانیوں میں ہی آگیا۔ اس

کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی فائل تھی۔

''سر! یہ کارلوس کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے۔ سیموئل کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ابھی نہیں ملی۔ تاہم اس کے سر میں لگنے والی گولی کی رپورٹ مل گئی ہے اور اس رپورٹ کے مطابق کارلوس اور سیموئل کو ایک ہی ریوالور سے قتل کیا گیا ہے۔'' گیری نے فائل سارجنٹ مارٹن کے سامنے رکھتے ہوئے اسے رپورٹ کے لبِ لباب سے بھی آگاہ کر دیا۔

''مجھے پہلے ہی یہ توقع تھی کہ کارلوس اور سیموئل کا قاتل ایک ہی ہے۔ دونوں قتل ایک ہی اسٹائل میں ہوئے ہیں، ماتھے پر گولی ماری گئی۔ جائے وقوعہ سے گولی کا خول بھی نہیں مل سکا جس سے یہ نتیجہ ہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قاتل بہت ہوشیار اور چالاک ہے اس نے دونوں قتل کرتے وقت گولی کے خول کو جائے وقوعہ پر نہیں چھوڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گولی کے خول پر درج سیریل نمبر سے پولیس اس جگہ تک پہنچ جائے گی جہاں سے یہ گولیاں خریدی گئی ہیں۔''

''سر! اس رپورٹ سے یہ بات تو طے ہو گئی ہے کہ ریمنڈے کا سیموئل کے قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ ویسے میں نے ریمنڈے کو پولیس ٹیم کے ہمراہ کورٹ روانہ کر دیا ہے جہاں اس کی ویڈیو دکھا کر اس کے کیس ری اوپن کرنے کی درخواست کی جائے گی۔'' گیری نے کہا۔

''ریمنڈے کا بچنا اتنے ٹھوس اور واضح ثبوت کے بعد ناممکن ہو چکا ہے۔ اسے اب بھول جاؤ، وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ ایک دفعہ اس کا کیس کھلا تو پھر پولیس اسے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لے گی۔ ویڈیو فلم کے بعد اب عدالت میں اسے کسی قسم کی رعایت نہیں ملے گی مگر ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔ ہمیں کارلوس اور سیموئل کے قاتل کو بھی انجام تک پہنچانا ہے۔'' سارجنٹ مارٹن نے کہا تو گیری نے یوں سر ہلایا جیسے وہ سارجنٹ مارٹن کی بات سے سو فیصد متفق ہو۔

''تو پھر سر! اب آگے کا کیا لائحہ عمل ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں نے آج سیموئل کے کچھ رشتے داروں کو پولیس اسٹیشن بلایا ہے۔ ویسے کل میری مقتول سیموئل کے ایک قریبی عزیز ہارڈی سے ملاقات ہوئی تھی اور اس سے ہونے والی ملاقات کے بعد ہی مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ ریمنڈے نے سیموئل کو قتل نہیں کیا مگر ہارڈی ایک جرائم پیشہ شخص ہے اس کی کسی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں نے سیموئل کے دیگر رشتے داروں کو

بلایا ہے تاکہ ان سے ہارڈی کی باتوں کی تصدیق کرسکوں۔ ان سب کے ٹیلی فون نمبرز بھی مجھے ہارڈی نے ہی دیے ہیں۔ بقول ہارڈی اگرچہ سیموئل سمیت اس کے دیگر رشتے دار بھی اس سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے تاہم ان سب کے پتے اور فون نمبرز اس کے پاس موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے ہوٹل گولڈ اسٹار کے اسٹاف کے کچھ افراد کو بھی یہاں طلب کیا ہے۔ خاص کر ریسپشن پر موجود عملے کو۔ اس بارمیں ان سے ذرا تفصیلی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اب میرے پاس ایک لائن آف ایکشن موجود ہے۔ سیموئل کے رشتے داروں یا ہوٹل گولڈ اسٹار کے اسٹاف میں سے کوئی بھی آئے تو اسے فوراً میرے کمرے میں بھیج دینا۔'' سارجنٹ مارٹن نے کہا اور پھر گیری کی لائی ہوئی فائل اٹھا کر اس کا جائزہ لینے لگا جبکہ گیری خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے سارجنٹ مارٹن کے ساتھ کام کرتے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا۔ اس وجہ سے وہ کافی حد تک سارجنٹ مارٹن کا مزاج آشنا بھی تھا۔ اس لیے سارجنٹ کو فائل کا مطالعہ کرتے دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اب مزید بات چیت نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے فائل میں فنگر پرنٹس رپورٹ بھی لگادی تھی تاہم اس میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔

سارجنٹ مارٹن تقریباً چار بجے تک سیموئل کے رشتے داروں اور ہوٹل گولڈ اسٹار کے اسٹاف سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ یہ سب افراد وقتاً فوقتاً پولیس اسٹیشن آرہے تھے۔ سارجنٹ کو ان سب سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو اسے پہلے معلوم نہیں تھیں۔ خاص کر ہوٹل گولڈ اسٹار کے ریسپشن پر موجود رہنے والی ایک نوجوان لڑکی میگی سے اسے ایک ایسی بات معلوم ہوئی جس سے اس کی ایک ذہنی الجھن دور ہوگئی۔ اب وہ قاتل کے بارے میں پُریقین ہوچکا تھا۔ اگرچہ سیموئل کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ ابھی آنا باقی تھی مگر سارجنٹ مارٹن کا خیال تھا کہ اب قاتل کی گرفتاری ضروری ہوچکی ہے۔

سارجنٹ مارٹن اپنی پولیس ٹیم کے ساتھ شام کے تقریباً چھ بجے ہوٹل گولڈ اسٹار روانہ ہوگیا۔ اس نے فون پر ہوٹل کے مالک لارڈ ٹموتھی سے بھی رابطہ کیا تھا اور ان سے گزارش کی تھی کہ وہ بھی ہوٹل آجائیں۔ جس پر لارڈ ٹموتھی نے کہا تھا کہ وہ ہوٹل پہنچ رہے ہیں۔

ہوٹل کے گیٹ پر سارجنٹ مارٹن کا استقبال اس بار بھی مسٹر براؤن نے کیا۔ ''کیا لارڈ ٹموتھی آگئے ہیں؟'' مسٹر براؤن سے مصافحہ کرتے ہوئے سارجنٹ مارٹن نے سوال کیا۔

''جی، وہ ابھی چند منٹ پہلے ہی آئے ہیں اور اس وقت اپنے آفس میں موجود ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے استقبال کے لیے گیٹ پر موجود رہنے کا حکم دیا تھا۔'' ہوٹل منیجر مسٹر براؤن نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

سارجنٹ مارٹن نے جواباً بس مسکراتے ہوئے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ مسٹر براؤن کے ہمراہ چلتے ہوئے اب ہوٹل کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوچکا تھا۔ گیری اور دیگر ماتحت عملہ اس کے پیچھے خاموشی سے چل رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی راہداری سے ہوتے ہوئے وہ کچھ ہی دیر میں لارڈ ٹموتھی کے آفس کے سامنے پہنچ گئے۔

''گیری! صرف تم میرے ساتھ اندر آؤ گے، باقی افراد باہر انتظار کریں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہوٹل منیجر مسٹر براؤن کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ مسٹر براؤن نے آفس کا دروازہ کھولا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔ گیری بھی سارجنٹ مارٹن کے ہمراہ اندر داخل ہوگیا۔ آنے سے پہلے اسے سارجنٹ مارٹن نے اچھی طرح بریف کردیا تھا کہ اسے وہاں کیا کرنا ہے۔ اس لیے اندر داخل ہوکر وہ منیجر براؤن کے ہمراہ ایک جانب کھڑا ہوگیا جبکہ سارجنٹ مارٹن نے آگے بڑھ کر سامنے بیٹھے لارڈ ٹموتھی سے باقاعدہ مصافحہ کیا اور پھر ان کے سامنے موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ کے فون سے تو میں پھر حیران ہوگیا ہوں۔'' لارڈ ٹموتھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سر! اصل میں، میں نے آپ کو فون کرکے اس لیے یہاں بلایا تھا تاکہ آپ کی اجازت سے قاتل کو گرفتار کرسکوں۔ میری تفتیش کے مطابق آپ کے ہوٹل میں ہونے والا قتل اور سیموئل کا اس کے گھر میں قتل ایک ہی شخص نے کیا ہے اور اس کا تعلق آپ کے ہوٹل کے عملے سے ہے اسی لیے میں نے آپ کو یہاں بلایا تھا۔''

سارجنٹ مارٹن کی بات سن کر لارڈ ٹموتھی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ ''مگر مجھے تو مسٹر براؤن نے بتایا تھا کہ کارلوس کو سیموئل نامی شخص نے قتل کیا ہے؟'' انہوں نے استفسار طلب نگاہوں سے سارجنٹ مارٹن کے عقب میں کھڑے اپنے منیجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کے چہرے پر بھی سارجنٹ کی بات سن کر حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ تاہم مسٹر براؤن کے ساتھ کھڑے گیری کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''کارلوس کو سیموئل نے قتل نہیں کیا تھا اور جیسا کہ فون پر میں آپ کو سیموئل کے قتل کے بارے میں بھی بتاچکا ہوں۔

کل صبح اسے بھی اس کے گھر میں قتل کر دیا گیا تھا اور کارلوس اور سیموئل کا قاتل ایک ہی شخص ہے۔'' سارجنٹ مارٹن نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، ویسے سیموئل نامی نوجوان کے قتل کی خبر میں نے ٹی وی پر بھی دیکھی تھی اور مجھے اسی وقت یہ گمان گزرا تھا کہ یہ وہی سیموئل ہے جو میرے ہوٹل میں بطور مسافر ٹھہرا تھا پھر فون پر آپ سے تصدیق بھی ہوگئی مگر آپ نے فون پر صرف اتنا بتایا تھا کہ قاتل میرے ہوٹل میں موجود ہے مگر یہاں آتے ہی آپ نے مجھ پر یہ دھماکا خیز انکشاف کیا کہ قاتل کا تعلق میرے ہوٹل کے ورکرز سے ہے۔ کون ہے وہ؟'' لارڈ ٹموتھی اپنے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے پُرتجسس انداز میں آگے کی جانب جھک گئے۔

''کارلوس اور سیموئل کو مسٹر براؤن نے قتل کیا ہے۔'' سارجنٹ مارٹن نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

اس کا انکشاف لارڈ ٹموتھی کے لیے اتنا حیرت انگیز تھا کہ وہ اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ کو بھول کر بے اختیار اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ جبکہ سارجنٹ کی بات سن کر اس کے عقب میں کھڑے مسٹر براؤن بھی اچھل پڑے تھے۔

''یہ کیا بکواس ہے سارجنٹ۔'' مسٹر براؤن کرسی پر بیٹھے سارجنٹ مارٹن کی ایک طرف آ کر برہم لہجے میں بولے۔ ''مجھے بھلا کسی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''مسٹر براؤن ٹھیک کہہ رہے ہیں سارجنٹ مارٹن۔'' لارڈ ٹموتھی نے بھی مسٹر براؤن کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں بھلا کسی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں انہیں کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ یہ بالکل تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی تنخواہ بھی ان کے ماہانہ اخراجات سے زیادہ ہے۔ کسی انسان کی جان لے کر ان کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے اور پھر ان کی کارلوس اور سیموئل سے کوئی دشمنی بھی نہ تھی۔''

''کارلوس کی حد تک تو آپ کی بات ٹھیک ہے۔'' سارجنٹ مارٹن نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں کارلوس کو اس ہوٹل آمد سے پہلے مسٹر براؤن جانتے بھی نہیں تھے۔''

''آپ کھل کر بات کریں سارجنٹ!'' لارڈ ٹموتھی ہلکی سی برہمی سے بولے۔ ''آپ کی باتیں مبہم اور ناقابلِ فہم ہیں۔ اگر مسٹر براؤن کارلوس کو جانتے ہی نہیں تھے تو اسے قتل کیوں کریں گے؟''

''تاکہ سیموئل، کارلوس کے قتل کے الزام میں پھنس جائے۔ ان کی اصل دشمنی تو سیموئل سے ہی تھی۔'' سارجنٹ مارٹن نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کی باتیں اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔'' مسٹر براؤن کو خاموش کھڑے دیکھ کر لارڈ ٹموتھی ایک بار پھر ان کی حمایت میں بول پڑے۔ ''اگر ان کی دشمنی سیموئل سے تھی تو یہ کارلوس کے بجائے سیموئل کو قتل کرتے؟''

''آپ کا اعتراض بجا ہے سر...... یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی تھا کہ آخر انہوں نے سیموئل کو ہی قتل کیوں نہیں کر ڈالا مگر جب میں نے آپ کے ہوٹل کے عملے سے پوچھ گچھ کی تو مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ آپ کے ہوٹل کی ریسپشنسٹ مس میگی سے اس سلسلے میں کافی مدد ملی۔ بہرحال میں آپ کو مسٹر براؤن اور سیموئل کے تعلق کی پوری کہانی سناتا ہوں کیونکہ پس منظر میں جانے بغیر آپ کو ساری بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' سارجنٹ مارٹن نے نرم لہجے میں لارڈ ٹموتھی کو جواب دیا۔ مسٹر براؤن دوبارہ نہیں بولے تھے تاہم ان کا چہرہ کسی پتھر کی طرح سخت ہوگیا تھا۔ گیری بھی خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا تھا۔

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' لارڈ ٹموتھی نے سارجنٹ مارٹن کو خاموش دیکھ کر کہا۔

''میں ذرا اپنے ذہن میں پوری کہانی ترتیب دے رہا تھا۔'' سارجنٹ مارٹن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ کہانی تقریباً پندرہ سال پرانی ہے۔ اس وقت مسٹر براؤن کی بیٹی جولیا زندہ تھی۔ اگرچہ پندرہ سال پہلے بھی مسٹر براؤن کی بیوی اس دنیا میں نہیں رہی تھی مگر ان کی بیوی کی اکلوتی نشانی یعنی مسٹر براؤن کی اکلوتی بیٹی جس کا نام جولیا تھا، مسٹر براؤن کا سب کچھ تھی۔ اس وقت جولیا کی عمر سولہ سے سترہ برس کے درمیان تھی کسی لڑکی کی یہ عمر بہت خطرناک ہوتی ہے۔ جذبات کا ایک سمندر اس کے دل میں موجزن ہوتا ہے۔ اگرچہ جولیا کی ماں کے بعد مسٹر براؤن نے جولیا کی پرورش بہت محبت اور شفقت سے کی تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ جولیا کو اس کے خاندان میں بہرحال ایک نارمل لڑکی کے طور پر نہیں جانا جاتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی انتہائی حساس طبیعت کی مالک تھی اور جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، اس کی حساسیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اگر مسٹر براؤن غلطی سے کبھی اسے ڈانٹ دیتے تو وہ کئی کئی مہینے اپنے ڈیڈی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اکثر اوقات اس پر ہیجانی کیفیت کے دورے بھی پڑتے تھے۔ اسے بچپن سے ہی تنہا رہنا پسند تھا اس لیے اس کی سہیلیاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔''

''ایک منٹ سارجنٹ!'' لارڈ ٹموتھی نے سارجنٹ

مارٹن کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ مسٹر براؤن کی بیٹی کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ میں اس بارے میں زیادہ تو نہیں جانتا مگر مسٹر براؤن نے ہی ایک دفعہ بتایا تھا کہ پندرہ سال پہلے ان کی بیٹی کا انتقال ہوگیا تھا۔'' لارڈ ملوتھی نے اپنے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے استفسار طلب نگاہوں سے خاموش کھڑے مسٹر براؤن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''انتقال نہیں ہوگیا تھا..... جولیا نے خودکشی کی تھی۔'' سارجنٹ مارٹن نے کہا تو لارڈ ملوتھی حیرت بھری نگاہوں سے سارجنٹ مارٹن کا چہرہ تکنے لگے۔ مسٹر براؤن خاموش کھڑے سارجنٹ مارٹن کی باتیں سن رہے تھے۔ تاہم اپنی مرحومہ بیٹی کا تذکرہ سن کر ان کے چہرے پر ہلکے سے کرب کے تاثرات امڈ آئے تھے۔

''سر! آپ جانتے ہیں، اس نے یہ خودکشی کیوں کی تھی؟ سیموئل کی بے وفائی کی وجہ سے۔ جی ہاں اس وقت سیموئل بھی پچیس سال کا ایک کھلنڈرا سا نوجوان تھا۔ لڑکیوں سے دل لگی کرنا اس کی عادت بلکہ فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ اس نے جولیا کو بھی ایک عام لڑکی یا شکار سمجھ کر اس سے دل لگی شروع کی۔ وہ ان دنوں مسٹر براؤن کے گھر سے چند گھر چھوڑ کر رہا تھا اور اسے وہاں آئے بھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ بہرحال جولیا پر نگاہ پڑتے ہی سیموئل نے اسے بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو آزما کر اپنی طرف مائل کرنا شروع کر دیا۔ سیموئل کی مردانہ وجاہت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا حالانکہ اب وہ چالیس کا ہو چکا تھا اور میں نے صرف اس کی لاش ہی دیکھی ہے مگر پھر بھی اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ڈیل ڈول اور چہرہ عورتوں کے لیے خاصی کشش رکھتا ہوگا اور پھر پندرہ سال پہلے تو وہ عمر کے اس حصے میں تھا جب انسان اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے۔ مسٹر براؤن کی بیٹی بھی اس کی خود میں دلچسپی نظرانداز نہ کرسکی اور اس نے سیموئل سے دوستی کرلی۔ ان کا یہ رشتہ بہت جلد شدید..... محبت میں تبدیل ہوگیا۔ سیموئل اور جولیا کی فطرت اور عادات میں نمایاں فرق تھا۔ جولیا سیموئل کو دل سے چاہنے لگی تھی اور پوری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تھی جبکہ سیموئل کچھ عرصے بعد جولیا سے بیزار ہوکر اس سے اپنی راہیں جدا کرنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ جولیا سے دور رہنا شروع کر دیا اور بات بے بات اس سے جھگڑنے بھی لگا۔ جولیا بھی سیموئل کی یہ بے رخی محسوس کر چکی تھی۔ کوئی عام امریکی لڑکی ہوتی تو وقتی طور پر صدمے سے دوچار ہونے کے بعد نارمل ہوجاتی مگر جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ جولیا بچپن سے ہی انتہائی زود رنج اور حساس طبیعت کی مالک تھی اور ایسی حساس طبیعت لڑکیاں محبت میں ناکامی کے بعد عموماً کیا کرتی ہیں، جولیا نے بھی وہی کیا۔ اس نے ایک خط لکھا جس میں واضح طور پر یہ لکھا کہ وہ سیموئل کی بے رخی و بے اعتنائی برداشت نہیں کرسکتی اور اس وجہ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہے، لہٰذا اس کی موت کے بعد کسی پر اس کے قتل کا الزام نہ لگایا جائے۔ یہ خط لکھ کر جولیا نے زہریلی گولیاں نگل لیں اور اگلے دن مسٹر براؤن نے اسے اس کے کمرے میں مردہ حالت میں پایا۔ معاملہ پولیس تک بھی گیا مگر پولیس نے بھی جولیا کی موت کو خودکشی قرار دے کر یہ کیس داخل دفتر کر دیا۔ کسی مرد کی بے وفائی پر پولیس کر بھی کیا سکتی تھی۔

''جولیا کی موت سے سیموئل کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ شاید اسے جولیا کی موت کا کچھ وقتی غم ہوا ہو مگر میری معلومات کے مطابق اس کی عادت و فطرت میں رتی بھر بھی تبدیلی رونما نہیں ہوئی، وہ ایک بھونرا صفت تھا اور مرتے دم تک بھونرا ہی رہا۔ اپنی اسی فطرت کی وجہ سے وہ اپنے آخری وقت تک غیر شادی شدہ تھا۔ مسٹر براؤن اپنی دنیا میں مگن رہنے والے شخص تھے وہ اپنی جاب پر جاتے اور شام کو تھکے ہارے واپس آتے تھے۔ انہیں جولیا اور سیموئل کے معاشقے کا اس وقت علم ہوا جب انہوں نے جولیا کا خط پڑھا۔ اپنی بیٹی کی موت کے بعد انہیں سیموئل سے نفرت ہوگئی تھی مگر ظاہر ہے وہ قانونی طور پر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد سیموئل بھی وہ علاقہ چھوڑ کر دوسری جگہ شفٹ ہوگیا اور شاید کسی نئی لڑکی سے دوستی کے بعد اس نے جولیا کو بھی بھلا دیا تھا۔

''جولیا کو اگر کسی نے یاد رکھا تھا تو وہ تھے مسٹر براؤن۔ مسٹر براؤن سیموئل کا کچھ بگاڑ تو نہیں پائے تھے مگر اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی ان کے دل میں اس کے لیے نفرت کم نہیں ہوئی تھی۔ مسٹر براؤن اس ہوٹل میں کافی عرصے سے ملازمت کر رہے ہیں اور سیموئل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پہلے بھی اس ہوٹل میں آتا جاتا رہا ہے۔ سیموئل کو دیکھ کر یقیناً مسٹر براؤن کے دل میں سوئی ہوئی نفرت پھر سے جاگ اٹھی ہوگی اور شاید یہی وہ وقت تھا جب انہوں نے اس سے اپنی بیٹی کا انتقام لینے کے بارے میں سوچا ہوگا اور انہیں اس کا موقع اس وقت ملا جب ہوٹل کے ہال میں

کارلوس اور سیموئل کے درمیان جھگڑا ہوا۔"

"سر! میں اس معاملے میں بے قصور ہوں۔" کافی دیر سے خاموشی کھڑے مسٹر براؤن مدافعانہ لہجے میں بولے۔

"اگر مجھے سیموئل کو مارنا ہوتا تو پندرہ سال انتظار کیوں کرتا؟ اور پھر ہوٹل میں سیموئل بھی رہائش پذیر تھا۔ میں اسے مارنے کے بجائے کارلوس کو کیوں مارنے لگا۔ سیدھی بات یہی ہے کہ سیموئل نے کارلوس سے ہوٹل کی لابی میں ہونے والے جھگڑے کا انتقام لینے کے لیے اسے مارا جبکہ سیموئل کو کارلوس کے بھائی ریمنڈے نے انتقاماً موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"مسٹر براؤن کی بات میں وزن ہے سارجنٹ۔" لارڈ ٹموتھی بولے۔ "میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور دعوے سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ یہ کسی انسان کا قتل نہیں کر سکتے۔"

"آپ انتقام کے جذبے سے شاید نا آشنا ہیں لارڈ ٹموتھی۔" سارجنٹ مارٹن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کی یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ مسٹر براؤن کی باتوں میں وزن ہے، اگر انہوں نے سیموئل سے انتقام ہی لینا تھا تو اتنے برس خاموشی کیوں رہے؟ تو اس سوال کا میرے پاس یہ جواب ہے کہ مسٹر براؤن سیموئل سے نفرت کرتے تھے مگر اسے جان سے مارنے کے بارے میں انہوں نے نہیں سوچا تھا۔ ویسے بھی سیموئل کا ایک عرصے تک مسٹر براؤن سے آمنا سامنا ہی نہیں ہوا تھا مگر جب برسوں بعد سیموئل کی اس ہوٹل میں آمد و رفت شروع ہوئی تو مسٹر براؤن کے سینے میں مدفون نفرت کا جذبہ آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا اور سینے میں لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا انہیں اس وقت موقع ملا جب کارلوس اور سیموئل کا جھگڑا ہوا۔ مسٹر براؤن کو ایسا لگا کہ اگر وہ کارلوس کو مار دیتے ہیں تو پولیس کا سارا شک سیموئل پر ہی جائے گا۔ کارلوس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی موت کا وقت ایک بجے کے قریب بتایا گیا ہے جبکہ سیموئل نے جب ہوٹل چھوڑا تھا تو کار پارکنگ رجسٹر میں ساڑھے گیارہ کا وقت درج ہے اس لیے سیموئل تو بہرحال کارلوس کا قاتل نہیں تھا۔

"اور مسٹر براؤن نے کارلوس کے بجائے سیموئل کو کیوں قتل نہیں کیا؟ یہ الجھن میرے ذہن میں بھی تھی جو آپ کے ہوٹل کی ریسپشنسٹ مس میگی نے دور کر دی۔ اگرچہ میں ہوٹل اسٹاف اور مس میگی سے پہلے بھی پوچھ گچھ کر چکا تھا مگر میں نے جب انہیں پولیس اسٹیشن بلا کر دوبارہ پوچھ گچھ کی تو مس میگی نے مجھ پر ایک ایسا انکشاف کیا جو شاید میگی کے لیے غیر اہم تھا مگر اس انکشاف سے مجھے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ آخر مسٹر براؤن نے سیموئل کو کیوں قتل نہیں کیا۔ کارلوس اور اس کے جھگڑے کی وجہ سے پولیس کا شک سیموئل پر ہی جاتا تھا۔ مس میگی نے مجھے بتایا کہ جب انہیں کارلوس کے قتل کے بارے میں معلوم ہوا تو ان سے صرف پندرہ منٹ پہلے کارلوس نے اسے فون کر کے کہا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے میں اپنا روم چھوڑ رہا ہے۔ مس میگی نے یہ بات مسٹر براؤن کو بھی بتائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مسٹر براؤن نے سیموئل کو بھی اپنی کار پر ہوٹل سے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ ان کے علم میں یہ نہیں تھا کہ سیموئل ہوٹل کا روم بھی چھوڑ کر جا رہا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سیموئل کی واپسی کب ہوگی۔ اگر کارلوس ہوٹل سے چیک آؤٹ کر جاتا تو اس کے بعد سیموئل کی آمد پر یہ اسے قتل بھی کر دیتے تو سیموئل کا قتل بہرحال کارلوس کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے سیموئل کو مارنے کے بجائے اسے کارلوس کے قتل میں پھنسانے کا پلان بنا لیا۔ جھگڑے کے وقت سیموئل اور کارلوس نے ایک دوسرے کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی تھیں اور مسٹر براؤن کو یقین تھا کہ کارلوس کے قتل کا الزام اسی کے سر جائے گا۔ ہوٹل کا کیمرا سسٹم بند تھا اور یہ بات بھی ان کے حق میں جاتی تھی۔ مسٹر براؤن کے پاس انتقام لینے کے لیے اس سے اچھا موقع نہیں تھا لہٰذا انہوں نے کارلوس کے کمرے میں جا کر اسے گولی مار کر قتل کر دیا۔ کارلوس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ مسٹر براؤن انہیں قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ اسی لیے اس نے انہیں کمرے میں بلا لیا ہوگا جہاں مسٹر براؤن نے اسے اچانک گولی مار کر قتل کر دیا۔ کمرے کے وسطی حصے میں پڑی لاش سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے ورنہ اگر مسٹر براؤن کارلوس کو دروازے پر گولی مارتے تو اس کی لاش کو کمرے کے اندر تک لے جانے میں انہیں خاصی دشواری ہوتی اور پھر فائر کی آواز بھی کسی نے نہیں سنی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمرے کا دروازہ بند کر کے گولی چلائی گئی اور سر! یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آپ کے ہوٹل کے تمام کمرے ساؤنڈ پروف ہیں۔ اگر سیموئل نے یہ قتل کیا ہوتا تو لاش کو دروازے پر ہی ملنا چاہیے تھا کیونکہ کارلوس اسے اندر آنے ہی نہ دیتا۔"

''سارجنٹ مارٹن! اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ سیموئل نے کارلوس کو قتل نہیں کیا تو پھر بھی میرے منیجر نے ہی کارلوس اور سیموئل کو مارا ہے اس کا بھی کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے۔ ابھی تک آپ میرے سامنے ایک بھی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکے'' لارڈ ملوتھی نے تیز لہجے میں کہا۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے کہ ابھی تک میں نے مسٹر براؤن کے خلاف آپ کو بس ایک کہانی سنائی ہے اور کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ میری یہ کہانی بھی سچ ہے اور میرے پاس گواہ بھی موجود ہیں .....مگر ابھی میری کہانی مکمل نہیں ہوئی۔ اب میں آتا ہوں اس کہانی کے دوسرے اہم سوال کی جانب جب مسٹر براؤن نے سیموئل کو پھنسانے کے لیے کارلوس کو مار ہی ڈالا تھا تو پھر انہیں سیموئل کو قتل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ دراصل اپنی دانست میں تو انہوں نے کارلوس کو مار کر سیموئل کے خلاف ایک کامیاب چال چلی تھی کیونکہ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ سیموئل ہوٹل سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس لیے انہوں نے ہوٹل کے دیگر اسٹاف میں بھی یہ بات پھیلا دی کہ سیموئل، کارلوس کو قتل کرنے کے بعد ہوٹل سے فرار ہو گیا ہے اور انہوں نے پولیس کو فون کرتے وقت بھی یہی بتایا۔ اس وقت ان کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ سیموئل واپس نہیں آئے گا۔

''ان کا خیال تھا کہ جب وہ واپس آئے گا تو اس وقت تک پولیس بھی آ چکی ہوگی اور کارلوس اور اس کے درمیان جھگڑے اور سنگین نتائج کی دھمکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پولیس سیموئل کو گرفتار کر لے گی۔ مگر پھر میں نے انہیں فون پر بتایا کہ سیموئل سے میرا رابطہ ہو چکا ہے اور وہ پولیس کے سامنے پیش ہونے پر بھی تیار ہے۔ وہ ہوٹل ساڑھے گیارہ بجے ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا جس کا ثبوت کار پارکنگ میں موجود رجسٹر ہے۔ اور کار پارکنگ میں ڈگلس نامی لڑکے سے تصدیق کرنے کے بعد مسٹر براؤن کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اگر انہوں نے رجسٹر کے اندراج میں کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو یہ شاید ان کے حق میں اچھا نہ ہو۔ ویسے اس سلسلے میں انہوں نے کار پارکنگ میں ڈیوٹی دینے والے لڑکے ڈگلس کو ترقی کا لالچ دے کر قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ ٹیمپرنگ کر کے رجسٹر کا وقت ایک بجے کر دے تو وہ اسے ہوٹل میں کسی اچھی جگہ تعینات کر دیں گے مگر ڈگلس نے اس بات کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ کارلوس کے قتل سے آگاہ ہونے کے بعد اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ معاملہ بہت حساس ہے، بہرحال آج صبح ڈگلس کو بھی میں نے پولیس اسٹیشن طلب کر رکھا تھا جہاں اس نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ مسٹر براؤن نے اسے رجسٹر میں درج وقت تبدیل کرنے کے لیے کہا تھا۔ ڈگلس عدالت میں بھی گواہی دینے کے لیے تیار ہے اور عدالت کے لیے یہ بات خاصی معنی خیز ہوگی کہ مسٹر براؤن نے سیموئل کے ہوٹل سے جانے کے وقت کو تبدیل کروانے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال، اب میں دوبارہ اصل مدعے کی طرف آتا ہوں۔ میں مسٹر براؤن کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ سیموئل شہر سے باہر ہے مگر رات گئے واپس آ جائے گا۔ میں صبح دس بجے اس سے ملنے جاؤں گا اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ قاتل ہے۔

''مجھ سے بات چیت کے بعد مسٹر براؤن کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ سیموئل کو پھنسانے کی ان کی چال ناکام ہو چکی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے سیموئل کو مارنے کا پلان بنا لیا۔ ریمنڈے دو دفعہ ہوٹل میں آ کر سیموئل کو مارنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ مسٹر براؤن کو لگا کہ اگر اب وہ سیموئل کو مارتے ہیں تو پولیس کی تفتیش کا سارا رخ ریمنڈے کی جانب ہو جائے گا۔ سیموئل نے ہوٹل میں کمرا لیتے وقت اپنا ایڈریس لکھوایا تھا۔ اس لیے مسٹر براؤن کو سیموئل کے ٹھکانے کے بارے میں جاننے میں بھی کوئی دشواری نہ ہوئی۔ میرے توسط سے انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کب اپنے گھر پہنچے گا۔ اسی لیے یہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچے۔ ان کے بیل دینے پر سیموئل یہی سمجھا ہوگا کہ ہم آئے ہیں اس لیے اس نے یہ پوچھے بغیر ہی دروازہ کھول دیا ہوگا کہ باہر کون ہے۔ اس کے بعد مسٹر براؤن کو اسے گولی مارنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور وہ سیموئل کو مار کر آرام سے وہاں سے نکل گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیموئل کی لاش دیکھنے سے لے کر کارلوس کے مرڈر تک میرے وہم گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہ دونوں قتل مسٹر براؤن کا کارنامہ ہو سکتے ہیں۔ مگر جب میں نے سیموئل کے ہمسایوں سے پوچھ گچھ کی تو میری ملاقات ہارڈی نامی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو سیموئل کا قریبی رشتے دار ہونے کا دعوے دار تھا اور اس نے مجھ پر ایک ایسا انکشاف کیا جس نے میری تفتیش کا سارا رخ ہی تبدیل کر دیا۔

''ہارڈی نے مجھے بتایا کہ اس نے آج صبح آٹھ بجے کے قریب مسٹر براؤن کو سیموئل کے گھر کے سامنے دیکھا

ہے۔ وہ مسٹر براؤن کو نہ صرف جانتا ہے بلکہ کسی زمانے میں ان کا ہمسایہ بھی رہ چکا ہے۔

''جولیا اور سیموئل کی محبت کی اور خودکشی کی کہانی بھی ہارڈی نے ہی مجھے سنائی۔ اس نے بتایا کہ سیموئل اب اسے منہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کے مالی حالات بھی اچھے نہیں تھے اور کچھ اس پر جرائم پیشہ ہونے کی چھاپ بھی لگ چکی تھی۔ تاہم پندرہ برس پہلے سیموئل سے اس کی بہت اچھی دوستی تھی اور سیموئل اور مسٹر براؤن کی بیٹی جولیا کے درمیان ہونے والی خلوت کی ملاقاتیں بھی اسی کے فلیٹ میں ہوا کرتی تھیں۔

''ہارڈی کا کہنا ہے کہ وہ مسٹر براؤن کو بڑی اچھی طرح پہچانتا ہے۔ ایک تو یہ کہ پندرہ برس گزرنے کے باوجود مسٹر براؤن کی ظاہری وضع قطع اور نقوش میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی اور دوسرا وہ ایک دو دفعہ اس ہوٹل میں بھی آیا تھا اس لیے جب اس نے مسٹر براؤن کو دیکھا تو کچھ فاصلہ ہونے کے باوجود پہچان لیا۔ بقول ہارڈی اس نے مسٹر براؤن کو دیکھنے سے چند سیکنڈ پہلے فائر کی آواز بھی سنی تھی مگر کیونکہ سیموئل کے گھر کی عقبی جانب موجود چھوٹے سے جنگل میں اکثر شکار وغیرہ کھیلا جاتا ہے، اس لیے گولی کی آواز نے اسے کسی اچنبھے میں نہیں ڈالا۔ میرے اس سوال پر کہ کیا اس نے مسٹر براؤن کے ہاتھوں میں کوئی ریوالور وغیرہ دیکھا تھا؟ اس کا جواب یہ تھا کہ اس نے مسٹر براؤن کے ہاتھوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے سیموئل کو گولی مارنے کے بعد ریوالور اپنی کوٹ کی جیب میں ڈال لیا ہو اور گولی کا خول اٹھا کر فوراً وہاں سے نکلنے کا سوچا ہو۔'' سارجنٹ مارٹن نے اپنے آخری الفاظ ایک سائڈ پر کھڑے مسٹر براؤن کی طرف دیکھتے ہوئے کہے جن کا چہرہ اب برف کی طرح سفید پڑ چکا تھا۔

''مسٹر براؤن! ہارڈی اور آپ کے ہوٹل کی کار پارکنگ میں موجود رہنے والا نوجوان ڈگلس عدالت میں آپ کے خلاف مضبوط گواہ بن چکے ہیں۔ ویسے اگر آپ اعترافِ جرم کر لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اس کیس میں ابھی ایک چیز مس ہے اور وہ ہے آلۂ قتل..... یعنی وہ ریوالور جس سے آپ نے کارلوس اور سیموئل کو قتل کیا ہے۔ کیا آپ اب بھی اعترافِ جرم کرنے سے انکار کریں گے؟ ہارڈی اور ڈگلس کی گواہی کے بعد آپ خود کو عدالت میں بے گناہ ثابت نہیں کر سکیں گے۔''

مسٹر براؤن نے فوری طور پر سارجنٹ مارٹن کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تاہم ان کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمایاں تھے۔ لارڈ ٹموتھی بھی حیرت زدہ سے مسٹر براؤن کو دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں بھی اب یقین ہو گیا تھا کہ کارلوس اور سیموئل کو انہوں ہی نے قتل کیا ہے۔

''میں نے ہی کارلوس اور سیموئل کو مارا ہے۔'' قدرے توقف کے بعد مسٹر براؤن شکست خوردہ لہجے میں بولے۔ ''آلۂ قتل یعنی ریوالور آپ کو ہوٹل میں ریزرو ڈ میرے کمرے کے باتھ روم کی فلش ٹینکی سے مل جائے گا۔ میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔''

''لارڈ ٹموتھی! کیا اب میں مسٹر براؤن کو گرفتار کر سکتا ہوں؟'' سارجنٹ مارٹن نے مسکراتے ہوئے لارڈ کو مخاطب کیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں مسٹر براؤن کو ہتھکڑیاں لگا کر ہوٹل سے باہر لایا گیا اور پولیس کی گاڑی میں روانہ کر دیا گیا جبکہ سارجنٹ مارٹن اور گیری اپنی علیحدہ گاڑی میں پولیس اسٹیشن روانہ ہو گئے تاہم اس سے پہلے وہ آلۂ قتل برآمد کرنا نہ بھولے۔

''سر! یہ کیس تو حل ہو گیا تاہم مسٹر براؤن اگر اپنے اعترافِ جرم سے منحرف ہو گئے تو عدالت میں انہیں شک کا فائدہ مل سکتا ہے۔ ہارڈی نے صرف انہیں سیموئل کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے اس پر گولی چلاتے نہیں۔'' گیری نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے پُرخیال لہجے کہا۔

''میں نے اسی لیے تو انہیں اعترافِ جرم کرنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی تھا کہ وہ عدالت میں اپنے بیان سے منحرف ہو سکتے ہیں مگر تم شاید بھول گئے کہ یہ اعترافِ جرم انہوں نے صرف پولیس کے سامنے نہیں کیا بلکہ ہوٹل کے مالک لارڈ ٹموتھی کے سامنے کیا ہے۔ اب لارڈ ٹموتھی عدالت میں ان کے اعترافِ جرم کے مضبوط گواہ ہیں۔'' سارجنٹ مارٹن نے جواب دیا تو گیری نے یوں سر ہلا دیا جیسے وہ سارجنٹ مارٹن کی دلیل سے سو فیصد متفق ہو۔ سارجنٹ مارٹن نے واقعی انتہائی چالاکی سے مسٹر براؤن کو اعصابی طور پر توڑ کر اعترافِ جرم پر مجبور کیا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے پولیس اسٹیشن میں ریمنڈے کو غصہ دلا کر اس کے سابقہ جرائم کا اعتراف کروالیا تھا اور اب ریمنڈے اور مسٹر براؤن دونوں کا سزا سے بچنا ناممکن تھا اور مسٹر براؤن کے معاملے میں تو آلۂ قتل بھی برآمد ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کے بچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بے لگام

ملک صفدر حیات

اولاد کے بارے میں بے شمار معاملے اور مختلف تجربات لوگوں کی رہنمائی کے لیے ہر وقت کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔ البتہ سمجھنے والوں کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں کیونکہ جس نے ٹھوکر کھانی ہو قدرت بھی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور پھر سونے کا نوالہ کھلا کر شیر کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے اولاد کو مزید ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھنے والے عموماً چھالوں کی تکلیف سے بلبلا جاتے ہیں... ایسے ہی اسے اذیت کو سہنا پڑا جب اس کی اولاد اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا سبب بنی... بہرحال ملک صفدر کو بھی آنکھوں سے تمام دھول نکالنے کا بہت تجربہ تھا جو یہاں اس وقت بہت کام آیا۔

بے لگام جانوروں کو سدھانے والے ملک جی کا

ایک اور کارنامہ

اگر اولاد نافرمان اور خودسر نکل آئے تو عموماً یہ کہتے ہوئے ماں کو الزام دیا جاتا ہے..... ''تمہارے لاڈ پیار اور بے جا حمایت نے اسے بگاڑا ہے۔'' لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ محبتِ مادر کی بہ نسبت حد سے متجاوز شفقتِ پدری زیادہ مہلک اور تباہ کن نتائج لاتی ہے۔ اس حوالے سے بگڑنے والے بچے جو گل کھلاتے ہیں ان میں پتیاں کم اور کانٹے زیادہ ہوتے ہیں اور..... بے لگام گھوڑا ہو یا انسان، وہ ہر حال میں اذیت رساں اور نقصان دہ ہی ثابت ہوتا ہے۔

وہ موسم سرما کا الوداعی زمانہ تھا۔ فروری کا مہینا قریب اختتام تھا۔ ایک خنک شام میں تھانے سے اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ چار دیہاتی مجھ سے ملنے آ گئے۔ ان میں ایک عورت اور تین مرد تھے۔ میں نے فوراً انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔

ان میں سے ایک دبلے پتلے دراز قامت شخص کا نام مشتاق معلوم ہوا۔ مشتاق کی عمر پچاس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ عورت مشتاق کی بیوی خالدہ تھی۔ خالدہ عام سی صورت شکل کی مالک ایک پینتالیس سالہ عورت تھی۔ باقی دو افراد سراج اور صدیق، مشتاق کے دائیں بائیں والے پڑوسی تھے۔ وہ چاروں خاصے پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے انہیں ایک چوبی بینچ پر بٹھایا پھر ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی! آپ لوگوں کا کیا مسئلہ ہے۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟''

''تھانے دار صاحب.....!'' مشتاق گلوگیر آواز میں بولا۔ ''تھانے کوئی شوق سے نہیں آتا۔ ہم لوگ بہت مشکل میں ہیں۔''

''میں نے بھی تو وہی پوچھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کون سی پریشانی آپ لوگوں کو یہاں کھینچ لائی ہے؟''

بھاری بھر کم جثے کے مالک سراج نے مجھے بتایا۔
''تھانے دار جی! مشتاق کی بیٹی لاپتا ہوگئی ہے.....''
''یہ کب کی بات ہے.....؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
''صحیح وقت کا تو پتا نہیں جناب۔'' مشتاق نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''صبح تو وہ گھر میں موجود تھی۔ بس دوپہر کے بعد کہیں نظر نہیں آ رہی۔''
''لڑکی دوپہر سے غائب ہے اور تم رپورٹ درج کرانے اب میرے پاس آئے ہو.....!'' میں نے گھور کر مشتاق کی طرف دیکھا۔ ''شام ہو چکی ہے۔ چند منٹ کے بعد اندھیرا پھیل جائے گا۔''
''وہ جی بات دراصل یہ ہے کہ.....'' مشتاق کی بیوی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''دوپہر سے اب تک ہم پینو کو گاؤں کے اندر ہی تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے ہر گھر میں جھانک لیا اور پنڈ کے ہر بندے سے پوچھ لیا لیکن کہیں سے بھی پینو کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔ اس کے بعد ہی ہم مدد لینے آپ کے پاس آئے ہیں۔ پتا نہیں، میری جوان جہان بیٹی کہاں گم ہوگئی ہے.....!''
بات کے اختتام پر وہ آنسو بہانے لگی۔ میں نے مشتاق کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''غالباً تمہاری بیٹی کا نام پروین ہے جو بگڑ کر ''پینو'' بن گیا ہے؟''
''جی تھانے دار صاحب.....!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
خالدہ نے چند لمحے پہلے اپنی بیٹی کے لیے ''جوان جہان'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اسی تناظر میں، میں نے مشتاق سے پوچھا۔ ''پینو کی عمر کیا ہے؟''
''اٹھارہ سال!'' اس نے جواب دیا۔
''کیا پینو اس سے پہلے بھی کبھی گھر سے غائب ہوئی ہے؟''
''نہیں سرکار..... ایسا پہلی بار ہوا ہے۔''
''گھر میں تمہارے اور خالدہ کے علاوہ اور کتنے افراد رہتے ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔
''کوئی نہیں مائی باپ۔'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ ''پینو ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ بس ہم تین ہی بندے اس گھر میں رہتے ہیں اور..... پینو کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ میری بیٹی بڑی اللہ والی تھی۔''
''تم لوگوں کو کب معلوم ہوا کہ پینو گھر میں موجود نہیں ہے؟''
''دوپہر کے وقت جی۔'' مشتاق کے بجائے خالدہ نے جواب دیا۔ ''میں پینو کو گھر میں چھوڑ کر رشیدہ کے ساتھ شاہ جی کے آستانے کی طرف چلی گئی تھی۔ جب میں آستانے سے لوٹی تو پینو گھر میں کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے مشتاق (مشتاق) سے پوچھا تو اسے بھی پینو کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بس جی..... پھر ہم نے پینو کو اِدھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کر دیا۔''
''مشتاق! تم کیا کام کرتے ہو؟'' میں نے گمشدہ پینو کے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''جب خالدہ شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی، اس وقت تم کہاں تھے؟''
''میں اپنی دکان میں کام کر رہا تھا اور یہ دکان میرے گھر کے سامنے والے حصے میں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں سائیکلوں کی مرمت کا کام کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے دکان میں ٹائر، ٹیوب اور دیگر سامان بھی رکھا ہوا ہے۔ جس کی جو ضرورت ہوتی ہے، میں مناسب قیمت پر فروخت کر دیتا ہوں۔ سمجھ لیں کہ چمن آباد کے لوگوں کو شہر کا پھیرا نہیں لگانا پڑتا، میں ان کی ضرورت کی چیز، شہر والے ریٹ پر ہی دے دیتا ہوں اور.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''میں نے اپنی دکان میں نصف درجن چھوٹی بڑی سائیکلیں بھی رکھی ہوئی ہیں جو میں فی گھنٹا کے حساب سے کرائے پر بھی دیتا ہوں۔''
''مشتاق!'' میں نے توجہ سے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔ ''تم نے اپنی دکان کی تفصیل تو بتا دی۔ ذرا یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی تو کرو کہ تمہاری بیٹی کہاں جا سکتی ہے؟''
موضع چمن آباد میرے تھانے سے لگ بھگ ایک میل کی دوری پر جنوب میں، جی ٹی روڈ پر ہی واقع تھا۔ جی ٹی (جنرل ٹرنک) روڈ کی دونوں جانب کارخانے اور فیکٹریاں تھیں اور ان فیکٹریوں کے عقب میں کہیں کہیں رہائشی آبادیاں موجود تھیں جبکہ زیادہ تر زمین زرعی کھیتوں پر مشتمل تھی۔ چمن آباد نامی اس گاؤں کے فرنٹ پر تین ٹیکسٹائل ملز تھیں جن کے دائیں بائیں خالی پلاٹس تھے۔ ایک لحاظ سے آپ انہیں کھیت بھی کہہ سکتے ہیں۔
مشتاق نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔
''تھانے دار صاحب! اگر مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ پینو کہاں گئی ہوگی تو پھر میں فریاد لے کر آپ کے پاس کیوں آتا۔ بس جی..... پینو بہت پہنچی ہوئی تھی۔ اسے سب پتا تھا.....!''
پینو کے حوالے سے مشتاق نے پہلے بھی کچھ اسی قسم کی بات کی تھی کہ ''میری بیٹی بڑی اللہ والی تھی۔'' اور اب وہ گمشدہ پینو کو بہت گیانی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
''مشتاق! تمہارے آخری جملے کا کیا مطلب ہے؟

پینو کو "سب" کیا پتا تھا؟"

"مشتاق کا دماغ خراب ہو گیا جی....." خالدہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "یہ پینو سے اندھی محبت کرتا ہے۔ اس کے لاڈ پیار نے پینو کو بڑا ضدی اور من موجی بنا دیا ہے۔ میری تو وہ ایک نہیں سنتی۔ ذرا سا کچھ کہہ دوں تو فوراً باپ کو شکایت لگاتی ہے اور مشتاق بھی اسے سمجھانے کے بجائے الٹا مجھ ہی کو ڈانٹتا ہے۔"

"خالدہ! تم چند منٹ بالکل خاموش بیٹھو۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "میں پہلے مشتاق سے بات کرلوں، پھر تمہاری باری بھی آئے گی۔"

"کریں جی آپ مشتاق سے بات۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ "یہ تو ایسے ظاہر کر رہا ہے جیسے پینو کے گم ہونے کا صرف اسی کو دکھ ہے۔ میں تو جیسے اس کی سوتیلی ماں ہوں....."

مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر خالدہ وہاں موجود رہی تو مجھے ڈھنگ سے بات نہیں کرنے دے گی۔ اتنی دیر میں، میں نے یہ بھی محسوس کرلیا تھا کہ صدیق اور سراج پڑوسی ہونے کے ناتے محض اخلاقی فرض نبھاتے ہوئے ان میاں بیوی کے ساتھ آ گئے تھے۔ میں نے ان تینوں مرد و زن کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"خالدہ، صدیق اور سراج..... تم باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ جس کی ضرورت ہوگی، میں اسے اندر بلا لوں گا۔"

صدیق اور سراج کوئی تاثر دیے بغیر اور خالدہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے میرے کمرے سے باہر چلی گئی تو میں مشتاق کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"ہاں بھئی مشتاق! اب بتاؤ، تم پینو کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

"تھانے دار صاحب! مجھے پینو کے گم ہونے کا بڑا صدمہ ہے۔ میں اپنے دکھ کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پچھلی رات کو پینو نے جو بات کی، اس وقت میں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ جانتی تھی کہ آج وہ اس گھر میں موجود نہیں ہوگی....."

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "پینو نے پچھلی رات تم سے ایسی کون سی بات کی تھی؟"

"ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور یہ ہمارا روز کا معمول تھا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "خالدہ جلدی سو جاتی تھی اور ہم باپ بیٹی بیٹھے اِدھر اُدھر کی بات چیت میں لگے رہتے تھے۔ گزشتہ رات بھی ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ پینو یکدم اداس ہو گئی۔

"کیا ہوا میری دکھی رانی؟" میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں ابا.....!"

"کچھ تو ہے بیٹا جی....." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تشویش بھرے انداز میں سوال کیا۔ "تم یکدم بجھ سی کیوں گئی ہو۔ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ.....!"

"کوئی پریشانی نہیں ابا!" وہ مرجھائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا ماں نے تمہیں ڈانٹا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ابا.....!"

"پھر..... پھر تم یکایک صدیوں کی بیمار کیوں نظر آنے لگی ہو۔" میں نے تشویش آمیز دلار سے جاننا چاہا۔ "ایسا محسوس ہو رہا ہے، کسی نے تمہارے وجود میں سے روح کھینچ لی ہو..... کیوں میری لاڈو.....؟"

"ابا.....!" وہ حسرت بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ "آج کی رات ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ کل رات ہم میں سے کوئی ایک اس گھر میں موجود نہیں ہوگا....." مشتاق نے لمحاتی توقف کر کے گھائل نظر سے مجھے دیکھا پھر نمناک لہجے میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! پینو بہت پہنچی ہوئی تھی۔ اسے کل رات ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آج وہ گھر میں نہیں ہوگی۔ میری مت ماری گئی تھی کہ اس وقت میں پینو کی بات میں چھپے رمز کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں....."

بات کے اختتام پر وہ دونوں ہاتھوں سے دھیرے دھیرے اپنا ماتھا پیٹنے لگا اور میں اس کی سادگی نما حماقت پر، تصور میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ وہ پینو کی جس بات کو اس کی کوئی کرامت اور سچی پیش گوئی سمجھ رہا تھا وہ میری نگاہ میں پینو کے فرار کا ایک اشارہ تھا۔ اگر میں غلطی پر نہیں تھا تو پینو کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔

میں نے ایک دکھی باپ کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔ "مشتاق! تم نے چمن آباد میں اچھی طرح پینو کو تلاش کرلیا ہے نا؟"

موضع چمن آباد تین سو گھروں پر مشتمل ایک گنجان آباد گاؤں تھا۔ اس کی آبادی کم و بیش تیرہ سو افراد تھی۔ ایسے بستے بستے گاؤں میں کسی ایک فرد کو تلاش کرنا اگر مشکل نہیں تو یہ کام آسان بھی نہیں تھا۔

"جی تھانے دار صاحب!" مشتاق نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "سب سے پوچھ کر دیکھ لیا

جناب۔ کوئی بھی پینو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ پتا نہیں، میری بیٹی کو زمین نے نگل لیا یا آسمان کھا گیا۔ اب آپ ہی ہمارا آخری سہارا ہیں.....'' بات پوری کرتے ہی اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور امداد طلب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''مشتاق! کیا تم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ پینو کے علاوہ بھی کوئی شخص چمن آباد سے غائب ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کیا مطلب جی.....؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو مشتاق؟''

''نہیں جی..... مجھے کسی اور بندے کے غائب ہونے کا علم نہیں ہے۔'' وہ بہ دستور الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ''آپ کے سوال سے تو یہی محسوس ہو رہا ہے کہ آپ پینو کے، گھر سے بھاگ جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں.....!''

''مشتاق! میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور ہماری تفتیش کی گاڑی ہمیشہ شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ بعض اوقات ہمیں خود پر بھی شک کرنا پڑتا ہے۔ تم چاہے اپنی بیٹی کو بہت پہنچی ہوئی اور اللہ والی سمجھتے رہو۔ عین ممکن ہے کہ تمہارا یہ سمجھنا صد فیصد درست ہو لیکن میں ایک پولیس والا ہوں اور میرے سامنے ایک جوان جہان لڑکی کی پراسرار گمشدگی کا معاملہ رکھا ہوا ہے لہٰذا دیگر امکاناتِ گمشدگی کے علاوہ میں یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوں کہ ہو سکتا ہے، پینو اپنی مرضی سے خود ہی اکیلی یا کسی کے ساتھ کہیں چلی گئی ہو اور.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور باقی باتیں خالدہ کے سامنے ہوں گی۔ تم اپنی بیوی کو اندر بلا لو۔''

وہ بینچ سے اٹھا اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے میرے کمرے کے دروازے پر پہنچا پھر ہاتھ کے اشارے سے اس نے خالدہ کو اندر بلا لیا۔ جب وہ میاں بیوی میرے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے باری باری دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد تسلی بھرے انداز میں کہا۔

''اس بات کا اطمینان رکھو کہ میں جلد یا بدیر تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے.....!''

انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر خالدہ مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ''کیسی شرط تھانے دار صاحب؟''

''سچ بولنے کی شرط!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں جو پوچھوں اس کا سولہ آنے درست جواب دینا ہوگا ورنہ مجھ سے کسی مدد کی امید نہ رکھیں۔ آپ لوگوں کے تعاون کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔''

''تھانے دار صاحب! ہم آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی کیوں کریں گے۔ آپ ہم سے پوچھیں جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں.....''

میں نے پوچھا۔ ''اب تک پینو کی شادی کیوں نہیں ہوئی۔ ماشاءاللہ! وہ اٹھارہ سال کی تھی۔ خوب صورت اور جوان جہان تھی۔ لڑکیوں کے تو چودہ پندرہ سال کی عمر ہی میں رشتے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب تک پینو کے کتنے رشتے آئے تھے؟''

''یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے تھانے دار صاحب!'' مشتاق نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ''آج تک پینو کا کوئی بھی ڈھنگ کا رشتہ نہیں آیا۔ بس، ایک ہی لڑکا اس سے شادی کا خواہش مند ہے اور میں اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح نہیں کر سکتا.....''

''کون ہے وہ لڑکا؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

''پتا نہیں، آپ ہوائی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں.....!'' خالدہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

قبل اس کے کہ میں خالدہ کے اظہارِ خیال پر کوئی سوال داغتا، مشتاق نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''اس لڑکے کا نام اعجاز ہے لیکن گاؤں میں سب اسے ''جاجو'' کہتے ہیں۔ وہ پکوڑے اور سموسے وغیرہ کا ٹھیلا لگاتا ہے اور اکثر اپنے ٹھیلے کے پہیوں میں ہوا بھروانے وہ میری دکان پر آجاتا ہے اور باتوں کے بہانے وہ کافی دیر میرے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ اس نے بعض اوقات ڈھکے چھپے الفاظ میں اور ایک آدھ بار واضح انداز میں مجھے باور کرایا ہے کہ وہ پینو کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے صاف انکار کر دیا مگر وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ اپنے ٹھیلے کے ٹائروں میں ہوا بھروانے کے بہانے وہ روزانہ میری دکان پر آتا ہے اور پھر کافی دیر ادھر ہی رکا رہتا ہے۔ اس نے آج تک مجھ سے کوئی غلط بات نہیں کی۔ وہ مجھ سے بڑے ادب و احترام سے ملتا ہے۔ اس کے شریفانہ رویے کو دیکھ کر میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا

کہ..... جاؤ یہاں سے اور کبھی میری دکان کا رخ نہیں کرنا۔ آپ سیانے بیانے ہیں تھانے دار صاحب....." وہ چند سیکنڈ کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"آپ تو جانتے ہیں، جس گھر کے آنگن میں بیری کا درخت ہوتا ہے وہاں پتھر تو آیا ہی کرتے ہیں۔ بیٹیوں کے والدین کو ایسے حالات سے گزرنا ہی پڑتا ہے.....!"

"ہاں..... میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں مشتاق!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم جاجو کو پینو کے قابل کیوں نہیں سمجھتے تھے۔ اس میں ایسا کون سا عیب ہے؟"

"کوئی ایک عیب ہو تو بتائیں نا جی۔" مشتاق کے بجائے خالدہ بول اٹھی۔ "ہماری پینو پانچ جماعتیں پاس ہے، حسین و جمیل ہے، جوان ہے اور ماشاءاللہ! صحت مند اور اونچی لمبی ہے۔ وہ اٹھارہ سال کی ہے مگر دیکھنے والے اس کی صحت اور تندرستی کی وجہ سے اسے تئیس چوبیس کی سمجھتے ہیں اور یہ جاجو....." اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"پینو کے مقابلے میں آدھے قد کاٹھ کا ہے۔ اسے پینو کے برابر کھڑا کریں تو وہ پینو کی بغل میں آئے گا۔ اس پر "نہ منہ، نہ متھا تے جن پہاڑوں لتھا" والا معاملہ ہے جی۔ اوپر سے جاجو چٹا ان پڑھ بھی ہے اور رنگت ایسی توے کے مانند کہ اگر اچانک سامنے آجائے تو بچے کیا، بڑے بھی ڈر جائیں۔ میں اپنی مصری کی ڈلی، نازوں سے پلی پینو کو اس لنگور کے ساتھ بیاہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی....."

اس بات کا مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ خالدہ زبان کی خاصی تیز اور مزاج کی طرار تھی۔ اس کے مقابلے میں مشتاق کے انداز میں ایک دھیما پن اور ٹھہراؤ پایا جاتا تھا۔ دونوں نے ایک ہی کردار یعنی اعجاز عرف جاجو کا ذکر کیا تھا مگر ان کے بیان کا زاویہ اور درجۂ حرارت ایک دوسرے سے خاصا مختلف تھا۔ میں نے خالدہ کی آتشیں اور ہتک آمیز بات تحمل سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر گہری سنجیدگی سے کہا۔

"خالدہ بی بی! ساری شکلیں اللہ کی بنائی ہوئی ہیں اور اس قادرِ مطلق کی کسی تخلیق کو مذاق اور تحقیر کا نشانہ بنانا انتہائی غیر اخلاقی بلکہ غیر انسانی فعل ہے۔ بے شک! ہر والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اولاد کا رشتہ جہاں چاہیں کریں اور جہاں نہ چاہیں، نہ کریں مگر تم نے جس طرح جاجو کا تعارف کرایا ہے وہ کسی بھی طور مناسب نہیں۔ انسانوں کو شکل و صورت عطا کرنے والے پروردگار سے ہر لمحہ ڈرتے رہنا چاہیے۔ پتا نہیں، اس مالک و مختار کو ہمارا کون سا عمل کس وقت ناگوار گزر جائے اور وہ اس کے بدلے ہمیں کس مشکل میں ڈال دے.....!"

اپنے کہے پر شرمندہ ہونے کے بجائے خالدہ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ "اس کے علاوہ ایک اور خاص بات بھی ہے تھانے دار صاحب.....!"

تو ثابت یہ ہوا کہ خالدہ زبان دراز ہونے کے ساتھ ساتھ نامعقول بھی تھی۔ اس وقت وہ ایک دکھی ماں کی حیثیت سے اپنی گمشدہ بیٹی کی رپورٹ درج کرانے میرے پاس آئی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑ کر اس کی طبیعت صاف کر دیتا مگر صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے ہاتھ ہولا رکھتے ہوئے کہا۔

"خالدہ بی بی! اب جلدی سے وہ خاص بات بھی بتا دو؟"

"تھوڑی دیر پہلے میں نے ہوائی چیزوں کا ذکر کیا تھا....." وہ ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔ "کیا آپ ایسی چیزوں کو مانتے ہیں؟"

میں نے بس ایسے ہی کہہ دیا۔ "ہوائی چیزوں سے تمہاری مراد جہاز، مکھی، مچھر، غبارے، پتنگ، پرندے وغیرہ ہی ہے نا.....؟"

"نہیں جی..... آپ میری بات نہیں سمجھے!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بڑی شدت سے بولی۔ "میرے کہنے کا مطلب تھا..... جن، پری اور دوسری ہوائی مخلوقات جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتیں....."

"میں ایسی ہوائی مخلوقات پر یقین رکھتا ہوں یا نہیں اور یا پھر کس حد تک یقین رکھتا ہوں، یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔" میں نے خالدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تم جو کہنا چاہتی ہو، وہ بیان کرو۔"

"پھر تو آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔ "میں سمجھ گئی ہوں، آپ ہوائی چیزوں کو نہیں مانتے....."

خالدہ کی اس "سمجھ" کے جواب میں، میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی مشتاق بول اٹھا۔

"تھانے دار صاحب! شاہ جی نے خالدہ کو بتایا ہے کہ پینو پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے۔ وہ جن مسلمان ہے اور اس کا نام گلزار ہے۔ یہ گلزار ہی پینو کا کوئی رشتہ نہیں آنے دیتا۔ شاہ جی کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے زبردستی پینو کی کہیں شادی کرنے کی غلطی کی تو گلزار، پینو کے شوہر کی گردن توڑ

ڈالے گا۔ پینو کی شادی اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب گلزار اس کی جان چھوڑ دے ورنہ اسے ساری زندگی گلزار کی خاطر کنواری ہی رہنا ہوگا۔۔۔"

"بہت خوب.....!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "یہ مسلم جن مسٹر گلزار تو بڑا دلچسپ عاشق ہے۔ پینو کے لیے کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں آنے دیتا اور اگر اس کی منظوری کے بغیر آپ لوگوں نے پینو کی کسی شخص سے شادی کر دی تو وہ اس بندے کی گردن توڑ دے گا لیکن اس گلزار کا جا جو جیسے ٹھنگنے کالے بھجنگ انسان پر کوئی بس نہیں چلتا۔ جا جو، پینو سے شادی کی خواہش کو اپنے دل میں بسائے اور ہونٹوں پر سجائے روزانہ پینو کے باپ کے پاس آتا ہے مگر اس کی گردن ابھی تک صحیح وسلامت ہے..... ہیں نا؟"

"آپ گلزار کا مذاق نہ اڑائیں جی....." خالدہ نے ہمدردی بھرے لہجے میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ہوائی مخلوق کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ انہیں انسانوں کی اگر کوئی بات بری لگ جائے تو یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں..... کچھ بھی!"

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے خالدہ کی آواز سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ مشتاق بھی مجھے سراسیمگی کی کیفیت میں دکھائی دیا۔ میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

"میں اس نام نہاد گلزار بلکہ نامراد گلزار کا مذاق نہیں اڑا رہا بلکہ تم دونوں کی عقل کا ماتم کر رہا ہوں جو تم کسی شاہ جی کی فضول باتوں کو سچ سمجھے بیٹھے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ....." میں نے براہِ راست خالدہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "شاہ جی نے تمہیں اس گلزار نامی جن کو اتارنے کا کوئی طریقہ بھی بتایا ہوگا..... ہیں نا؟"

"نن..... نہیں جی۔" مشتاق نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میں نے تم سے پوچھا ہے کیا جو تم اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہو؟" میں نے ڈانٹ آمیز نظر سے اسے گھورا۔ "تم تھوڑی دیر چپ بیٹھو۔ مجھے شاہ جی کی مریدنی سے بات کرنے دو۔ یہ آج بھی شاہ جی کے آستانے پر حاضری دے کر آئی ہے.....!"

میرے سرزنش بھرے معنی خیز الفاظ کی چبھن نے مشتاق کی زبان کو حلق کے نیچے اتار دیا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو بیٹھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے خالدہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم آج رشیدہ کے ساتھ شاہ جی کے آستانے پر کیا کرنے گئی تھیں؟"

"میں پینو کے سلسلے ہی میں شاہ جی سے بات کرنے گئی تھی۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

"کس قسم کی بات؟" میں نے پوچھا۔

"پینو پر عاشق جن کو بھگانے کی بات....." اس نے بتایا۔ "شاہ جی نے کہا ہے کہ اگر ان کی بات پر عمل کیا گیا تو وہ تین راتوں میں گلزار کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ پھر پینو کا معاملہ ایک دم صاف ہو جائے گا۔"

پینو کے بارے میں ابھی تک مجھے جو کچھ معلوم تھا اس کے مطابق مشتاق آج اپنی دکان میں حسبِ معمول کام کر رہا تھا اور خالدہ اور پینو گھر کے اندرونی حصے میں موجود تھیں۔ پھر خالدہ، کسی رشیدہ نامی عورت کے ساتھ شاہ جی کے آستانے کی طرف چلی گئی تھی اور جب وہ واپس لوٹی تو پینو گھر سے غائب تھی۔ اس تناظر میں، میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"کیا یہ تین راتوں والے عمل کی بات شاہ جی نے آج تم سے کی تھی؟"

"نہیں جی۔ یہ بات تو انہوں نے ایک ماہ پہلے ہی مجھے بتا دی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں نے مشتاقے سے آدھی بات کی تھی یعنی پینو پر عاشق جن گلزار کے بارے میں تو بتا دیا تھا لیکن اس جن کو اتارنے والے عمل کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ مشتاقا کبھی بھی اس عمل کے لیے راضی نہ ہوتا....."

"کیوں..... اس عمل میں ایسی کون سی بات تھی جو مشتاق کے لیے ناقابلِ قبول تھی؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"مشتاقا، پینو سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔" خالدہ نے بتایا۔ "یہ ایک لمحے کے لیے بھی پینو کو اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتا اور شاہ جی نے کہا تھا کہ پینو کو تین راتیں ان کے آستانے پر گزارنا ہوں گی۔ وہ پینو پر کوئی مخصوص عمل کریں گے جس کے نتیجے میں وہ خبیث جن گلزار ہمیشہ کے لیے پینو کی جان چھوڑ دے گا....."

مشتاق غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ "کم بخت....." اس نے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بات تم نے ایک ماہ تک مجھ سے کیوں چھپائے رکھی؟ اگر تم نے مجھے پہلے بتایا ہوتا تو میں آستانے پر جا کر شاہ جی کی ساری بزرگی ناک کے راستے نکال دیتا۔ اس کی یہ مجال کہ میری پینو کے بارے میں ایسی بات کرے.....!"

"دیکھ لیا تھانے دار صاحب آپ نے مشتاقے کا

غصہ.....!'' وہ اپنے شوہر کی جانب اشارہ کر کے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں اسی لیے اب تک چپ سادھے بیٹھی تھی۔ مشتاقا، پینو کے حوالے سے ذرا سی بات سن کر بھڑک اٹھتا ہے.....''

''تو میں اس میں غلط کیا کرتا ہوں.....؟'' وہ بیوی کو آنکھیں دکھاتے ہوئے غرایا۔ ''اگر مجھے اس بات کا پتا ہوتا تو میں شاہ جی کا دماغ درست کر دیتا۔''

''میں بات کر رہا ہوں نا.....؟'' میں نے ان دونوں میاں بیوی کو جھڑکا۔ ''اگر تمہیں اسی طرح چونچیں لڑانا تھیں تو میرے پاس کیا لینے آئے ہو.....'' پھر میں نے مشتاق کو مخاطب کرتے ہوئے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے تمہیں چپ بیٹھنے کو کہا ہے نا۔ اگر اب تم بیچ میں بولے تو میں تمہیں کمرے سے نکال دوں گا اور پھر تمہاری کوئی بھی بات نہیں سنوں گا..... سمجھ گئے یا کوئی اور طریقہ اختیار کروں؟''

''جی.....'' وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ ''سمجھ گیا جناب۔''

میں نے خالدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ''ایک ماہ پہلے جب شاہ جی نے تمہیں، پینو کا جن اتارنے والے تین راتوں کے عمل کے بارے میں بتایا تھا تو اس کے جواب میں تم نے کیا کہا تھا؟''

''میں نے شاہ جی کو صاف منع کر دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ پینو کا باپ اس کام کے لیے راضی نہیں ہوگا۔''

''پھر شاہ جی نے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بولے، آپ لوگوں کی مرضی ہے۔ میں زبردستی تو نہیں کر سکتا۔'' وہ بتانے لگی۔ ''آپ لوگ لڑکی کے ماں باپ ہو۔ جب آپ کو اس کی فکر نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے پریشان ہونے کی مگر میری ایک بات نوٹ کر لو خالدہ بی بی.....'' انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''یہ جن بڑا ڈھیٹ ہے، خود بخود کبھی بھی نہیں جائے گا۔ اس کا اتارا کرنا ہی پڑے گا ورنہ ایک دن یہ خبیث پینو کی جان بھی لے سکتا ہے۔''

''پھر تم نے کیا کیا خالدہ بی بی؟'' میں نے کریدا عمل جاری رکھا۔

''کچھ نہیں جی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بس، میں نے صبر کر لیا اور چپ ہو کر بیٹھ گئی۔''

میرا ذہن پینو کی گمشدگی والے معاملے کی کڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ایک زنجیر کی شکل دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسی ذیل میں خالدہ سے میں نے پوچھ لیا۔

''اس ایک ماہ کے دوران تم شاہ صاحب سے ملنے کتنی مرتبہ گئی ہو؟''

''ایک بار بھی نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''آج بھی رشیدہ اپنے کسی کام سے شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی کہ ضد کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ یہی سوچا تھا کہ میں شاہ جی سے پینو کے لیے دعا ہی کروا لوں گی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ جب میں واپس آؤں گی تو پینو گھر سے غائب ہو چکی ہوگی.....'' بات کے اختتام پر وہ روہانسی ہو گئی۔

''کہیں شاہ جی کی دعا الٹی تو نہیں پڑ گئی.....!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے کوئی دافع جن دعا کی اور گلزار نامی وہ جن شاہ جی کا بھی استاد نکلا۔ وہ پینو کو اپنے ساتھ لے کر کہیں دفع ہو گیا۔''

میں نے یہ بات بر سبیلِ مذاق کی تھی۔ پتا نہیں، میری بات ان میاں بیوی کی سمجھ میں آئی یا ان کی کھوپڑیوں کے اوپر سے گزر گئی۔ بہرحال ان لمحات میں وہ دونوں مجھے بڑی مشکل میں نظر آئے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرے مخاطب دونوں ہی تھے۔

''جب آپ دونوں پینو کو تلاش کر رہے تھے تو اس وقت جا جو کہاں تھا؟''

میرے اس اچانک سوال پر انہوں نے چونک کر الجھن زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا پھر مشتاق نے جواب دیا۔

''پتا نہیں تھانے دار صاحب! وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا یا ہو سکتا ہے، وہ مجھے نظر تو آیا ہو لیکن پریشانی کے باعث وہ میرے ذہن سے نکل گیا۔''

''میں نے تو آج اس منحوس کی شکل تک نہیں دیکھی۔'' خالدہ نے کڑوے لہجے میں بتایا۔ ''نہ تو مشتاقے کی دکان پر اور نہ ہی گاؤں میں اور کہیں.....''

''اب میں تم لوگوں سے جو پوچھنے جا رہا ہوں اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا ہے۔'' میں نے باری باری ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے غلط جواب دیا یا مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو پھر میں آپ کی بیٹی کو ڈھونڈ نہیں پاؤں گا۔ تم لوگ پینو کو ہمیشہ کے لیے کھو دو گے.....!''

''ایسی باتیں نہ کریں تھانے دار صاحب!'' مشتاق نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میں پینو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

خالدہ روہانسی ہوگئی۔ ''تھانے دار جی.....!'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر منت ریز لہجے میں کہا۔ ''ہم نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اب بھی آپ جو پوچھو گے، ہم بالکل سچ بتائیں گے۔ آپ کسی بھی طرح ہماری پینو کو ڈھونڈ نکالیں۔ ہماری زندگی میں صرف ایک پینو ہی تو ہے.....''

''مجھے یہ بتاؤ.....'' میں نے ان کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''پینو کا کسی سے کوئی چکر وغیرہ تو نہیں تھا؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ یک زبان ہو کر حتمی انداز میں بولے۔

''ٹھیک ہوگیا.....'' میں نے ایک طویل اور آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ لوگ گھر جا کر آرام کرو۔ میں نے پینو کے بارے میں تمام ضروری باتیں نوٹ کر لی ہیں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد از جلد پینو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں کل صبح چمن آباد کا چکر بھی لگاؤں گا۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل حیدر علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حیدر علی کا تعلق موضع چمن آباد ہی سے تھا اور وہ روزانہ رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ اگلی صبح وہ دوبارہ تھانے آ کر اپنی ڈیوٹی شروع کر دیتا تھا۔ وہ اس وقت چھٹی کے لیے پر تول ہی رہا تھا۔ میں نے ضروری ہدایات کے بعد حیدر علی کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

اگلی صبح خاصی خنک اور دھند دار تھی۔ صبح دس بجے تک بھی سورج کا کہیں نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کانسٹیبل حیدر علی اپنی ڈیوٹی پر آیا تو میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ گزشتہ رات میں نے خصوصی ہدایات کے ساتھ حیدر علی کو تھانے سے رخصت کیا تھا۔

''ہاں بھئی! کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے حیدر علی کی آمد پر پوچھا۔

''جاجو کل دن بھر گاؤں میں موجود نہیں تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، وہ صبح کا گیا شام کو واپس لوٹا تھا۔''

''اور شاہ جی کا کیا حال احوال ہے؟''

''وہ اپنے آستانے پر حسب معمول موجود ہے۔'' حیدر علی نے جواب دیا۔ ''کل وہ چمن آباد کے باہر کہیں آیا گیا نہیں۔ میری معلومات کے مطابق خالدہ اور رشیدہ لگ بھگ ایک گھنٹا آستانے پر گزار کر آئی تھیں۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ پینو کو آستانے کے آس پاس یا آستانے کے اندر کہیں نہیں دیکھا گیا۔''

''پینو لاپتا ہے، اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی حیدر علی!'' میں نے کانسٹیبل کے چہرے پر نگاہ جما کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ورنہ مشتاق اور اس کی گھر والی یوں روتے کرلاتے میرے پاس نہ آتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پینو گاؤں میں موجود نہیں ہے۔ تم نے پینو کے غیاب کے بارے میں کیا معلوم کیا ہے؟''

''ملک صاحب! یہ بات پورے چمن آباد کے علم میں آ چکی ہے کہ پینو کہیں چلی گئی ہے لیکن کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی ہے۔'' کانسٹیبل نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''بہر حال، اس سلسلے میں مجھے ایک اشارہ ملا ہے۔''

''کیسا اشارہ؟'' میں نے چونک کر کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

''میرا ایک دوست ہے سعید.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''گاؤں میں وہ سعید و نائی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ پینو کل دن میں لگ بھگ گیارہ بجے جی ٹی روڈ پر کھڑی تھی.....''

''اوہ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''کیا سعید و نائی نے خود اپنی آنکھوں سے پینو کو جی ٹی روڈ پر کھڑے دیکھا تھا؟''

''اس سلسلے میں وہ پُر وثوق نہیں ہے ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے سرسری انداز میں کہا۔

''اس کا کیا مطلب ہوا.....؟''

''مطلب یہ کہ سعید و نے پینو کی ایک جھلک دیکھی تھی۔'' حیدر علی نے جواب دیا۔ ''وہ اپنی سائیکل پر جا رہا تھا تو پینو اسے روڈ کے کنارے کھڑی نظر آئی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سعید و کی اس پر اچٹتی سی نگاہ پڑی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پینو تھی مگر وہ صد فیصد یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا.....''

''اتنا بھی کافی ہے.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات؟''

''نہیں جناب.....'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''ویسے میں نے سعید و نائی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور پینو کے بارے میں جیسے ہی کوئی بات پتا چلے، وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔''

''ویری گڈ.....!'' میں نے ستائشی نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم نے بہت اچھا کیا حیدر علی۔''

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کانسٹیبل جنید خان کو اپنے ساتھ لیا اور ہم ایک تانگے پر سوار ہو کر چمن آباد کی جانب

روانہ ہوگئے۔ جب ہم مشتاق کے گھر پہنچے تو دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے لیکن ابھی تک سورج چاچو نے اپنا دیدار نہیں کرایا تھا۔

میں اس پروگرام کے تحت چمن آباد پہنچا تھا کہ مشتاق اور خالدہ سے پوچھ تاچھ کے بعد میں شاہ جی کے آستانے کا رخ کروں گا مگر وہاں پہنچ کر جو حالات پیش آئے انہوں نے میرے منصوبے کی ترتیب کو بدل کر رکھ دیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، چمن آباد ٹیکسٹائل ملز کے عقب میں واقع تھا۔ جی ٹی روڈ کے کنارے پر موجود ''راسکو'' انڈسٹریز اور ''زیبائش'' ٹیکسٹائل ملز کے بیچ میں سے ایک نیم پختہ راستہ چمن آباد کی طرف جاتا تھا اور یہ گاؤں ان فیکٹریوں کے پچھواڑے آباد تھا۔ ہمارا تانگا جیسے ہی گاؤں کے اندر داخل ہوا، میں نے گاؤں کے مین بازار میں ایک ٹھیلے والے کو دیکھ کر کوچوان سے کہا۔

''علی محمد! ذرا تانگا روکنا.....''

گاؤں کے ''مین بازار'' سے کہیں آپ کسی بھرے پُرے بارونق بازار یا مارکیٹ کا تصور نہیں کر لیجیے گا۔ میں نے اس نیم پختہ راستے کا ذکر کیا ہے جو جی ٹی روڈ سے نکل کر چمن آباد کے قلب تک جاتا تھا۔ اس راستے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف قسم کی دکانیں موجود تھیں اور کہیں کہیں سبزی، پھل اور دیگر اشیائے ضرورت کے ٹھیلے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے جس ٹھیلے کے نزدیک تانگا رکوایا وہاں پر ایک سیاہ رو، پستہ قامت شخص سموسے اور پکوڑے بیچ رہا تھا۔ گزشتہ شام تھانے میں مشتاق اور اس کی بیوی سے میری جو گفتگو ہوئی تھی وہ میرے ذہن میں تر و تازہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس سموسے پکوڑے فروش پر نگاہ پڑتے ہی میرے تصور میں اعجاز عرف جاجو کا نام چمکا تھا۔

میں تانگے سے اترا اور ٹہلنے والے انداز میں چلتے ہوئے مذکورہ ٹھیلے کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں اس وقت سرکاری وردی میں تھا اور تانگے میں موجود کانسٹیبل جنید خان نے بھی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ وہ ٹھیلے والا تانگے کو رکتے دیکھ چکا تھا اور اس کے اندر کانسٹیبل کو بھی، اور جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ یکدم اٹین شین ہوگیا اور بصد احترام بولا۔

''ست بسم اللہ سرکار..... تھانے دار صاحب تشریف لائے ہیں.....''

''تم جاجو ہی ہو نا.....؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''جی سرکار!'' وہ اپنی گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''حکم کریں جی، میں آپ کی کیا خدمت کروں۔ میرے پاس پیش کرنے کے لیے یہ سموسے اور پکوڑے ہی ہیں۔''

''تم ایک اور خاص چیز کو بھول رہے ہو جاجو.....!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ گھبرا گیا اور فکرمندی سے پوچھا۔ ''وہ کیا جی؟''

''اس خاص چیز کا نام ہے، اعجاز عرف جاجو.....!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں حضور.....؟'' وہ حد درجہ الجھے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیا یہ غلط ہے کہ تم مشتاق سائیکلوں والے کی بیٹی پروین عرف پینو کو پسند کرتے ہو؟'' میں نے جاجو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو.....؟''

پینو کے ذکر پر جاجو کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ وہ یکا یک بہت زیادہ حواس باختہ نظر آنے لگا تھا۔ میں مسلسل سوالیہ نظر سے اسے گھور رہا تھا۔ چند لمحات کے تذبذب کے بعد وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''جی..... نن..... نہیں..... ہاں..... جی.....''

''ایک جواب دو.....'' میں نے کرخت انداز میں کہا۔ ''ہاں یا نہیں؟''

''ہا..... ں ں ں.....'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''پیار کرنا..... کوئی جرم تو نہیں تھانے دار صاحب..... اور نہ ہی کسی سے شادی کی خواہش رکھنا کوئی گناہ.....!''

''میں تمہارے فلسفے سے اتفاق کرتا ہوں جاجو!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن پیار کی چاہت اور شادی کی خواہش میں اگر اپنے محبوب کو غائب کر دیا جائے تو پھر یہ سنگین عمل جرم بن جاتا ہے اور یقیناً گناہ بھی.....!''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا.....'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ کہیں آپ.....'' اس نے چونک کر بے یقینی سے مجھے دیکھا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ ''کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ پینو کی گمشدگی میں میرا کوئی ہاتھ ہے.....!''

''تو کیا ایسا نہیں ہے.....؟'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہرگز نہیں جی!'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ ''میں اس

قسم کی گھنیا حرکت نہیں کرسکتا جناب۔ میں نے تو بڑے ادب آداب کے ساتھ چاچا مشتاق سے درخواست کی تھی مگر اس نے مجھے ٹال دیا.....''

''اور اس کے بعد پینو اچانک گم ہوگئی.....؟'' میں نے جاجو کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہیں نا.....!''

''نہیں سرکار.....'' وہ گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پینو کی گمشدگی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ مجھے تو خود کل رات میں پتا چلا ہے کہ پینو اچانک کہیں غائب ہوگئی ہے.....!''

''تمہیں زندہ لوگوں کی کھائی جائیں یا گزر جانے والوں کی، اس سے پولیس والوں کا دل نہیں پگھلتا جاجو.....'' میں نے اسے خطرناک نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہیں کل رات کو اس لیے پتا چلا کہ تم کل کا پورا دن چمن آباد میں تھے ہی نہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جی.....'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اماں نے اپنے کسی کام سے مجھے گکھڑ منڈی بھیجا تھا۔''

''تم کس کام سے گکھڑ منڈی گئے تھے؟'' میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور اپنے گھر سے کتنے بجے روانہ ہوئے تھے۔''

''ادھر گکھڑ منڈی میں میری خالہ شمشاد رہتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اماں نے کچھ کپڑے اور دیگر چھوٹا موٹا سامان اپنی بڑی بہن کے لیے بھجوایا تھا اور میں لگ بھگ دس بجے صبح گھر سے نکلا تھا اور گیارہ بجے سے پہلے خالہ شمشاد کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ میری اماں سے پوچھ لیں۔''

موضع چمن آباد سے گکھڑ منڈی کا فاصلہ کم و بیش آٹھ میل تھا۔ اس حساب سے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر وہ کسی تانگے پر سوار ہو کر گکھڑ منڈی گیا تھا تو اسے اتنا ہی وقت لگنا تھا۔

''تمہاری اماں سے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں جاجو.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات تو میں معلوم کر چکا ہوں کہ گزشتہ روز یعنی بائیس فروری کو تم صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک چمن آباد میں موجود نہیں تھے۔ میں تو اپنا ایک بندہ سیدھا گکھڑ منڈی تمہاری خالہ شمشاد کے پاس بھیجوں گا جو واپس آ کر مجھے بتائے گا کہ تم گزشتہ روز گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان اپنی خالہ کے گھر میں تھے یا نہیں؟''

جاجو نے نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکائیں اور خاصے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان کا کیا مطلب ہوا سرکار؟''

''یہ وہ وقت ہے جب پینو اچانک چمن آباد سے غائب ہوگئی تھی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بات سمجھ میں آئی کہ نہیں؟''

''جی، سمجھ گیا.....'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا جیسے دل چاہے، تصدیق کرلیں۔ آپ مجھے اس معاملے میں ملوث نہیں پائیں گے۔''

جاجو کے آخری جملوں سے بے پناہ اعتماد جھلکتا تھا۔ وہ شکل اور قد کاٹھ کا جیسا بھی سہی مگر اس کی گفتگو کے انداز میں بڑی معقولیت پائی جاتی تھی۔ میرے پیشہ ورانہ تجربے نے مجھے بتا دیا کہ جاجو نے مجھ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔

''تمہارا گھر کس طرف ہے جاجو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اُدھر دوسری گلی میں۔''

پھر اس نے بتایا کہ اس کے والد حفیظ اللہ کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا اور وہ اپنی ماں ارشاد بی بی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا اور کوئی بھائی یا بہن نہیں۔ ارشاد بی بی کا بھی دنیا میں صرف ایک ہی رشتے دار تھا اور وہ تھی اس کی بڑی بہن شمشاد بی بی گکھڑ منڈی والی۔ شمشاد بی بی کے شوہر امان اللہ کی ادھر گکھڑ منڈی میں دریوں کی دکان تھی۔ شمشاد اور امان اللہ کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام مریم تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی مریم کی شادی اعجاز عرف جاجو سے کردیں اور جاجو کا دل پینو میں اٹکا ہوا تھا۔

''تم سارا دن ٹھنڈے پکوڑے اور سموسے ہی بیچتے رہتے ہو یا کسی گاہک کو تازہ بھی تل کر دیتے ہو؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''یہ تو جی گاہک پر منحصر ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''اگر آپ جیسا کوئی گاہک آجائے تو اس کے لیے گرما گرم نکال کر دیتا ہوں۔''

''اچھا.....!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''کیا تم ادھر ہی کھڑے ہو کر کاروبار کرتے ہو یا گھوم پھر کر سموسے اور پکوڑے بیچتے ہو؟''

''یہی میرا مستقل ٹھکانا ہے تھانے دار صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''میں روزانہ ادھر ہی ٹھیلا لگاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے کہا۔ ''اگر واپسی میں

ادھر سے میرا گزر ہوا تو میں تمہارے پکوڑے اور سموسے ضرور چیک کروں گا....."

وہ میری بات سے کچھ اور ہی سمجھا۔ جلدی سے بولا۔

"آپ کا جب دل چاہے، میرے سامان کو چیک کر سکتے ہیں۔ اس سموسوں اور پکوڑوں میں استعمال ہونے والا بیسن، میدہ، گھی اور دیگر مسالا جات ایک دم اصلی اور معیاری ہیں۔"

میں نے جس پیرائے میں "چیک کروں گا" کے الفاظ استعمال کیے تھے وہ جاجو کی کھوپڑی میں جگہ نہیں بنا پائے تھے۔ میں نے بھی اسے سمجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور تانگے میں جا بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے کوچوان علی محمد نے تانگا آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

مشتاق کا گھر گاؤں کے وسط میں، نیم پختہ راستے کے کنارے پر واقع تھا۔ میں نے جس نیم پختہ راستے کا ذکر کیا ہے وہ دراصل موضع چمن آباد کے بیچوں بیچ گزر کر ریلوے لائن تک چلا جاتا تھا۔ ریلوے لائن کی دوسری جانب سرسبز وشاداب کھیتوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مشتاق اپنی دکان میں موجود تھا۔

وہ سات مرلے (لگ بھگ ایک سو ساٹھ گز) کا مکان تھا۔ مشتاق نے ہمارے تانگے کو اپنی دکان کے سامنے رکتے دیکھا تو اٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور بڑے ادب سے بولا۔

"اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ کیا میری پینو کا کچھ پتا چلا؟"

بات کے اختتام پر وہ امید بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا۔

"مشتاق! میں تمہارے دل کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔ تمہاری بیٹی کا ایک سراغ تو ملا ہے لیکن پینو تک پہنچنے کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔ کیا ہم گھر کے اندر بیٹھ کر اطمینان سے بات کر سکتے ہیں.....!"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں جناب....." وہ جلدی سے بولا۔ "آپ آئیں میرے ساتھ۔"

میں نے کوچوان علی محمد کو ہدایت کی کہ وہ تانگے میں موجود رہے اور کانسٹیبل جنید خان سے کہا کہ وہ گھوم پھر کر پینو کی گمشدگی کے حوالے سے سن گن لینے کی کوشش کرے اور میں خود مشتاق کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔

بیوی

دنیا کے 2 مشکل ترین کام۔ (1) اپنا آئیڈیا کسی دوسرے کے دماغ میں منتقل کرنا۔ (2) کسی دوسرے کا مال اس کی جیب سے اپنی جیب میں منتقل کرنا۔ جو شخص پہلے کام میں کامیاب ہو جائے، اسے ٹیچر کہتے ہیں اور جو دوسرے کام میں کامیاب ہو اسے بزنس مین کہتے ہیں اور جو دونوں کاموں میں کامیابی حاصل کر لے اسے بیوی کہتے ہیں۔

☆☆☆

برابر

جرمنی میں اساتذہ کو تمام دیگر پیشوں میں کام کرنے والوں سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹرز، انجینئرز، ججز وغیرہ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کو بھی اساتذہ کے برابر تنخواہ دی جائے۔ جب یہ مطالبہ جرمنی کی چانسلر انجلا مورکل کے علم میں آیا تو انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو ان لوگوں کے برابر کیسے کر دوں۔ جن قابلِ احترام لوگوں کی وجہ سے آپ اپنے موجودہ مقام پر کھڑے ہیں اور معاشرے میں باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

اندر مشتاق کی بیوی خالدہ بھی موجود تھی۔ انہوں نے مجھے صحن میں بچھی ایک چارپائی پر بٹھایا اور میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مشتاق نے پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! آپ کو پینو کا کون سا سراغ ملا ہے؟"

"پہلے تم دونوں بھی بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "پھر بات کرتے ہیں۔"

مشتاق نے جلدی سے نزدیک ہی دوسری چارپائی بھی بچھا دی۔ خالدہ میری خاطر تواضع کے ذیل میں سرگرمی دکھانا چاہتی تھی لیکن میں نے بڑے واضح الفاظ میں اسے سختی سے منع کر دیا۔ وہ دونوں میرے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے اور ان کی سوالیہ نظریں مجھ پر جم گئیں۔

"میری بات کو دھیان سے سنو۔ مجھے جو سراغ ملا ہے وہ بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے کہ پینو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ کل ٹھیک گیارہ بجے دن میں جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑی دیکھی

گئی ہے۔اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔"

"مجھے تو اسی کمینے پر شک ہے جی....." خالدہ نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔"وہ کل سارا دن گاؤں میں نہیں تھا۔اسی نے میری بچی کو کہیں گم کر دیا ہے۔آپ اسے گرفتار کر کے چھترول کریں گے تو وہ سب کچھ اپنی زبان سے قبول کر لے گا۔"

میں پلک جھپکتے میں خالدہ کی بات کی تہ میں اتر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا تاہم پھر بھی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

"خالدہ بی بی! تم کس کمینے کی بات کر رہی ہو؟"

"وہی لنگور جی جو مشتاقے کے پاس بیٹھ کر گپیں لگاتا رہتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔"میں جاجو کی بات کر رہی ہوں۔"

"تم بالکل غلط انداز میں سوچ رہی ہو خالدہ بی بی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔"میں نے اچھی طرح تفتیش کر لی ہے۔جاجو کا پینو کی گمشدگی میں کوئی ہاتھ نہیں۔"

"وہ بے چارہ رات کو بھی مجھ سے ملنے آیا تھا اور صبح بھی ادھر کا ایک چکر لگا کر گیا ہے۔" مشتاق نے غم زدہ آواز میں بتایا۔"اسے بھی پینو کے اچانک غائب ہو جانے کا بڑا دکھ ہے۔"

"اگر جاجو پینو کی گمشدگی میں ملوث نہیں تو پھر وہ کہاں غائب ہو گئی ہے؟" خالدہ نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔

"وہ جہاں بھی گئی ہے اسے وہاں سے واپس لانے کے لیے ہی تو یہ ساری تگ و دو کی جا رہی ہے۔" میں نے باری باری ان دونوں میاں بیوی کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔"یہ تو پتا چل گیا ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے۔وہ اکیلی گئی ہے یا کسی کے ساتھ، یہ معلوم کرنا باقی ہے اور اسی سلسلے میں مجھے آپ لوگوں کا تعاون درکار ہے۔آپ کی مدد کے بغیر میں پینو کو بازیاب نہیں کر سکوں گا....."

"ہم تو ہر قسم کا تعاون کر رہے ہیں آپ کے ساتھ۔" خالدہ نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔"بتائیں، اور کیا کریں؟"

"مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔"کیا پینو کا گاؤں کے کسی بندے کے ساتھ کوئی چکر تھا..... کیا وہ کسی کو پسند کرتی تھی؟"

"ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے تھانے دار صاحب!" مشتاق نے بے بسی سے کہا۔

خالدہ بولی۔"بالکل نہیں جی۔آپ غلط انداز میں سوچ رہے ہیں۔پینو اگر کسی خاص بندے کو پسند کر رہی ہوتی تو یہ بات مجھ سے چھپ نہیں سکتی تھی۔"

"تو پھر کہیں....." میں نے خالدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔"پینو کو گلزار نے تو غائب نہیں کر دیا.....؟"

"کون گلزار.....؟" مشتاق بے ساختہ بول اٹھا۔

"میں اس مسلم جن کی بات کر رہا ہوں جو تمہاری لاڈلی بیٹی پینو پر عاشق ہو گیا تھا....." میں نے مشتاق کے سوال کے جواب میں کہا۔

خالدہ کا چہرہ یک دم پیلا پڑ گیا۔وہ صدیوں کی بیمار نظر آنے لگی۔میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"تمہیں یہ اچانک کیا ہو گیا خالدہ بی بی۔تم اس قدر گھبرا کیوں گئی ہو؟"

"وہ جی..... میں آج صبح شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی۔" وہ ڈری سہمی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔"میں پینو کے لیے بہت پریشان تھی اس لیے وہاں چلی گئی تھی....."

"پھر شاہ جی نے پینو کی گمشدگی کے حوالے سے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے بھی ایسی ہی بات کی ہے جیسی آپ کر رہے ہیں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔"وہ کہہ رہے تھے، یہ جنات بہت خبیث اور کمینے ہوتے ہیں۔یہ ناری مخلوق ہے۔ان سے خیر کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔یہ کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔یہ جس کسی انسان پر بھی آ جاتے ہیں، پھر آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔انہیں مستقل طور پر دفع دور کرنے کے لیے باقاعدہ علاج بہت ضروری ہے....." لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر شاہ جی کے فرمودات کو مکمل کرتے ہوئے بتایا۔

"شاہ جی نے کہا ہے..... خالدہ بی بی! اگر تم نے میری بات مان لی ہوتی تو آج تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مجھے یقین ہے کہ گلزار ہی پینو کو اپنے ساتھ کہیں لے گیا ہے۔ بس دعا کرو کہ وہ نامراد پینو کو کوئی نقصان نہ پہنچائے.....!"

"پہلی بات تو یہ کہ بقول شاہ جی، گلزار نامی وہ جن پینو پر عاشق ہے۔" میں نے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دوسری بات یہ کہ دنیا کا کوئی بھی عاشق انسان یا جن اپنی معشوقہ کو نقصان پہنچانے کا تصور نہیں کر سکتا۔تیسری بات یہ کہ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ کسی عاشق جن نے اپنی معشوقہ کو یوں اغوا کیا ہو اور چوتھی بات یہ کہ....." میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میری تقلید میں وہ دونوں میاں بیوی بھی کھڑے ہو گئے۔ میں نے چوکھی بات کے ذیل میں، سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''کیا پینو اکیلی سوتی تھی یا آپ میں سے کسی کے ساتھ؟''

''وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہی سوتی تھی سرکار۔'' مشتاق نے بتایا۔ ''ہم میاں بیوی دوسرے کمرے میں سوتے ہیں۔''

مکانیت کے اعتبار سے مشتاق کا گھر چار کمروں پر مشتمل تھا۔ مکان کے عقبی حصے میں دو کشادہ کمرے پہلو بہ پہلو واقع تھے جن کے آگے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اسی طرح گھر کے سامنے والے حصے میں بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک میں مشتاق نے سائیکلوں والی دکان کھول رکھی تھی جبکہ دوسرا کمرا بند تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ بند کمرا گھر کی بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ ان چاروں کمروں کے درمیان ایک کشادہ صحن واقع تھا جہاں پر اس وقت میں موجود تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ باورچی خانہ اور دوسری دیوار کے ساتھ نہانے اور کپڑے وغیرہ دھونے والا باتھ روم بنا ہوا تھا۔

''میں پینو کا کمرا دیکھنا چاہتا ہوں.....!'' میں نے کہا۔

''آپ آئیں میرے ساتھ۔'' مشتاق نے کہا۔ ''میں آپ کو پینو کا کمرا دکھا دیتا ہوں۔''

مکان کے عقبی حصے میں تعمیر شدہ دو کمروں میں سے ایک مشتاق اور اس کی بیوی خالدہ کے تصرف میں تھا جبکہ دوسرے کمرے میں پروین عرف پینو کا بسیرا تھا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی پینو کے کمرے میں پہنچ گئے۔

میں نے تنقیدی نگاہ سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی ہوئی تھی اور اس چارپائی کے اوپر بستر بھی لگا ہوا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک دیوار کے پاس چھوٹی سی چوبی میز بھی رکھی ہوئی تھی جس پر کنگھی، شیشہ اور دو چار خواتین کے بناؤ سنگار کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی شے میرے کام کی نہیں تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پینو کی چارپائی کے نیچے جھانک کر دیکھا تو وہاں پر مجھے ایک صندوق رکھا نظر آیا۔ میں نے مذکورہ جستی صندوق کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔

خالدہ نے کہا۔ ''پینو اس صندوق میں اپنے کپڑے وغیرہ رکھتی تھی۔''

میں نے مشتاق سے پوچھا۔ ''کیا میں اس صندوق کو کھول کر دیکھ سکتا ہوں؟''

''بے شک جناب.....'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ ضرور دیکھیں جی۔''

میں نے اس ڈیڑھ بائی تین فٹ کے جستی صندوق کو اٹھا کر چارپائی کے اوپر رکھا۔ صندوق کو تالا نہیں لگایا گیا تھا۔ بس اس کی دونوں سائڈ کی کنڈیاں بند تھیں۔ میں نے وہ کنڈیاں کھول کر صندوق کا ڈھکنا اٹھا دیا۔

صندوق کے اندر کا نظارہ کوئی خوشگوار نہیں تھا۔ ایک لحاظ سے اس صندوق کو خالی ہی کہا جا سکتا تھا۔ چند مڑے تڑے اخبارات کے سوا وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جس طرح شفٹنگ کے بعد خالی گھر بے سروسامانی اور ویرانی کی تصویر بن جاتا ہے، بعین اس صندوق کو بھی ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔ لگتا تھا، صندوق کے اندر موجود سامان کو کہیں اور شفٹ کر دیا گیا تھا۔ میں صندوق کے کھلے ہوئے پیٹ کا بغور جائزہ لے ہی رہا تھا کہ خالدہ کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''پینو کے کپڑے کہاں گئے..... صندوق تو خالی پڑا ہے.....؟''

''خالدہ بی بی! اب تو تمہیں میری بات کا یقین آ گیا نا کہ پینو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے اور اپنے سارے کپڑے لتے بھی ساتھ لے گئی ہے۔'' میں نے گمشدہ پینو کی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ اکیلی گئی ہے یا کسی کے ساتھ، بس یہ پتا چلانا باقی ہے اور جب مجھے اس سوال کا جواب مل گیا تو پھر پینو کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہیں رہے گا۔''

''یا اللہ! مجھ پر رحم فرما.....'' مشتاق گلوگیر آواز میں بولا۔ ''میرے جگر کا ٹکڑا کہاں گم ہو گیا۔ میں پینو کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا۔''

''کچھ تو خیال کر مشتاقے! تو مرد ہو کر آنسو بہا رہا ہے۔'' خالدہ نے گھور کر اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ ''میں پینو کی ماں ہوں اور اس کی گمشدگی کا مجھے بھی بہت زیادہ دکھ ہے لیکن میں نے ابھی تک صبر کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔''

''مجھے تو تھانے دار صاحب کی بات ٹھیک ہی لگ رہی ہے.....'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ ''تم پینو کی ماں تھیں۔ بیٹیاں اپنی ماں کے بہت قریب ہوتی ہیں۔ میں تو سارا دن دکان میں کام کرتا رہتا تھا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ پینو پر کڑی نظر رکھتیں.....!''

''مشتاقے! تم میرے سامنے یہ بات تو نہ کرو.....'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کب مجھے پینو کے قریب ہونے دیا تھا۔ تم اس کی ہر جائز اور ناجائز بات مانتے تھے۔ میں کبھی کسی غلط بات پر روک ٹوک کرتی تو تم ہمیشہ اسی

کا ساتھ دیتے تھے اور مجھے دبکا مار کر چپ کرا دیا کرتے تھے۔ وہ میری سختی کب تھی جو میں اس پر نظر رکھتی۔ تمہارے لاڈ پیار نے اسے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا۔ اگر واقعی تھانے دار صاحب کی بات درست ہے تو پینو کی گمشدگی کے ذمے دار تم ہو مشتاقے..... صرف تم!"

"کسی پر الزام لگانا دنیا کا سب سے آسان کام ہے اللہ کی بندی....." مشتاق نے بے چارگی سے کہا۔ "میرے لاڈ پیار کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ وہ گھر سے بھاگ جائے۔ میں تو اپنی محبت سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ ہماری زندگی کی اکلوتی خوشی تھی۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری لاڈو اتنا بڑا قدم اٹھائے گی....."

"اب تو وہ قدم اٹھ چکا مشتاقے.....!" وہ اپنے نکیلے الفاظ سے شوہر کا سینہ چھلنی کرتے ہوئے بولی۔ "خالی صندوق چیخ چیخ کر اعلان کر رہا ہے کہ تمہاری لاڈو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔ اب تم کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی محبت اور لاڈ پیار کا ماتم کرو مشتاقے.....!"

ان میاں بیوی کی بحث و تکرار کو سماعت کرنے کے دوران میں، میں صندوق کے حالاتِ اندرونی کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ صندوق کے ڈھکنے والے حصے میں دونوں جانب پاکٹ کی طرز کے دو خانے بنے ہوئے تھے۔ ان جستی خانوں کی تلاشی بڑی سود مند ثابت ہوئی۔ ایک خانے کے اندر سے مجھے ایک تہ شدہ کاغذ ملا۔ میں نے فوراً مذکورہ کاغذ کو کھول کر دیکھا۔

وہ کسی طالب علم کی کاپی سے پھاڑا ہوا ایک عام سا صفحہ تھا جس پر صرف یک سطری تحریر رقم کی گئی تھی..... "کل ٹھیک گیارہ بجے، جی ٹی روڈ پر، مولوی کے کھوکھے کے سامنے.....!"

اس مختصر سی تحریر نے میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا کیا اور میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ گزشتہ شام تھانے میں خالدہ نے بڑے فخر سے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیٹی پانچ جماعتیں پاس ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اردو لکھنا اور پڑھنا جانتی تھی۔ میرے ہاتھ میں موجود کاغذ کی تحریر میں رقم کا نام درج نہیں تھا لیکن اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تحریر کا خالق کوئی مرد ہو گا جس کے کہنے پر پینو اپنے کپڑے سمیٹ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس مرد نے پینو کو مولوی کے کھوکھے کے سامنے جی ٹی روڈ پر آنے کو کہا تھا۔ اس تحریر میں "کل" کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ پینو بائیس فروری کی صبح دس بجے سے دوپہر بارہ بجے کے درمیان گھر سے نکلی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تحریر اکیس فروری کو پینو تک پہنچائی گئی تھی۔ سعیدو نائی نے بائیس فروری کو دن گیارہ بجے پینو کو گرم چادر کی بکل مارے، جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑے دیکھا تھا۔ مولوی کا کھوکھا "جنرل سراکس لمیٹڈ" کے برابر میں، جی ٹی روڈ کے کنارے پر واقع تھا۔ "جی سی ایل" جنرل سراکس لمیٹڈ میں پتھر اور مٹی کی فینسی اینٹیں تیار کی جاتی تھیں اور "مولوی کا کھوکھا" دراصل ایک ہوٹل تھا جہاں کے کھانے بہت لذیذ اور مشہور تھے۔

"یہ آپ کے ہاتھ میں کیسا کاغذ ہے تھانے دار صاحب؟" مشتاق نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

وہ دونوں میاں بیوی انگوٹھا ٹیک انسان تھے اس لیے وہ پرچہ انہیں دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"یہ رقعہ اس شخص کی طرف سے ہے جس کے ساتھ تمہاری بیٹی گئی ہے۔ اس میں پینو کے لیے یہ پیغام درج ہے..... کل ٹھیک گیارہ بجے، جی ٹی روڈ پر، مولوی کے کھوکھے کے سامنے۔"

"ہائے میرے ربا..... یہ دن بھی دیکھنا تھا....." خالدہ اپنا سر پکڑ کر کمرے کے فرش پر بیٹھ گئی۔ "مشتاقے کی لاڈو نے تو ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا....."

"تھانے دار صاحب.....!" مشتاق دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور منت ریز لہجے میں بولا۔ "آپ کسی بھی طرح جلد از جلد میری پینو کو ڈھونڈ نکالیں۔ میں اس ذلت اور رسوائی کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے مناسب الفاظ میں ان دونوں کو تسلی دلاسا دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ اگر پینو کا کسی کے ساتھ کوئی چکر تھا تو مجھے بتا دو....."

"ہم سچ کہتے ہیں جی....." وہ بیک زبان ہو کر بولے۔ "ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے....." میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر اس مختصر تحریر والے پرچے کو تہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "اب میں خود ہی اس بندے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

میں گمشدہ پینو کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ تھے۔ جب میں صحن کو عبور کر رہا تھا تو مشتاق کی دکان کے برابر والے بند کمرے کو دیکھ کر میں نے سرسری انداز میں استفسار کیا۔

''یہ تم لوگوں کی بیٹھک ہے نا.....؟''

''نہیں جی.....'' مشتاق نے جواب دیا۔ ''یہ کمرا ہم نے کرائے پر دیا ہوا ہے۔''

''لیکن میں نے تو اس کمرے کو اندر اور باہر سے بند دیکھا ہے.....!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے مشتاق کی طرف دیکھا۔ ''تم نے یہ کمرا کس کو کرائے پر دے رکھا ہے اور اس بندے نے کس چیز کی دکان کھولی ہوئی ہے؟''

''اس بندے کا نام ماجد ہے تھانے دار جی۔'' مشتاق کے بجائے خالدہ نے جواب دیا۔ ''اور ماجد نے یہاں کوئی دکان شکان نہیں کھول رکھی بلکہ وہ خود اس کمرے میں رہتا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا.....'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میں بتاتا ہوں جی.....'' مشتاق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بات یہ ہے جی کہ ماجد کا تعلق چک بیالی (بیالیس) شرقی سے ہے۔ وہ ادھر ''زیبائش'' ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا ہے اور ہم نے یہ کمرا ماجد کو کرائے پر، رہائش کے لیے دے رکھا ہے۔''

''اوہ.....'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''تو اس وقت ماجد فیکٹری گیا ہوگا.....'' میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے یہ کمرا بند ہے؟''

''نہیں جی..... ماجد تو اپنے پنڈ گیا ہوا ہے۔'' خالدہ نے بتایا۔

''ماجد کب چک بیالیس شرقی گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

مشتاق نے بتایا۔ ''وہ دو دن پہلے اپنے گھر گیا ہے۔''

''یعنی اکیس تاریخ کو؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، جی.....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آج تیئس تاریخ ہے۔ وہ دو دن پہلے دوپہر میں فیکٹری سے چھٹی کر کے آ گیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ گاؤں میں اس کا بچہ بیمار ہے اس لیے اسے معمول سے ہٹ کر گھر چک بیالی شرقی جانا پڑ گیا ہے۔''

''اوہ.....تو ماجد شادی شدہ ہے؟''

''جی۔ اس کا ساڑھے تین سال کا ایک بیٹا بھی ہے.....طارق!'' مشتاق نے بتایا۔ ''ماجد کی شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ اس کی بیوی کا نام نگی (صغریٰ) ہے۔''

''کیا آپ دونوں میں سے کوئی کبھی ماجد کی بیوی یا اس کے بیٹے سے ملا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی!'' خالدہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

مشتاق نے کہا۔ ''اپنے بیوی بچے کے بارے میں یہ ساری باتیں ہمیں ماجد نے ہی بتائی ہیں ورنہ ہم کبھی چک بیالی شرقی گئے ہیں اور نہ ہی ماجد کے گھر سے کبھی کوئی چمن آباد آیا ہے۔ ماجد ایک بھلا مانس انسان ہے۔ اس نے آج تک ہمیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ بغیر مانگے ہر ماہ کی سات تاریخ کو ہمیں کرایہ دے دیتا ہے۔ اس کے رویے اور اخلاق کو دیکھتے ہوئے ہم نے اس کی ہر بات پر یقین کر لیا ہے۔''

''ماجد کتنے عرصے سے تمہارا کرایہ دار ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک سال سے زیادہ ہی ہو گیا ہے۔''

''وہ ہر ماہ کی سات تاریخ ہی کو کرایہ کیوں ادا کرتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''اس کا کوئی خاص سبب؟''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ فیکٹری سے اسے ہر ماہ کی سات تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے۔''

''کیا ماجد لکھنا پڑھنا جانتا ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جی.....!'' مشتاق نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''اس نے مجھے یہی بتایا ہے کہ وہ آٹھ جماعتیں پاس ہے۔''

''ٹھیک ہو گیا.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''مشتاق! تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا ہے کہ اکیس فروری کی دوپہر ماجد کو معمول سے ہٹ کر اپنے گاؤں جانا پڑا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کا معمول کیا ہے؟''

''ماجد کی فیکٹری میں اتوار کو ہفتہ وار تعطیل ہوتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہر ماہ کی سات تاریخ کے بعد جو بھی ہفتے کا دن آتا ہے اسی روز ماجد دو دن (ہفتہ اور اتوار) کے لیے اپنے گھر والوں سے ملنے چک بیالی شرقی چلا جاتا ہے پھر اس کی واپسی سوموار کی صبح ہی ہوتی ہے۔ فیکٹری والوں نے اسے ہر ماہ ہفتے کے ایک دن کی چھٹی کرنے کی سہولت دے رکھی ہے.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''دو دن پہلے یعنی اکیس فروری کو سوموار کا دن تھا اور آج بدھ وار ہے۔ پھر سات تاریخ بھی ابھی کافی دور ہے اسی لیے میں نے کہا کہ وہ اس بار خلاف معمول اپنے گاؤں گیا ہے۔''

موضع چمن آباد سے چک بیالیس شرقی کم و بیش پندرہ میل تھا۔ یہ اتنا فاصلہ تھا کہ کوئی فیکٹری ورکر روزانہ اپنے گھر

سے کام پر آجا نہیں سکتا تھا۔ اسی وجہ سے ماجد زیبائش ٹیکسٹائل ملز کے عقب میں واقع چمن آباد میں مشتاق کے گھر کے ایک کمرے میں، کرایہ دار کی حیثیت سے آباد ہو گیا تھا اور مہینے میں ایک چکر وہ اپنے گھر کا لگا آتا تھا۔''

''مشتاق!'' میں نے گمشدہ پینو کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ماجد ٹیکسٹائل فیکٹری میں کام کیا کرتا ہے؟''

''وہ تانا ماسٹر ہے جناب!'' اس نے جواب دیا۔

ٹیکسٹائل انڈسٹری میں کام کے مختلف شعبے ہوتے ہیں جن میں تلکیاں بھرنا، تانیاں بنانا، کھڈی پر کپڑا بننا، کپڑے پر پرنٹنگ کرنا..... وغیرہ ہا! بنیادی شعبہ جات شمار کیے جاتے ہیں۔ ماجد ''زیبائش'' ٹیکسٹائل ملز میں تانا ماسٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تانا مشین پر تانیاں بنایا کرتا تھا۔ تانی، کھڈی پر چڑھتی ہے تو اس کے بعد ہی کپڑے کی بُنائی کا عمل شروع ہوتا ہے۔

میں نے مشتاق اور خالدہ کے چہرے پر نگاہ جما کر کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''کیا ماجد کا پینو سے ملنا جلنا تھا؟''

''جی..... ہم تینوں سے اس کا ملنا جلنا ہے۔'' مشتاق نے اثبات میں جواب دیا۔

خالدہ نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ماجد ہمارا کرایہ دار ہے لیکن وہ گھر کے ایک فرد کی طرح یہاں رہتا ہے۔ اکثر ہم اسے کھانے پینے کی چیزیں بھی دیتے رہتے ہیں۔''

''اور یہ سامانِ خورونوش پینو اسے پہنچایا کرتی تھی.....!'' میں نے معنی خیز نظر سے خالدہ کی طرف دیکھا۔ ''ہیں نا؟''

''کبھی پینو اور کبھی میں۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

''ماجد نے کب تک واپس آنے کو کہا تھا؟''

''کہہ رہا تھا، ایک دو دن میں لوٹ آؤں گا۔'' مشتاق نے بتایا۔

''مگر دو دن تو گزر گئے اور وہ آیا نہیں.....!'' میں نے کہا۔

''اللہ خیر کرے۔'' خالدہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ''اس کے بیٹے کی طبیعت ٹھیک ہو.....!''

''آمین!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم دونوں کے تعاون کا بہت شکریہ۔ آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد پینو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''یہ آپ کا ہم دونوں پر عظیم احسان ہوگا تھانے دار جی۔'' خالدہ تشکر بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ لوگوں کو پینو کے بارے میں کوئی بھی نئی بات پتا چلے تو سیدھا تھانے آکر مجھے بتانا ہے۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

مشتاق جلدی سے سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے فرماں برداری سے بولا۔ ''جی..... ضرور.....!''

میں مشتاق کے گھر سے باہر نکل آیا۔ کوچوان علی محمد اور کانسٹیبل جنید خان تانگے میں موجود تھے۔ میں بھی تانگے پر سوار ہو چکا تو کوچوان نے پوچھا۔

''ملک صاحب! واپس تھانے ہی جانا ہے نا؟''

''تم تانگے کو چمن آباد سے نکال کر جی ٹی روڈ پر پہنچو، پھر بتاتا ہوں.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا جی۔'' کہتے ہوئے علی محمد نے تانگا آگے بڑھا دیا۔ ''جو آپ کا حکم ملک صاحب!''

ہمارا تانگا جب چمن آباد کے مین بازار سے گزرا تو اعجاز عرف جاجو لپک کر سامنے آگیا پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے تانگا روکنے کے لیے کہا۔ کوچوان نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا کرنا ہے ملک صاحب؟''

''تانگا روک دو.....'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس عاشق نامراد کی بھی سن لیتے ہیں۔''

تانگے کو رکتا دیکھ کر جاجو واپس اپنے ٹھیلے کی طرف گیا اور وہاں سے دو بھرے ہوئے خاکی تھیلے اٹھا لایا اور انہیں میری جانب بڑھاتے ہوئے بڑی چاہت سے بولا۔

''یہ گرما گرم پکوڑے اور سموسے میں نے خاص طور پر آپ کے لیے تیار کیے ہیں۔ ساتھ ہی انار دانے کی چٹنی بھی ہے۔ آپ کھائیں گے تو مزہ آجائے گا۔''

اس خیال سے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو، میں نے اس کے ہاتھ سے وہ بھرے ہوئے دونوں تھیلے لے لیے۔ ایک خاکی تھیلے میں کوئی درجن بھر تازہ بہ تازہ سموسے تھے اور دوسرے تھیلے میں آدھا سیر کے قریب گرما گرم پکوڑے تھے۔ دونوں تھیلوں کے اندر سے بڑی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے گھور کر جاجو کی طرف دیکھا پھر بغرضِ تفریح ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

''ایک پولیس آفیسر کو رشوت پیش کر رہے ہو.....؟''

''نن..... نہیں جی۔'' وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ ''مائی باپ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟''

''میں تمہارے یہ پکوڑے اور سموسے معیار کی چیکنگ کے لیے لے جا رہا ہوں۔'' میں نے تفریح کے عمل کو

دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یاد رکھو، میں اس کے بدلے اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں لاؤں گا۔ میرا ایک بندہ سیدھا گکھڑ منڈی جائے گا اور شام سے پہلے وہاں کی رپورٹ لاکر مجھے دے گا۔ اگر تمہارا بیان کسی بھی مرحلے پر غلط ثابت ہوا تو الٹا لٹکا کر تمہاری چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔ میں تھانے دار ہوں ذرا اوکھری ٹائپ کا......''

''پروا نہیں ہے سرکار۔'' وہ بے نیازی بھرے اعتماد سے بولا۔ ''آپ جس طرح چاہیں، اپنی تسلی کریں۔ اگر میں نے آپ سے کوئی جھوٹ بولا ہو تو آپ میری چمڑی ادھیڑیں یا مجھے جان سے مار ڈالیں، میں اف تک نہیں کروں گا۔''

جاجو کے ٹھوس اور پُراعتماد جواب نے ایک بات تو پایۂ ثبوت تک پہنچا دی کہ مجھے اس کے بیان کی تصدیق کے لیے کسی کو گکھڑ منڈی بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے مشاہدے، تجربے اور وجدان کی روشنی میں جاجو، پنو کی گمشدگی میں ملوث نظر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

جی ٹی روڈ پر پہنچ کر میں نے تانگے کو ''زیبائش'' ٹیکسٹائل ملز کی جانب مڑوا لیا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ ان گرما گرم سموسوں اور پکوڑوں سے دل کھول کر انصاف کریں۔ میں تھوڑی دیر فیکٹری کے اندر گزار کر آتا ہوں۔''

ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ میری مشتاق اور خالدہ سے کس نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی لہٰذا وہ ماجد نامی کسی تانا ماسٹر کی اسٹوری سے واقف نہیں تھے۔ کانسٹیبل جنید خان نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔

''اور آپ......؟''

''بتایا تو ہے، مجھے زیبائش ملز میں ایک چھوٹا سا کام ہے......!''

''آپ یہ نہیں کھائیں گے؟'' اس نے خاکی تھیلوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر یہ ٹھنڈے ہو گئے تو ان کا مزہ باقی نہیں رہے گا۔''

''فی الحال سموسوں اور پکوڑوں سے لطف اندوز ہونے سے کہیں زیادہ اہم کام میرے سامنے ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں پہلے وہ کام نمٹالوں۔ اس کے بعد پیٹ پوجا کے بارے میں بھی سوچ لوں گا......''

میرے حتمی انداز کے بعد جنید خان نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ میں تانگے سے اترا اور ٹہلنے والے انداز میں چلتے ہوئے زیبائش ملز کے گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔

فیکٹری کا مالک بابو شفیق اس وقت آفس میں موجود نہیں تھا۔ میں سیدھا جا کر منشی سے ملا۔ کسی بھی کارخانے میں منشی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ آپ اسے جدید دور کا جنرل منیجر سمجھ لیں۔ مالک کے بعد وہ سب سے زیادہ اہم تصور کیا جاتا ہے۔ زیبائش ملز کے منشی کا نام عبدالجبار تھا۔ عبدالجبار ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا اور سنجیدہ مزاج خوش اخلاق شخص تھا۔

منشی نے میرا پُرتپاک استقبال کیا اور میرے ''نہ، نہ'' کرنے کے باوجود بھی اس نے میری خاطر تواضع کے لیے چائے اور کیک منگوا لیے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

''فرمائیں ملک صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''میں آپ کی فیکٹری کے ایک ورکر ماجد کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے چائے اور کیک سے انصاف کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''میرے خیال میں، اس سلسلے میں آپ سے زیادہ مفید اور کوئی ثابت نہیں ہوسکتا......!''

''جی ضرور...... آپ حکم کریں۔'' وہ متانت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کی ہر نوعیت کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ بس، آپ مجھے......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے پُرتشویش نظر سے مجھے دیکھا اور ان الفاظ میں مستفسر ہوا۔

''بس، آپ مجھے یہ بتادیں کہ سب خیریت تو ہے نا ملک صاحب......؟''

''ابھی تک تو خیریت ہی ہے جبار صاحب!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''دعا کریں کہ آگے بھی خیریت ہی رہے......''

''اصل میں، کسی پولیس آفیسر کا چل کر آنا اور ہماری فیکٹری کے ایک ملازم کے حوالے سے چھان بین کرنا ذہن میں ہزاروں قسم کے خدشات کو جنم دیتا ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''آپ میری بات تو سمجھ رہے ہیں نا؟''

''صد فیصد سمجھ رہا ہوں جبار صاحب......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''فکر نہ کریں۔ اگر ماجد کسی معاملے میں ملوث نہیں تو پھر آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن پتا تو چلے کہ آخر معاملہ کیا ہے......'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک تو آپ نے کچھ بتایا ہی نہیں کہ آپ ماجد کے بارے میں کس طرح کی تفتیش کرنے آئے ہیں؟''

''بتاتا ہوں......'' میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

آیندہ دس منٹ میں، میں نے منشی عبدالجبار کو حقیقتِ حال سے پوری طرح آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری توجہ اور فکرمندی سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ماجد کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ سب وہی تھا جو مشتاق اور خالدہ کی زبانی مجھ تک پہنچ چکا تھا یعنی..... سب ٹھیک ہے۔ ماجد ایک عظیم انسان ہے۔ اس کے کردار پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ وغیرہ وغیرہ!

اب ترپ کا پتا پھینکنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے منشی عبدالجبار کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''جبار صاحب! کیا آپ نے فیکٹری کے اندر ملازمین کے لیے کوئی حاضری رجسٹر بھی رکھا ہوا ہے جس پر ہر ورکر روزانہ اپنے دستخط کرتا ہو؟''

''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا کوئی نظام ہماری فیکٹری میں موجود نہیں ہے البتہ، ہر ماہ کی سات تاریخ کو جب تنخواہ دی جاتی ہے تو میں ایک رجسٹر پر اس کا باقاعدہ اندراج کرتا ہوں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بعض ملازمین نے ایڈوانس لیا ہوا ہوتا ہے جو ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے تھوڑا تھوڑا کٹواتے رہتے ہیں لہٰذا ان کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا ماجد نے کبھی بھی ایڈوانس رقم لی ہے؟''

''نہیں جناب! اس کا ریکارڈ صاف ہے۔'' منشی نے بتایا۔

''ابھی آپ نے جس سیلری رجسٹر کا ذکر کیا، میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو.....!''

''کوئی اعتراض نہیں ملک صاحب!'' وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ ''میں ابھی آپ کو وہ رجسٹر دکھاتا ہوں۔''

پھر اس نے میری فرمائش پوری کر دی۔ میں تنقیدی نظر سے اس سیلری رجسٹر کا جائزہ لینے لگا۔ اِکا دُکا کو چھوڑ کر باقی تمام ورکرز نے تنخواہ وصول کرتے ہوئے رجسٹر پر اپنے انگوٹھے کا نشان ثبت کیا ہوا تھا۔ جن اِکا دُکا افراد نے دستخط کیے ہوئے تھے، ان میں ماجد بھی شامل تھا۔ میں نے ماجد کے دستخط کا بغور معائنہ کیا لیکن دستخط کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ یک سطری تحریر بھی ماجد کی لکھی ہوئی تھی۔

میں نے سیلری رجسٹر کو بند کرتے ہوئے منشی سے استفسار کیا۔ ''جبار صاحب! کیا آپ کے پاس ماجد کی تحریر کا کوئی نمونہ ہے؟''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی ہے۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اضطراری لہجے میں کہا۔ ''میں وہ نمونہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''جی..... ابھی دکھاتا ہوں۔'' اس نے شائستگی سے کہا پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک الماری کی جانب بڑھ گیا۔

زیبائش ٹیکسٹائل ملز کے آفس میں منشی عبدالجبار کی میز کی ایک جانب دیوار کے ساتھ ایک چوبی الماری رکھی ہوئی تھی جو یقیناً اس فیکٹری کے لیے ریکارڈ روم کی حیثیت کی حامل تھی۔ منشی چند منٹ تک اس الماری کے اندر کچھ تلاش کرتا رہا پھر ایک کاغذ کے ساتھ واپس لوٹا اور اس کاغذ کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہمارے پاس ماجد کی یہ واحد تحریر ہے جو ایک یادگار کی حیثیت رکھتی ہے جس کا اپنا ایک خاص پس منظر ہے۔''

میں نے منشی کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے لیا۔ مذکورہ کاغذ کی تحریر سے پتا چلا کہ وہ ایک ''تنخواہ میں اضافے'' کی درخواست تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے وہ یک سطری تحریر نکال لی جو گمشدہ پینو کے جستی صندوق میں سے مجھے ملی تھی۔ پھر میں باریک بینی سے ان دونوں تحاریر کا موازنہ کرنے لگا۔ اس دوران میں منشی عبدالجبار کی آواز بھی مسلسل میری سماعت تک رسائی حاصل کر رہی تھی۔

''فیکٹری ملازمین کا کوئی بھی چھوٹا بڑا مسئلہ ہوتا ہے تو وہ براہ راست مجھ سے بات کرتے ہیں۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ ''اگر کسی کو تنخواہ بڑھوانا ہو تو وہ بھی مجھ ہی سے درخواست کرتا ہے۔ میں فیکٹری ورکرز کے مسائل کو بابو جی (شفیق صاحب) کے سامنے رکھتا ہوں کیونکہ وہ فیکٹری کے مالک ہیں۔ کسی بھی معاملے کا فائنل فیصلہ انہی کو کرنا ہوتا ہے لیکن اس بندے ماجد نے تو فیکٹری کی ایک نئی تاریخ لکھ ڈالی تھی۔ ان دنوں ماجد کی ماہوار تنخواہ چالیس روپے ہوا کرتی تھی۔ ماجد نے بابو شفیق کے نام ایک درخواست لکھی جس میں

امید

اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ حالات آپ کے موافق نہیں ہیں۔ ہر چیز آپ کے ہاتھوں سے نکل رہی ہے تو پریشان نہ ہوں بلکہ ایک بار اس درخت کے بارے میں ضرور سوچیں جو ایک ایک کر کے اپنے سارے پتے گنوا چکا ہے لیکن اس امید پر ثابت قدم کھڑا ہے کہ کوئی بات نہیں۔ بہار کے دن ضرور پلٹ کر آئیں گے اور وہ پھر سرسبز و شاداب ہو جائے گا۔

اس نے نہایت ہی شائستہ الفاظ میں کہا کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور پھر اس نے یہ درخواست براہِ راست بابو شفیق کو دے دی تھی......" وہ اپنی سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بابو جی کو ماجد کا یہ انداز بہت بھایا اور انہوں نے اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہدایت کی کہ میں اس درخواست کو کسی فائل میں محفوظ کرلوں۔ اسی لیے تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ تحریر ایک یادگار کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا اپنا ایک خاص پس منظر ہے اور اب...... ماجد کی یہ تحریر آپ کے ہاتھ میں ہے ملک صاحب۔"

میں نے سیلری رجسٹر میں ماجد کے نام کے سامنے "پچاس روپے" لکھا دیکھا تھا۔ اب یہ راز کھلا کہ وہ رقم چالیس روپے سے پچاس روپے میں کیسے بدلی تھی۔ پچاس روپے ماہانہ تنخواہ کا سن کر آپ کو شدید حیرت ہو رہی ہوگی اور آپ میں سے بعض یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ملک صاحب پتا نہیں، کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ میں اسی دنیا کے گزرے ہوئے زمانے کا ذکر کر رہا ہوں اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ اس زمانے میں ایک فیکٹری مزدور کی تنخواہ آج کے مزدور کی ماہانہ آمدنی سے کم از کم تین گنا زیادہ ہوا کرتی تھی۔ زیادہ حیران نہ ہوں۔ میں اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیتا ہوں۔ جس دور میں ایک فیکٹری ورکر کی اوسط تنخواہ پچاس روپے ماہوار ہوا کرتی تھی تب سونا ساٹھ روپے تولہ (دس گرام) مل جایا کرتا تھا اور دس سے پندرہ روپے میں ایک متوسط خاندان کا مہینے بھر کا راشن خریدا جا سکتا تھا۔ آج سونے کے فی تولہ بھاؤ کو ذہن میں رکھ کر خود ہی اندازہ لگا لیں کہ میں نے کیا غلط کہا ہے اور کیا درست!

"ملک صاحب! آپ تو ماجد کی درخواست کے اندر گم ہو کر ہی رہ گئے ہیں۔" منشی عبدالجبار نے اپنی باتیں روک کر مجھ سے کہا۔ "لگتا ہے، آپ اس کے اندر سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں......!"

"کچھ نہیں...... بہت کچھ جبار صاحب!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا پھر ماجد کی درخواست اور پینو کے صندوق سے ملنے والے پرچے کو منشی کی جانب بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "لیکن آپ بھی میری برآمدات کو ملاحظہ کر لیں......!"

اس نے میرے ہاتھ سے دونوں کاغذات لے لیے پھر بغور ان کا تقابلی جائزہ لینے لگا۔ میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش ڈھونڈی نہیں جا سکتی تھی۔ چند لمحات کے بعد منشی جبار نے بھی میرے برآمد کردہ نتیجے کی توثیق کر دی۔ اس کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ملک صاحب! یہ دونوں تحریریں تو بالکل ایک جیسی ہیں......!"

"یعنی آپ مانتے ہیں کہ یہ ایک لائن......" میں نے پینو کے صندوق سے حاصل ہونے والے پرچے کی یک سطری تحریر پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ لائن بھی ماجد ہی کے ہاتھ سے لکھی گئی ہے؟"

"جی بالکل!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "دونوں تحریروں میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ یہ بھی تسلیم کر لیں کہ ماجد اپنے بیٹے کی بیماری کا بہانہ کر کے آپ سے پورے مہینے کی تنخواہ لے گیا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ اسے جتنا سیدھا سمجھ رہے ہیں وہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ اب سارا معاملہ واضح ہو گیا ہے۔ مشتاق اور خالدہ کی بیٹی پروین عرف پینو ماجد کے ساتھ ہی گھر سے بھاگی ہے۔"

"ملک صاحب......" منشی جبار سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو یہ پرچہ کہاں سے ملا ہے؟"

"پینو کے کپڑے رکھنے والے صندوق میں سے۔" میں نے جواب دیا۔ "اور وہ صندوق بھی کپڑوں کے وجود سے ایک دم خالی پڑا ہے۔"

"ماجد ایک شادی شدہ شخص ہے اور ایک بیٹے کا باپ بھی ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "وہ پینو کو لے کر اپنے گاؤں تو نہیں گیا ہوگا۔"

"آپ کی بات میں وزن ہے منشی صاحب......" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "بہ شرط یہ کہ ماجد واقعتاً شادی شدہ ہو اور اس کی بیوی و بیٹا چک بیالیس شرقی میں رہتے ہوں۔"

"یہ تو آپ عجب بات کر رہے ہیں ملک صاحب!" اس کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہوئی۔ "کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ماجد نے اپنی بیوی، بچے اور گاؤں کے حوالے سے غلط بیانی کی ہوگی؟"

آپ کبھی ماجد کے چک گئے ہیں اس سے ملنے؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں!" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"میں بھی نہیں گیا مگر اب جانا لازم ٹھہرا ہے۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ نے کبھی ماجد کی

بیوی صغریٰ اور اس کے ساڑھے تین سالہ بیٹے طارق کو کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں جناب.....'' وہ سر کو انکاری حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''بس، ذکر ہی سنا ہے۔''

''میں نے بھی ذکر ہی سنا ہے منشی صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مشتاق اور خالدہ نے بھی ماجد کی زبانی ہی یہ قصہ سن رکھا ہے۔ کوئی بھی شخص چک بیالیس شرقی گیا ہے اور نہ ہی ماجد کی بیوی اور بچے سے ملا ہے.....'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ کام مجھے ہی کرنا ہوگا منشی صاحب!''

''اللہ آپ کو کامیابی عطا فرمائے.....!'' وہ پُرخلوص انداز میں بولا۔

میں نے صدقِ دل سے کہا۔ ''آمین.....!''

☆☆☆

آیندہ روز میں نے کانسٹیبل آفتاب احمد کو ساتھ لیا اور چک بیالیس شرقی کی جانب روانہ ہو گیا۔ پینو کی گمشدگی کو دو دن گزر گئے تھے اور آج تیسرا دن شروع ہوا تھا۔ وہ بائیس فروری دن میں دس اور بارہ بجے کے درمیان گھر سے غائب ہوئی تھی اور سعیدو نائی کے بیان کے مطابق اس نے لگ بھگ گیارہ بجے پینو کو گرم چادر کی بکل مارے جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑے دیکھا تھا۔ پینو کے صندوق سے برآمد ہونے والی مختصر تحریر سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے اسے بائیس فروری کی دوپہر گیارہ بجے جی ٹی روڈ پر مولوی کے کھوکھے کے سامنے پہنچنے کو کہا تھا اور وہ ''کسی'' کوئی اور نہیں بلکہ مشتاق کا کرائے دار ماجد تھا۔

ساری کڑیاں ایک ایک کر کے آپس میں جڑتی چلی جا رہی تھیں اور میں نے چوبیس فروری کی صبح اسی لیے چک بیالیس شرقی کا رخ کیا تھا تاکہ اس کیس کی زنجیر کو مکمل کر سکوں۔ اس وقت میں اور کانسٹیبل آفتاب احمد ایک ویگن پر سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے اور ہم دونوں بیول ڈریس میں تھے۔

''ملک صاحب! آج آپ بہت زیادہ خاموش ہیں۔'' مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر آفتاب نے کہا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''آفتاب.....!'' میں نے اس کی جانب رخ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ''خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کہ ہم جس محکمے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں ''خیریت'' نام کی کوئی چیز پائی جاتی ہے؟''

''نہیں جناب.....!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں تو ہر طرف افراتفری اور بھاگ دوڑ ہی لگی رہتی ہے لیکن میرے پوچھنے کا یہ مقصد نہیں تھا.....!''

''جہاں افراتفری اور بھاگ دوڑ کا ماحول بنا ہوا ہو وہاں خیریت کی توقع رکھنا دیوانے کا خواب ہی ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال، تم بتاؤ..... تمہارے سوال کرنے کا مقصد کیا تھا؟''

''میں نے آپ کو پہلے کبھی اتنا خاموش نہیں دیکھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بس، اسی لیے پوچھ لیا.....''

''میرا ذہن پینو اور ماجد میں الجھا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب تک میں اس گتھی کو سلجھا نہیں لیتا، مجھے سکون نہیں ملے گا۔''

''آپ کل جنید خان کے ساتھ چمن آباد گئے تھے، ہیں نا.....؟'' آفتاب نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں، گیا تھا۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''وہاں سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی ہی میں تو ہم نے چک بیالیس شرقی جانے کا قصد کیا ہے۔ میں یہ ساری باتیں، تھانے سے نکلنے سے پہلے تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''جی ملک صاحب.....'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''میں..... دراصل جنید خان کے بارے میں سوچ رہا تھا.....''

''کیوں..... جنید خان کو کیا ہوا ہے؟''

''جب کل شام آپ تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف چلے گئے تھے تو جنید آپ کو ڈھونڈ رہا تھا.....'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آپ سے کوئی خاص بات کرنا چاہ رہا ہو۔''

''میں پینو کی طرح کوئی مفقود الخبر تھوڑی تھا جو جنید مجھے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔'' میں نے کانسٹیبل آفتاب کو گھورا۔ ''اگر اسے مجھ سے کوئی ضروری کام تھا تو سیدھا میرے کوارٹر پر آ جاتا۔''

''میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ سے کیا کہنا چاہ رہا تھا۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''بس، میں نے جو محسوس کیا، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔''

آج صبح جب ہم تھانے سے روانہ ہو رہے تھے تو اس وقت جنید خان تھانے میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ مجھ سے مل کر اپنے ذہن کا بوجھ ضرور ہلکا کر لیتا۔

''چلیں، ٹھیک ہے۔'' میں نے کانسٹیبل آفتاب سے کہا۔ ''چک بیالیس شرقی سے واپسی پر میں جنید خان سے ملاقات کر لوں گا، پھر پتا چل جائے گا کہ گزشتہ رات وہ مجھے

کیوں تلاش کر رہا تھا۔''

میرے اس جواب کے بعد آفتاب چپ ہو کر بیٹھ گیا۔

گزشتہ روز دورۂ چمن آباد میں جنید خان تمام وقت میرے ساتھ تھا سوائے جب میں اول، پینو کے غمزدہ والدین سے اور دوم، زیبائش ٹیکسٹائل ملز کے منشی عبدالجبار سے گفت وشنید میں معروف رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ زیبائش ٹیکسٹائل ملز کا رخ کرنے سے پہلے میں نے جنید خان اور کوچوان علی محمد کو ''سموسہ + پکوڑا'' دعوت اڑانے کا حکم دیا تھا اور مشتاق سائیکلوں والے کے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے جنید خان کو تاکید کی تھی کہ وہ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر معلومات اکٹھا کرنے کی کوشش کرے۔

''تو کیا جنید خان کو گمشدہ پینو کے حوالے سے کوئی اہم بات پتا چلی تھی.....'' میرے ذہن میں ایک طاقتور خیال نے جنم لیا۔ ''اور گزشتہ رات جنید خان یہی بات مجھے بتانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا؟''

میں نے اپنے ذہن کو تسلی دی۔ ''اب جو بھی ہے، واپس تھانے پہنچ کر دیکھ لیں گے۔ فی الحال مجھے چک بیالیس شرقی پر فوکس کرنا چاہیے۔''

ویگن نے ہمیں سڑک کے کنارے ایک ایسے مقام پر اتارا جہاں سے چک بیالیس شرقی لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم نے یہ مسافت پیدل چلتے ہوئے طے کی اور بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

ماجد کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس وقت ہم عوامی لباس میں تھے اس لیے چک بیالیس شرقی میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی ورنہ اگر ہم پولیس کی وردی میں ہوتے تو پورے گاؤں میں تھرتھلی مچ جانا تھی۔

ماجد کے باپ منظور کی چک بیالیس میں کریانے کی دکان تھی اس لیے بھی..... اس کے گھر تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی، پوچھ تاچھ پر ہمیں پتا چلا کہ اس وقت گھر پر ماجد کی ماں شاہدہ اور اس کی بیوی صغریٰ عرف سگی موجود تھیں جبکہ منظور اپنی دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم سیدھا اس کی دکان پر پہنچے تھے جو کہ گھر کے سامنے والے حصے میں تھی۔

''میرا نام صفدر علی ہے اور یہ میرا دوست آفتاب حسین ہے۔'' میں نے معمولی سے ردوبدل کے ساتھ تعارف کراتے ہوئے منظور کو بتایا۔ ''ہم حافظ آباد میں رہتے ہیں اور تمہارے بیٹے ماجد سے ملنے آئے ہیں۔''

منظور کی عمر پچپن کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ گندمی رنگت اور عام سی شکل وصورت کا مالک ایک سادہ طبیعت انسان تھا۔ اس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے فارغ تھا۔ کھوپڑی کے گرداگرد چھدرے بالوں کی جھالر نظر آ رہی تھی۔

منظور نے الجھن زدہ انداز میں باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ ماجد سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

''بزرگو..... آپ نے ہمیں اس لیے نہیں پہچانا کہ آج سے پہلے کبھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''اور جب ماجد سامنے آئے گا تو سلسلہ بھی بتا دیں گے۔''

میرے انداز میں اچھی خاصی چبھن پائی جاتی تھی۔ منظور نے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔ ''سب خیریت تو ہے نا.....؟''

''چاچا منظور.....'' آفتاب نے ماجد کے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تک تو خیریت نہیں ہے۔ ماجد ہتھے چڑھ گیا تو پھر امید کی جا سکتی ہے کہ خیریت ہو جائے گی.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے بوجھل سانس خارج کی پھر کڑے لہجے میں پوچھا۔

''ماجد ہے کہاں..... کیا وہ گھر کے اندر چھپ کر بیٹھا ہوا ہے؟ اسے باہر نکالو ورنہ ہمیں زبردستی تمہارے گھر میں گھسنا پڑے گا.....''

آفتاب کے جارحانہ انداز نے منظور کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''ماجد نے ایسا کیا کر دیا ہے؟''

''وہ چمن آباد سے ایک کڑی اغوا کر کے یہاں لایا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور ہم پینو نامی اسی کڑی کو برآمد کرنے اور تمہارے بیٹے کو گرفتار کرنے یہاں آئے ہیں۔ اب بات آئی سمجھ میں.....؟''

''تت..... تو آپ لوگوں..... کا تعلق..... پولیس سے ہے.....؟'' وہ پریشانی بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''ٹھیک سمجھے!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں تھانہ انچارج ہوں اور یہ کانسٹیبل آفتاب احمد ہے۔ چمن آباد میرے تھانے کی حدود میں آتا ہے اسی لیے ہم ماجد کی تلاش میں ادھر آئے ہیں۔''

©2020

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''یہ چمن آباد ہے کہاں اور میرے بیٹے کا کسی پینو سے کیا واسطہ.....؟''

''چمن آباد، ضلع گوجرانوالہ، تحصیل گوجرانوالہ کا ایک نواحی گاؤں ہے جو جی ٹی روڈ کے کنارے، زیبائش ٹیکسٹائل ملز کے عقب میں واقع ہے۔ پینو اسی گاؤں میں رہتی تھی اور ماجد پینو کے گھر میں ایک کرائے دار کی حیثیت سے قیام پذیر تھا۔ بائیس فروری کی دوپہر ماجد اور پینو، چمن آباد سے غائب ہو گئے تھے یعنی صرف دو دن پہلے.....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''کیا اتنی تفصیل کافی ہے یا.....؟''

میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو منظور کریانہ فروش اضطراری انداز میں بولا۔ ''یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جی!''

''غلط فہمی.....!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ.....'' منظور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا بیٹا ماجد کبھی چمن آباد نہیں گیا اور اسے کسی کے گھر میں کرائے پر رہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ تو جب سے پیدا ہوا ہے، ادھر اسی گھر میں رہ رہا ہے اس پرچون کی دکان میں وہ میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ وہ اس وقت دکان کے لیے سودا وغیرہ لینے نزدیکی شہر گیا ہوا ہے۔ بس، اب وہ واپس آنے ہی والا ہے..... اور آپ پتا نہیں، میرے بیٹے پر کیسے کیسے الزام لگا رہے ہیں۔''

منظور کی اس سنسنی خیز وضاحت نے تو میرا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ میں اپنے ذہن میں جو کہانی لے کر چک بیالیس شرقی پہنچا تھا، وہ یکلخت کلٹی ہو گئی تھی لیکن میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا لہٰذا میں نے منظور پر تیز و تند سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

''منظور! کیا تم اس بات سے انکاری ہو کہ ماجد کی عمر لگ بھگ ستائیس سال ہے؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے اس لیے میں انکار نہیں کروں گا۔''

''ماجد کی بیوی کا نام صغریٰ ہے لیکن سب اسے ''سگی'' کہہ کر پکارتے ہیں۔'' میں نے استفسارات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سگی اس وقت کم و بیش پچیس سال کی ہے۔''

''جی..... یہ سب بھی ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''ماجد تمہاری اکلوتی اولاد ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم نے پانچ سال پہلے اس کی سگی سے شادی کی تھی۔ ان دونوں کا ایک بیٹا ہے جس کا نام طارق ہے۔ اس وقت طارق کی عمر ساڑھے تین سال ہے؟''

منظور نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو ہمارے بارے میں یہ ساری باتیں کیسے پتا چلی ہیں تھانے دار صاحب.....؟''

اس دوران میں چک بیالیس شرقی کے چند دسنیک بھی وہاں جمع ہو گئے تھے اور بڑی دلچسپی سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔

''تمہارے ہر سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا چاچا منظور.....!'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''پہلے تم میرے انٹرویو میں پاس ہو کر دکھاؤ۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے تم سے جو پوچھا، وہ غلط ہے یا صحیح؟''

''سو فیصد صحیح ہے جناب!'' وہ تصدیق کرتے ہوئے بولا۔

''تو پھر تم اس بارے میں کیا کہتے ہو.....'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارا بیٹا ماجد تانا ماسٹر ہے۔ وہ ایک سال پہلے روزگار کے سلسلے میں چمن آباد کی طرف نکل گیا تھا۔ اس نے زیبائش ٹیکسٹائل ملز میں ملازمت اختیار کی اور چمن آباد میں مشتاق سائیکلوں والے کے گھر کا ایک کمرا کرائے پر حاصل کر کے وہاں رہنے لگا۔ فیکٹری سے ماجد کو پچاس روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ وہ ہر ماہ کی سات تاریخ کے بعد آنے والے ہفتہ اور اتوار کو یہاں چک بیالیس شرقی آپ لوگوں سے ملنے آیا کرتا ہے اور پیر یعنی سوموار کی صبح وہ واپس اپنی نوکری پر روانہ ہو جاتا ہے.....؟''

''ان میں سے کوئی ایک بات بھی درست نہیں ہے تھانے دار صاحب!'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو ان لوگوں سے پوچھ لیں.....'' اس نے اپنی دکان کے سامنے جمع ہونے والے نصف درجن سے زیادہ افراد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب ماجد کو بچپن سے جانتے ہیں جناب.....!''

ہجوم کے ری ایکشن نے میری حیرت کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ سب منظور کے موقف کی تائید کر رہے تھے یعنی منظور کے اکلوتے بیٹے ماجد نے کبھی چمن آباد کا رخ کیا تھا اور نہ ہی زیبائش ٹیکسٹائل ملز میں کبھی ملازمت کی تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر ماجد کے پینو کو بھگا لے جانے کا کوئی

جواز نہیں بنتا تھا پھر..... وہ کون شخص تھا جس کی تلاش میں ہم چک بیالیس شرقی پہنچے تھے؟

اُدھر یہ خطرناک سوال میرے ذہن میں ابھرا، ادھر بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ ''تو پھر مشتاق سائیکلوں والے کی بیٹی پینو کو کون بھگا کر لے گیا ہے؟ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے چمن آباد اور زیبائش ملز میں ملازمت اختیار کرتے ہوئے اپنا نام ماجد کیوں بتایا؟ اس نے مشتاق اور اس کی بیوی و بیٹی سے یہ کیوں کہا کہ وہ چک بیالیس شرقی کا رہنے والا ہے۔ اس کی بیوی کا نام صغریٰ عرف سگی اور بیٹے کا نام طارق ہے جو ساڑھے تین سال کا ایک گول مٹول اور پیارا سا بچہ ہے؟ اس پراسرار بندے نے پینو کو گھر سے بھگا لے جانے کے لیے تمہارے بیٹے ماجد کی شخصیت اور پس منظر کا سہارا کیوں لیا؟''

''تھانے دار پتر.....'' ایک ضعیف العمر شخص نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے تو میں آپ کو اس بندے تک پہنچا سکتا ہوں جس نے آپ سب کو دھوکا دیا ہے۔''

''وہ کس طرح بابا جی؟'' میں نے چونک کر اس خمیدہ کمر بڈھے بابے کی طرف دیکھا۔ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر اس دغاباز کو پکڑنے میں آپ میری کچھ مدد کردیں.....''

''میں اپنی بعد میں کہوں گا کیونکہ ابھی میں کافی کچھ سوچ رہا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ پینو کو گھر سے بھگا لے جانے والے بندے کا حلیہ اور قد کاٹھ کیسا ہے.....؟''

میں نے سوالیہ نظر سے آفتاب احمد کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''آفتاب! تم بابا جی کو ماجد کی شکل صورت اور وضع قطع کے بارے میں بتاؤ۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے صرف ماجد کا نام ہی سنا تھا اور وہ بھی محض دو روز پہلے۔ میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آفتاب کو اپنے ساتھ چک بیالیس شرقی لانے کا میرا ایک خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ آفتاب، ماجد کا صورت آشنا تھا۔ دراصل آفتاب ہوٹل بازی کا عادی تھا۔ اس نے ماجد کو تین چار بار مولوی کے کھوکھے پر کھانا کھاتے دیکھا تھا۔ میں چونکہ ماجد کی تلاش میں چک بیالیس شرقی آیا تھا لہٰذا مجھے کسی ایسے ہم سفر کی ضرورت تھی جو ماجد کو دیکھتے ہی پہچان لے چنانچہ اس سفر میں آفتاب کو میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

میرے حکم پر کانسٹیبل نے ماجد کا حلیہ اور جسامت تفصیل سے بیان کردی۔ جب کانسٹیبل خاموش ہوا تو وہ بابا سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''مجھے تو یہ رمضان علی کا پتر قدیر لگتا ہے.....!''

ایک دو اور پختہ عمر افراد نے بھی اس بڈھے بابے کی بات کی تصدیق کردی۔ یہ سب سن کر میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں نے ان سب کو بحیثیت مجموعی مخاطب کر کے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کون رمضان اور کون قدیر.....؟''

''قدیر..... رمضان اور صفیہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھے بتایا۔ ''وہ لوگ بھی ادھر ہی چک بیالیس شرقی میں رہتے تھے اور کھیتی باڑی سے گزر بسر کرتے تھے۔ کافی عرصہ پہلے رمضان کی موت ہوگئی..... کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک زہریلے سانپ نے رمضان کو ڈس لیا تھا۔ صفیہ دماغی طور پر کمزور تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ صفیہ دماغی مریضہ تھی اور یہ اثرات قدیر کے اندر بھی منتقل ہوئے تھے۔ اس کی باتیں صحیح الدماغ افراد سے بہت مختلف تھیں۔ وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گاؤں والے جاہل ہیں جو اس کی باتیں ان لوگوں کے پلے نہیں پڑتی ہیں۔ قدیر کے ایسے ہی رویے کی وجہ سے اکثر لوگوں نے اسے ''پروفیسر'' کہہ کر چھیڑنا بھی شروع کردیا تھا.....'' وہ سانس درست کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''لگ بھگ تین سال پہلے قدیر یہ گاؤں چھوڑ کر اچانک کہیں غائب ہوگیا تھا پھر اس نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ قدیر اس وقت کہاں ہوگا اور کیا کر رہا ہوگا مگر آپ کے سپاہی نے ماجد کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ تو ہو بہو قدیر ہی لگتا ہے۔''

''اور قدیر کی ماں صفیہ.....!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر بے چینی سے کہا۔ ''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''صفیہ کے انتقال کے بعد ہی تو قدیر غائب ہوا تھا۔'' مجھے بتایا گیا۔ ''ماں جیسی تیسی بھی تھی جب تک وہ زندہ تھی، قدیر نے گاؤں چھوڑنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا لیکن صفیہ کی وفات کے بعد وہ بہت زیادہ اداس ہوگیا تھا اور پھر ایک دن اچانک وہ غائب ہوگیا۔''

''قدیر نے تعلیم کہاں تک حاصل کی تھی؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

مجھے بتایا گیا۔ ''وہ چار جماعتیں پاس تھا مگر خود کو کسی

عالم فاضل سے کم نہیں سمجھتا تھا۔"

"اور ماجد.....!" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "یہ کتنی جماعتیں پڑھا ہوا ہے؟"

میں نے ان لوگوں کو گمشدہ پینو کے صندوق سے ملنے والے یک سطری پیغام اور منشی عبدالجبار کی فائل میں سنبھال کر رکھی ہوئی تنخواہ میں اضافے کی درخواست کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

"ایک جماعت بھی نہیں۔" ماجد کے باپ منظور نے جواب دیا۔ "میرا پتر چٹا ان پڑھ ہے مگر حساب کتاب میں خاصا تیز ہے۔ میری دکان کا سارا انتظام وہی چلاتا ہے اور بازار سے سودا سامان لانا بھی اسی کے ذمے ہے۔"

میں اس وقت جس نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار تھا اس کے مطابق منظور کریانہ فروش کا اکلوتا بیٹا ماجد وہ شخص ہرگز نہیں ہوسکتا تھا جس کی تلاش میں، میں اپنے تھانے سے چک بیالیس شرقی پہنچا تھا۔ باقی قدیر نامی یہ بندہ پینو کی گمشدگی میں بہ حیثیت ماجد ملوث تھا یا نہیں، اس بارے میں سردست میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ کیس کل شام تک جتنا سہل اور سیدھا دکھائی دے رہا تھا، وہ سہانا خواب چکنا چور ہوکر رہ گیا تھا اور ایک مرتبہ میں پھر اندھیری گلی میں کھڑا تھا۔

میں اپنے مطلوبہ بندے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس مجمع میں سے کسی نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔

"لو جی..... ماجد بھی آ گیا!"

میں نے اس طرف دیکھا جدھر اس بندے نے اشارہ کیا تھا۔ مجھے مذکورہ سمت میں ایک سائیکل سوار سامان والے تھیلوں سے لدا پھندا نظر آیا۔ میں نے اس شخص پر نگاہ جما دی۔

جلد ہی وہ ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی سائیکل کو کریانے کی دکان کے پہلو میں کھڑا کیا پھر وہاں موجود افراد کو حیرت اور استعجاب بھری نظر سے دیکھنے کے بعد منظور سے مستفسر ہوا۔

"ابا! کیا ہوگیا..... سب خیریت تو ہے نا؟"

منظور نے میرا اور آفتاب کا تعارف کرانے کے بعد ماجد کو بتایا۔ "پتر! کسی بندے نے تمہارے نام پر ادھر چمن آباد میں بڑی افراتفری مچا دی ہے اور ایک کڑی کو بھی بھگا لے گیا ہے۔ پولیس اسی کی تلاش میں ہمارے پنڈ آئی ہے۔"

میں نے پُرمعنی سوالیہ نظر سے آفتاب احمد کی طرف دیکھا۔

وہ ایک منٹ تک بغور ماجد کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! یہ ہمارا

مطلوبہ ماجد نہیں ہے۔"
"لیکن یہ کیسے ممکن ہے......" ماجد نے اپنے باپ کی وضاحت کے جواب میں قدرے تیز آواز میں کہا۔" کوئی شخص میرا نام اختیار کرکے اتنا بڑا دھوکا کس طرح کرسکتا ہے؟"

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں منظور کریانہ فروش کے بیٹے ماجد کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ تب جا کر بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اس کے بعد بھی وہ کافی دیر تک مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔

چک بیالیس شرقی میں اب ہمارا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ مجھے جس بندے کی تلاش تھی وہ منظور کا بیٹا ماجد ہرگز نہیں تھا لہٰذا ہم نے واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

پچیس فروری کی صبح میری آنکھ کافی دیر سے کھلی اور اس کا سبب چوبیس فروری کی رات تاخیر سے سونا تھا اور اس کے نتیجے میں میری فجر کی نماز بھی نکل گئی تھی۔

جب میں اور کانسٹیبل آفتاب احمد چک بیالیس شرقی سے روانہ ہوئے تو میرا اندازہ یہی تھا کہ مغرب سے پہلے ہم اپنے تھانے پہنچ جائیں گے مگر اس روز ہر قدم الٹا ہی پڑ رہا تھا۔ ایک تو مجھے جس ماجد کی تلاش تھی وہ چک بیالیس شرقی میں کہیں موجود نہیں تھا اور جس ماجد سے میں مل کر آ رہا تھا، وہ میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ اس وقتی ناکامی نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا پھر اس وقت اس کوفت میں شدید نوعیت کی جھنجلاہٹ بھی شامل ہوگئی جب چک بیالیس شرقی سے روانہ ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی ہماری ویگن خراب ہوگئی اور خراب بھی ایسی کہ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس کے انجن میں کوئی ایسا فالٹ آگیا تھا جو باوجود کوشش کے بھی ڈرائیور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ وہ اس روٹ کی آخری ویگن تھی۔ اگلی ویگن کل صبح ہی وہاں سے گزرنے والی تھی۔

ہم ایک طرح سے "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو کر رہ گئے تھے۔ اس مقام سے پیدل چل کر تھانے پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایک تو موسم ٹھنڈا ٹھار، اوپر سے سری کی برفیلی ہوا بھی چل پڑی تھی اور ان ناساعد حالات میں قرب وجوار میں کوئی محفوظ پناہ گاہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی چنانچہ "مجبوری کا نام شکریہ" کے مصداق ویگن کے اندر دبک کر بیٹھے رہنا ہی دانش مندانہ فیصلہ تھا اور درحقیقت یہ حالات اور وقت کا تقاضا بھی تھا۔ انسان اپنے حالات کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

خدا خدا کرکے رات گیارہ بجے ویگن کا ڈرائیور انجن کے فالٹ کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے پندرہ منٹ بعد ہماری ویگن سڑک پر رواں دواں تھی۔ اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ میں کب تھانے پہنچا ہوں گا اور عشا کی نماز کی ادائیگی کے بعد کب مجھے سونا نصیب ہوا ہوگا۔

اگلی صبح میں تھانے پہنچا اور کانسٹیبل جنید خان کو اپنے پاس طلب کرلیا۔ وہ بھی مجھ سے ملاقات کے لیے بے قرار تھا لہٰذا دوڑتا چلا آیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور کچھ کہنے کے لیے اپنے لب وا کرنے ہی والا تھا کہ میں نے سوال داغ دیا۔

"کیا میں نے تھانے کے عملے میں سے کسی کو اپنے کوارٹر کی طرف آنے سے منع کیا ہے؟"

"نہیں جی......" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔" بلکہ آپ کا تو فرمان ہے کہ اگر کام ہو تو ہم آپ کو رات کے آخری پہر بھی ڈسٹرب کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے ہمیں فری ہینڈ دے رکھا ہے۔"

"تو پھر تمہارے فری ہینڈ کو کسی نے ہتھکڑی لگا دی تھی یا میرا فرمان تمہارے ذہن سے مٹ گیا تھا؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔" مجھے پتا چلا ہے، پچھلی رات تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟"

"جی ملک صاحب......" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔" بتاؤ، کیا معاملہ تھا؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔" وہ بڑی سادگی سے بولا۔" پھر میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں......"

"میں کوئی تمہاری محبوبہ ہوں جو ذرا ذرا سی بات پر تم سے روٹھ جاؤں گا......" میں نے معنی خیز نظر سے اسے گھورا۔" یا پھر تم کسی سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہو؟ تم نے کسی مجرم سے رشوت لے کر اسے چھوڑ دیا ہے یا پھر......؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ملک صاحب......!" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی منت ریز لہجے میں بولا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوال کیا۔" تو پھر کیسی بات ہے؟"

"آپ نے کل مشتاق سائیکلوں والے کے گھر کے سامنے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں گھوم پھر کر پینو کی گمشدگی کے حوالے سے معلومات اکٹھا کروں۔"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔" بس، اسی سلسلے میں مجھ سے ایک چھوٹی سی کوتاہی ہوگئی......!"

"کیسی کوتاہی......" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے

پوچھا۔ ''کیا تم نے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں جو تمہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا یا تم نے اپنی سماعت پر تالا ڈال لیا تھا جس کی وجہ سے تمہیں کچھ سنائی نہیں دیا؟''

''مجھے دکھائی بھی دیا اور سنائی بھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''بس، میں آپ سے اس کا ذکر نہ کر سکا۔ یہی سوچا تھا کہ آپ جب زیبائش ٹیکسٹائل ملز سے واپس آئیں گے تو آپ کو سب کچھ بتا دوں گا لیکن پھر یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی اور جب دوبارہ یاد آیا تو آپ تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں جا چکے تھے.....!''

''سچ سچ بتاؤ، تم نے کل تانگے میں بیٹھ کر کتنے سموسے اور پکوڑے پیلے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیونکہ جب میں واپس آیا تو دونوں تھیلے خاصے ہلکے ہو چکے تھے؟''

''بس جی..... میں نے تھوڑے سے پکوڑے اور کوئی چھ سات سموسے ہی کھائے تھے.....'' وہ بڑی معصومیت سے بولا۔

''یہ ''بس جی'' نہیں بلکہ ''ٹرک جی'' ہے.....!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تلی ہوئی چیزیں زیادہ مقدار میں کھانے سے معدے پر بوجھ پڑتا ہے اور اس بوجھ کو ہٹانے کے لیے انسان کی عقل کھوپڑی میں سے نکل کر انسان کے معدے میں پہنچ جاتی ہے۔ جس کے بعد انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت خاصی ماند پڑ جاتی ہے اور یادداشت تو سمجھو..... لمبی تان کر سو جاتی ہے.....!''

''غلطی ہو گئی ملک صاحب!'' وہ عاجزانہ انداز میں بولا۔ ''آئندہ میں کھانے کے معاملے میں احتیاط برتوں گا۔''

''اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''کم سونا عبادت، کم بولنا حکمت اور کم کھانا صحت ہے..... یہ مولائے کائنات کا فرمان ہے اور مولا کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ درِ نایاب کی حیثیت کا حامل ہے۔ یاد رکھو..... کم کھانا انسان کھاتا ہے اور زیادہ کھانا انسان کو کھا جاتا ہے۔''

''سمجھ گیا جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کی نصیحت کو پلے باندھ لیا ہے ملک صاحب!''

''شاباش..... تو پھر شروع ہو جاؤ۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ تم کل رات مجھ سے ملاقات کے لیے کیوں مضطرب تھے؟''

''مجھے پینو کے بارے میں ایک خاص بات پتا چلی تھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''کل جب آپ مشتاق سائیکلوں والے کے گھر میں مصروف تھے تو میری فرید پراچہ سے ملاقات ہو گئی۔ فرید میرا پرانا دوست ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بائیس فروری کی دوپہر وہ مولوی کے کھوکھے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا تو لگ بھگ گیارہ بجے اس نے پینو کو جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑے دیکھا تھا.....''

''کچھ نیا بتاؤ.....'' میں نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ''یہ سب میں پہلے سے جانتا ہوں۔''

''آپ مجھے بات تو پوری کرنے دیں نا ملک صاحب.....'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ''میں آپ کو کچھ نیا ہی بتانے والا تھا۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس پر نگاہ جما دی اور کہا۔ ''میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔''

''تھوڑی ہی دیر کے بعد فرید پراچہ نے ماجد کو ''جنرل سراکس'' کے پہلو سے نکلتے دیکھا۔ ''جنید خان مجھے اپنی کارکردگی کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ''ماجد دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بڑے محتاط قدموں سے چلتے ہوئے پینو کے نزدیک پہنچ گیا۔ پینو نے اس وقت گرم چادر میں اپنے وجود کو اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ اسی چادر کے اندر سے پینو نے ایک چھوٹی سی گٹھری نکال کر ماجد کو تھمائی۔ ان کے درمیان مختصر سی گفتگو بھی ہوئی تھی جو ظاہر ہے فرید سن نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ان دونوں سے خاصے فاصلے پر مولوی کے کھوکھے کے اندر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ بس اس نے اتنا ہی دیکھا کہ ماجد اور پینو جی ٹی روڈ کے کنارے جنوب کی سمت پیدل ہی چل پڑے تھے.....''

مولوی کے کھوکھے سے جنوب کی جانب پہلا گاؤں کنگنی والا تھا اور اگر وہ لوگ کسی بس یا ویگن پر سوار ہو جاتے تو کہیں کے کہیں بھی پہنچ سکتے تھے۔ کیا انہوں نے گھر سے بھاگ کر کنگنی والا میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا تھا؟ میرے ذہن میں اچانک یہ سوال ابھرا لیکن اگلے ہی لمحے میرے ذہن نے اس سوال کی نفی کر دی کیونکہ چمن آباد اور کنگنی والا میں بہ مشکل دو فرلانگ (چار سو چالیس گز یا چوتھائی میل) کا فاصلہ حائل تھا اور اس نام نہاد ماجد نے پینو کو گھر سے بھگا لے جانے میں جتنی مضبوط منصوبہ بندی کی تھی اس کے تناظر میں، میں اس سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

کانسٹیبل جنید خان نے فرید پراچہ کے مشاہدے کے حوالے سے مجھے جو کچھ بتایا، اس میں میرے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کی معلومات میں اضافے کی غرض

سے کہا۔

''ہم سب جس بندے کو ماجد سمجھ رہے ہیں وہ کوئی اور ہے!''

''کیا مطلب ملک صاحب.....'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''میری اب تک کی تفتیش اور تحقیق کے مطابق اس چالباز شخص کا نام قدیر ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''قدیر کا تعلق بھی کبھی چک بیالیس شرقی سے رہا ہے اور وہ ماجد کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے اسی لیے اس نے بہ آسانی ماجد کا روپ دھار کر چمن آباد اور زیبائش ملز میں، سب کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور بالآخر پینو کو بھگا لے گیا۔ میں گزشتہ روز چک بیالیس شرقی میں اصلی ماجد سے مل کر آیا ہوں اور وہیں سے مجھے پتا چلا ہے کہ ہمیں جس بندے کی تلاش ہے، وہ قدیر کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔''

''ملک صاحب.....!'' میرے خاموش ہونے پر وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایسا تو صرف فلموں میں ہوتا دیکھا گیا ہے.....!''

''فلموں کے اسکرپٹ رائٹرز بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں جنید خان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ فلم کار جو کہانی رقم کرتا ہے، ویسا معاشرے میں کہیں نہ کہیں پیش آچکا ہوتا ہے اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ مصنف کی تحریر کے مطابق مستقبل قریب میں ویسا واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔''

جنید خان عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

ہمارے درمیان گفتگو کا یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اچانک کانسٹیبل شوکت علی میرے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

''ملک صاحب! کسی نے ماجد کو قتل کر دیا ہے۔ ادھر کھیتوں میں اس کی لاش پڑی ہے.....!''

☆☆☆

کانسٹیبل شوکت کی فراہم کردہ اطلاع نے میرے رگ وپے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی اور میں آناً فاناً جنید خان کے ساتھ ایک تانگے پر سوار ہو کر جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

مردِ مذکور کی بے حس و حرکت باڈی کھیتوں کے بیچوں بیچ پڑی تھی اور اس کے اردگرد درجن بھر افراد جمع تھے جو آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان سب کی نظر میں وہ اس تانا ماسٹر ماجد کی لاش تھی۔ جو سائیکلوں والے مشتاق کے گھر میں ایک کرائے دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھا اور زیبائش ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا تھا۔ چک بیالیس شرقی کے وسنیک اجتماعی طور پر یہ فتویٰ دے چکے تھے کہ وہ رمضان علی اور صفیہ کا اکلوتا بیٹا قدیر تھا۔ حقیقت کیا تھی، اس سے پردہ اٹھنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

میں نے اکڑوں بیٹھ کر اس بے سدھ پڑے شخص کے جسم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کی گردن پر مجھے ایسے آثار دکھائی دیے جیسے گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی ہو۔ میں نے معائنے کے سلسلے کو آگے بڑھایا اور اسی معائنے کے دوران میں جب میں نے اس کی بند آنکھوں کو کھول کر اندر نگاہ ڈالی تو میں چونک اٹھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں کہیں بھی موت کی سفاکی اور سرد مہری دکھائی نہیں دی۔ اس کے بجائے وہاں مجھے زندگی کی موہوم سی رمق نظر آئی۔ میں نے اس کے سینے پر کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکن کو محسوس کرنے کی کوشش کی تو وہاں بھی موت کے سناٹے سے میرا سابقہ نہیں پڑا۔ فوراً سے پیشتر میرے وجدان نے راہنمائی کرتے ہوئے مجھے بتایا..... یہ شخص ابھی زندگی کی قید سے آزاد نہیں ہوا.....!

یہ انتہائی سنسنی خیز احساس تھا اور ایسے مواقع پر میری چھٹی حس نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ میں کانسٹیبل کو اپنے ساتھ ایک طرف اتنے فاصلے پر لے گیا کہ وہاں پر موجود افراد ہماری باتیں نہ سن سکیں پھر میں نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''جنید! یہ سب لوگ اس بندے کو مُردہ سمجھ رہے ہیں۔ ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا کہ ان میں سے کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی شبہ ہو کہ یہ زندہ ہے ورنہ ہم اس موذی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی نہیں پا سکیں گے جس نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔''

''تت..... تو آپ..... یہ کہنا چاہ..... رہے ہیں کہ ماجد..... میرا مطلب ہے، قدیر..... زندہ ہے.....'' جنید خان نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میرا پیشہ ورانہ تجربہ تو اسی جانب اشارہ کر رہا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے مشاہدے نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا۔''

''پھر تو ہمیں فوری طور پر اس بندے کو اسپتال پہنچانا چاہیے تاکہ اسے فوری طبی امداد دی جا سکے۔'' جنید خان نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جب یہ ہوش میں آنے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرائے گا تو پینو کی پراسرار گمشدگی کا پردہ خود بخود چاک ہو جائے گا۔''

''ہم یہی کرنے والے ہیں مگر ان لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم اس بندے کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا رہے ہیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم ڈاکٹرز کو صورت حال سے آگاہ کر دینا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بھی اسپتال پہنچ رہا ہوں۔''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''تو آؤ، ہم کام سے لگ جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم دوبارہ اس بے ہوش شخص کے پاس آئے اور میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''سب سے پہلے ماجد کی لاش کو کس نے دیکھا تھا؟''

ایک ادھیڑ عمر دیہاتی مجمعے میں سے نکل کر میرے سامنے آ گیا اور بولا۔ ''تھانے دار صاحب! میرا نام رفیق ہے۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے تانا ماسٹر کو یہاں پڑے دیکھا۔ پھر میں نے آوازیں دے دے کر، لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ کھیتوں میں موجود، اپنے اپنے کام میں مصروف لوگ میری پکار پر فوراً چلے آئے۔ ہمیں یہ پتا چل چکا تھا کہ ماجد، مشتاق کی کڑی پینو کو بھگا لے گیا ہے اور پولیس ان دونوں کو بڑی شدومد سے تلاش کر رہی ہے اسی لیے ہم نے ایک بندے کو فوراً تھانے کی طرف دوڑایا اور اب آپ یہاں موجود ہیں۔''

''جنید خان!'' میں نے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''تم ماجد کی لاش کو تانگے میں ڈال کر فوراً اسپتال کی جانب روانہ ہو جاؤ۔ اس کا پوسٹ مارٹم بے حد ضروری ہے۔''

''جی ملک صاحب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''میں ابھی جا رہا ہوں۔ واپسی پر مجھے یہاں آنا ہے یا تھانے؟''

''تھانے!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں بھی موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد تھانے پہنچ رہا ہوں۔ باقی باتیں ادھر ہی ہوں گی۔''

''او کے سر!'' اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

میں نے دو افراد کو جنید خان کی مدد کرنے کے لیے کہا اور خود خانہ پُری کے لیے وہاں موجود لوگوں سے پوچھ تاچھ کا عمل جاری رکھا۔

''کسی نے ماجد کی لاش کو چھوا تو نہیں؟'' میں نے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

رفیق عرف لیکا نے جواب دیا۔ ''نہیں تھانے دار صاحب! میں نے جب سے ماجد کی لاش کو دریافت کیا ہے، ادھر ہی موقع پر موجود ہوں۔ کسی نے بھی لاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''ایک مرے ہوئے آدمی کے جسم کا تو خوف ہی بہت زیادہ ہوتا ہے تھانے دار صاحب۔'' اللہ رکھا نامی ایک شخص نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''اسے چھونے کی ہمت کون کرے گا۔''

جمیل نامی ایک بڈھے بابے نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''جیسی کرنی، ویسی بھرنی..... اس بدبخت نے مشتاقے کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کیا تھا۔ اس کا یہی حشر نشر ہونا تھا.....!''

''چاچا جمیل! تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجائی جا سکتی۔'' نواز تیلی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس کام میں مشتاقے کی کڑی بھی شامل تھی۔ ماجد اگر بدبخت ہے تو پینو بھی کسی منہ کالک سے کم نہیں۔ ماجد، پینو کو زبردستی اغوا کر کے نہیں لے گیا تھا بلکہ وہ اپنی رضامندی سے ماجد کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ ان دونوں نے مل کر مشتاقے اور خالدہ کی عزت کا فالودہ بنایا ہے.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بڑے کڑوے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''سیانے سچ کہہ گئے ہیں..... اولاد کو سونے کا نوالہ کھلاؤ مگر شیر کی نظر سے دیکھو۔ میں سمجھتا ہوں، یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں مشتاقا بھی برابر کا شریک ہے۔ اولاد کی محبت میں اتنا بھی اندھا نہیں ہو جانا چاہیے کہ انسان کو اس کے چھن بھی دکھائی نہ دیں۔ مشتاقے نے تو پینو کو بے لگام چھوڑا ہوا تھا۔''

''تم لوگ آپس کی بحث بازی بند کرو تو میں بھی تھوڑا سا کارِ سرکار کر کے اپنی روزی حلال کر لوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ یکدم خاموشی اختیار کر کے میری جانب متوجہ ہو گئے۔ اس دوران میں کانسٹیبل جنید بے ہوش بندے کو تانگے پر لاد کر..... ڈسٹرکٹ اسپتال روانہ ہو چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماجد اپنے اچھے یا برے انجام کو پہنچ چکا۔ تم میں سے کوئی جانتا ہے کہ ماجد کی موت میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟''

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی میرے اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ نواز تیلی نے بڑے تیکھے انداز میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں یہ تو نہیں جانتا کہ ماجد کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے البتہ اس بات کا مجھے یقین ہے کہ اس کی موت میں مشتاقے کا کوئی ہاتھ نہیں۔''

''اور تمہارے اس یقین کی وجہ؟'' میں نے نواز تیلی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ جناب..... اتنی جرأت دکھانے کے لیے انسان کا غیرت مند ہونا بہت ضروری ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اگر مشتاق کی عزت زندہ ہوتی تو معاملہ یہاں تک بڑھنا ہی نہیں تھا۔ ایک ایسے پردیسی کو اس نے اپنا کرائے دار بنا رکھا تھا جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور پینو کا بھی ماجد سے کھلم کھلا میل جول تھا۔ یہ چاند تو ایک دن چڑھنا ہی تھا سرکار.....!''

مشتاق سائیکلوں والا ان لوگوں میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی مشتاق کے غیاب میں نواز تیلی کچھ زیادہ ہی بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کے نکیلے اور زہر میں بجھے ہوئے جملوں سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اپنے دل میں مشتاق کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا۔ اس قسم کی باتیں تو پینو کی ماں خالدہ نے بھی مجھ سے کی تھیں کہ مشتاق کے بے جا لاڈ پیار نے پینو کا دماغ خراب کر رکھا تھا، وہ حد سے زیادہ ضدی، سرکش اور خودسر ہوگئی تھی لیکن نواز تیلی کا اندازِ تنقید مخاصمانہ تھا۔

''نواز.....'' میں نے اسے گھسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ماشاءاللہ! تمہارا تجربہ اور مشاہدہ خاصا وسیع ہے۔ تمہارے خیال میں پینو اس وقت کہاں ہوگی؟''

''مجھے کیا پتا جی.....؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''میں نے کب کہا کہ تم اس کے مقام سے واقف ہو۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تو تمہارا خیال جاننا چاہ رہا تھا۔''

''جناب! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ ماجد کی لاش چمن آباد کے کھیتوں میں پڑی ملی ہے۔'' وہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب یہی ہے کہ پچھلی رات ماجد کو ادھر ہی کہیں قتل کر کے اس کی لاش کو کھیتوں میں پھینک دیا گیا تھا اور..... پینو چونکہ ماجد کے ساتھ بھاگی تھی اس لیے اسے بھی چمن آباد یا اس کے آس پاس کہیں ہونا چاہیے.....''

''تمہاری بات میں وزن ہے نواز۔'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم قانون کے ساتھ تعاون کرو.....''

''کس قسم کا تعاون تھانے دار صاحب؟'' اس نے حیرت آمیز الجھن سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

میں نواز تیلی کو ایک طرف لے گیا۔ ''تم اپنے خیال کو ایک طرف رکھو اور ایک دو بندوں کو ساتھ رکھ کر چمن آباد اور اس کے گردونواح میں پینو کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔'' میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کام بہت ہوشیاری اور رازداری کے ساتھ کرنا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

''چنگی طراں سمجھ گیا تھانے دار صاحب!'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں کسی کو اس معاملے کی کانوں کان خبر نہیں ہونے دوں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''تمہاری اس خفیہ تحقیق کا جو بھی نتیجہ برآمد ہو، اس کی رپورٹ تم نے تھانے آ کر میرے سامنے پیش کرنا ہے۔''

''او کے سرکار!'' وہ بڑے اسٹائل سے بولا۔ ''میں آپ کی توقع پر پورا اترنے کی پوری کوشش کروں گا۔ انشاءاللہ.....!''

میں نے مزید دس منٹ جائے وقوعہ کی رسمی کارروائی میں گزارے پھر سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا۔ میں نے نواز تیلی کے ذمے جو کام لگایا تھا، اس کی اپنی جگہ ایک اہمیت تھی مگر ان لمحات میں میری نگاہ اس بے ہوش بندے پر ٹکی ہوئی تھی جسے میں نے کانسٹیبل جنید خان کی نگرانی میں بغرضِ علاج معالجہ کھیتوں سے اٹھوا کر ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوایا تھا۔ اگر اس بندے کی آنکھ اور زبان کھل جاتی تو اس کیس کے مختلف دروازوں پر لگے ہوئے تالے خود بخود کھل جاتے.....!

☆☆☆

ڈاکٹروں کی انتھک محنت و توجہ اور ادویہ کے جادو اثر عمل نے کام دکھایا اور سہ پہر چار بجے کے قریب اس بندے نے آنکھ کھول دی۔ لگ بھگ چھ بجے وہ بیان دینے کے قابل ہوگیا۔ اسے حالتِ بے ہوشی سے عالم ہوش میں لانے میں اسپتال کی کارکردگی کے علاوہ میری دعاؤں کا اثر بھی شامل تھا۔ اس کیس کو حل کرنے کے لیے ایک وہی شخص میری امید کا ذریعہ تھا۔

وہ بندہ قدیر ہی تھا۔ اس نے خود کو زمانے بھر کی نظروں سے چھپا کر رکھنے کے لیے اپنا علاقہ چھوڑنے کے ساتھ ہی ایک نقلی شخصیت بھی تخلیق کر لی تھی۔ اگرچہ ماجد نامی ایک انسان جیتا جاگتا چک بیالیس شرقی میں موجود تھا لیکن بہرحال وہ ماجد نہیں بلکہ قدیر سن آف رمضان علی تھا۔ قدیر

نے جو ابتدائی بیان دیا اس کا خلاصہ میں اسی کی زبانی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

''پینو مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور وہ بھی مجھ میں گہری دلچسپی لینے لگی تھی مگر یہ سوچ کر کہ میں نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچے کا باپ بھی ہوں، پینو نے مجھ سے ایک خاص فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ ہمارے بیچ تعلقات آگے بڑھتے رہے اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں پینو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا چنانچہ اس کی محبت سے مجبور ہو کر میں نے اسے اپنی اصلیت سے آگاہ کر دیا۔

''یہ سب سن کر پینو بہت خوش ہوئی اور وہ ہر حال میں مجھے اپنانے کے لیے تیار تھی لیکن اس کے ساتھ ہی پینو نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ اگر اس کے والدین کو پتا چلا کہ میں ماجد نہیں، قدیر ہوں اور میں نے انہیں اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا وہ سب جھوٹ ہے تو وہ شادی کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ایک اندیشہ پینو کو یہ بھی تھا کہ اگر اس کے ماں باپ نے چک بیالیس شرقی جا کر قدیر کے بارے میں کچھ پرتیت کی تو یہ راز چھپا نہیں رہ سکے گا کہ قدیر کی ماں دماغی مریضہ تھی اور اسی بیماری میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں چک بیالیس شرقی میں قدیر کی یعنی میری ریپوٹیشن بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ وہاں بسنے والا کوئی بھی آدمی میری حمایت میں زبان نہ کھولتا کیونکہ میں نے کبھی کسی سے بنا کر رکھی ہی نہیں تھی لہٰذا ہم دونوں نے مل کر یہی فیصلہ کیا کہ گھر سے بھاگ کر ہم کسی اور علاقے کی طرف نکل جاتے ہیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا یہ فیصلہ غلط تھا لیکن اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ سو، ہم نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک قدم اٹھا لیا مگر پھر سب کچھ الٹا ہو گیا.....''

''کیا الٹا ہو گیا؟'' میں نے سوال و جواب کا سیشن شروع کرتے ہوئے قدیر سے پوچھا۔

''ہم دونوں جی ٹی روڈ کے کنارے، بڑے مزے سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک کسی نے میرے عقب میں آ کر میرے منہ پر ایک کپڑا رکھ دیا۔'' اس نے بتایا۔ ''عقب میں ہونے کے باعث میں اس منحوس شخص کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ کوئی تنومند اور سخت جان شخص تھا جس نے اتنے زور سے میرے منہ پر کپڑا دبا رکھا تھا کہ مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کپڑے میں سے ایک عجیب سی ناگوار بدبو بھی آ رہی تھی۔

اس گینڈے نے مجھے زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ ان لمحات میں، میں پینو کے لیے بہت فکرمند تھا مگر میری بے بسی نے مجھے کچھ کرنے نہیں دیا اور میں دیکھتے ہی دیکھتے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا.....''

بولتے بولتے قدیر کی سانس پھول گئی اور وہ دھیرے دھیرے کھانسنے لگا۔ میں نے اسے پانی پلایا اور اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ جس دور کا واقعہ ہے اس زمانے میں گوجرانوالہ کے قلب سے گزرنے والی جی ٹی روڈ سنسان اور غیر آباد ہوا کرتی تھی۔ کہیں کہیں کوئی فیکٹری اور بیچ میں خالی پلاٹس یا پھر تا حدِ نگاہ سرسبز و شاداب کھیتوں کا لامحدود سلسلہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قدیر کو پیش آنے والے واقعے کا کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا۔

''جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک تاریک کمرے میں بے دست و پا پایا۔'' وہ خود پر ٹوٹنے والی بپتا کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میرے ہاتھ پاؤں اور کمر کو ایک چارپائی کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ پھر ایک موٹا تازہ، ننگ دھڑنگ، سیاہ بدن اور سرخ آنکھوں والا ٹھگنا سا بدشکل بندہ میرے پاس آیا اور اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خوف ناک انداز میں کہا۔

''میرا نام گلزار ہے۔ میں پینو کا عاشق ہوں۔ تمہاری یہ مجال کہ میری معشوقہ کو بھگا لے جاؤ۔ میں تمہارا حشر نشر کر کے رکھ دوں گا.....''

''پینو کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اس پر گلزار نامی کوئی جن عاشق ہے لیکن میں نے اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا لیکن گلزار کو اپنے سامنے دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ اس کے توے کے مانند سیاہ بدن پر صرف ایک لنگوٹ تھا اور اس کی سرخ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ میں اس کی غضب ناکی کو محسوس کر کے سہم گیا تھا تاہم پھر بھی میں نے جی کڑا کر کے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''گلزار بھائی! میری پینو کہاں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ..... آپ ہمارے درمیان سے ہٹ جائیں۔''

''میری منت سماجت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ طیش کے عالم میں بولا۔ ''بیچ میں، میں نہیں آیا بلکہ تم آئے ہو۔ میں تو بچپن ہی سے اس پر عاشق ہوں۔ وہ صرف اور صرف میری ہے۔ اگر تم دوبارہ اپنی زبان پر اس کا نام لائے تو میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔

شرافت کے ساتھ پینو سے دستبردار ہو جاؤ گے تو میں تمہیں اٹھا کر کسی دور دراز علاقے میں پھینک آؤں گا لیکن اگر تم اپنی ضد پر قائم رہے تو پھر اس کمرے سے تمہاری لاش ہی باہر جائے گی۔''

''تھانے دار صاحب! اگرچہ میں اس گلزار نامی جن سے ڈر گیا تھا لیکن پینو کی محبت نے مجھے بہت سہارا دیا اور میں نے گلزار کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا۔ وہ مجھے کھانے پینے کے لیے بہت کم دیتا تھا اور ہر بار آ کر ایک ہی بات کرتا تھا...... پینو کا خیال اپنے دل سے نکال دو، اگر تمہیں زندگی عزیز ہے تو......! جناب پینو کے بغیر تو میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، میں اس کے خیال سے کیسے باز آ جاتا۔ میں بھی ہر تکلیف اٹھا کر اپنی ضد پر قائم رہا پھر پچھلی رات جب گلزار میرے پاس آیا تو اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''تم کتے کی دم ہو۔ میں نے تمہیں جان بچانے کے لیے جو مہلت دی تھی وہ تم نے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ضائع کر دی۔ اب موت ہی تمہارا مقدر ہے...... مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ......!''

''پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبانے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور کمر چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی لہٰذا میں اس نامراد جن کے جبر کے سامنے کوئی مزاحمت نہ کر سکا اور وہ گلا دبا کر مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اسی دوران میں، میں کب ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا، مجھے کوئی خبر نہیں۔ ابھی اسپتال میں میری آنکھ کھلی ہے تو پتا چلا ہے کہ میں زندہ ہوں......''

''جب تک تم اس نام نہاد گلزار نامی جن کے قبضے میں رہے، پینو کہاں تھی؟'' اس کی داستان کے اختتام پر میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''میں پینو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''لیکن میں اس کے بارے میں سب کچھ جان گیا ہوں۔''

اس نے امید بھری نظر سے میری طرف دیکھا اور لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! خدا کے لیے میری پینو کو بچا لیں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

''پینو سب سے پہلے مشتاق اور خالدہ کی ہے۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''تم فی الحال ادھر اسپتال ہی میں آرام کرو۔ میں پینو کو بچانے جا رہا ہوں۔ تم سے میں بعد میں آ کر بات کرتا ہوں......''

وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کانسٹیبل جنید خان کی قدیر کے ساتھ ڈیوٹی لگائی، اسپتال کے عملے کو خصوصی ہدایات دیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔

☆☆☆

قدیر کی اسٹوری میں ''گلزار'' کی انٹری نے میرا کام آسان بنا دیا تھا۔ یہ فلیتہ نادر شاہ عرف شاہ جی ہی کا لگایا ہوا تھا کہ پینو پر گلزار نامی ایک جن عاشق ہے جس کو بھگانے کے لیے وہ پینو کو تین رات تک اس کے آستانے پر بلا کر کوئی خاص عمل کرنا چاہتا تھا۔ جب شاہ جی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اس نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا۔

میں نے اسی رات دو کانسٹیبل اور حوالدار فلک شیر کی مدد سے پیر فرتوت نادر شاہ کے آستانے پر چھاپا مارا اور شاہ جی کی ہوس کا شکار ہونے والی پینو کو زندہ سلامت برآمد کرا لیا۔ شاہ جی اور اس کے دستِ راست جلال کا میں نے جو حشر کیا اسے آپ تصور کی نگاہ سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ اس سارے قبیح کھیل میں جلال نے اپنے حلیے میں خاصی ڈراؤنی تبدیلی کر کے گلزار جن کا کردار ادا کیا تھا۔

میں نے پینو کو مشتاق سائیکلوں والے کے حوالے کرنے کے بعد سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اولاد سے لاڈ پیار ضرور کرو مگر اسے بے لگام نہ چھوڑو۔''

وہ شرمندگی کے بوجھ سے زمین میں گڑا چلا جا رہا تھا۔ جھکی ہوئی گردن کے ساتھ اس نے مریل سی آواز میں جواب دیا۔ ''جو آپ کا حکم......!''

''یہ بندہ قدیر برا انسان نہیں ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں سے جو غلطی ہوئی، اسے معاف کر دینا۔ یہ تمہارے لیے ایک مثالی داماد اور پینو کے لیے ایک اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ انہوں نے جو بھی کیا، وہ ایک دوسرے کی محبت میں کیا ہے، اگرچہ طریقۂ کار غلط تھا مگر ان کی محبت میں کوئی عیب نہیں ہے......!''

مشتاق کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ گردن اٹھا کر خاموش اور تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان آنسوؤں میں ندامت، خوشی، احسان مندی اور شکر کے رنگوں کی آمیزش تھی۔

میں نے اس کے آنسو پونچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نگاہ جما کر اسے تکتا رہا۔ ایسے جذباتی مناظر بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں......!

(تحریر: حُسام بٹ)

قاتل کون

نسرین اختر نینا

انسان کا ایمان بھی کیا چیز ہے... نہ کمزور پڑے تو سونے کے انبار دیکھ کر بھی ذرا نہیں ڈگمگاتا اور نیت خراب ہو جائے تو ذروں پر سب کچھ ہار جاتا ہے۔ وہ بھی عمر بھر کی وفاداریوں کا پابند تھا لیکن بدعہدی نے اسے وفاؤں کی تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا... ایسے میں اس کے قدم بہکے تو عجب کیا ہوا۔

مسیحا کا روپ دھارنے والے سکندل دوستوں کا رنگ ڈھنگ

ڈاکٹر عمران علی نے جب آخری مریض کو فارغ کیا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ مساجد سے ظہر کی اذانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں آج عمران اکیلا ہی تھا کلینک میں کیونکہ اس کا ڈسپنسر دو دن قبل چھٹی پر اپنے گاؤں جا چکا تھا۔ اس کی بہن کی شادی تھی اور وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر تھا۔ اپنی جگہ اس نے اپنے ایک دوست کو رکھوایا تھا مگر آج وہ بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا فون آیا تھا کہ اسے بخار ہے، اس لیے وہ نہیں آسکتا۔ ڈسپنسر کی غیر موجودگی کی وجہ سے ڈاکٹر عمران کو بے حد مشکل پیش آرہی تھی کیونکہ مریضوں کو باری باری چیک کرنا پھر انہیں دوائیں دینا اور کئی ایک کو ٹیکے وغیرہ لگانا۔ صبح نو بجے

سے ایک بجے تک مسلسل کام کرنے کی وجہ سے وہ تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ اس لیے گھر کے لیے نکلنے سے قبل اس نے سوچا کہ وہ کچھ دیر آرام کر لے۔ یوں بھی گرمی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کا گھر قریبی گاؤں میں تھا۔ آج کل وہ شہر ہی میں اپنے کلینک کے قریب نیا گھر بنوا رہا تھا تاکہ روز روز گاؤں جانے کی مشقت برداشت نہ کرنی پڑے۔ وہ کلینک آنے جانے کے لیے اپنا ویسپا اسکوٹر استعمال کرتا تھا۔ گاڑی تو تھی مگر اس کو بڑا بیٹا چلاتا تھا۔ اس نے پچھلے سال ہی میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا۔ دونوں لڑکیاں ایف اے اور بی اے میں زیرِ تعلیم تھیں۔ جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا شہر کے اسکول میں میٹرک میں تھا۔ بڑا بھائی بہنوں کو ان کے کالج اور بھائی کو اسکول چھوڑ کر اپنے کالج چلا جاتا تھا۔ واپسی پر البتہ وہ تینوں بھائی بہنیں وین پر گھر جاتے تھے کیونکہ بڑے بھائی کی کالج سے لیٹ چھٹی ہوتی تھی۔

عموماً ڈاکٹر عمران صبح ساڑھے نو بجے کلینک آجاتا تھا جبکہ ڈسپنسر اصغر پہلے ہی آکر صفائی وغیرہ کروالیتا۔ دس بجے تک مریض آنا شروع ہو جاتے تھے۔ ایک بجے عمران گھر واپس چلا جاتا۔ ڈسپنسر چونکہ دور سے آتا تھا، اس لیے وہ کلینک ہی میں رک جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ عموماً گھر سے لے کر آتا تھا۔ کبھی کبھی بازار سے بھی لے کر کھا لیتا تھا۔ وہ گزشتہ دس سال سے ڈاکٹر عمران کے کلینک میں کام کر رہا تھا۔ انتہائی قابلِ اعتماد اور محنتی شخص تھا۔ ڈاکٹر شام کو چھ بجے کلینک میں دوبارہ آتا تھا اور نو بجے تک مریضوں کو چیک کر کے گھر چلا جاتا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈسپنسر اصغر بھی اپنی موٹر سائیکل پر اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہو جاتا۔ اسے یہ موٹر سائیکل ڈاکٹر عمران نے قسطوں پر لے کر دی تھی اور اصغر ہر مہینے اپنی تنخواہ میں سے کچھ رقم کٹوا دیتا تھا۔ اس نے اپنی شادی کے لیے بھی ڈاکٹر سے آٹھ سال پہلے قرضہ لیا تھا جو ابھی تک نہیں اترا تھا۔ مگر عمران اس سے زیادہ اصرار بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دو بہنوں، بوڑھی ماں اور بیوی پر مشتمل کنبے کے اخراجات پورے کرنا۔ آسان نہیں تھا۔ اس لیے وہ گاہے بگاہے اس کی مدد بھی کرتا رہتا تھا۔ اصغر کے دو بھائی بڑے تھے مگر وہ مشکل سے اپنا ہی گزارہ کر سکتے تھے۔ والدہ اور بہنوں کی ذمے داری اصغر پر ہی تھی۔ ایک بہن کی شادی چار سال پہلے کر دی تھی۔ تب بھی عمران نے امداد کے طور پر اسے کافی رقم دی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے دوستوں سے بھی کہا تھا کہ وہ اس کے غریب ڈسپنسر کے لیے کچھ رقم مہیا کر دیں اور ان لوگوں نے رقم اکٹھی کر کے دے دی تھی جس سے آسانی سے اصغر نے بہن کی شادی کی ذمے داری پوری کر لی تھی۔

دوسری بہن کی شادی کے لیے بھی اصغر نے دوبارہ ڈاکٹر عمران کے آگے دستِ سوال دراز کیا تھا مگر اب حالات مختلف تھے۔ ایک تو اصغر ابھی تک موٹر سائیکل کے لیے لیا گیا قرضہ ہی نہیں ادا کر سکا تھا پھر عمران کے اپنے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے۔ اس کے بیٹے نے ایک پرائیویٹ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا کیونکہ انٹری ٹیسٹ میں اس کے نمبر اتنے نہیں آسکے تھے کہ اسے کسی سرکاری میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا۔ پرائیویٹ میڈیکل کالج کی فیس لاکھوں میں ادا کرنا پڑی تھی۔ اس کے علاوہ عمران اپنا گھر بھی بنوا رہا تھا پھر اس نے اپنی والدہ کے دل کا بائی پاس کروایا تھا جس میں بڑی رقم خرچ ہو گئی تھی۔ گھر بنانے کے لیے عمران نے ہاؤس بلڈنگ سے قرضہ لیا تھا۔ وہ اس کی قسطیں بھی ادا کر رہا تھا۔

اور سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اب اس کی پریکٹس بھی اتنی نہیں چل رہی تھی۔ اس کے کلینک کے قریب دو اور ڈاکٹروں نے بھی کلینک کھول لیے تھے۔ پھر ایک مشہور اور بڑے اسپتال میں پروفیسر کے عہدے پر کام کرنے والے ڈاکٹر نے اس علاقے میں اپنا پرائیویٹ اسپتال قائم کر لیا تھا اور یوں عمران کی آمدنی کافی کم ہو گئی تھی لیکن پھر بھی گزارہ چل رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اصغر کی ڈیمانڈ کے مطابق تو اسے رقم نہ دے سکا۔ البتہ تھوڑی بہت مدد اس کی کر ہی دی تھی اور وہ بظاہر اس پر خوش ہو گیا تھا اور چھٹی پر چلا گیا تھا تاکہ بہن کی شادی کے انتظامات کر سکے۔ اس نے اگرچہ ایک بندہ مہیا کر دیا تھا... مگر وہ کوئی زیادہ تجربہ کار نہیں تھا اور عمران کو پہلے دن اسے بہت زیادہ گائڈ کرنا پڑا تھا جبکہ دوسرے روز وہ چھٹی کر گیا تھا، اسی لیے عمران کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

عمران نے باتھ روم میں جا کر پہلے وضو کیا پھر کلینک میں نماز ادا کی اور آرام کرنے کی غرض سے ایک طرف پڑے صوفے پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی گہری نیند سو گیا۔ ادھر جب وہ ڈیڑھ دو بجے تک اپنے معمول کے مطابق گھر نہ پہنچا تو بیوی کو پریشانی تو محسوس ہوئی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اکثر جب مریضوں کا زیادہ رش ہوتا تھا تو وہ دوپہر کو گھر نہیں آتا تھا اور کلینک ہی میں ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھا لیتا تھا اور شام تک وہیں آرام کر لیتا تھا..... لیکن جب

رات کو دس بجے تک بھی وہ گھر نہ پہنچا تو سارے گھر والے پریشان ہو گئے۔ پہلے اگر کبھی وہ کلینک میں دوپہر کو رک جاتا تھا تو فون کر دیا کرتا مگر آج تو اس نے فون بھی نہیں کیا تھا۔ پھر رات کو عموماً ساڑھے نو بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا لیکن وہ ہنوز گھر نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس کی بیوی نے اپنے بڑے بیٹے احمر سے کہا۔

''احمر بیٹا تمہارے ابو ابھی تک گھر نہیں آئے۔ ان کا فون بھی بند جا رہا ہے۔ مجھے تو پریشانی محسوس ہو رہی ہے۔ اللہ خیر کرے۔ اتنی دیر تو انہوں نے کبھی نہیں کی۔ پھر دوپہر کو بھی گھر نہیں آئے۔ فون بھی نہیں کیا۔ میں نے کئی بار نہ صرف ان کے سیل فون پر ٹرائی کیا ہے بلکہ لینڈ لائن پر بھی کئی بار کوشش کی ہے مگر وہ فون اٹھا ہی نہیں رہے۔''

''اوہو امی..... ابو کوئی بچے تو ہیں نہیں جو گم ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے، کسی دوست سے ملنے چلے گئے ہوں۔ آ جائیں گے کچھ دیر تک۔ آپ بلاوجہ ہی پریشان ہو رہی ہیں۔'' احمر نے بے پروائی سے کہا۔

''نہیں احمر! ابو اتنی بے پروائی کا مظاہرہ کبھی نہیں کرتے۔ کم از کم فون ضرور کرتے ہیں۔ آج صبح نو بجے سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ امی بلاوجہ پریشان نہیں ہوتیں۔ تم عاطف کے ساتھ کلینک جاؤ اور پتا کرو ابو کا۔'' بڑی بہن نازش نے احمر کو سمجھایا تو وہ کچھ سنجیدہ ہوا۔

''چلو عاطف..... تیار ہو جاؤ۔ میں کمرے سے گاڑی کی چابی لے آؤں۔'' احمر نے چھوٹے بھائی عاطف سے کہا۔ کچھ دیر بعد دونوں بھائی شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب کلینک کے سامنے پہنچے تو اس پر کلوزڈ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ عمران کا اسکوٹر بھی باہر نہیں تھا۔

''شاید ابو کلینک بند کر کے گھر کے لیے نکل گئے ہیں۔'' احمر نے کہا۔ ''لیکن اگر وہ گھر کی جانب جا رہے ہوتے تو راستے میں ہمیں ضرور نظر آ جاتے۔''

ہمیشہ کے بے پروا عاطف نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو مگر دیکھو نا سڑکوں پر کس قدر رش تھا، ہو سکتا ہے ہمارا دھیان ہی ان کی طرف نہ گیا ہو۔''

احمر نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔''

عاطف نے ارد گرد کی دکانوں کی طرف دیکھ کر کہا جن میں سے بیشتر بند ہو چکی تھیں۔ پنڈی شہر کا یہ بازار شہر کے وسط میں تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ اس لیے اِکا دُکا دکانوں کے علاوہ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔

''بھائی! ہم کسی سے پوچھتے ہیں کہ ابو کب کلینک بند کر کے گئے تھے..... پہلے تو اصغر یہاں رہتا تھا۔ وہ بھی آج چھٹی پر ہے۔ ورنہ تو مسئلہ ہی نہ ہوتا۔'' عاطف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کس سے پوچھیں؟ آس پاس کی ساری دکانیں بند ہیں، دور دراز والوں کو کیا پتا ہو گا وہ کہاں کسی کے آنے جانے پر دھیان دے سکتے ہیں۔'' احمر نے متفکر لہجے میں کہا۔

''چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا۔'' عاطف نے اسٹریٹ لائٹ کی ملگجی سی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

''بھائی! امی کی کال آ رہی ہے۔'' عاطف نے اپنا موبائل احمر کی جانب بڑھا دیا۔

''ہیلو امی.....؟'' احمر نے فون ریسیو کر کے کہا۔

''نہیں..... امی! پاپا تو نہیں ملے۔ ہم ان کے کلینک کے سامنے ہی کھڑے ہیں۔ کلینک تو بند ہے۔ ہو سکتا ہے گھر کے لیے نکل گئے ہوں۔ جیسے ہی وہ گھر پہنچیں، آپ ہمیں بتا دیجیے گا۔ ہم تب تک یہیں چوکیدار سے معلوم کرتے ہیں کہ وہ کب یہاں سے گئے تھے۔'' احمر نے کہا اور پھر کال منقطع کر دی۔

''آؤ عاطف، چوکیدار کو تلاش کرتے ہیں۔ وہی صحیح بتا سکتا ہے۔'' پھر دونوں بھائی بازار میں گھوم پھر کر چوکیدار کو ڈھونڈنے لگے۔ وہ انہیں کچھ فاصلے پر ایک دکان کے تھڑے پر کچھ افراد کے ساتھ بیٹھا نظر آ گیا۔

''اللہ دتہ چاچا..... آپ یہاں کب سے بیٹھے ہیں؟'' احمر نے قریب جا کر چوکیدار سے پوچھا۔

''تھوڑی دیر ہوئی ہے۔ کیا بات ہے پتر..... کوئی کام تھا کیا؟'' اللہ دتہ چوکیدار جو احمر کو پہچانتا تھا، اپنی جگہ سے اٹھ کر دونوں بھائیوں کی طرف آ گیا تھا اور احمر کے استفسار پر کہنے لگا۔

''وہ..... میں نے پوچھنا تھا کہ ابو یعنی ڈاکٹر عمران کب کلینک بند کر کے یہاں سے گئے ہیں؟'' احمر نے چوکیدار سے پوچھا۔

''کلینک تو میں جب آیا تھا، تب بند ہی تھا۔ دن کی ڈیوٹی والا چوکیدار پہلے ہی جا چکا تھا۔'' اللہ دتہ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، چاچا..... آپ کا شکریہ۔'' یہ کہہ کر احمر واپس کلینک کی جانب روانہ ہو گیا۔ عاطف بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی چل رہا تھا۔ اب دونوں بھائی قدرے پریشان ہو رہے تھے۔ کلینک میں نئے آنے والے ڈسپنسر کا ایڈریس اور فون نمبر بھی انہیں معلوم نہیں تھا۔ ورنہ اس سے ہی پتا کر لیتے۔

''ابو کہیں دوائیاں وغیرہ لینے اسلام آباد نہ چلے گئے ہوں۔ اکثر ہی جاتے رہتے ہیں۔'' عاطف نے کچھ سوچ کر کہا۔

''اگر وہ اسلام آباد جاتے تو کم از کم بتا کر تو ضرور جاتے۔ ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ چپکے سے نکل گئے ہوں۔ خیر رزاق ماموں کو فون کر کے پتا کر لیتے ہیں کیونکہ ابو جب بھی اسلام آباد جاتے ہیں، انہی کے ہاں ٹھہرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر احمر نے اسلام آباد میں مقیم اپنے ماموں سے رابطہ کیا۔

''ہیلو ماموں! میں احمر بات کر رہا ہوں۔''

''خیریت بیٹے؟'' دوسری طرف سے رزاق ماموں نے پوچھا۔

''جی ماموں خیریت ہی ہے۔ وہ دراصل ابو صبح سے نکلے ابھی تک گھر نہیں پہنچے۔ میں اور عاطف کچھ دیر پہلے ہی ان کے کلینک پر آئے۔ وہ یہاں پر بھی نہیں، شام سے ہی کلینک بند ہے۔ چونکہ وہ اسلام آباد بھی اکثر چلے جاتے ہیں تو میں نے سوچا کہ آپ سے پوچھ لوں... کہیں آپ کی طرف تو نہیں آئے۔'' احمر نے تفصیل سے ماموں کو بتایا۔

''نن..... نہیں احمر بیٹا..... میرے ہاں تو نہیں آئے بلکہ دو تین دن سے ان کا فون بھی نہیں آیا۔ شاید کسی دوست سے ملنے نہ چلے گئے ہوں۔ ویسے پچھلے ہفتے وہ لاہور جانے کا بھی کہہ رہے تھے۔''

''لیکن ماموں! اگر وہ لاہور جاتے تو بتا کر جاتے۔ پھر ان کا اسکوٹر بھی نہیں ہے۔ اب انہوں نے اسکوٹر پر تو نہیں جانا تھا نا۔'' احمر نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ہاں، یہ بات تو ہے۔ خیر فکر نہ کرو۔ آج نہیں تو کل گھر آجائیں گے۔ بعض اوقات کسی ضروری کام سے کہیں جاتے ہوئے بندے کے ذہن میں گھر میں بتانا یاد نہیں رہتا۔'' رزاق نے احمر کو سمجھایا اور پھر دو چار مزید اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔ احمر نے مزید کچھ رشتے داروں اور عمران کے قریبی دوستوں کو فون کیا مگر کسی نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس دوران بارہ بج چکے تھے۔

''بھائی! گھر چلو۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ انشاء اللہ ابو گھر آجائیں گے۔ کبھی کسی مریض کو دیکھنے آس پاس کے دیہاتوں میں بھی چلے جاتے ہیں۔ کئی بار دو دو دن بعد گھر واپس آتے تھے۔'' عاطف نے کہا تو احمر بولا۔

''ہاں یار! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کل تک انتظار کر لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ فاصلے پر پارک کی گئی گاڑی کی جانب بڑھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ عاطف بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی ریورس کرنے کے بعد اس نے مین روڈ پر ڈال دی۔

جب دونوں گھر پہنچے تو ماں اور بہنیں بے چینی سے ان کی منتظر تھیں۔ احمر نے پوری بات بتا کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اطمینان تو کسی کو بھی نہ تھا، سارے گھر میں عجیب سی پریشانی کا سماں تھا..... مگر پھر بھی امید تھی کہ شاید صبح تک ان کی خیر خبر مل جائے۔ یونہی امید وبیم کی کیفیت میں رات گزر گئی۔ صبح معمول کے مطابق بچے تیار ہو کر اپنے اپنے تعلیمی اداروں کی جانب روانہ ہوگئے اور نرگس بھی بظاہر تو گھر کے کام کاج میں مصروف تھی مگر اس کا دھیان فون کی گھنٹی کی جانب ہی لگا ہوا تھا۔ وہ خود بھی بار بار عمران کے فون پر بیل دیتی مگر دوسری طرف سے خاموشی تھی۔ کلینک کی لینڈ لائن پر بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔

دوپہر تک دونوں لڑکیاں اور عاطف تو گھر واپس آگئے۔ البتہ احمر کالج سے فارغ ہو کر دوبارہ کلینک کی جانب چلا گیا۔ کلینک ہنوز بند تھا۔ البتہ دن کی ڈیوٹی والا چوکیدار مقصود ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ مضبوط تن وتوش کا نوجوان تھا۔ احمر سے کئی بار اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر عمران اکثر اس کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ مقصود کو دیکھ کر احمر اس کی جانب گیا تو وہ بھی ہوٹل سے باہر آگیا۔

''السلام علیکم مقصود بھائی! کیسے ہیں آپ؟'' احمر نے اس سے کہا۔

''وعلیکم السلام احمر بابو! میں ٹھیک ہوں۔ کہو کیسے آنا ہوا؟''

''تم نے ابو کو کب دیکھا تھا؟ کل صبح.....'' احمر نے مقصود کے سوال کو نظر انداز کر کے اپنا سوال داغ دیا۔

''کل تو میں آیا ہی لیٹ تھا۔ دراصل میرے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں اسپتال لے کر گیا تھا پھر انہیں گھر چھوڑ کر دو بجے تک جب یہاں آیا تو ڈاکٹر صاحب کا کلینک بند تھا پھر شام کو ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے پر گھر چلا گیا تھا۔ اس لیے میں کل ڈاکٹر صاحب سے نہیں مل سکا۔'' مقصود نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے مقصود بھائی! شکریہ آپ کا۔'' یہ کہہ کر احمر اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔

''ایک منٹ رکو احمر بابو۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''وہ..... وہ..... دراصل.....'' ایک لمحے کے لیے احمر ہچکچایا۔ اس پر مقصود جلدی سے بولا۔

''ہاں..... ہاں کہو..... رک کیوں گئے؟''
''ابو کل رات سے گھر نہیں پہنچے۔ کلینک بھی بند ہے ان کا..... اور اسکوٹر بھی نہیں ہے یہاں۔''
''اوہ..... اچھا..... شاید کسی رشتے دار کے ہاں چلے گئے ہوں۔'' مقصود نے کہا۔
''سب سے پتا کروایا ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں گئے۔'' احمر نے پریشان کن لہجے میں کہا۔
''اور ان کے ڈسپنسر سے معلوم کیا؟''
''وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔''
''اور دوسرا؟ کیونکہ جب وہ چھٹی کرتا تھا تو اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دیا کرتا تھا۔'' مقصود نے استفسار کیا۔
''مجھے نہیں علم ہے کہ کوئی اور ڈسپنسر آیا تھا یا نہیں۔'' احمر نے کہا۔
''پھر تو یہ بہت تشویش ناک بات ہے۔ یوں کیسے ڈاکٹر صاحب غائب ہو سکتے ہیں۔ وہ تو آندھی ہو یا طوفان، باقاعدگی سے دونوں ٹائم کلینک پر آتے تھے۔ میرا خیال ہے، احمر بابو! آپ دوسرے ڈاکٹروں کے کلینکس پر پتا کریں۔'' مقصود نے مشورہ دیا۔
''مگر اس وقت تو سارے کلینک بند ہیں، اب تو وہ شام ہی کو کھلیں گے۔'' احمر اب کافی پریشان ہو چکا تھا۔ نرگس بھی کئی بار فون کر کے پوچھ چکی تھی۔

ڈاکٹر عمران محنتی اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان اور شفیق باپ بھی تھا۔ وہ انتہائی محنت سے اپنے بچوں کے لیے رزقِ حلال کما رہا تھا۔ اس کی ایک خواہش تھی کہ اس کے بچے کامیاب اور اچھے انسان بنیں اور معاشرے کے لیے بوجھ بننے کے بجائے مفید ثابت ہوں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اچھی زندگی بسر کریں۔ اس نے خود بھی گھر کے نامساعد حالات کے باوجود بڑی انتھک جدوجہد کر کے یہ مقام حاصل کیا تھا۔ وہ دو ہی بھائی تھے۔ بڑا بھائی بی اے کے بعد اپنا کاروبار کر رہا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے اور سبھی حصولِ علم میں مصروف تھے۔ چند ماہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسے کینسر تھا اور باوجود علاج کے وہ جانبر نہیں ہو سکا تھا۔ والد کئی برس قبل ہی انتقال کر چکے تھے۔ والدہ بوڑھی اور بیمار تھیں۔ وہ بڑے بیٹے کے گھر ہی میں رہتی تھیں۔ باپ کے انتقال کے بعد دوسرے بیٹے نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر والد کا ہول سیل کاروبار سنبھال لیا تھا تاکہ گھر کی گاڑی چل سکے اور دوسرے دونوں بھائی اپنی تعلیم مکمل کر سکیں۔

عمران اپنے بھتیجوں کی سرپرستی کے ساتھ ان کی مالی مدد بھی کرتا تھا تاکہ ان کا کاروبار اچھی طرح سیٹ ہو جائے جو والد کی طویل اور جان لیوا بیماری کی وجہ سے کافی خسارے میں جا رہا تھا۔ عمران کی بڑی بیٹی نازش کا رشتہ بڑے بھتیجے اکرام سے طے ہو چکا تھا۔ اکرام بی فارمیسی کے فائنل سمسٹر میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہ بھی عمران کی طرح ذہین اور محنتی تھا اور عمران کو یقین تھا کہ وہ تعلیم مکمل کر کے اپنے شعبے میں بے حد ترقی کرے گا اور اس کی بیٹی ایک پُرسکون اور خوشگوار زندگی بسر کرے گی۔ ایک چاہنے والے باپ کی حیثیت سے عمران کی سوچوں کا مرکز ہر لمحہ اس کے بچے ہی ہوتے تھے۔ اگرچہ وہ اپنی ماں کا بھی خیال رکھتا تھا۔ ہر روز ملنے جاتا۔ ماں کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم اسے ہر ماہ دیتا تھا۔ بڑا بھائی اس پر ناراض ہوتا تو وہ مسکرا کر کہتا۔
''بھائی جان! میں بھی اماں ہی کا بیٹا ہوں اور ان کی خدمت کرنا مجھ پر بھی واجب ہے۔'' اس پر بھائی خاموش ہو جاتا۔

لاڈلے بیٹے کے انتقال اور خطرناک بیماری نے ماں جی کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ ہر وقت بیٹے کو یاد کر کے روتی رہتیں۔ ایسے میں دونوں بہوئیں، پوتے اور پوتیاں ان کی دلجوئی کی کوشش کرتے .... مگر ان کی بے قرار روح کو کسی پل قرار نہیں آتا تھا۔

غرضیکہ عمران دونوں خاندانوں کے لیے سہارا تھا اور وہ احسن طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ زندگی بڑے سہل اور پُرسکون انداز میں بسر ہو رہی تھی۔ بچے وقت پر اپنے تعلیمی اداروں میں چلے جاتے۔ گھر آ کر لڑکیاں ماں کے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں پھر اپنی پڑھائی میں مصروف ہو جاتیں۔ لڑکے واپس آ کر کچھ دیر ٹی وی دیکھتے پھر گھر کے قریب گراؤنڈ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتے اور پھر اسٹڈی کرنے لگتے۔ باپ کے رات کو گھر آنے پر سارے گھر والے مل کر کھانا کھاتے۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے آپس میں خوش گپیاں کرتے۔ اپنی دن بھر کی مصروفیات کا ذکر کرتے اور پھر سو جاتے۔ اگلے دن کے لیے تازہ دم ہونے کے لیے گھر کے سارے افراد پابندی سے نماز ادا کرتے۔ تلاوت کلام بھی سبھی ترجمے کے ساتھ کرتے اور یوں اچانک ہی ان کی روٹین درہم برہم ہو گئی تھی۔ ان کا پیارا باپ ایسے غائب ہو گیا تھا جیسے اسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان۔ کافی دیر تک احمر وہیں ٹھہر کر دوسرے ڈاکٹرز کے کلینک کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ مقررہ وقت پر پہلے ان کلینکس

کے چوکیدار اور ڈسپنسرز آئے تو احمر بے تابی سے ان کی جانب بڑھا اور اپنے والد کے بارے میں استفسار کیا۔ سبھی نے یہی بتایا کہ پرسوں ایک بجے تک انہوں نے کلینک کھلا دیکھا تھا اور ڈاکٹر عمران کا اسکوٹر بھی باہر کھڑا تھا۔ اس کے بعد کلینک پر کلوزڈ کا بورڈ ہی لگا دیکھا اور اسکوٹر بھی دوبارہ نہیں دیکھا اور ڈاکٹر عمران سے بھی پرسوں صبح ہی ان کی علیک سلیک ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عمران کے کلینک پر آنے والے مستقل مریضوں میں سے بھی کئی آئے اور کچھ نئے بھی مگر کلینک بند دیکھ کر دوسرے ڈاکٹرز کے کلینکس کی جانب چلے گئے..... کچھ مریضوں سے بھی احمر نے پوچھا مگر کسی نے بھی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

"میرا خیال ہے احمر بیٹا کہ آپ کلینک کھول لو تاکہ مریض تو آئیں نا اور شاید ان میں سے کوئی اس دن بھی آیا ہو۔ اس طرح کچھ سن گن مل جائے گی۔" شام کے چوکیدار نے احمر کو کلینک کے سامنے مایوس اور دل گرفتہ کھڑے دیکھ کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"مگر چاچا! میرے پاس تو کلینک کی چابی ہی نہیں ہے۔ ایک چابی ابو کے پاس ہوتی تھی، دوسری ڈسپنسر کے پاس۔" احمر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ مشکل ہی سے اپنے آنسو ضبط کر پا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔ وہ لوگ تو کبھی ایک دن کے لیے بھی اس طرح باپ سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ کہاں اب وہ دو دن سے غائب تھا۔ احمر کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بوڑھی دادی کو کیا بتائیں گے۔ وہ تو کئی بار فون کر کے پوچھ چکی تھیں کہ عمران ان سے ملنے کیوں نہیں آ رہا اور نرگس بہانہ بنا دیتی تھی... وہ اپنے ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہیں۔ اس پر ماں تڑپ کر کہتی۔

"شہر سے باہر جاتے ہوئے مجھ سے مل کر تو جاتا۔ کم از کم فون ہی کر دیتا۔" اور جواب میں نرگس چپ ہو جاتی۔ وہ کیا کہتی کہ وہ تو اپنے بچوں کو بھی بتائے بغیر جانے کہاں روپوش ہو گیا ہے کہ کوئی سراغ بھی نہیں چھوڑ کر گیا۔

شام کو سات بجے تک احمر مایوس ہو کر گھر لوٹ آیا۔ ماں اور بھائی بہنوں کے اداس ستے ہوئے چہرے دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ ماں کی سوجی سوجی سرخ آنکھیں دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ شاید وہ روتی رہی ہے۔ نہ احمر سے کسی نے کچھ پوچھا نہ ہی اس نے کوئی بات کی۔ کرنے، کہنے اور پوچھنے کو تھا ہی کیا۔ غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور بیڈ پر لیٹ کر ساری صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔

اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنے پیارے والد کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ ساری رات سوتے جاگتے ہی بسر ہوئی اور جب کچھ دیر کے لیے آنکھ لگتی تو پریشان کن سوچیں نیند اچاٹ کر دیتیں۔ یہی کیفیت گھر کے دیگر افراد کی بھی تھی۔ کسی نے رات کو کھانا کھایا تھا نہ ہی کوئی سویا تھا۔ صبح مشکل سے ہلکا پھلکا ناشتا کر کے احمر اور عاطف گھر سے نکل گئے۔ دونوں بہنیں بھی کالج نہیں گئیں، کسی انہونی کا خیال انہیں پریشان کیے دے رہا تھا۔

کلینک پہنچ کر احمر نے ایک چابی بنانے والے کو بلایا۔ اس نے تالے کو چیک کر کے چابی کا ناپ لیا اور ایک گھنٹے تک چابی بنا کر لے آیا۔

احمر اور عاطف کلینک کھول کر دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ یہ کلینک دو بڑی بڑی دکانوں پر مشتمل تھا۔ ایک سائڈ پر معائنے کے لیے ڈاکٹر کا کمرا بنایا گیا تھا۔ جس کے آگے پردہ پڑا تھا۔ گلاس ڈور بھی لگایا گیا تھا تاکہ ڈاکٹر اطمینان سے مریضوں کو چیک کر سکے۔ دائیں طرف کے کونے پر دواؤں کا کاؤنٹر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسٹور تھا جبکہ باقی حصے میں کرسیاں رکھ کر مریضوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

اسٹور میں دواؤں کے خالی پیکنگ والے ڈبے اور دوسرا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے کمرے کے ساتھ ہی چھوٹا سا اٹیچڈ باتھ روم تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ ڈاکٹر کی کرسی تھی۔ اس کے سامنے گلاس ٹاپ ٹیبل پر ڈاکٹر کا بریف کیس اور اسٹیتھو اسکوپ پڑے تھے۔ ایک لینڈ لائن فون بھی تھا اور بلڈ پریشر چیک کرنے والا آلہ گرے کلر کے باکس میں بند تھا۔ غرضیکہ ہر چیز اسی طرح اچھے طریقے سے سیٹ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی کوئی کمرے کو ڈاکٹر کی آمد سے پہلے صاف کر کے گیا ہے۔

احمر نے لینڈ لائن فون کا ریسیور اٹھا کر اپنا موبائل نمبر ڈائل کیا تو کال کنیکٹ نہیں ہوئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ پچھلے دنوں کی بارشوں کے باعث لینڈ لائن فون ڈیڈ ہو گیا تھا اور عمران نے ان سب کو تاکید کی تھی کہ جب تک فون ٹھیک نہیں ہو جاتا وہ لوگ اس سے موبائل ہی پر رابطہ کر لیا کریں۔ ٹیبل پر پڑی ایک پلاسٹک کی باسکٹ میں ایک چھوٹی سی ڈائری تھی جس پر ڈاکٹر عمران مریضوں اور دوسرے لوگوں کے فون نمبر لکھ لیتا تھا کیونکہ ہر نمبر موبائل میں وہ فیڈ نہیں کرتا تھا۔ احمر نے ڈائری دیکھی تو اس میں ڈسپنسر اصغر کا سیل نمبر درج

تھا۔ احمر نے جلدی سے اپنے فون پر اصغر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کچھ دیر بیل ہونے کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

''ہیلو السلام علیکم اصغر بھائی! میں احمر بات کر رہا ہوں۔'' احمر نے جلدی سے کہا۔

اصغر نے کہا۔ ''وعلیکم السلام احمر بھائی! کیسے ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' احمر نے جواب دیا۔

''کیسے فون کیا؟ سب خیریت ہے نا؟'' اصغر نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

''اصغر بھائی! خیریت ہی تو نہیں ہے۔'' احمر نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''ک..... کک..... کیوں؟ کیا ہوا؟'' اصغر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''وہ..... وہ.....'' یہ کہہ کر احمر رک گیا۔

''ہاں..... ہاں..... کہو..... کیا بات ہے؟'' اصغر نے پوچھا۔

احمر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرح اپنے باپ کی گمشدگی کی بات کرے۔ بالآخر دل کڑا کر کے بولا۔ ''اصغر بھائی ابو..... دو دن سے غائب ہیں۔ نہ ہی کلینک آ رہے ہیں۔ نہ ہی گھر پہنچے ہیں۔''

''ہیں..... یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ..... کہاں..... جا سکتے ہیں؟ میں تین دن پہلے ہی تو چھٹی لے کر آیا ہوں۔ اپنی جگہ بندہ بھی لگوایا تھا کلینک میں تاکہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ کہیں آؤٹ آف سٹی تو نہیں چلے گئے؟''

''نہیں اصغر بھائی! سب جگہ پتا کروایا ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں گئے اور یہاں کلینک میں بھی پرسوں ایک بجے کے بعد سے نہیں آئے۔ ان کا اسکوٹر بھی غائب ہے، البتہ بریف کیس ان کی ٹیبل ہی پر پڑا ہے۔'' احمر نے تفصیل سے ساری بات بتائی۔

''ارشاد احمد..... میرا مطلب ہے کہ نیا ڈسپنسر کہاں ہے؟ کیا وہ آ رہا ہے کام پر؟'' اصغر نے پوچھا۔

''میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میں آپ کو اسی لیے فون کر رہا ہوں کہ آپ مجھے اس کا فون نمبر اور ایڈریس دے دیں تاکہ میں اس سے رابطہ کر کے اس سے پوچھ سکوں کہ وہ دو دن سے کیوں نہیں آ رہا کیونکہ کلینک کی ایک چابی تو اسی کے پاس ہوتی ہے نا۔''

''اچھا..... اچھا، میں اس کا فون نمبر سینڈ کر رہا ہوں اور آپ مجھ سے رابطے میں رہیے اور جیسے ہی ڈاکٹر صاحب کا پتا چلے، مجھے فوراً اطلاع دیجیے گا۔ دراصل میں یہاں شادی کے انتظامات میں اس بری طرح پھنسا ہوا ہوں کہ یہاں سے نکل ہی نہیں سکتا۔ ورنہ میں فوراً آ جاتا۔ بہرحال آپ ارشاد سے رابطہ کر کے اسے کلینک آنے کو کہیں۔ میں بھی اسے فون کرتا ہوں۔ سخت غیر ذمے دار بندہ ہے وہ۔'' پھر چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اصغر نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''بھائی! میرا خیال ہے ہمیں پولیس میں رپورٹ لکھوا دینی چاہیے۔ ہم اپنے طور پر دو روز سے ابو کو ڈھونڈ رہے ہیں مگر تاحال کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ ایسا نہ ہو کہ اغوا برائے تاوان والوں نے انہیں اغوا کر لیا ہو۔'' عاطف جو فیس بک پر اغوا کی وارداتوں کے بارے میں کئی پوسٹیں پڑھ چکا تھا، کہنے لگا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔'' یہ کہہ کر احمر نے موبائل پر ون فائیو والوں کو کال کی تو ان کی ایک موبائل ٹیم جو آس پاس ہی تھی، چند منٹ ہی میں پہنچ گئی۔

ایک سب انسپکٹر اور دو دیگر افراد پر مشتمل ٹیم کو احمر نے نہایت تفصیل سے ساری بات بتائی۔ اس دوران ڈسپنسر ارشاد احمد بھی آ چکا تھا۔ چونکہ جس دن ڈاکٹر عمران غائب ہوا تھا، اس روز وہ چھٹی پر تھا اس لیے وہ کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ پولیس والوں نے اصغر کو بھی فون کر کے ساری معلومات لیں اور پھر انہوں نے احمر کو ہدایت کی کہ وہ قریبی تھانے جا کر اپنے والد کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دے اور پھر وہ اچھی طرح کلینک کا معائنہ کر کے چلے گئے۔ احمر نے پہلے اپنے ایک دوست کو فون کیا۔ اس کا بڑا بھائی ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا اور کچھ ماہ پہلے ہاؤس جاب مکمل کیا تھا اور ابھی تک اسے جاب نہیں ملی تھی۔ ایک سرکاری اسپتال میں بغیر تنخواہ کے کام کر رہا تھا۔ شام کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں معمولی تنخواہ پر بھی ملازمت کر رہا تھا۔ دراصل احمر چاہتا تھا کہ والد کی غیر موجودگی میں کم از کم کلینک کھلا رہے۔ وہ خود تو ابھی سیکنڈ ایئر میں زیر تعلیم تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں تو کوئی باقاعدہ ڈاکٹر ہی کام کر سکتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس کے دوست ناصر کا بھائی ڈاکٹر عابد مغل ہی مناسب تھا۔ ناصر نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بھائی سے بات کر کے اسے بتا دے گا۔

کلینک کو کھلا دیکھ کر بہت سے مستقل آنے والے مریض آنے لگے۔ معمولی کھانسی، نزلہ، زکام اور بخار کے مریضوں کو ارشاد احمد نے چیک کر کے مناسب دوائیں دے دیں اور مریضوں کو بتایا کہ ڈاکٹر عمران جب تک نہیں آ جاتے، تب تک ایک نئے ڈاکٹر کل سے کلینک میں آیا کریں گے۔ اس پر مریض مطمئن ہو گئے۔ کسی مریض نے بھی ڈاکٹر عمران کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتائی۔

دو دن پہلے آنے والوں میں سے تین چار ہی دوبارہ آئے تھے کیونکہ ڈاکٹر نے انہیں دو دن کی دوا دی تھی اور پھر دوبارہ چیک اپ کے لیے آنے کو کہا تھا۔ وہ لوگ گیارہ بجے تک ڈاکٹر سے معائنہ کروا کر چلے گئے تھے۔ یوں بھی احمر نے ارشاد کو سمجھا دیا تھا کہ وہ مریضوں سے ڈاکٹر عمران کے غائب ہوجانے کا تذکرہ نہ کرے کیونکہ اس طرح وہ لوگ گھبرا کر آنا ہی نہ چھوڑ دیں جبکہ وہ دوسرے ڈاکٹر کا بندوبست کرنے جارہے تھے تاکہ مریض پہلے کی طرح آتے رہیں اور بددل ہوکر دوسرے کلینکس کی طرف نہ چلے جائیں۔

اس دوران میں عاطف اور احمر تھانے جاکر ڈاکٹر عمران کی گمشدگی کے بارے میں رپورٹ بھی درج کروا آئے تھے۔ ایک بجے کلینک بند کر کے گھر جانے سے پہلے احمر نے ارشاد کو تاکید کی تھی کہ شام کو مقررہ وقت پر آکر وہ کلینک لازمی کھول لے۔ وہ اور عاطف بھی آجائیں گے اور شاید نیا ڈاکٹر بھی آجائے۔

گھر پہنچ کر احمر نے نرگس کو ساری کارکردگی کی رپورٹ دی اور وہ بے چاری خاموش ہوگئی۔ اب تو دعائیں ہی آسرا تھیں کہ عمران کہیں سے خود ہی آجائے۔ ورنہ اپنے بس میں جو کوششیں ممکن تھیں، وہ لوگ کر چکے تھے۔ نرگس جاکر ساس کو بھی۔۔ دلاسا دے آئی تھی کہ وہ فکر نہ کریں، جلد ہی عمران گھر واپس آجائے گا مگر جانے والا نہیں آیا۔ منتظر نگاہیں اس کی راہ تکتے تکتے پتھرا چکی تھیں۔ بوڑھی ماں ایک بیٹے کا دکھ ابھی بھولی نہیں تھی کہ دوسرا بھی غائب ہوگیا۔ مرنے والوں پر تو پھر رفتہ رفتہ صبر آہی جاتا ہے مگر گمشدہ کا انتظار بے حد جان لیوا ہوتا ہے۔ انہونی کا دھڑکا ہر لمحے ہی سوہانِ روح ہوتا ہے۔ سب گھر والے انتظار کی سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔

اگرچہ زندگی کے سارے معمولات ویسے ہی جاری تھے۔ کلینک میں نیا ڈاکٹر آچکا تھا جو ڈاکٹر عمران کی طرح ماہر تو نہ تھا مگر بے حد محنتی اور فرض شناس تھا۔ عام بیماریوں کا علاج تو وہ کر لیتا تھا مگر پیچیدہ قسم کے کیسز کو وہ اسپتال کے لیے ریفر کر دیا کرتا تھا۔ پھر اس کے دو تین اسپیشلسٹ ڈاکٹرز واقف تھے۔ ہفتے میں دو تین دن کے لیے وہ بھی شام کو باری باری ایک گھنٹے کے لیے آجاتے تھے۔ اس طرح کلینک بہت بہتر انداز میں چل رہا تھا۔ احمر، ڈاکٹر عابد کی اس قدر لگن سے کام کرنے کی وجہ سے بے حد خوش تھا۔ اسے معقول تنخواہ دینے کے علاوہ کمیشن بھی دیتا تھا کیونکہ اسی کی وجہ سے کلینک چل رہا تھا۔ دیگر اسپیشلسٹ ڈاکٹرز اپنی فیس میں سے کچھ رقم کلینک کو دے دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب تک عمران کا کھوج نہ مل جاتا، تب تک تو اسی طرح روزگار کا بندوبست کرنا تھا۔

پولیس نے شروع میں تو خاصی سرگرمی سے عمران کی تلاش کی۔ ارشاد اور اصغر سے انتہائی گہرائی سے تفتیش کی گئی۔ آس پاس کے دکان داروں اور عمران کے تمام رشتے داروں، دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی مگر کہیں سے بھی کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ سبھی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ نہ ڈاکٹر عمران کا اسکوٹر ملا، نہ ہی اس کا موبائل مل سکا۔ یونہی چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اب پولیس نے عمران کی تلاش کا کام تقریباً ترک کر دیا تھا۔ دوسرے کئی گمشدہ افراد کی طرح عمران کی تلاش اب اس کے اہل خانہ ہی کی ذمے داری رہ گئی تھی اور انہوں نے ہنوز اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ کلینک کا کام بہت اچھا جارہا تھا۔ ڈاکٹر عابد اور اس کی ٹیم بے حد محنتی تھی۔ اس نے ایک گارڈ، ڈسپنسر اور نرس کا انتظام بھی کرلیا تھا تاکہ خواتین مریضوں کو وہ انجکشن وغیرہ لگا دیا کرے اور بھی دیگر مسائل خواتین نرس سے بہتر طور پر ڈسکس کرسکتی تھیں۔ پرانے ڈسپنسر اصغر اور ارشاد کو ہٹایا نہیں گیا تھا۔ انہوں نے خود ہی کام چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے کلینک کو وقت نہیں دے سکتے۔ اس طرح عابد کو اپنی مرضی کے بندے رکھنے میں آسانی ہوگئی تھی۔

اگرچہ احمر اور اس کی فیملی کو کوئی مالی پریشانی نہیں تھی۔ کلینک کی آمدنی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عمران نے کچھ دکانیں بھی خرید رکھی تھیں۔ ان سے بھی معقول رقم کرائے کی مد میں آجاتی تھی۔ اس کے علاوہ قسطوں پر کچھ پلاٹ بھی لے رکھے تھے جن کو بیچ کر احمر نے بینک میں پیسے جمع کروا دیے تھے، تاکہ مکان کی تعمیر کا کام باقاعدگی سے جاری رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد مکان مکمل ہوجائے تاکہ وہ لوگ شہر میں منتقل ہوجائیں۔ اس طرح کلینک کی نگرانی بھی بہتر طور پر ہوسکتی تھی اور بچوں کو تعلیمی اداروں میں آنے جانے میں بھی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ بیٹے کی اتنے عرصے تک گمشدگی نے اس کی والدہ کو مستقل بیمار کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت دونوں بیٹوں کو یاد کر کے اشک بہاتی رہتی تھیں۔ ذہنی مریضہ بھی بن چکی تھیں۔ ان کی حالت کا احساس کر کے نرگس انہیں اپنے گھر لے آئی تھی تاکہ جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے ان کی ذہنی صحت پر بہتر اثر ہو، مگر وہ اب اپنی ذات کے خول میں بند ہوچکی تھیں۔ جس ماں کے دو جوان بیٹے نظروں سے اوجھل ہوجائیں اس کی کیفیت کا اندازہ لگانا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

غرضیکہ نرگس اور بچوں کے لیے یہ بڑا کٹھن اور آزمائش کا وقت تھا۔ عمران کی گمشدگی ہی کم اذیت ناک نہیں تھی کہ اوپر سے اس کی والدہ کی ابتر حالت الگ سے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی طرح تعاون کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی تھیں۔ ان کی مخدوش حالت کے پیش نظر احمر نے ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک تجربہ کار نرس کا انتظام کر دیا تھا جو صبح دس بجے سے شام کے چھ بجے تک ان کی دیکھ بھال کرتی مگر وہ نرس کی بات بھی نہیں مانتی تھیں۔ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے کمرے سے نکل جانے کو کہتیں، مگر وہ بڑے تحمل سے ان کو سمجھا بجھا کر ان کو کھانا بھی کھلا دیتی، دوائیں وہ اب انجکشن کے ذریعے دیتی تھی۔ پھر کسی نہ کسی طرح نہلا دھلا کر صاف کپڑے بھی تبدیل کروا دیتی..... اور یوں اب وہ دواؤں کے زیر اثر سکون سے سو جاتیں۔

نرگس کو نرس کے آنے کے بعد کچھ سکون ملا تھا، البتہ رات کو نرس کے جانے کے بعد وہی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ان کے اعصاب انتہائی لاغر ہو چکے تھے۔ ان کی ساری جان آنکھوں میں سمٹی ہوئی تھی جن میں بیٹے کی دید کی جوت ہر وقت جلتی رہتی تھی..... جو کہ آ کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ جانے وہ کس دیس کا باسی بن گیا تھا اور اپنے ہنستے کھیلتے گھرانے کو غم واندوہ کی عمیق گہرائیوں میں دھکیل گیا تھا۔

☆☆☆

اس دن شام کو احمر اور عاطف کلینک کے لیے دوائیں اور دوسری ضروری چیزیں لے کر آئے تھے۔ اب دواؤں کو فریج، فریزر اور کاؤنٹر میں رکھنے کے بعد خالی کارٹن اسٹور میں رکھنے تھے مگر اسٹور میں تو پہلے ہی اتنا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے اسٹور کی صفائی کی جانب کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ چونکہ عابد اور باقی عملہ وقت پر آ کر مریضوں میں مصروف ہو جاتے تھے اس لیے انہیں فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔

''یار عاطف! کیوں نا ہم دونوں مل کر آج اسٹور کی صفائی کر لیں۔ ساتھ گارڈ کو بھی لگا لیتے ہیں۔ کل ویسے بھی اتوار ہے۔ ہماری چھٹی ہی ہے۔ اس لیے جتنا بھی وقت لگ جائے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' احمر نے عاطف کو تجویز پیش کی۔

''ٹھیک ہے بھائی..... مگر امی کو اطلاع ضرور دے دینا۔ ورنہ وہ پریشان ہوتی رہیں گی کہ ہم کہاں غائب ہو گئے ہیں کیونکہ اسٹور کی صفائی کا کام تو مریضوں کے جانے کے بعد ہی ہو پائے گا۔''

''ہاں یہ صحیح ہے۔ یوں بھی ساڑھے آٹھ تو بج ہی رہے ہیں، نو بجے تک ڈاکٹر صاحب اور دیگر افراد چلے جائیں گے۔ گارڈ کو روک لیں گے۔ پھر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں کام نمٹ جائے گا۔ باقی اگر کچھ رہ بھی گیا تو ہم دونوں کر لیں گے۔ گارڈ کو ایک گھنٹے کے بعد فارغ کر دیں گے۔''

احمر نے یہ فیصلہ کر کے نرگس کو فون کر دیا تو وہ کہنے لگی۔ ''ضروری نہیں آج ہی سارا کام ختم کرو۔ گیارہ بجے تک گھر آ جانا۔''

''او کے امی! ایسا ہی کریں گے۔'' پھر احمر اور عاطف کچھ دیر کے لیے کلینک سے باہر چلے گئے تاکہ آدھا گھنٹا گزار سکیں۔ ایک ریسٹورنٹ میں جا کر انہوں نے برگر اور کولڈ ڈرنکس لیں، گارڈ کے لیے بھی قریبی ریستوران سے کھانا لے لیا اور جب واپس کلینک آئے تو ڈاکٹر عابد فارغ ہو چکا تھا۔ کچھ دیر تک چند ضروری معاملات پر بات چیت کرنے کے بعد عابد اور دیگر افراد چلے گئے تو احمر نے گارڈ کو اس کا پیک کیا ہوا کھانا اور کولڈ ڈرنک دی اور وہ ہال کمرے ہی میں بیٹھ کر اپنا کھانا کھانے لگا۔ دونوں بھائی کلینک کے اس کمرے میں آ گئے جہاں ڈاکٹر مریضوں کا معائنہ کرتا تھا۔ وہاں صوفے پر بیٹھ کر انہوں نے برگر کھائے۔

اس دوران میں گارڈ بھی کھانا کھا چکا تھا پھر اس نے اسٹور کا دروازہ کھولا اور سارا کاٹھ کباڑ باہر نکالنے لگا۔ احمر اور عاطف بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ اسٹور میں دیواروں کے ساتھ بنے سیمنٹ کے شیلفوں پر بھی کافی چیزیں پڑی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں سارا سامان اسٹور سے نکالا جا چکا تھا۔ احمر نے گارڈ سے کہا کہ وہ اگلے روز صبح آ کر یہ سارا ردی کا سامان کسی کباڑیئے کو بلا کر فروخت کر دے۔ پھر گارڈ نے اسٹور کے فرش کو جھاڑو اور پوچھا لگا کر اچھی طرح صاف کیا جہاں گرد و غبار کی کئی کئی انچ موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ فرش جب صاف ہو گیا تو گارڈ چونک پڑا کیونکہ سارا فرش چپس کا بنا ہوا تھا البتہ ایک دیوار کے ساتھ چپس کے بجائے سیمنٹ کا فرش کیا گیا تھا۔ اب گارڈ چونکہ نیا تھا، اس نے پہلے تو یہ فرش نہیں دیکھ رکھا تھا مگر پھر بھی وہ حیران سا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ سارے کلینک اور آدھے سے زیادہ اسٹور کا فرش تو چپس کا تھا اور اسٹور کے کچھ حصے میں سیمنٹ کیا گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اتنا حصہ کھود کر دوبارہ سے بنایا گیا ہو پھر اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے... شروع ہی سے ایسا فرش بنایا گیا ہو۔ اس نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اس لیے وہ اسٹور سے باہر نکل آیا۔ چونکہ دس سے زیادہ کا ٹائم

ہو رہا تھا' اس لیے احمر نے گارڈ کو کچھ رقم دی کیونکہ اس نے اپنے معمول سے زیادہ وقت لگایا تھا۔ گارڈ سلام کر کے رخصت ہو گیا تو عاطف کہنے لگا۔

''میرا خیال ہے بھائی، ہم بھی گھر چلتے ہیں۔ کچھ دیر اور ہو گئی تو امی کے فون پر فون آنے شروع ہو جائیں گے۔ اب تو نرس بھی جا چکی ہو گی اگر دادو نہ سوئیں تو وہ بھی امی کے لیے پرابلم کھڑی کرنا شروع ہو جائیں گی۔ باقی کام ہم کل صبح آ کر نمٹا لیں گے۔'' عاطف کی بات سن کر احمر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر بولا۔

''تم کہتے ہو تو چلے جاتے ہیں گھر..... ورنہ میں نے سوچا تھا کہ یہ کام آج ہی نمٹا لیتے۔ کارٹن ہی رکھنے ہیں اسٹور میں۔ صبح تم نے دیر سے جاگنا ہے پھر دوپہر کے کھانے کے بعد اور تیار ہونے میں بہت ٹائم لگ جائے گا۔ کل میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ایک پروجیکٹ پر بھی کام کرنا تھا۔''

''لیکن بھائی! میں بہت تھک گیا ہوں۔ اسکول کے کچھ دوستوں کے ساتھ صبح آؤٹنگ کے لیے چلا گیا تھا۔ شام کو آپ یہاں لے آئے۔ ذرا بھی ریسٹ نہیں کر سکا۔'' سدا کے سست عاطف نے بہانہ بنایا تو احمر سمجھ گیا کہ اس کا موڈ مزید کام کرنے کا نہیں ہو رہا۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ کلینک سے باہر نکلا۔ کلینک کے گلاس ڈور کو بند کر کے شٹر گرایا اور دونوں سائڈ پر تالے لگا کر گاڑی میں آ بیٹھا اور پھر کچھ دیر بعد دونوں بھائی گھر پہنچے تو وہاں ایک اور مسئلہ ان کا منتظر تھا۔ دادی اماں اپنے بیڈ سے نیچے گر گئی تھیں اور اب زور زور سے چیخ چلا رہی تھیں۔

احمر اور عاطف نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھا تھا، ان کے پاس گیٹ کی چابی تھی۔ اس لیے وہ خود ہی گیٹ کھول کر گھر میں داخل ہو گئے تھے۔ گیراج میں گاڑی کھڑی کر کے اس بڑے سے ہال میں داخل ہوئے جس میں گھر کے باقی کمروں کے دروازے کھلتے تھے اور دادی اماں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سارے گھر میں گونج رہی تھیں۔

''کاش باقی جسم کی طرح دادو کی زبان بھی مفلوج ہو جائے۔ ان کے چیخنے چلانے اور گالیوں سے تو جان چھوٹے۔'' عاطف بڑبڑایا۔

''بری بات ہے عاطف..... ایسے نہیں کہتے۔ دادو ہماری بزرگ ہیں۔'' احمر نے عاطف کو گھرکا۔

''ہونہہ بزرگ..... ابو خود تو جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں اور یہ تحفہ ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔'' عاطف کا موڈ آج کچھ زیادہ ہی خراب تھا۔ وہ یونہی بڑبڑاتا ہوا اپنے اور احمر کے مشترکہ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ احمر جلدی سے کمرے میں داخل ہوا اور چمکار کر دادی اماں سے کہنے لگا۔

''دادو پلیز..... آپ اس طرح ٹھنڈے فرش پر نہ لیٹیں۔ بغیر رضائی یا کمبل کے آپ کو ٹھنڈ لگ جائے گی..... پھر بخار ہو گیا تو ابو آ کر ناراض ہو جائیں گے آپ سے اور وہ پھر کہیں چلے جائیں گے۔'' دادی اماں جو اس اثنا میں اب چیخنے چلانے کے بجائے آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھیں' احمر کی بات بہت توجہ سے سن کر خوش ہو گئیں اور کہنے لگیں۔

''کیا..... کیا..... مم..... میرا..... بیٹا..... میرا شہزادہ عمران آ رہا ہے؟ شکر ہے میرے مولا۔ میرا بچہ واپس آ گیا۔ بس ایک مرتبہ وہ آ جائے تو میں اپنے بیٹے کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔ اسے بوڑھی اور بیمار ماں کا خیال ہی نہیں ہے۔ کتنے دنوں سے میری خبر ہی نہیں لی۔ وہ آ جائے گا تو میں اس کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی..... ایک پل بھی اس دوزخ میں نہیں رہوں گی۔'' وہ مسلسل بول رہی تھیں۔

''دادو..... میری پیاری دادو! جو آپ چاہتی ہیں وہی ہو گا مگر فی الحال تو اٹھیں نا۔'' احمر نے ان کے گرد اپنے مضبوط بازو لپیٹ کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی تو وہ بغیر کسی مزاحمت کے احمر کی مدد سے بیڈ پر لیٹ گئیں اور پھر کچھ دیر بعد ہی سکون سے سو گئیں۔

''شکر ہے بیٹا! اماں تمہاری بات مان گئیں۔ ورنہ تو جب سے نرس گئی ہے، انہوں نے واویلا کر کر کے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔'' نرگس نے انہیں رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا اور پھر وہ سب کمرے سے باہر آ گئے۔ باہر نکلتے ہوئے احمر نے زیرو پاور کا بلب آن کر دیا تھا کیونکہ مکمل اندھیرے کمرے میں وہ نہیں سو سکتی تھیں اور چونک کر اٹھ جاتی تھیں۔

ہال میں آ کر نرگس اور دونوں بہنوں نے کھانا ٹیبل پر لگایا۔ چونکہ احمر اور عاطف برگر کھا چکے تھے اس لیے انہوں نے کھانے سے معذرت کر لی اور اپنے کمرے میں آ کر لباس تبدیل کر کے بیڈ پر لیٹ گئے تاکہ جلدی سو کر صبح وقت پر بیدار جائیں اور کلینک جا سکیں کیونکہ احمر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسٹور کے علاوہ باقی سارے کلینک کی بھی اچھی طرح صفائی کر لیں گے۔ گارڈ کو بھی انہوں نے صبح آنے کو کہہ دیا تھا۔ ایک چابی اس کے پاس بھی ہوتی تھی تاکہ وہ صبح آ کر ردی والے کو ردی اشیا فروخت کرے۔

صبح نو بجے جب عاطف اور احمر کلینک پہنچے تو گارڈ آچکا تھا۔ ایک ردّی والا ہال میں بیٹھا ردی تول رہا تھا جبکہ گارڈ اسٹور کی صفائی کر کے اس میں سامان رکھ رہا تھا۔ وہ بار بار یہی سوچے جا رہا تھا کہ اسٹور کے کچھ حصے کا فرش باقی اسٹور سے مختلف کیوں ہے۔ صفائی کے دوران ہی اسے ایک موبائل کی سم بھی ملی تھی جو اس نے یہ سوچ کر جیب میں رکھ لی تھی کہ احمر آئے گا تو اسے دے دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پرانے ڈسپنسر کی سم ہو یا پھر ڈاکٹر صاحب سے وہاں گر گئی ہو۔ ردّی والا فالتو سامان لے کر چلا گیا تو پھر گارڈ نے پورے کلینک کی صفائی کی جبکہ احمر اور عاطف دو اور مزدوروں کے ساتھ مل کر کلینک کی سیٹنگ کرتے رہے اور یوں شام تک سارا کلینک بھی سیٹ اور صاف ستھرا ہوگیا بلکہ اس کی نئے سرے سے سیٹنگ بھی کروا دی گئی۔ پہلے ریسیپشن کاؤنٹر ڈاکٹر کے چیکنگ روم کے ساتھ ہی تھا۔ اب اسے داخلی دروازے کے دائیں طرف سیٹ کیا گیا تھا جبکہ سامنے کی دیوار اور اسٹور کے سائڈ والی دیوار کے ساتھ صوفے لگا دیے گئے تھے تاکہ مریض وہاں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کر سکیں۔ اس کے علاوہ کچھ نئی کرسیاں بھی منگوا کر داخلی دروازے کی بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ رکھ دی گئی تھیں۔ ڈسپنسر اور دواؤں کے لیے ہال ہی میں معائنے کے کمرے کے ساتھ چھوٹا سا پارٹیشن بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر کے کمرے کو بھی نئے سرے سے سیٹ کیا گیا تھا۔ یہ ساری تبدیلیاں اور سیٹنگ دونوں بھائیوں نے اسی انداز میں کی تھیں جیسے کہ ڈاکٹر عمران نے کچھ دنوں پہلے ذکر کیا تھا..... کہ جیسے ہی اسے تھوڑی فرصت ملی تو وہ نئے سرے سے کلینک کو رینوویٹ کرے گا اور اپنے والد کے پلان کے مطابق سیٹنگ کرتے ہوئے دونوں بھائی دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ اگر ابو اچانک کہیں سے آگئے تو یہ ان کے لیے بہت بڑا سرپرائز ہوگا اور وہ یہ سب تبدیلی دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ جب کلینک کو بند کر کے احمر گاڑی کی جانب بڑھا تو اچانک گارڈ کو اسٹور سے اٹھائی ہوئی سم یاد آگئی۔ اس نے اسے جیب سے نکالا اور احمر کو مخاطب کیا۔

''احمر صاحب! مجھے اسٹور کی صفائی کرتے ہوئے یہ سم ملی تھی۔''

''اوہ اچھا.....'' یہ کہہ کر احمر نے گارڈ سے سم لے کر اپنی شرٹ کی جیب میں رکھ لی اور پھر آ کر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

چونکہ دونوں بھائی سارے دن کے تھکے ہوئے تھے اس لیے گھر پہنچ کر کھانا کھا کر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ احمر نے شرٹ کی جیب سے اپنا پرس نکال کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا تو ساتھ ہی سم بھی گر پڑی اور احمر نے اسے اٹھا کر پرس کے ساتھ ہی ٹیبل پر رکھ دیا اور پھر لباس تبدیل کر کے بیڈ پر لیٹا تو کچھ دیر بعد ہی گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ عاطف پہلے ہی سو چکا تھا۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر احمر تیار ہو کر کالج چلا گیا جبکہ سم ٹیبل ہی پر پڑی رہی، عاطف کی کالج سے چھٹی تھی۔ اس لیے وہ دیر تک سوتا رہا۔ وہ دوپہر کو اٹھ کر لاؤنج میں آیا، کھانا کھا کر تیار ہوا اور کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ نرگس سارے گھر کی صفائی کرنے کے بعد دونوں بھائیوں کے کمرے میں آئی۔ ان کے بیڈ کو ٹھیک کیا اور سائڈ ٹیبلز کی ڈسٹنگ کی تو سم نیچے گر پڑی اور پھر جب کمرے میں جھاڑو لگائی تو کوڑے کے ساتھ ہی وہ سم کوڑے دان میں پہنچ گئی۔ ویسے بھی چھوٹی سی سم پر کون توجہ دیتا۔ شام کو کالج سے واپسی پر احمر کلینک پہنچا تو گارڈ نے اس سے کہا۔

''احمر صاحب! آپ نے وہ سم چیک کی تھی جو کل میں نے آپ کو دی تھی؟''

''ارے وہ سم..... مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ میں نے جیب میں رکھی تھی شاید۔'' احمر نے بے خیالی میں جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس نکالا اور اس کو کھول کر دیکھنے لگا۔ ''اس میں نہیں ہے، شاید گھر میں رہ گئی۔ خیر میں آج چیک کر لوں گا۔'' احمر نے بے پروائی سے کہا تو گارڈ کسی مریض کے بلانے پر اس کی طرف چلا گیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

رات کو جب احمر گھر پہنچا تو سم اس کے ذہن سے نکل چکی تھی۔ چونکہ دادو کی طبیعت زیادہ خراب تھی، سارے گھر والے ان کے پاس تھے اس لیے احمر بھی ادھر ہی چلا گیا۔ ڈاکٹر نے آ کر ان کا چیک اپ کیا تھا اور وہ یہی کہہ گیا تھا کہ ان کو ذہنی خلفشار سے بچایا جائے ورنہ یہ مکمل طور پر ذہنی توازن کھو دیں گی مگر ذہنی خلفشار سے انہیں بچانا کسی کے بس میں تھا ہی کب۔ چونکہ احمر کی شکل عمران سے بے حد مشابہ تھی اس لیے جب احمر آتا تو وہ خوش ہو جاتیں۔

''میرا بیٹا آ گیا۔ کہاں رہ گیا تھا تو..... تو جانتا نہیں کہ میں تیرے بغیر اداس ہو جاتی ہوں۔'' وہ احمر کے چہرے کو اپنے کمزور جھریوں زدہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہتیں۔ احمر انہیں لپٹا کر پیار کرتا

اور پھر وہ اس کے کہنے پر کھانا بھی کھاتیں۔ جب سے اسٹور اور سارے کلینک کی صفائی ہوئی تھی، یوں تو صاف ستھرا چمکتا دمکتا کلینک بہت اچھا لگتا تھا لیکن جب بھی اسٹور کا دروازہ کھلا رہ جاتا تو سارے کلینک میں عجیب سی بو محسوس ہوتی تھی۔ پہلے تو چونکہ اسٹور میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا اور اس میں مختلف قسم کے پرانے آلات، ایکسپائر ادویات، اسپرٹ اور پرانے گتے کے ڈبوں کی ملی جلی بو ہوتی تھی، یوں بھی تب اسٹور کا دروازہ بہت کم کھولا جاتا تھا لیکن صفائی کے بعد گارڈ اور ڈسپنسر وغیرہ اکثر ہی اسٹور میں جاتے رہتے تھے اور کبھی دروازہ بھی کھلا رہ جاتا تو ناگوار سی بو سارے کلینک میں چکراتی پھرتی تھی۔ مریض تو تھوڑی دیر کے لیے آتے تھے، انہیں بُو زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہوتی بھی تو وہ یہی سمجھتے ہوں گے کہ یہ کلینک میں موجود مختلف قسم کی دواؤں کی وجہ سے ہے لیکن چونکہ ڈاکٹر، نرس، ڈسپنسر اور گارڈ زیادہ وقت کے لیے ہوتے تھے، اس لیے انہیں بُو زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

کئی بار ڈسپنسر نے کلینک اور اسٹور میں اسپرے بھی کیا مگر بدبو ہنوز موجود تھی پھر ایک روز شام کو احمر آیا تو گارڈ نے اسے اس بدبو کے بارے میں بتایا جو واضح طور پر اسٹور سے آرہی تھی۔

''ہوسکتا ہے اسٹور میں کوئی چوہا وغیرہ مرگیا ہو۔ ورنہ تو سارا پرانا کاٹھ کباڑ تو اسٹور سے نکالا جاچکا ہے۔'' احمر نے ڈاکٹر عابد سے باتیں کرتے ہوئے گارڈ کی طرف مڑ کر کہا۔

''مگر احمر صاحب! یہ مردہ چوہے کی بو نہیں ہے۔ یہ ایک خاص قسم کے اسپرے کی بو ہے جو عموماً مردہ جانوروں سے اٹھنے والے تعفن کو ختم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے اور اس کی بو کھلی جگہوں سے تو جلدی ختم ہوجاتی ہے مگر بند جگہوں سے عرصہ دراز تک نہیں جاتی۔''

''ایسا تو نہیں کہ اس اسپرے کی کوئی بوتل اسٹور میں گرگئی ہو۔'' ڈاکٹر عابد نے کہا۔

''نہیں سر! ہم نے تو یہ اسپرے کبھی بھی نہیں منگوایا۔ ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ یہاں ہر روز باقاعدگی سے صفائی کی جاتی ہے اور چوہے، بلیوں کو تو کبھی بھی اسٹور اور کلینک میں نہیں دیکھا گیا۔'' ڈسپنسر گل نواز نے کہا۔

''ارے ہاں، یاد آیا۔'' اچانک گارڈ نے کچھ سوچ کر کہا۔

''میں جب اسٹور سے پرانا سامان نکال رہا تھا تو اس اسپرے کی ایک بوتل ملی تھی، جو میں نے باہر کچرے کے ڈبے میں پھینک دی تھی اور اس کے بعد دوبارہ ایسی بوتل نہیں دیکھی۔''

''ممکن ہے، وہی اسپرے غلطی سے اسٹور میں گرگیا ہو۔''

بس ایک لمحے کی بات تھی گارڈ کی بات سنتے ہی احمر کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور اسے کسی انہونی کا ادراک ہونے لگا..... اور پھر اس نے پہلی فرصت میں اسٹور کا جائزہ اور اس کے فرش کو کھودنے کا حکم دے دیا..... پھر جیسے ساری الجھی گتھی سلجھتی چلی گئی۔ اسی گڑھے سے عمران کی لاش برآمد ہوگئی جسے سائیلنسر لگے ریوالور کی گولی کھا گئی جو عین دل کے مقام پر لگی تھی۔ پھر اسے یاد آیا اس کے باپ کے پاس کام کرنے والے دونوں ڈسپنسر کس طرح اپنی مصروفیات کا بہانہ کرکے کام چھوڑ گئے تھے۔ گویا یہ کیس دوبارہ کھلوایا گیا۔ پھر تو جیسے جیسے کیس آگے بڑھتا گیا عقل کے اوپر پڑے سارے پردے ہٹتے چلے گئے۔ جس روز ارشاد نے چھٹی کی تھی اس سے ایک دن پہلے عمران نے بینک سے ایک بڑی رقم نکال کر اسٹور روم میں پڑی ایک ٹیبل کی دراز میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا کیونکہ اس سے اگلے دن ہفتے کا دن تھا اور گھر بنانے کے لیے ہفتے کے دن اسے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی لہٰذا تقریباً پانچ لاکھ روپے اس نے نکلوا کر محفوظ کرلیے تھے مگر بدقسمتی سے یہ ساری کارروائی جانے کیسے نئے ڈسپنسر ارشاد احمد کے علم میں آگئی۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھتا اور سمجھتا رہا۔ اسی رات اس نے پرانے ڈسپنسر سے فون پر بات کی، چونکہ دونوں آپس میں گہرے دوست تھے اور ضرورت مند بھی۔ ارشاد احمد تو موج مستی کا دیوانہ تھا اور غربت کی وجہ سے اسے یہ سہولت میسر نہ تھی البتہ کبھی کبھی گھر سے کچھ رقم ہاتھ لگ جاتی تو عیش کرلیتا جبکہ اصغر کے گھر میں بھی ذمے داریوں کا انبار تھا جنہیں ادا کرتے کرتے اس کے کاندھے جھکنے لگے تھے لہٰذا دونوں نے اسی رات پلاننگ کی اور اگلے دن ارشاد احمد نے بہانہ کرکے چھٹی کرلی مگر دور سے تمام معاملات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اصغر سے ملنے کے بعد دونوں موقع کی تلاش میں تھے اور پھر انہیں وہ موقع مل گیا جب عمران تھک کر تھوڑی دیر آرام کی خاطر لیٹا تو گویا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا اور اسے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ ہمیشہ کی نیند سوجائے گا..... مجرموں کو سزا ملی۔ لوٹی رقم بھی کچھ مل گئی مگر..... جانے والے کب پلٹتے ہیں۔ وہ جو اتنے لوگوں کو پیارا تھا، کتنے بے یار و مددگار لمحات میں موت کو گلے لگالیا۔ اس کے انجام پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔

⌘⌘⌘

بدلہ

تنویر ریاض

اگرچہ اسے شکار سے کوئی رغبت نہ تھی مگر اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ اسے ایک دن اس طرح شکار کرنا پڑے گا کہ کوئی اس کا نشان بھی نہ ڈھونڈ سکے... کیونکہ بدلے کی آگ میں جلتے جلتے اس نے مجرم کو ٹھکانے لگانے کے لیے ہر پہلو پر غور کرلیا تھا۔

ایک کمزور مگر عقلمند حسینہ کا خوفناک انتقام

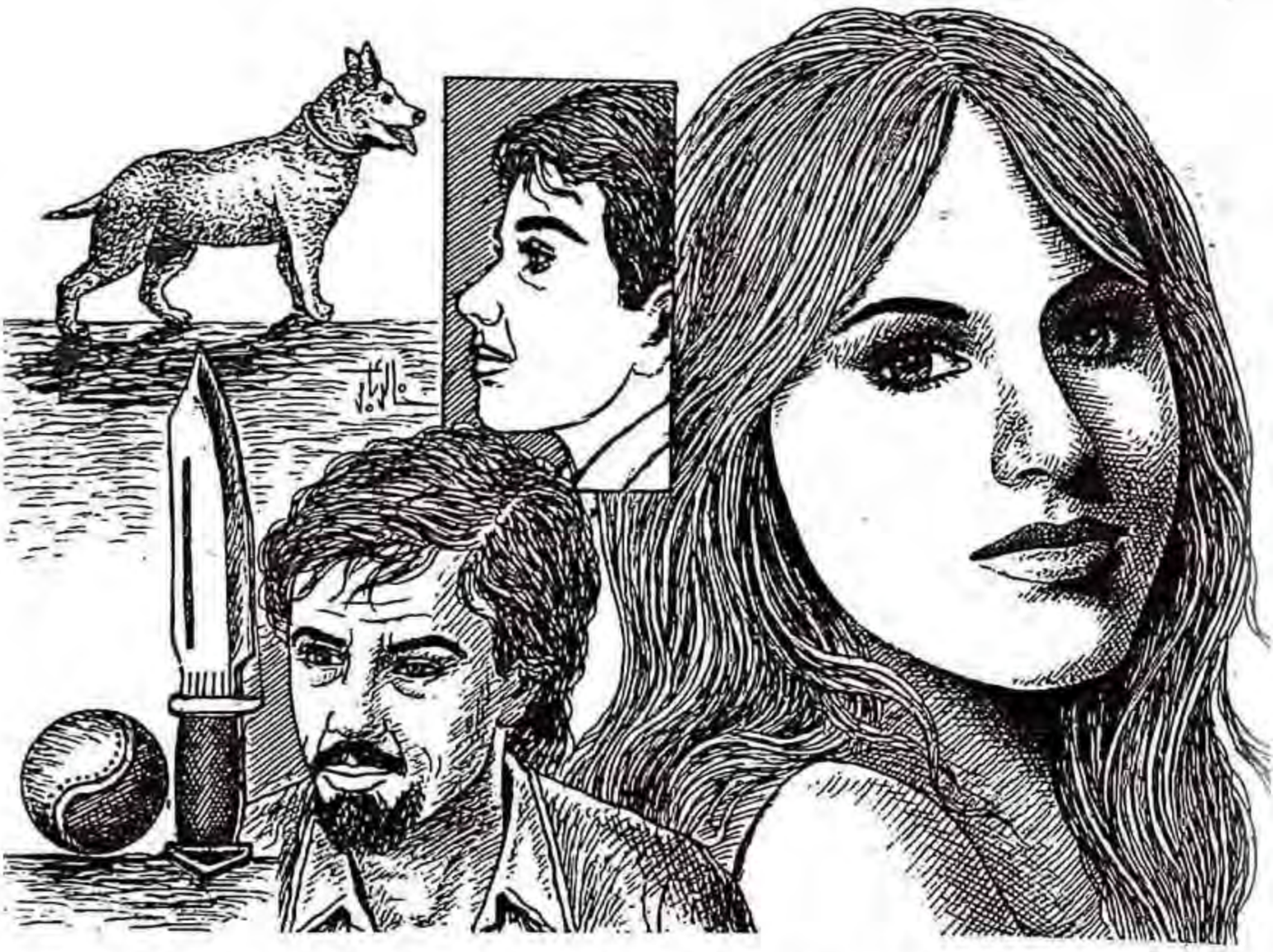

این کو شکار کا موسم بہت پسند تھا۔ جب اس نے ایک نئے نام کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کیا تو اس نے اپنی کہانی یوں بیان کی۔ وہ اور اس کی بہن اپنے باپ کے ساتھ شکار پر جایا کرتے تھے تاوقتیکہ اس نے فوج میں شمولیت اختیار نہ کرلی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اور اس کا شوہر باقاعدگی سے ہر سیزن پر شکار کے لیے جانے لگے پھر چٹان پر پھسلنے سے اس کے شوہر کی موت واقع ہوگئی۔

اس کہانی کا بڑا حصہ خیالی تھا۔ این کی کوئی بہن

نہیں تھی۔ اسے اپنے باپ کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ البتہ یہ سچ ہے کہ وہ فوج میں آ گئی تھی اور اس نے ہمیشہ شکار سے لطف اٹھایا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ کلیئن کاؤنٹی میں کسی کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ این دو بدو لڑائی میں بھی بہت بہتر تھی۔

وہ شکار کے سیزن کا دوسرا ویک اینڈ تھا۔ ٹریوس ہائی اسکول کی پرنسپل این ڈی وٹ اس سہانے موسم میں شکار کی تلاش میں جنگل میں گھوم رہی تھی۔ اس نے شکاریوں والا کیموفلاج لباس اور بوٹ پہن رکھے تھے اور اس میں اپنے آپ کو آرام دہ محسوس کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا اور اس نے سر کے بالوں کو ایک جالی دار ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے پاس ایک رائفل، چاقو اور گن تھی۔

چلتے ہوئے اس کا پاؤں ایک ٹہنی پر پڑا اور اس کے چٹخنے کی آواز سن کر وہ بوکھلا گئی۔ اپنے آپ کو برا بھلا کہتے ہوئے اس نے درختوں کے درمیان گرے ہوئے پتوں اور شاخوں سے بچ کر چلنے کی کوشش کی تاکہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔

تبھی اس نے تقریباً ایک میل کے فاصلے سے گولی چلنے کی آواز سنی۔ شاید کسی دوسرے شکاری کے لیے یہ ایک اچھا دن تھا۔ ایک انسانی آواز نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ اپنے سامنے کھلے میدان میں جانے کی تیاری کر رہی تھی جو ایک کم گہرے پیالے کی شکل میں تھا۔ اس نے کچھ آوازیں سنیں جنہوں نے اسے بتایا کہ اس جنگل میں وہ اکیلی نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی، تبھی اس نے ایک آدمی کو قتل ہوتے دیکھا۔

ایک سرخ بالوں اور چھوٹی ڈاڑھی والا طویل قامت شخص، دوسرے آدمی کے ساتھ کشتی لڑ رہا تھا جس کا قد چھوٹا اور بال سرمئی تھے۔ یہ کوئی دوستانہ کشتی نہیں تھی بلکہ وہ ایک دوسرے کو مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ این نے مداخلت کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اپنے آپ کو روک لیا۔ اس طرح وہ خبروں میں آ سکتی تھی۔ این ہمیشہ اپنے اسکول کا نام بلند کرنے کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ ٹریوس میں آنے کے بعد اس کا ذکر صرف دو مرتبہ اخبار میں آیا تھا۔ پہلی بار جب وہ اسسٹنٹ پرنسپل سے پرنسپل بنی اور دوسری بار اس کی تصویر اس وقت اخبار میں شائع ہوئی جب ٹریوس ہائی اسکول کی باسکٹ بال ٹیم کی جیت پر وہ تالیاں بجا رہی تھی۔

این نے میدان میں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ غیر ضروری شہرت سے بچنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔ یہ محض احتیاطی تدبیر تھی۔ اس کا ارادہ کسی کو نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔

اس طرح کی شدید لڑائی زیادہ دیر نہیں چلتی۔ اس میں بہت زیادہ توانائی خرچ ہوتی ہے۔ این کے خیال میں سرمئی بالوں والا ہار رہا تھا لیکن وہ حیران رہ گئی جب وہ اپنے حریف پر غالب آنے لگا پھر اچانک ہی اس نے چاقو نکال کر دوسرے آدمی پر وار کر دیا۔ سرخ بالوں والا کمر کے بل گر گیا۔ چاقو اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی اور وہ اسی وقت مر گیا۔

سرمئی بالوں والا بھی ہانپ رہا تھا۔ جب اس کی سانس قابو میں آئی تو اس نے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور اسے دیکھنے لگا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ فون کرے یا نہیں۔ اس کے اوور آل پر صرف ایک خون کا دھبا تھا جبکہ دائیں ہاتھ پر سرخ دھبا نظر آ رہا تھا۔

این اپنا سر آگے پیچھے ہلا رہی تھی جیسے مختلف امکانات پر غور کر رہی ہو۔ اگر وہ اپنی خفیہ پناہ گاہ سے باہر آتی ہے تو سرمئی بالوں والا کیا وضاحت پیش کرے گا۔ وہ کہہ سکتا ہے..... اوہ میرے خدا! میں نے ابھی ایک لاش دیکھی ہے۔ یا یہ کہ میرا فون خراب ہے۔ کیا تم پولیس کو اطلاع دے سکتی ہو؟ اس شخص نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور مجھے اپنا دفاع کرنا پڑا یا وہ این کو بھی قتل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

کیونکہ این مسلح تھی اور سرمئی بالوں والے کا چاقو ابھی تک لاش میں پھنسا ہوا تھا اس لیے این نے نہیں سوچا کہ سرمئی بالوں والے کے پاس کامیابی کا کوئی موقع ہے۔ اس نے ایک بار پھر این کو حیران کر دیا۔ وہ لاش کے قریب گیا۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر اس کے سینے سے چاقو نکالا اور پستول سے اس جگہ فائر کیا جہاں چاقو کا زخم تھا۔ این سمجھ گئی کہ وہ موت کی وجہ کو غیر واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اب اس کا اگلا قدم کیا ہو گا؟

چاقو اور گن پیک کرنے کے بعد وہ کافی دیر تک لاش کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ یہاں سے جانے والا ہے۔ اگر وہ شمال کی طرف گیا تو اس کے بالکل قریب سے گزرے گا۔ این ہاتھ میں چاقو پکڑے ہوئے خاموش بیٹھی ہوئی تھی لیکن وہ مشرق میں واقع ڈیلبی روڈ کی طرف گیا۔

این وہاں پندرہ منٹ تک رہی۔ اسے پکا یقین تھا کہ سرمئی بالوں والا کسی مقصد کے تحت گھر گیا ہے تاکہ اپنے ہاتھ دھوئے، ہتھیار صاف کرے اور کپڑوں کو واشنگ مشین میں ڈال دے۔ جب پندرہ منٹ گزر گئے تو این نے لاش کے قریب جانے اور اس کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا تاکہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے اس کی شناخت ہو سکے لیکن جب مردہ شخص کے فون کی گھنٹی بجنے لگی تو اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔

واپسی کے لیے این نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ اس کے لیے یہ بہت اہم تھا کہ پولیس یا کوئی اور یہ جان سکے کہ کسی نے اس شخص کو قتل ہوتے دیکھا ہے یا کم از کم یہ تعین کر سکے کہ جنگل میں کوئی موجود تھا جس نے لاش کی اطلاع نہیں دی۔ وہ جنگل میں پندرہ منٹ تک زمین پر بیٹھی سڑک کی طرف دیکھتی رہی۔ اس امید پر کہ شاید سرمئی بالوں والا اپنی گاڑی میں وہاں سے گزرے لیکن جب اس نے کسی گاڑی کو نہیں دیکھا تو بھاگ کر سڑک پار کر لی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ اپنے گھر میں شاور لینے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد آتش دان کے سامنے کاؤچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے برابر میں باسکٹ بال ٹیم کا کوچ ہولٹ ہنری بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہرن کا گوشت لے کر آیا تھا جو گاجر، پیاز، آلو اور مٹر کے ساتھ ابلنے کے لیے اسٹوو پر رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھ میں چائے کی پیالیاں تھیں اور فلیٹ اسکرین پر فٹ بال کا میچ چل رہا تھا۔

''مجھے امید ہے کہ تم سیزن ختم ہونے سے پہلے ایک ہرن کا شکار کر لوگی۔'' ہولٹ نے کہا۔

این بولی۔ ''میں نے ہرن تو نہیں مارا لیکن ایک قتل ہوتے دیکھا ہے۔''

ہولٹ کی بھویں تن گئیں۔ ''مجھے پوری بات بتاؤ۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ڈیلبی روڈ کے کسانوں سے ان کے جنگل میں شکار کھیلنے کی اجازت لے رکھی ہے۔ میں نے سیزن کا پہلا اور تیسرا ویک اینڈ وہاں گزارا لیکن آج بھی میں نے شکار پر جانے کا فیصلہ کیا۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ اس کے بعد این نے پوری کہانی کسی ترمیم و اضافے کے بغیر اسے سنا دی۔

''تم ان دونوں میں سے کسی کو نہیں جانتیں؟'' ہولٹ نے پوچھا۔

این نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن معلوم ہو جائے گا۔''

''کیا اخبار میں اشتہار دو گی؟ اگر تم نے ہفتے کے روز ایک سرخ بالوں والے آدمی کو قتل کیا ہے تو براہِ کرم این ڈی وٹ سے رابطہ کرو۔''

این مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاس کچھ آئیڈیاز ہیں۔'' دونوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ دوسرے شکاری اپنی حدود میں کیا کر رہے تھے لیکن وہ دونوں یہی سوچ رہے تھے۔ ''اس سے بہت مدد ملے گی اگر کوئی لاش کو جلد از جلد دیکھ لے۔''

''یہ شکار کا سیزن ہے۔ جلد ہی کسی کی نظر اس لاش پر پڑے گی۔''

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کاؤنٹی کے اخبار ہفتے میں تین دن شائع ہوتے تھے لیکن تین شماروں میں اس لاش کے ملنے یا کسی فرد کی گمشدگی کے بارے میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔

اس کے بعد والے ویک اینڈ میں این شکار پر نہ جا سکی کیونکہ اسے ایک ہنگامی ضرورت کے تحت اسکول جانا پڑ گیا تھا لیکن اس کے عوض اسے دورانِ ہفتہ ایک دن کی چھٹی مل گئی۔ این نے شکار پر جانے کے لیے اپنا مخصوص لباس پہنا اور خوش قسمتی سے اس بار ایک ہرن کا شکار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے ہولٹ کو فون کیا۔

''ہائے ہنی! میں نے ایک شکار کر لیا ہے۔ کیا تم مجھے سڑک پر سنگِ میل کے نشان کے پاس مل سکتے ہو؟''

''بالکل..... تم نے صحیح وقت پر فون کیا ہے۔''

اس کے بعد این نے اس جگہ کا رخ کیا جہاں اس نے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ سرمئی بالوں والا مقتول کی لاش کو ٹھکانے لگانے آیا ہوگا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ لاش ابھی تک وہیں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے فون نکال کر نو گیارہ ملایا اور دس منٹ میں پولیس وہاں پہنچ گئی۔ پہلے دو پیٹرول آفیسر آئے۔ انہوں نے محتاط انداز میں اس جگہ کا جائزہ لیا اور این سے سوالات شروع کر دیے۔ اس نے ایک پولیس آفیسر سے پوچھا۔ ''کیا میرا دوست اس ہرن کو لے جانے کے لیے یہاں آ سکتا ہے؟''

آفیسر لاسکی، ہولٹ کو جانتا تھا اور جنگل میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ہولٹ کا ٹرک سڑک کے کنارے کھڑا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے این کو اجازت دے دی کہ وہ ہولٹ کو وہاں بلا سکتی ہے۔

ہولٹ نے جنگل میں داخل ہونے کے بعد این کو فون کیا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں ہولٹ۔'' این نے جواب

میں کہا۔ ''تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔''

''اگر تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔'' دوسرے پولیس آفیسر نے کہا۔

این نے اس کے کہنے پر عمل کیا لیکن اس طرح اس کی نظروں سے لاش اوجھل ہوگئی جو وہ ہولٹ کو دکھانا چاہ رہی تھی۔ اس نے پولیس آفیسر کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ ''میں نے ہولٹ کو اس لیے بلایا ہے کہ وہ اس ہرن کو پروسیسنگ پلانٹ پر لے جائے۔''

ہولٹ اسے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''کیا یہ لاش ٹھیک حالت میں ہے؟''

وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کسی شخص نے اسے چھیڑا تو نہیں۔

این نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

ہولٹ نے پولیس آفیسر سے کہا۔ ''کیا ہم دونوں جاسکتے ہیں؟''

''تمہارے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔'' آفیسر لاسکی بولا۔ ''لیکن مس این کو سراغ رساں کے آنے تک یہیں ٹھہرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں ہرن لے کر جارہا ہوں۔'' ہولٹ نے این سے کہا۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں واپس آکر سڑک پر تمہارا انتظار کروں؟''

''میں گھر تک پیدل جاسکتی ہوں۔'' این نے کہا۔ ''لیکن اچھا ہوگا اگر مجھے لفٹ مل جائے۔ گو کہ میں نہیں جانتی کہ یہاں کتنی دیر رکنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' ہولٹ نے کہا اور سوچنے لگا کہ اس طرح اسے یہ دیکھنے کا موقع مل جائے گا کہ وہاں کوئی مشکوک شخص آتا ہے یا نہیں۔

اس رات ہولٹ نے این سے کہا۔ ''میں نے وہاں کسی سرمئی بالوں والے کو رکتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''پھر تو واقعی وہ بہت ہوشیار ہے۔'' این نے کہا۔ وہ اس وقت چکن بنا رہی تھی اور ہولٹ سیب کاٹ رہا تھا۔ وہ دونوں ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ اکٹھے کھانا بناتے تھے۔

''اس کے پاس پولیس ریڈیو نہیں ہے یا وہ اس سڑک سے بہت کم گزرتا ہے۔'' ہولٹ نے فرائی پین میں سیب ڈالتے ہوئے کہا۔

''وہ اس کے جنازے میں ضرور آئے گا۔'' این نے پورے یقین سے کہا۔ ''وہ جانتا تھا کہ سرخ بالوں والا اس کا دشمن ہے اور یہ بڑی عجیب بات ہوگی اگر وہ جنازے میں شریک نہیں ہوا۔''

''تم جنازے میں جاؤ گی؟''

''میرا جانا فطری ہے کیونکہ میں نے ہی لاش دریافت کی تھی۔''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد ہولٹ بولا۔ ''تم تنہا جاؤ گی یا میں بھی ساتھ چلوں؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ تمہارا جانا ضروری ہے۔'' این نے کہا۔

این کو اخبار سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کا نام لونی آرنلڈ تھا۔ ایک ہفتے تک کسی نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کروائی کیونکہ وہ اپنے فارم ہاؤس والے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ اخبار کی خبر سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ الگ تھلگ رہنے والا اور تنہائی پسند شخص تھا۔ سب سے پہلے اس کی غیر حاضری کو اس کے بھائی جیری نے محسوس کیا تاہم اس نے بھی اسے زیادہ اہمیت نہیں دی، جب تک اس کے بیٹے نے پولیس کو فون کرنے پر اصرار نہیں کیا۔ جب انکل لونی کے کتے نے بھونکنا بند نہیں کیا تو بھتیجے کو تشویش ہوئی۔ اس نے وہاں جا کر دیکھا تو کتا زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ جب لونی گھر پر نہیں ہوتا تو یہ ایک عام بات تھی لیکن اس کی خوراک اور پانی کے پیالے کا خالی ہونا یقیناً غیر معمولی واقعہ تھا۔

این نے وہاں جا کر دیکھا۔ اس کا گھر مقفل تھا اور ٹرک گھر کے سامنے کھڑا ہوا تھا جبکہ کوئی اور چیز غائب نہیں تھی اور نہ ہی کوئی چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔ پولیس کو بھی اس کی گمشدگی کا اس وقت پتا چلا جب این نے جنگل میں اس کی لاش کی موجودگی کی اطلاع دی۔

لونی کے دائیں جانب رہنے والے پڑوسی جارج نارمن کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا۔ ''یہ شکار کا سیزن ہے۔ بہرحال ہم نے لونی کو کبھی باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ جنگل کی طرف گیا تھا۔''

لونی کی ماں گریٹا نے کہا۔ ''وہ ملنے جلنے والا شخص نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ مجھے بھی بہت کم فون کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو مہینا گزر جاتا۔ اس لیے جب اس کا فون نہیں آیا تو مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔''

جنازے میں شرکت کے لیے این نے سیاہ ماتمی لباس پہنا اور چرچ پہنچ گئی۔ اس نے پیچھے کی جانب ایک ایسی بینچ کا انتخاب کیا جہاں سے وہ سب کو دیکھ سکے۔ اسے وہاں کچھ ایسے چہرے بھی نظر آئے جنہیں وہ پہچانتی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سروس شروع ہونے سے دس منٹ پہلے سرمئی بالوں والا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے سرمئی

سوٹ کے ساتھ سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے ہمراہ ایک عورت بھی تھی جو دیکھنے میں اس سے دس سال چھوٹی لگ رہی تھی۔ این نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ عورت بہت خوبصورت تھی لیکن اس کے چہرے سے غم جھلک رہا تھا۔ کم از کم اس کی سرخ آنکھیں یہی ظاہر کررہی تھیں۔ وہ جوڑا سامنے کی نشستوں پر بیٹھ گیا۔ این نے بھی اپنی جگہ بدل لی اور ان کے عقب میں جا کر بیٹھ گئی تاکہ ان کا مشاہدہ کرسکے۔

سروس شروع ہوئی لیکن اس نے بہ مشکل ہی کچھ سنا ہو۔ اس کی ساری توجہ اس جوڑے پر تھی۔ سرمئی بالوں والا لوہے کا بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات اور رویے پر قابو پاسکتا تھا۔ اس کے برعکس عورت کے لیے ایسا کرنا مشکل تھا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور وہ بار بار ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں صاف کررہی تھی۔

پادری نے اعلان کیا کہ لونی کا بھائی اس موقع پر چند الفاظ کہنا چاہتا ہے۔ سرخ بالوں والا جیری آرنلڈ اپنی ماں، بیوی اور بیٹے کے ساتھ اگلی نشستوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ بیٹے کی عمر پندرہ سولہ سال ہوگی۔ این نے پہچان لیا کہ وہ اس کے اسکول کا شاگرد کیل تھا۔

''میرا بھائی ملنے جلنے والا شخص نہیں تھا۔'' جیری نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ تنہائی پسند تھا لیکن اس کا ایک قریبی دوست میرا بیٹا کیل تھا جو اس کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی رفاقت سے لطف اندوز ہوتے تھے اور ان کے درمیان ایک مضبوط تعلق تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

''میرے بھائی کو بھی شکار کرنا پسند تھا اور وہ ایک ایماندار، سمجھ دار اور محتاط شکاری تھا۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا اور اپنے انداز سے رہ رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ مزید کئی برس اسی طرح گزار دے گا لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس میں بھی ہمارے لیے سبق پوشیدہ ہے۔''

جیری نے اپنی بات ختم کرنے سے پہلے کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ جس نے بھی اسے گولی ماری ہے، وہ سامنے آئے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ حادثہ تھا لیکن یہ تمہارے اپنے مفاد میں ہے کہ اس بارے میں کچھ کہو۔''

اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں تھوڑی سی ہلچل ہوئی جیسے وہ جیری کی اپیل پر ردِعمل ظاہر کرنے والے ہوں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی اٹھ کر چلائے۔

''ہاں میں نے گولی چلائی تھی۔ مجھے معاف کردو۔''

این کی نظریں سرمئی بالوں والے پر تھیں۔ اس نے بھی اظہارِ افسوس کے طور پر سر ہلایا پھر وہ کھڑا ہوا اور ڈائس کی طرف بڑھ گیا۔ یعنی قاتل ہی اگلا مقرر تھا۔

''میں جارج نارمن ہوں..... لونی کا پڑوسی۔'' قاتل نے کہا۔ ''ہم دس سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ میں اور جین اسے ہفتے میں ایک دوبار دیکھا کرتے تھے لیکن ہمارے درمیان کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ لونی ایک دفعہ میرے پاس باڑ لگانے کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔ ہم نے اسے کھانے پر روک لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جین کے بنائے ہوئے اطالوی کھانے پسند کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ وقتاً فوقتاً جین کے لیے اپنے فارم کی چیزیں لانے لگا۔''

یہ کہہ کر جارج نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو بدستور سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ جارج نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''لونی ایک اچھا پڑوسی تھا۔ خاموش طبیعت اور محنتی۔ ہمیں اس کی کمی ہمیشہ محسوس ہوگی۔''

این نے بقیہ سروس نہیں سنی اور فیصلہ کرلیا کہ وہ قبرستان نہیں جائے گی۔ وہ جو معلوم کرنے آئی تھی وہ اسے معلوم ہوگیا تھا۔ ٹریوس ہائی اسکول کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے لونی کے قتل کے بارے میں کیا کرنا چاہیے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فی الحال کچھ نہیں کرے گی۔ اب جبکہ وہ جان چکی تھی کہ اسے کس نے قتل کیا اور اسے پورا یقین تھا کہ لونی کو کیوں قتل کیا گیا۔ وہ جین کے بنائے ہوئے اطالوی کھانوں پر مرمٹا تھا اور ان دونوں کے درمیان بڑھتی ہوئی قربت جارج سے برداشت نہ ہوسکی۔

این اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ لونی کی موت سے اس کے معمولات متاثر نہیں ہوں گے پھر ایک روز گروسری اسٹور میں اس کا سامنا کیل سے ہوگیا۔ وہ اس کے عقب میں کھڑا اس کی کہنی ہلا رہا تھا۔ این نے مڑ کر دیکھا اور چونک گئی۔

''معاف کرنا مس ڈی وٹ۔'' کیل نے کہا۔ ''میرا مقصد تمہیں ڈرانا نہیں تھا۔''

''تم کیل ہو؟'' وہ خوش دلی سے بولی۔ ''اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے ہو؟''

''ہاں میڈم! میرے انکل کو حال ہی میں قتل کیا گیا

ہے۔تم اس کے جنازے میں آئی تھیں اور تم نے ہی اس کی لاش دیکھی تھی۔''

''ہاں۔''

''تم جانتی ہو کہ وہ کوئی حادثہ نہیں تھا۔''

''کیل! یہ جگہ ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

''پھر کہاں؟'' کیل کی آواز کچھ اونچی ہوگئی تھی۔

''کیل! میں پولیس آفیسر نہیں ہوں۔کوئی نہیں جانتا کہ تمہارے انکل کی موت کیسے ہوئی۔بہتر ہے کہ اس بات کو جانے دو۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹرالی آگے بڑھادی۔

کیل نے بھی اپنی خریداری مکمل کرلی تھی۔این نے اسے اسٹور سے باہر جاتے ہوئے دیکھا پھر اس کی نظر کرسٹی پر گئی جو برابر والی قطار میں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔وہ اس سے قد میں چھوٹی اور عمر میں زیادہ تھی اور اسے اسکول میں ملازمت کرتے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا۔وہ اپنے کام میں بہت مستعد اور ہوشیار تھی۔اس لیے این نے بھی اسے ملازمت پر برقرار رکھا۔

این مسکراتے ہوئے بولی۔''چچا کے مرنے کے بعد کیل بہت پریشان ہے۔اس کے باپ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ وہ دونوں آپس میں بہت قریب تھے۔''

''اوہ .....تم جنازے میں گئی تھیں؟'' کرسٹی نے کہا حالانکہ اسے یہ بات معلوم تھی کیونکہ اسی وجہ سے اسے ایک میٹنگ کا وقت تبدیل کرنا پڑا تا کہ این اس میں شریک ہوسکے۔''اور تم نے لاش بھی دیکھی تھی۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

این نے اثبات میں سرہلادیا اور بولی۔''معاف کرنا، مجھے اپنی ٹرالی خالی کرنی ہے۔'' وہ اس سے زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ کرسٹی ہمیشہ اس کی ٹوہ میں رہتی تھی اس لیے این کو اس کے ساتھ محتاط رہنا پڑتا تھا۔

اپنا سامان گاڑی میں رکھتے وقت بھی این اس لڑکے کیل کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔یہ بالکل فطری بات تھی کہ وہ انصاف مانگ رہا تھا۔اسے یقین تھا کہ انکل لونی کی موت حادثہ نہیں تھی۔این سوچ رہی تھی کہ کیل نے یہ اندازہ کیسے لگایا۔

یہ معما بھی جلد ہی حل ہوگیا۔اسکول کی نرس لوئیس اگلے روز سہ پہر کو این کے دفتر میں آئی۔اس نے کرسٹی کے کمرے میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور بولی۔''میں نہیں جانتی کہ تمہیں یہ بات معلوم ہے لیکن میں ٹیڈ لاسکی سے ڈیٹنگ کررہی ہوں۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا۔'' این نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ تم نے لاش دریافت کی تھی اس لیے میں تمہیں اعتماد میں لے کر کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' لوئیس نے کہا۔

اب این بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی تھی ویسے بھی لوئیس کا اس پر اعتماد کرنا کئی لحاظ سے اس کے حق میں بہتر تھا .....وہ اسکول کے بچوں اور ٹیچرز میں بہت مقبول تھی اور اگر وہ این کی طرف آجاتی تو اس کی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہوجاتی۔

''مجھے پوری بات بتاؤ۔'' این نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لاش کچھ عرصہ وہاں پڑی رہی۔کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب سے وہاں تھی۔'' لوئیس نے کہا۔''تم نے وہ کب دیکھی؟''

این جانتی تھی کہ وہ لاش کتنا عرصہ وہاں پڑی رہی۔ اس نے مختصراً کہا۔''چند روز قبل.....''

لوئیس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔''لیکن لاش کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گولی کے زخم کے علاوہ وہاں ایک اور زخم بھی ہے۔پیتھالوجسٹ کو یقین ہے کہ وہ چاقو کا زخم ہے۔''

این نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''یہ تم کیا کہہ رہی ہو لوئیس؟''

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ گولی لگنے سے پہلے لونی کے سینے میں چاقو گھونپا گیا تھا۔''

''یعنی کسی کے گولی مارنے سے پہلے ہی وہ مرچکا تھا؟''

''شاید۔پھر اسے گولی کیوں ماری گئی؟''

این نے کہا۔''شاید اس کی لاش پر اتفاقاً گولی لگ گئی ہو۔یعنی اس کے مرنے کے بعد۔ہوسکتا ہے کہ کسی شکاری کی گولی اسے لگی ہو۔''

''اس کا امکان نظر نہیں آتا۔'' لوئیس نے کہا۔''وہ زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ایسے میں کسی شکاری کی گولی اسے کیسے لگ سکتی ہے؟''

''یعنی میڈیکل آفیسر کا خیال ہے کہ لونی کو چاقو سے قتل کیا گیا پھر اس زخم کو چھپانے کے لیے اسی جگہ پر گولی ماری گئی؟''

لوئیس سرہلاتے ہوئے بولی۔''ٹیڈ کا بھی یہی خیال ہے۔''

''واقعی کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔'' این نے کہا۔

''کسی کو حادثاتی طور پر چاقو نہیں گھونپا جاتا۔'' لوئیس نے وثوق سے کہا۔

اسی وقت این کو خیال آیا کہ لوئیس نے بھی یقیناً ایسے کیس دیکھے ہوں گے۔

اس نے پوچھا۔ ''تم بھی تو ایمرجنسی روم میں رہ چکی ہو؟''

لوئیس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں، وہ بہت اچھے دن تھے لیکن مجھے بہت وقت دینا پڑتا تھا اور جب میری ماں مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ کوئی آسان کام کروں۔ اب میں ساڑھے تین دن یہاں اور ساڑھے تین دن جونیئر ہائی اسکول میں کام کرتی ہوں۔''

''تم بہت اچھا کام کر رہی ہو۔'' این نے کہا۔

''شکریہ۔ میں صرف لونی کے بارے میں بات کرنے آئی تھی۔'' لوئیس کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی پھر وہ دروازے پر جا کر رک گئی اور اس نے کہا۔ ''اسی طرح تم بھی، میرا مطلب ہے کہ اچھا کام کر رہی ہو۔ میں نے کئی پرنسپلز کو دیکھا ہے لیکن تم ان سب میں بہترین ہو۔''

لوئیس کے جانے کے بعد این اپنے خیالوں میں کھو گئی۔ اب وہ کیل کی ناراضی سمجھ گئی تھی۔ اس لڑکے کو مشکوک شہادت کا پتا چل گیا تھا۔ اس نے گھر جانے سے پہلے اپنی میز صاف کرنی شروع کر دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیل اس بارے میں کیا کرنے والا ہے۔

کیل دوسرے دن اسکول آیا تو اس کا ایک بازو سلنگ میں جھول رہا تھا۔ ہولٹ اسے ورلڈ ہسٹری پڑھاتا تھا۔ اس نے این کو بتایا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ وہ اندھیرے میں باڑ سے الجھ گیا تھا۔''

دو گھنٹے بعد لوئیس نے آ کر بتایا کہ کیل کے بازو میں تکلیف بڑھ گئی ہے اور وہ گھر جانا چاہتا ہے۔ این نے اس کی ماں کو فون کیا جس نے بتایا کہ وہ کیل کے باپ کے ساتھ ریلے میں ہے جو وہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر ہے لہٰذا کیل اسکول میں ہی ٹھہرے اور چھٹی ہونے پر بس سے گھر آ جائے۔

''اگر اس کے والدین راضی ہوں تو میں اسے گھر چھوڑ دوں گی۔'' این نے کہا۔ ''میں لنچ کے لیے گھر جا رہی ہوں اور اس کا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے۔''

لوئیس نے کیل کی ماں کو فون کیا اور وہ اس پر راضی ہو گئی۔ دس منٹ بعد این اس لڑکے کو اپنی کار میں لے کر جا رہی تھی۔ ''اب مجھے اپنے بازو کی اصل کہانی بتاؤ۔'' این نے کہا۔ کیل نے قہر آلود نظروں سے اسے

Recent Stories

Hina Digest January 2020

Suspense Digest February 2020

Pakeeza Digest January 2020

LOAD MORE

دیکھا تو وہ بولی۔ ''مجھے یہ سوجا ہوا چہرہ مت دکھاؤ اور بات کرو۔''

کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''انکل لونی..... مسز جارج سے ملا کرتے تھے۔'' وہ ان کے جنسی تعلقات کے بارے میں بات کرتے ہوئے شرما رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' این نے کہا۔ اسے پہلے سے ہی اس کا اندازہ تھا۔

''مسٹر جارج کو یہ بات معلوم ہوگئی۔'' کیل نے کہا۔

این نے سر ہلا دیا۔ ''اس لیے میرا خیال ہے کہ اس نے ہی انکل لونی کو قتل کیا ہے۔ وہ پکا بدمعاش ہے اور مس جین سے بھی حسد رکھتا ہے۔ وہ اچھی عورت ہے لیکن اپنے حق کے لیے کھڑی نہیں ہوتی۔ میری مما بھی یہی کہتی ہے، مجھے اس پر افسوس ہوتا ہے۔''

اس کی باتوں سے ایسا لگا کہ صرف لونی آرنلڈ ہی اپنی پڑوسن پر بری نظر نہیں رکھتا تھا بلکہ اور لوگ بھی اس کے ہمدرد تھے۔

''انکل لونی زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کی میموریل سروس پر یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی۔''

این نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ ''لیکن وہ پہلی بار مسٹر جارج کے گھر گئے تو وہ موجود نہیں تھا البتہ جین بڑی اچھی طرح پیش آئی اور وہ اس کی طرف مائل ہونا شروع ہوگئے پھر وہ اکثر جارج کی غیر موجودگی میں جین سے ملنے کے لیے جانے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ بھی ان کے لیے ایسے ہی جذبات رکھتی ہے۔ انہوں نے صرف ایک بار مجھ سے اس کے بارے میں بات کی تھی۔ اس کے بعد کبھی نہیں کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ مردوں کو ان عورتوں کے بارے میں بات نہیں کرنی چاہیے جن کے ساتھ ان کا تعلق ہو۔''

''اچھا مشورہ ہے۔'' این نے کہا۔

''لہٰذا میرا اندازہ ہے کہ مسٹر جارج نے انکل لونی کو جنگل میں اس وقت گھیر لیا جب وہ غیر مسلح تھے اور شاید وہ مس جین سے ملنے جا رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں میں لڑائی ہوئی اور غیر متوقع طور پر مسٹر جارج حاوی ہوگئے، انہوں نے انکل کو قتل کر دیا۔''

''تمہارے بازو پر زخم کیسے آیا؟''

''میں گزشتہ شب انکل لونی کے کتے کو کھانا کھلانے گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان کا مکان ہمارے اور جارج کے درمیان میں ہے لہٰذا میں نے سوچا کہ ایک نظر مس جین کو دیکھ لوں۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''میں نے دیکھا کہ وہ اسے مار رہا تھا۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے گھر میں داخل ہونے اور اسے روکنے کے بارے میں سوچا۔'' کیل نے کہا۔ ''مگر دروازہ مقفل تھا۔''

''شاید اس طرح تمہاری جان بچ گئی۔''

''کیا؟''

''تمہیں یقین ہے کہ جارج نے تمہارے انکل کو قتل کیا ہے؟'' این نے کہا۔ ''پھر وہ تمہیں کیوں نہ قتل کرتا؟''

''مس جین کے سامنے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس نے تمہارے انکل کو مس جین کے سامنے قتل نہیں کیا؟''

کیل ششدر رہ گیا پھر اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''میں پرانی مشینری اور دوسرے سامان پر چڑھ گیا جس سے ایک زوردار آواز ہوئی اور اس نے جین کو مارنا بند کر دیا۔''

''لیکن وہ تمہارے پیچھے آیا۔''

''یہ تم کیسے جانتی ہو؟''

''تمہارے بازو سے۔''

''ہاں۔ میں وہاں سے بھاگا اور اندھیرے میں سامان لے جانے والی ٹرالی سے ٹکرا گیا جو ایک طرف الٹ گئی جس سے میرے کندھے اور بازو پر چوٹ آئی۔''

''اس کے بعد تم نے کیا کیا؟''

''میں انکل لونی کے گھر گیا، تمام دروازے اندر سے بند کیے۔ لائٹس بجھائیں اور باتھ روم میں چھپ گیا۔''

''کیا جارج تمہاری تلاش میں آیا تھا؟''

''ہاں۔'' کیل نے کہا۔ ''وہ پانچ منٹ بعد وہاں پہنچ گیا۔ میں نے تمام پردے ہٹا دیے تھے جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔''

''اس کے جانے کے بعد تم نے کتے کے ساتھ کیا کیا؟''

''میں نے اس کی زنجیر دوبارہ باندھ دی۔ اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسے کسی کے حوالے کر دیں۔ وہ پاگلوں کی طرح بھونکتا ہے۔''

کچھ دیر بعد وہ کیل کے گھر پہنچ گئے۔ ''تمہارے والدین کو چاہیے کہ کندھے کا علاج کروائیں۔'' این نے کہا۔ ''وہ تمہیں ایکسرے کے لیے لے جائیں۔''

''نہیں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ اس میں تکلیف

نہیں ہو رہی۔"

"پھر بھی تمہیں ایکسرے کروانا چاہیے۔"

"اگر تم مجھے انکل لونی کے گھر اتار دو تو میں کتے کو کھانا دے دوں۔"

"کیا تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟" این نے رکھائی سے کہا۔

"یقیناً۔"

"اگر تمہیں یقین ہے کہ اس شخص نے تمہارے انکل کو قتل کیا ہے تو تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ تمہیں قتل نہیں کرے گا۔ میں تمہیں گھر پر اتار دوں گی۔"

کیل خاموش ہو گیا۔ این خود بھی سوچ رہی تھی کہ اب وہ کیا کہے۔ "تم رات کو گھر پر ہی رہنا۔" اس نے کیل کو تاکید کی۔

"تم کیا کرنے والی ہو؟"

این نے گہری سانس لی اور بولی۔ "کیل! تم اپنے باپ کے بارے میں سوچو جس کا بھائی اس سے بچھڑ گیا۔ اب اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تمہارے والدین پر کیا گزرے گی۔"

لیکن کیل کے دماغ پر اپنے چچا کا انتقام سوار تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"خدا حافظ کیل اور اپنے بازو کا خیال رکھنا۔" این نے کہا اور گھر کے بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

جب تک وہ گھر میں داخل نہیں ہو گیا، این وہاں سے نہیں گئی پھر اس نے لنچ کے لیے ریستوران کا رخ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ کیل کے والدین ایک گھنٹے میں گھر پہنچ جائیں گے اگر وہ اس وقت تک دروازہ بند کر کے بیٹھا رہے تو ٹھیک رہے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ اسکول واپس جانے کے لیے کار میں سوار ہو رہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ کرسٹی کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "وہ قتل ہو گیا۔"

"کون؟" این نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی، گو کہ وہ سمجھ گئی تھی۔

"کیل..... اس کے والدین گھر آئے تو وہ موجود نہیں تھا۔ انہوں نے لونی کے گھر جا کر دیکھا۔ کسی نے کیل اور لونی کے کتے کو ہلاک کر دیا۔"

جارج کو کیسے معلوم ہوا کہ کیل، کتے کو کھانا کھلانے آئے گا؟ این کو یہی سوچ کر حیرت ہو رہی تھی لیکن اس نے اس سوال کو ایک طرف رکھا اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلے پر غور کرنے لگی کہ وہ اس کا بدلہ لینے کے لیے کیا کرے گی؟

این کو محسوس ہوا کہ کرسٹی ابھی تک بول رہی تھی۔

"مس ڈی وٹ! پولیس تم سے بات کرنے آئی ہے۔ کیا میں انہیں تمہارے گھر بھیج دوں؟ تم میری بات سن رہی ہو نا؟"

"ہاں، سن رہی ہوں۔" این نے کہا۔ "میں اسکول واپس آ رہی ہوں۔"

وہ اسکول پہنچی تو سراغ رساں اسمتھ اس کا منتظر تھا۔ این نے اس کے چہرے کے نقوش سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اسکول میں پڑھنے والی لڑکی ٹمارا کا باپ تھا۔ سراغ رساں نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔

"وہ ہمارے اسکول کی بہترین ایتھلیٹ ہے۔" این نے کہا۔ "اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ پڑھائی میں بھی اچھی ہے۔"

"دونوں ہی باتیں درست ہیں۔" سراغ رساں بولا۔ "لیکن میں اس وقت ٹمارا کے بارے میں بات کرنے نہیں آیا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ کیل کو گھر چھوڑنے کیوں گئی تھیں؟"

"گزشتہ شب کیل نے گھر پر اپنا بازو زخمی کر لیا تھا۔ آج جب وہ اسکول آیا تو اس کا بازو سلنگ میں تھا۔ اسکول نرس نے مجھے بتایا کہ کیل کے بازو میں درد ہو رہا ہے۔ اس نے کیل کے والدین کو فون کیا۔ وہ ریلے گئے ہوئے تھے اور ان کے واپس آنے میں دیر تھی۔ کیل کے پاس کار نہیں ہے اور نہ ہی وہ ایک ہاتھ سے گاڑی چلا سکتا تھا۔ میں لنچ کرنے جا رہی تھی لہٰذا میں نے کیل کو اس کے گھر چھوڑنے کی پیشکش کر دی۔ لوئیس نے اس کے والدین کو اس بارے میں بتا دیا اور وہ اس پر راضی ہو گئے۔"

"راستے میں تم دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟"

"ہم نے اس کے انکل لونی کے بارے میں باتیں کیں جس سے وہ بہت قریب تھا۔ کیل نے مجھے اس کے انکل اور پڑوسیوں کے تعلقات کے بارے میں بتایا۔"

"یہ ایک عجیب اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کیل کے انکل کی لاش دریافت کی اور آج تم کیل کو گھر چھوڑنے گئیں تو اس کی موت واقع ہو گئی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔"

"کیا اس نے تمہیں بتایا کہ اس کے بازو پر کس طرح چوٹ لگی؟"

''اس نے کہا تھا کہ وہ ٹرالی پر گر گیا تھا۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کیل اپنے انکل کے گھر کیوں گیا تھا؟''

''ہاں۔ اسے اپنے انکل کے کتے کو کھانا کھلانا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے والدین کے آنے تک گھر میں ہی رہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کتے کی دیکھ بھال کا فیصلہ کر چکا تھا۔'' این دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی۔ ''کاش، وہ میری بات سن لیتا۔ معافی چاہتی ہوں۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کیل کے ساتھ کیا ہوا؟''

''مجھے افسوس ہے میڈم۔ فی الحال ہم کوئی معلومات نہیں دے سکتے۔'' سراغ رساں نے کہا۔

کیل کے قتل کے بعد آنے والے مہینوں میں این نے جارج سے حساب کتاب برابر کرنے کے لیے حکمتِ عملی بنانا شروع کر دی۔ اس کے لیے اسے مختلف ذرائع اختیار کرنا تھے۔ اسے گن، چاقو یا باکسنگ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے موسم بہار کے آغاز میں سافٹ بال کے کھلاڑی کو وارم اپ ہوتے دیکھا تو اس کھیل میں اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔

''کیا تم مجھے سکھا سکتے ہو کہ اس طرح گیند کیسے پھینکی جاتی ہے؟'' اس نے ہولٹ سے کہا۔

''میں ہارڈ بال کے بارے میں زیادہ جانتا ہوں۔''

''دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔'' این نے کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم اس کی مشق کریں گے۔'' ہولٹ نے کہا۔ ''کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم اس میں بھی اتنی ہی مہارت حاصل نہ کر لو جتنی کہ تمہیں دوسری چیزوں میں ہے۔''

''کتنے زور سے یہ گیند لگ سکتی ہے؟''

''کیلی! کیا تمہارے فون پر چیریٹی کے زخم کی تصویر اب بھی موجود ہے؟'' ہولٹ نے سافٹ بال کوچ سے پوچھا۔

''یقیناً۔'' کیلی نے اپنی جیب سے فون نکالا اور تصویر تلاش کر کے این کو فون پکڑا دیا۔

''یہ نشانات کیسے ہیں؟'' این نے زخم دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ گیند کی سلائی کے نشانات ہیں۔'' کیلی نے کہا۔

این نے پوچھا۔ ''گیند کی رفتار کتنی تھی؟''

کیلی سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ گیند ٹائیگر نے پھینکی تھی۔ وہ پینتالیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے گیند پھینکتی ہے۔''

''مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔'' این بولی۔

☆☆☆

جین، ٹریوس کمیونٹی سینٹر میں ہونے والے بک کلب کی میٹنگ میں گئی۔ وہاں این بھی موجود تھی۔ اسے جین کے برابر میں بیٹھنے کا موقع مل گیا۔ تین ملاقاتوں کے بعد اس نے جین کو اپنے ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دے دی۔ جین نے کہا کہ اس کے لیے اسے اپنے شوہر سے پوچھنا پڑے گا۔ جارج نے اس پر رضامندی ظاہر کر دی۔

این نے کھانے کے دوران میں باتوں باتوں میں جارج سے متعلق وہ تمام معلومات حاصل کر لیں مثلاً اس کا شیڈول، عادات اور بیوی کے ساتھ اس کا رویہ وغیرہ۔ این کو معلوم ہو گیا کہ جارج سیزن کے پہلے دن شکار پر گیا تھا۔ یہ ایک رسم تھی اور وہ اس دن شکار پر ضرور جاتا تھا۔ چاہے تیز بارش ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ وہ ایک رات پہلے ہی اپنا شکار کا سامان نکال کر رکھ لیتا تھا تاکہ اسے جین کو نہ جگانا پڑے۔

ان معلومات کی بنیاد پر این نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دینا شروع کی۔ اس کا انحصار اس پر تھا کہ جارج کس جگہ کا انتخاب کرتا ہے۔ وسط اکتوبر میں ہفتے کے روز سورج نکلنے سے پہلے این اپنا کیموفلاج سوٹ پہن کر جنگل میں پہنچ گئی۔ وہ صبح چار بجے سے جارج کے گھر کے عقب میں اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے پہلے ہی بہت سی چیزوں کا انتظام کر لیا تھا۔ اس کی بیلٹ کے ساتھ سافٹ بال کا جالی دار بیگ لٹک رہا تھا اور اس کی جیب میں ایک رسی رکھی ہوئی تھی۔

ساڑھے چار بجے رینچ ہاؤس کا دروازہ کھلا جو کار پورچ میں کھلتا تھا۔ جارج نے پورچ کی لائٹیں بند کیں۔ اپنا سامان اٹھایا جس میں رائفل، زین اور تھرماس شامل تھا اور شکارگاہ کی جانب چل دیا۔ این بھی اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ پُراعتماد اور پُرعزم تھی۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ ہولٹ اس کی مدد کے لیے کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر جارج غالب آ جائے تو کیا کرنا ہے۔

ایک منٹ بعد ہی این کو معلوم ہو گیا کہ اس نے صحیح مچان کا انتخاب کیا ہے۔ وہ ایک نئی لوہے کی سیٹ تھی جسے درخت کے ساتھ بولٹ کے ذریعے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ لوہے کی سیڑھی بھی لگی ہوئی تھی۔ جب جارج اپنے اسٹینڈ پر چڑھا تو این بھی اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ایک

اچھے شکاری کی طرح جارج بھی مچان پر چڑھتے وقت حفاظتی زین استعمال کرتا تھا تاکہ اگر نیند آجائے تو زین کی وجہ سے نیچے گرنے کا خطرہ نہیں رہے گا۔

این کو سورج نکلنے کا انتظار تھا تاکہ اسے اپنے مقصد کے لیے مناسب روشنی مل سکے پھر اس نے خاموشی سے اپنے جالی دار بیگ میں سے ایک سافٹ بال نکالی اور کھڑے ہوکر اپنے ہاتھ کو ایک مخصوص انداز میں حرکت دی اور گیند کو پوری قوت سے نشانے پر پھینک دیا جس کی مشق اس نے کئی بار کی تھی۔

سافٹ بال پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے سفر کرتی ہوئی جارج کے سر میں جا کر لگی۔ این نے ایک چونکا دینے والی تیز آواز سنی۔ جارج اپنی جگہ پر ڈگمگایا اور اس نے سہارے کے لیے قریبی شاخ پکڑ لی۔ این کو یقین نہیں تھا کہ وہ پہلی کوشش میں جارج کو نیچے گرا دے گی۔ اس سے پہلے کہ جارج کے حواس بحال ہوتے این نے دوبارہ گیند پھینکی۔ اس بار وہ سیدھی جارج کے دائیں کندھے پر جا کر لگی اور رائفل پر اس کی گرفت کمزور ہوگئی۔

جب اس نے دوسرے ہاتھ سے کندھا پکڑنا چاہا تو اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ نیچے گرنے لگا لیکن حفاظتی زین نے اسے پکڑا ہوا تھا حالانکہ این نے رات دو بجے ہی اس کا ایک فیتہ ریتی سے گھس دیا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ جارج کے گھر میں کوئی کتا نہیں تھا ورنہ وہ اتنے اطمینان سے اپنا کام نہیں کر سکتی تھی۔

جارج اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ شاید سیل فون نکالنا چاہ رہا ہوگا۔ این نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لیا۔ پہلی کوشش ناکام رہی لیکن دوسری بار گیند اس کے ہاتھ پر لگی، جارج کی چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے مضروب ہاتھ کو بے چینی سے ہلانے لگا۔ این کو اندازہ ہوگیا کہ اس کی ہر حرکت کے ساتھ کسی ہوئی زین کے کچھ حصے مچان سے الگ ہو رہے ہیں۔

این کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی۔ وہ اس کے مچان سے کچھ اور قریب ہوگئی تاہم اتنا فاصلہ رکھا کہ وہ اسے پکڑ نہ سکے۔ جارج تقریباً الٹا لٹکا ہوا تھا۔ ''تم کون ہو؟'' اس کی آواز میں خوف اور غصہ نمایاں تھا۔ ''میرے علاقے میں کیا کر رہی ہو؟ میرا فون نکالو اور کسی کو مدد کے لیے بلاؤ۔''

''میں یہاں تمہاری مدد کرنے نہیں آئی۔'' این نے ٹارچ کی روشنی زین کے گھسے ہوئے حصے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ جارج تقریباً ایک دھاگے پر لٹکا ہوا تھا۔ اس نے بھی خطرہ محسوس کر لیا۔ اس نے بے قابو ہوکر گھومنا شروع کر دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح زین کے اوپری حصے کو پکڑ لے۔ این نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کم از کم چھ فٹ بلندی سے نیچے گرے گا اور یہ اس کا بازو یا ٹانگ توڑنے کے لیے کافی ہے۔

''تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟'' جارج نے پوچھا۔ ''کیا تم بھی لونی کی طرح میری بیوی کی طرف داری کر رہی ہو؟''

''اس کا لونی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' این نے کہا۔ ''تم نے کیل کو کیوں مار ڈالا؟''

این نے ٹارچ کی روشنی میں جارج کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ ''وہ لڑکا کتے کو کھانا کھلانے آیا تھا، جب میں اسے ہلاک کرنے والا تھا۔ مجھ سے اس کا بھونکنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جب کیل نے مجھے گن کے ساتھ دیکھا تو وہ اپنے آپ کو نہ روک سکا۔''

''ٹھیک ہے، تم نے وضاحت کر دی۔'' این نے کہا۔ یہ شخص اتنی جلدی نہیں مرے گا، وہ انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ وہ آگے کی طرف جھکی اور زین کے گھسے ہوئے حصے پر ہاتھ مار کر اسے کھینچ لیا۔ جارج فوراً ہی گر پڑا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس سے پہلے این اسے اسی کی رائفل سے گولی مارنے کے لیے تیار ہوگئی تھی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی جس پر اسے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔

اس نے سب گیندیں اکٹھی کیں اور انہیں واپس تھیلے میں ڈال دیا اور اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ زمین پر اس کے قدموں کے نشانات تو نظر نہیں آرہے۔ پھر وہ محتاط طریقے سے جنگل سے باہر نکلی۔ واپسی میں اسے ایک اور سنہری موقع مل گیا۔

اس نے ہولٹ کو فون کیا۔ ''میں نے ایک ہرن کا شکار کیا ہے۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

این نے اسے اپنی لوکیشن بتا دی۔ ''میں وہاں آرہا ہوں۔'' ہولٹ نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے کامیاب شکار کیا۔''

این نے ایک گہری سانس لی۔ اسے ہرن کے شکار سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے لونی اور کیل کے قاتل کو اس کے انجام تک پہنچا دیا تھا۔ جارج سے بدلہ لینے کا یہی ایک راستہ تھا۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعر و سخن

❁ وزیر محمد خان .... بٹل ہزارہ

تُو غنی ہے سو خزانوں سے عطا کر مالک
مجھ سے در در کا تماشا نہیں دیکھا جاتا

❁ انیلہ رشید سیال..... خیر پور میرس

مدت سے کوئی شخص رلانے نہیں آیا
جلتی ہوئی آنکھوں کو بجھانے نہیں آیا
کہتا تھا کہ ساتھ جئیں اور مریں گے
اب روٹھ گئے ہیں تو منانے نہیں آیا

❁ جاوید خان..... پنڈی

اِس میں قسمت کی خطا ہے نہ زمانے کا قصور
غم تو انسان کے جینے کی سزا ہوتے ہیں

❁ اُم عبداللہ..... شاہ فیصل ٹاؤن، کراچی

ہوا نے جو بدلا ہے رخ بادباں کا
ٹھہر سا گیا ہے سفر کارواں کا
جھلستی دھوپ میں چھوڑ کر تنہا
دے گیا مقدر وہ بے سائباں کا

❁ محمد انور ندیم..... اسلام نگر (اوکاڑہ)

آیا نہیں وہ رہ گئے رستے سجے ہوئے
یہ سال بھی گزر گیا ہر سال کی طرح

❁ عاصم خان..... پشاور

خالی ہے دل فقیر کے کشکول کی طرح
اِس شہرِ بے وفا سے وفا کون لے گیا

❁ شگفتہ ناصر..... سرگودھا

ہر حقیقت فریب لگتی ہے
جب کوئی اعتبار کھو بیٹھے

❁ انعم کمال..... حیدرآباد

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں
پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

❁ صادق معاویہ..... خان پور ضلع رحیم یار خان

بال و پر کاٹ کے صیاد نے یہ ارشاد کیا
توڑ دیا قفس جا تجھے آزاد کیا

❁ ریاض بٹ ..... حسن ابدال

وطن کے ہوں اگر کانٹے تو بھر لے اپنے دامن میں
اگر ہوں پھول پردیسی تو مت چن بے وفا ہوں گے

❁ پرویز بھٹی..... خانیوال

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اُسے

❁ مسعود علی..... سکھر

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

❁ ریحانہ شبیر.....ملتان

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھیے
اک پھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

❁ اسما ممتاز.....کراچی

اُڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

❁ سعیدہ نسیم.....چنیوٹ

دسمبر کی شبِ آخر نہ پوچھ کس طرح گزری
یہی لگتا تھا ہر دم وہ ہمیں پھول بھیجے گا

❁ اکبر علی اکبر.....خدوخیل بونیر

کیسے عجب موڑ پہ مجھ کو ملے ہو آج
کھونے کا حوصلہ ہے نہ پانے کی آرزو

❁ نبیلہ اظہر.....گھوٹکی

ملنا اگر ترا نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

❁ ثاقب علی.....مری

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

❁ جواد خان.....میانوالی

یہیں رکیں کہ چلیں، کچھ بڑھیں کہ ستا لیں
تھپک رہی ہیں ہوائیں، افق بلاتا ہے
سحر تو آئے گی، آتی رہے گی، دم لے لیں
دلوں میں کوئی مگر چٹکیاں بجاتا ہے کوئی

❁ اسلم راٹھور.....بی

رہزنوں کا حصار ٹوٹ چکا
اہتمامِ سفر کرو، تو چلیں
خوفناک دلدل سے
ہم صغیرو، اُبھر چلو، تو چلیں

❁ صبا حمید.....ٹنڈو الٰہیار

ڈھونڈتا ہوگا ہمیں بھی تو ستارہ کوئی
گھر سے نکلیں تو نکل آئے گا رستہ کوئی
دل کے آئینے میں سوغاتِ سفر لایا ہوں
پھول سا ہاتھ کوئی چاند سا چہرہ کوئی

❁ عمران شیروانی.....لاہور

تری جفا کا فلک سے نہ تذکرہ چھیڑا
ہنر کی بات کسی کم ہنر سے کیا کرتے
تجھے نہیں ہے ابھی فرصتِ کرم نہ سہی
تھکے نہیں ہیں مرے ہاتھ بھی دعا کرتے

❁ آریز ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

بڑا سکون ملا آج اس کے ملنے سے
چلو یہ دل سے توقع کا وسوسہ بھی گیا
عجیب لطف تھا نادانیوں کے عالم میں
سمجھ میں آئیں تو باتوں کا وہ مزہ بھی گیا

❁ محمد ریاض.....لاہور

بولے تو سہی جھوٹ ہی بولے وہ بلا سے
ظالم کا لب و لہجہ دل آویز بہت ہے

❁ محمد یوسف.....روہڑی

بس اب ترکِ تعلق کے بہت پہلو نکلتے ہیں
سو اب یہ طے ہوا ہے شہر سے سادھو نکلتے ہیں

❁ ندا علی.....میرپور خاص

تم اس کی رہنمائی کیا کرو گے
کدھر جانا ہے دریا جانتا ہے

❁ امتیاز احمد.....بہاولپور

وہی کرن ہے کرن ارتقا کی نظروں میں
جو کھل کے ریشۂ گل میں نفوذ کر جائے
جو رنگ بن کے سما جائے بند کلیوں میں
جو آگ بن کے رگِ سنگ میں اتر جائے

❁ صبا سحر.....کراچی

ہم نے دھوئی چہرۂ آفاق سے گردِ ملال
پربتوں پر ہم نے ڈالے گھومتی راہوں کے جال
ہم نے صحراؤں کو بخشا سبزہ زاروں کا جمال
ہم نہ ہوتے تو کسے تھی بحر گردی کی مجال

❁ علی نواز بلوچ.....کوئٹہ

مری ٹوٹی ہوئی کلیو! مرے اترے ہوئے پھولو!
تمہاری ہی مہک سے ذہنِ انساں تازہ دم ہوگا
کھلے گا پھول بن کر، لہلہائے گا چمن بن کر
تمہاری یاد میں اشکوں سے جو رخسار نم ہوگا

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

جانے کیا رنگ دکھائے گا یہ وحشی موسم
اس قدر شور دریچوں میں ہوا کا ہوتا

❁ نعیم احمد ..... بہاولپور

دھرتی سے لوگ بھاگ کے جائیں تو کس طرف
ہر سمت آسماں ہے زمیں سے ملا ہوا

❁ شاہینہ مہتاب..... چنیوٹ

دیکھ لینا گھیر لے گی وہ گھنی ظلمت اُسے
اپنے سائے کو بھی ظالم ڈھونڈتا رہ جائے گا

❁ حنظلہ شاہد..... سکھر

جس ہاتھ میں لکیر نمایاں ہے بخل کی
اُس ہاتھ میں ہیں آج خزانوں کی کنجیاں

❁ امجد ریاض..... چیچہ وطنی

وہم در وہم کی صورت ہے متاعِ ہستی
یہ تو خوابوں میں سرابوں کا سفر لگتا ہے

❁ طاہر مجاہد..... پھالیہ

آسماں اپنے ارادوں میں مگن ہے لیکن
آدمی اپنے خیالات لیے پھرتا ہے

❁ نوشتہ گلزار..... بھکر

اُکتا کے ہوس ناک نگاہوں کے ستم سے
اک پیڑ نے شعلوں سے بدن ڈھانپ لیا ہے

❁ لبنیٰ وکیل..... کوئٹہ

اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ

❁ سید ظفر عباس..... بھوآنہ

پھر بھیانک تیرگی میں آگئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

❁ رخسانہ شکیل..... آزاد کشمیر

کائنات ایک دشتِ بے انجام
اب کہاں ڈھونڈیئے کسی کی گلی

❁ شاہد علی..... فیصل آباد

مرے نیاز کی تکمیل کس طرح ہوگی
اگر میں پا نہ سکا تیری بے رخی کا جواز

❁ نادیہ ریاض..... نواب شاہ

ابھی کچھ اور سلگنا ہے وقت کی لَو پر
ابھی نہیں مرے معیارِ زندگی میں گداز

❁ سلیم قادر..... میانوالی رانجھا

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہ گزر کا ذکر کریں

❁ ناہید یوسف..... اسلام آباد

یہاں اب ان کے اظہارِ محبت کا گزر کیا ہو
کہ سناٹے کی موسیقی پہ بھی سر دھن رہا ہوں میں

❁ زبیر خان..... لیہ

چمک رہے ہیں شگوفے، دہک رہے ہیں گلاب
وفورِ موسمِ گل ہے کہ باغ جلتے ہیں

❁ میمونہ عزیز..... لاہور

وہ دیوانے جو ہمت ہار کے بیٹھے تھے صدیوں سے
اب اپنی منجمد تقدیر سے ٹکرانے آئے ہیں

❁ تنظیم احمد..... جھنگ سٹی

میں گل کو دیکھ کر تخلیقِ گل کی سوچتا ہوں
گلوں کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں

❁ فیاض احمد..... اوکاڑہ

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

❁ مدحت رضوان..... کراچی

کُڑھو نہ راہنماؤں کے عہد و پیماں پر
یہ وہ چمن ہیں جو پھولے مگر کبھی نہ پھلے

❁ ناظم علی..... بنوں

کل مجھ پر الزام تھا سارا آج توفق ہے رنگ تمہارا
کل تم مجھ سے شرماتے تھے آج آئینے سے شرماؤ

❁ ماریہ چودھری ..... پاکپتن شریف

شکایت اپنے توکل سے ہے خدا سے نہیں
کہ میرا دامنِ امید ہی دریدہ رہا

ہال لومین اپنے پہاڑی کیبن کی بالکونی میں کرسی پر بیٹھا خوبصورت موسم سے لطف کشید کر رہا تھا۔ سنہری دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور اس نے ماحول کو روشن کر رکھا تھا۔

چپس کا پیکٹ اور کوک کا ٹن ختم ہوا تو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گریگ آئلس کا تازہ جاسوسی ناول ایک جانب رکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے پائپ میں تمباکو بھرا اور اسے سلگا کر وادی میں کسی نقرئی رنگت والے سانپ کے مانند لہراتے، بل کھاتے دریا کی جانب دیکھنے لگا۔ سرخ لکڑی والے جنگلات سے نیچے وادی بھری ہوئی تھی اور دلفریب نظارہ پہلی بار دیکھنے والوں کو ایک بار ضرور مبہوت کر دیتا تھا۔

اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس اچانک مداخلت پر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور چہرے سے ناگواری ٹپکنے لگی۔ اس دوپہر میں اسے کسی کی آمد کی توقع نہیں تھی..... ویسے بھی کوئی اسے پہلے فون کیے بغیر نہیں آتا تھا۔ غلطی سے اگر کوئی ایسا کر بھی لیتا تو وہ اپنے سخت رویے سے اس بات کو یقینی بنا لیتا تھا کہ اگلی بار یہ غلطی نہ دہرائی

گوشۂ تنہائی

مظہر سلیم ہاشمی

وہ دنیا کے ہر بُرے کام سے کنارہ کش ہو بیٹھا تھا، اچانک اس پُرسکون سمندر میں شناسائی اور انتقام کے پتھر نے طوفان برپا کر ڈالا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تہس نہس ہو کر رہ گیا کیونکہ... اس نے برائی کو چھوڑا تھا مگر برائی تو اس کے تعاقب میں تھی۔

جرم کی دلدل میں اترنے والے ایک قاتل کا ماجرا

جائے۔ اسے بن بلائے مہمان بلائے جان ہی لگتے تھے۔

اب بھی ایک بار تو اس کے جی میں آیا کہ وہ اس دستک کو نظر انداز کر دے اور اپنی جگہ پر ہی لکار ہے لیکن آنے والا بھی کوئی مستقل مزاج ہی تھا جو دستک پر دستک دیے جا رہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی چرمی کرسی چھوڑی، کیبن میں ڈگ بھرتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

سامنے موجود شخص نے اسے دیکھ کر دانت نکالے۔ وہ ایک شاندار پینٹ کوٹ میں ملبوس تھا..... اس کا لباس نہ صرف قیمتی تھا بلکہ بالکل نیا نکور بھی دکھائی دے رہا تھا۔ بیش قیمت جوتے اس کی امارت کا اظہار چیخ چیخ کر کر رہے تھے۔ یہ ڈیو پارڈو تھا۔ لومین کو اس کی آمد سے زیادہ یہ بات حیران کن لگی کہ وہ اکیلا آیا تھا۔ لومین کی جیب کے ساتھ پارک کی گئی اس کی بڑی سی کیڈی لاک لیموزین میں کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔

''کیسے ہو ہال؟ بہت عرصے بعد ملاقات ہو رہی ہے..... شاید چار یا پانچ سال بعد؟'' پارڈو بولا۔

''چھ.....'' لومین نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

''تم اچھے لگ رہے ہو..... ہمیشہ کی طرح فٹ..... تندرست و توانا۔''

''میں روزانہ کسرت کرتا ہوں۔''

''کیا میں اندر آ کر بات کر سکتا ہوں؟'' پارڈو نے اس کی جانب سے دعوت نہ ملنے پر خود ہی جھنجلا کر پوچھا۔

لومین دروازے سے ہٹ کر ایک جانب ہو گیا تو پارڈو اندر داخل ہوا..... اسی اثنا میں وہ دروازہ بھیڑ چکا تھا۔

پارڈو نے اندر داخل ہو کر کیبن کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کیبن کی ایک ایک چیز سے بہترین ذوق کا اندازہ ہو رہا تھا۔ تزئین و آرائش نہایت خوش اسلوبی سے کی گئی تھی۔ دیواروں پر کسی قسم کا کوئی پینٹ نہیں تھا لیکن قیمتی سرخ لکڑی سے بنی وہ دیواریں الگ ہی چھب دکھلا رہی تھیں۔ ان پر لٹکی شکار کی فریم شدہ تصاویر میں لومین کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک جانب موجود شیلف میں نہایت قرینے سے جاسوسی ناول سجے ہوئے تھے۔

''بہت خوبصورت جگہ منتخب کی ہے تم نے.....'' پارڈو نے متاثر ہوتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم اور تمہارا گوشۂ عافیت۔''

''تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے ڈیو.....؟ یقیناً اتنی دور تم مجھے ہیلو کرنے آئے ہو اور نہ ہی میرے مکان کی تعریف کرنے۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' پارڈو نے اس کے روکھے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

لومین نے اپنا پائپ جلایا اور ایک گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگ رہا تھا کہ ایسی ہی کوئی بات ہو گی۔''

''مسئلہ یہ ہے کہ میں شدید مشکل میں پڑ گیا ہوں..... میں تم سے مدد نہ مانگتا لیکن صورتِ حال یہ ہو چکی ہے کہ اب میں کسی پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا۔'' پارڈو نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''تم جانتے ہو ڈیو کہ میں یہ دھندا چھوڑ چکا ہوں.....'' لومین نے کہا۔ ''چھ سال ہو گئے مجھے ریٹائر ہوئے۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں..... اگلے ماہ اپنی چونسٹھویں سالگرہ مناؤں گا۔''

''چونسٹھ سال میں کون سا بڑھاپا آ جاتا ہے.....؟'' پارڈو نے اس کی ہمت افزائی کرنے والے انداز میں کہا۔

لومین نے اس بات کا کوئی جواب دینا گوارا نہ کیا۔

''ہم اچھے دوست رہے ہیں۔'' پارڈو بولا۔ ''میں نے کئی بار تمہاری مدد کی ہے..... کیا تم وہ سب بھول گئے ہو؟ کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ میں کتنی بار تمہارے کام آیا ہوں؟''

''مجھے سب یاد ہے۔''

''میں تمہیں یہ سب مفت میں کرنے کے لیے بھی نہیں کہہ رہا۔'' پارڈو نے اسے قدرے ڈھیلا پڑتے دیکھا تو پیسوں کی بات چھیڑ دی۔

لومین نے یہ سن کر کندھے اچکا دیے جیسے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہ ہو۔

''تم جو فیس لیا کرتے تھے اس کے اوپر پانچ لاکھ مزید لے لینا بلکہ میں تمہیں دس لاکھ مزید کا بونس دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''پیسا اب میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا.....''

''ہال! پلیز مان جاؤ.....'' پارڈو اب گڑگڑانے پر اتر آیا تھا۔

''میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور اتنا عرصہ قتل و غارت میں گزارنے کے بعد اب پھر سے یہ دھندا شروع نہیں کرنا چاہتا۔ میں اتنا کما چکا ہوں کہ اپنی باقی ماندہ زندگی بغیر کوئی کام کیے آرام سے گزار سکتا ہوں۔ مجھے گھومنے پھرنے کا بھی کوئی شوق نہیں ہے..... گھریلو ضرورت کا سامان میں ہفتے میں ایک دن، چار میل نیچے موجود قصبے سے جا کر لے آتا ہوں۔ اپنے من پسند لکھاریوں کے ناولوں کے ساتھ یہاں اکیلے وقت گزارنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں ایک دن کے لیے بھی اپنا یہ گوشۂ تنہائی چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ خاموشی، تنہائی اور میں..... اور کچھ نہیں چاہیے مجھے زندگی سے..... تم سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟'' لومین نے تفصیل سے سمجھا کر انکار کرتے

ہوئے کہا لیکن پارڈو شاید سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

''ہاں، ہاں..... لیکن میں واقعی بہت مشکل میں پھنس چکا ہوں۔ سب اقتدار کا کھیل ہے..... ہر کوئی اپنی قوت کا اظہار کر رہا ہے۔ سرکٹ رہے ہیں اور وفاداریاں بدل رہی ہیں۔ اپنے قابلِ اعتماد اور قریبی ساتھیوں پر بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔''

لومین کا پائپ پھر سے بجھ چکا تھا۔ اس نے ماچس کی ایک تیلی جلائی اور پھر سے اسے سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

''یہ جنگ میرے اور نک گالٹ کے بیچ میں ہے.....'' پارڈو بولا۔

''مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا..... تم اور نک گالٹ ہی اس مجرمانہ کھیل میں سرکردگی کی جنگ لڑ رہے ہو گے۔'' لومین بولا۔ ''یقیناً تمہیں نک سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہی میری مدد درکار ہو گی؟''

''ہاں..... نک سے ہی مجھے چھٹکارا چاہیے۔''

''تم جانتے ہو نا کہ میں اور نک بھی کبھی بہت اچھے دوست رہے ہیں.....؟''

''ہاں جانتا ہوں.....'' پارڈو نے کہا۔ ''لیکن تمہیں میں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں باقی ہر جگہ سے مایوس ہو چکا ہوں۔ کسی اور کے پاس جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی پرانے دنوں میں تم کہا کرتے تھے کہ جو بھی مطلوبہ رقم ادا کرے تم اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تمہارے لیے ذاتی جذبات کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔''

''پرانے دن ہوا ہو چکے ہیں پارڈو..... میں اب بدل چکا ہوں۔''

''صرف تم ہی اس تک پہنچ رکھتے ہو ہال..... تم جانتے ہو کہ تم بہت ہی آسانی سے اس کا کام تمام کر سکتے ہو۔ تمہارے علاوہ وہ آج کل کسی اور ہٹ مین کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دے گا۔''

لومین کش لگاتا رہا لیکن منہ سے کچھ بولنے کی زحمت نہ کی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گہری سوچ میں گم ہو۔

''تم یہ کام کرنے کے بارے میں سوچو تو سہی..... تم سرے سے انکار ہی کر رہے ہو۔ کم از کم میری خاطر اتنا تو کر سکتے ہو کہ اس معاملے میں سوچنے کا وعدہ ہی کر لو۔''

''ٹھیک ہے..... اتنا تو میں کر ہی سکتا ہوں۔'' لومین نے کش لینے کے درمیان منہ سے دھواں اگلتے ہوئے کہا۔

''اچھی بات ہے۔'' پارڈو کے رگ و پے میں اتنی سی بات سن کر ہی اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی۔

''کچھ پینا پسند کرو گے؟ تمہاری حالت سے لگتا ہے کچھ پینا تمہارے لیے بہتر رہے گا۔'' لومین نے اس کی ہیئت کذائی پر تبصرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، ہاں..... کیوں نہیں؟''۔

''اب بھی بوربن میں پانی ملا کر پیتے ہو؟''

''ہاں..... اس کے بغیر اچھی نہیں لگتی۔''

لومین ایک جانب بنے اپنے چھوٹے سے کچن میں گیا اور ایک کیبنٹ کھول کر اس میں سے مشروب کی بوتل نکالی۔ جام میں بوربن کے ساتھ پانی ملایا اور لا کر پارڈو کو پیش کر دیا۔ اس سارے عمل کے دوران اس کے ماتھے پر چھائی تیوری گہری سوچ کی عکاسی کرتی رہی۔

''تم نہیں لو گے؟'' پارڈو نے اس سے پوچھا تو اس کا استغراق ٹوٹا۔

''میں صرف رات کے کھانے کے بعد ہی پیتا ہوں۔'' لومین نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکونی میں آ جاؤ..... اس پہر وہاں کا نظارہ بھی خوب ہوتا ہے اور ہم

تشوگ

پروفیسر صاحب گھر میں داخل ہوئے اور بیوی سے پوچھا۔ ''بیگم! آج آپ نے کیا پکایا ہے؟''

بیوی مہنگائی کی وجہ سے پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی۔ غصے سے بولی۔ ''خاک پکائی ہے۔''

پروفیسر صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''بیگم! اگر خاک کو الٹا کریں تو کاخ بنتا ہے۔ فارسی میں کاخ محل کو کہتے ہیں اور محل کو الٹا کریں تو لحم بنتا ہے اور لحم اردو میں گوشت کو کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج آپ نے گوشت پکایا ہے۔ بھئی بیگم جلدی سے کھانا لگائیں..... بہت بھوک لگی ہے۔''

بیگم بھی کچھ کم نہ تھی۔ کہنے لگی۔ ''اور اگر گوشت کو الٹا کریں تو جناب عالی وہ تشوگ بنتا ہے اور تشوگ سنسکرت میں سوٹے (ڈنڈے) کو کہتے ہیں۔''

اور یہ کہہ کر بیگم اپنی جگہ سے اٹھی ہی تھی کہ پروفیسر صاحب اگلی ساری بات سمجھ گئے اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں اردو ادب کی تاریخ بالکل خاموش ہے۔

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا

دھندے کی بات بھی کرلیں گے۔"

یہ سن کر پارڈو کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"کیا..... کیا تم یہ کام کرنے کے لیے راضی ہو؟" اس کی چمکتی نگاہوں میں سوال تھے۔

"شاید....." یہ کہہ کر وہ ٹیرس کی جانب بڑھ گیا۔

پارڈو بھی اپنا بلوریں جام اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔

"کیسا نظارہ ہے؟" لومین نے سامنے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہایت شاندار اور بے حد دلکش....." پارڈو کے جواب میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ وہ واقعی میں اس شاندار منظر سے متاثر ہوا تھا۔

"یہ دلفریب نظارہ ان بہت ساری وجوہات میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے مجھے اس جگہ سے محبت ہوگئی۔ اسے تم پہلی نظر کی محبت بھی کہہ سکتے ہو۔ یہاں ٹھہر کر میں میلوں دور تک دیکھ سکتا ہوں۔"

لومین چلتے چلتے بالکل ریلنگ کے پاس پہنچ گیا۔ پارڈو نے اس کے قریب آکر نیچے جھانکا۔

"اوہ خدایا..... یہاں سے تو زمین نظر نہیں آتی..... صرف ہواؤں کی سنسناہٹ ہے....."

"یہ پانچ سو فٹ سے بھی زیادہ گہری کھائی ہے۔" لومین نے پُرغرور لہجے میں کہا۔ "جب تم سامنے سے آتے ہو تو اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرا کیبن بالکل پہاڑی کے کنارے پر بنا ہوا ہے۔"

"اچھا سنو..... وہ نک....."

"ریلیکس کرو ڈیو..... اور اس خوبصورت نظارے کا مزہ لو۔" لومین نے اس کی بات کاٹ کر اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ اس نے بات مکمل ہونے کے بعد بھی ہاتھ اس کے کندھے سے اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

پارڈو نے اپنا جام بلند کیا اور گھونٹ گھونٹ کرکے چسکیاں لینے لگا۔ اس کی ٹانگیں ریلنگ کے اوپری حصے سے مَس ہو رہی تھیں۔

لومین غیر محسوس انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹا، اپنا ہاتھ پارڈو کے کندھے سے کھسکاتے ہوئے اس کی پیٹھ تک لایا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ ایک زوردار دھکا دے دیا۔

پارڈو کو جھٹکا لگا تو اس کے بازو آگے کی جانب ہوگئے۔ گلاس اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اچھلا اور گہری کھائی کی جانب محوِ پرواز ہوگیا۔ لمحاتی فرق کے ساتھ خود پارڈو بھی چیختے ہوئے، گلاس کے پیچھے، نیچے کی جانب رواں تھا۔

گھومتے مڑتے، قلابازیاں کھاتے اور چلاتے ہوئے وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کی چیخیں سننے کے لیے وہاں اس کے قاتل لومین کے سوا کوئی نہ تھا اور لومین کو ان چیخوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہ تھی۔

پارڈو جب نظر آنا بند ہوگیا تو لومین کیبن کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے کبھی بھی موبائل فون رکھنے کی زحمت نہ کی تھی کیونکہ اس کے نزدیک یہ وقت ضائع کرنے والا آلہ تھا۔ وہ اپنے لینڈ لائن فون کے پاس پہنچا اور اپنے بٹوے سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس پر لکھا ہوا نمبر ملانے میں مشغول ہوگیا۔

"ہیلو....." ایک کھردری لیکن ہلکی سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ "نک.....؟"

"ہاں بول رہا ہوں..... کون؟"

"میں ہال لومین بات کر رہا ہوں۔"

"ہال....." دوسری جانب سے نک کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ "لگتا ہے کہ تم میری پیشکش پر غور کر رہے ہو؟"

"ہاں کر رہا ہوں۔" لومین بولا۔ "بلکہ صاف الفاظ میں کہوں تو میں کر چکا ہوں۔"

"ہائیں..... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" نک کے استعجاب میں کمی نہیں آئی تھی۔ "لیکن کیسے؟ پچھلی ملاقات میں تو تم نے واضح الفاظ میں مجھے انکار کر دیا تھا۔ میری پیشکش رد کرتے ہوئے تم نے کہا تھا کہ تم ریٹائر ہو چکے ہو۔ ایک دن کے لیے بھی اپنا گوشۂ تنہائی نہیں چھوڑ سکتے۔"

"مجھے چھوڑنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔" لومین مسکراتے ہوئے بولا۔ "اور کام بھی مکمل ہوگیا۔"

"وہ کیسے؟"

"یہ میں تمہیں تب بتاؤں گا جب میری فیس کے ساتھ تم وہ پچاس لاکھ ڈالرز کا بونس بھی لاؤ گے جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" لومین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں، اپنے کچھ بندے بھی ساتھ لے آنا تاکہ لاش کے ساتھ ساتھ پارڈو کی گاڑی بھی ٹھکانے لگائی جاسکے۔"

یہ کہہ کر لومین نے فون بند کر دیا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس نے کرائے کے قاتل کے طور پر بہت عرصہ قتل و غارت گری میں وقت گزارا تھا۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے گوشۂ تنہائی کا سکون روز روز برباد نہیں کرسکتا تھا لیکن گھر آئی لکشمی کو ٹھکرانا بھی حماقت شمار ہوتی ہے۔ اس نے فریج سے ایک کوک کا ٹن نکالا اور بالکونی میں جا کر اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر ناول ..... پڑھنے لگا۔

⌘⌘⌘

جانے کی جلدی

منظر امام

جب بھوک ہو اور روٹی نہ ملے تو بہت دکھ ہوتا ہے... وہ بھی ایک ایسا ہی ضرورت مند تھا مگر اس سے زیادہ ایسا ہنرمند تھا جس کی مثال ملنا مشکل تھی... لیکن تقدیر کی ستم ظریفی کہ اس کے فن کا اعتراف بھی ہوا تو کب... جب وہ ان سب سے بے نیاز ہو گیا۔

پل پل جینے کی تمنا میں قدم قدم پر ٹھکرائے جانے والا ہنرمند

وہ ایک مایوس نوجوان تھا۔

نہ جانے کیوں بہت سے نوجوان ہزار خوبیوں کے باوجود ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

میں تقدیر وغیرہ کا قائل نہیں تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ خدا کی مرضی اور آدمی کی اپنی کوشش اسے ترقی بھی دیتی ہے اور بلندی سے نیچے بھی پھینک دیتی ہے۔ میں اس کی خوبیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتا تھا۔

اس کے پاس ایک ہنر ایسا تھا کہ اچھے اچھوں کو اس

کی کاریگری دیکھ کر پسینے آجاتے تھے۔ وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ وہ ٹائلز پر نقش ونگار بنانے کا ماہر تھا۔ اس مشینی دور میں جب لوگ اس کا کام دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔ ایسے ایسے نقش ابھارتا کہ عقل دنگ رہ جاتی۔

لیکن کئی مہینوں سے اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس انوکھے کام کی مانگ ختم ہوتی جارہی تھی۔

ایک بار میں نے اس سے کہا۔ ''جبران! تمہارا جوہنر ہے نا، وہ تمہیں بہت آگے لے جائے گا۔''

''ہونہہ۔'' وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں طنز بھی تھا اور بے دلی بھی..... ''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں یاسر صاحب۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں اچھے دنوں کے انتظار میں بیٹھا رہوں.....''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے؟''

''جلدی ہے یاسر صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے اپنی دو بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ لڑکے والوں کو تاریخ دے رکھی ہے لیکن کام ہی نہیں چل رہا ہے۔ لوگ میرے کام کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن کام نہیں دیتے۔ ایسی تعریف کا کیا فائدہ۔ چلیں چھوڑیں چائے پلوائیں.....''

یہ اس کی عادت تھی۔ جب بھی میرے پاس آتا، اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہتا چلیں چائے پلوائیں۔ میں نے پیون کو آرڈر دینے کے بعد کہا۔

''دیکھو، میں کوشش کرتا ہوں کہ کہیں تمہاری جاب ہوجائے۔''

''دیکھیں یاسر صاحب! جاب تو میں بہت پہلے کر چکا ہوتا لیکن ایک ضد سی ہوگئی ہے اگر ترقی نام کی کوئی چیز ہوئی ہے تو اسی کام میں کروں گا..... ورنہ نہیں۔''

یہ اس کی ضد تھی یا اس کا جنون تھا۔

مجھے اس کی فکر رہتی تھی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی سے انسیت ہوجائے تو اس کے بارے میں بے چینی سی رہتی ہے۔ جبران ایک ایسا ہی آدمی تھا۔ قدرت نے اسے ایک فنکار بنایا تھا لیکن افسوس اس کے فن کی قدر نہیں ہورہی تھی۔

ایک دن جبران نے مجھے فون کیا۔ ''یاسر صاحب! کیا آپ کچھ دیر کے لیے میرے گھر آسکیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں..... لیکن خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں ہاں، خیریت ہے۔ میں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''

میں نے اس کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ یعنی اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دو بار باہر اسے ڈراپ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ ''گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اسی لیے میں آپ کو اندر اپنے کمرے میں لے جاسکتا ہوں۔''

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں نے پہلی بار اس کے گھر کی حالت دیکھی تھی۔ بہت ہی خستہ تھی۔ در و دیوار سے مفلسی ظاہر ہورہی تھی۔

اس کے کمرے میں ایک ایسی چیز تھی جس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

اس کمرے کی دیواروں پر وال پیپرز لگے ہوئے تھے۔ نہیں..... وہ وال پیپرز نہیں تھے بلکہ غالیچہ تھا۔ چھوٹا قالین جس کو پورے کمرے کی دیواروں پر اس طرح جڑ دیا گیا تھا کہ وہ دیوار کا حصہ بن گیا تھا۔ اس قالین پر ایک باغ کا نقشہ بنایا گیا تھا۔ کیا باغ تھا..... جیتا ہوا۔ لگتا تھا جیسے کمرے میں پھل کھل گئے ہوں۔

''کیسا لگا یہ قالین؟'' جبران نے پوچھا۔

''بہت خوبصورت۔'' میں نے تعریف کی۔ ''اتنا خوبصورت قالین کہاں سے ملا؟''

''کہیں سے نہیں۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''کیونکہ یہ سرے سے قالین ہی نہیں ہے۔''

''کیا..... قالین نہیں ہے تو پھر؟''

''یہ ٹائلز ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اور یہ میرا ہنر ہے۔''

''کیا؟'' میں دنگ رہ گیا تھا۔ ''جبران! تم نے تو کمال کر دکھایا ہے۔ واہ! اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔''

''کئی مہینے لگے ہیں مجھے ان کو بنانے میں۔ بنانے کے بعد میں نے انہیں اس دیوار میں اس طرح لگا دیا ہے کہ قالین معلوم ہوتے ہیں۔''

''واقعی۔ میں تو یہی سمجھا تھا۔''

''آپ چھو کر دیکھ لیں۔''

میں نے دیوار کو چھو کر دیکھا، واقعی وہ ٹائلز ہی تھے۔ بالکل قالین کی طرح۔ اگر ایسے ٹائلز فرش پر لگا دیے جائیں تو قیمتی قالین کا تاثر دیں گے۔

''جبران! یہ تو تم نے کمال ہی کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسی بات کا تو رونا ہے کہ اتنا کمال رکھتے ہوئے جھک مار رہا ہوں۔'' وہ تلخ ہوکر بولا۔

''یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فنکار کی قدر اس کی موت کے بعد ہی ہوتی ہے۔''

''کیا فائدہ ایسی قدر اور ایسی فنکاری کا۔'' اس نے کہا۔ ''چلیں چھوڑیں۔ چائے پلوائیں۔''

وہ اپنی رو میں بول گیا جس طرح میرے پاس آکر

بولا کرتا تھا۔ پھر جب اسے خیال آیا تو ہنسنے لگا۔ ''یاسر صاحب! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا کہ خود آپ اس وقت میرے گھر پر ہیں۔ چائے پلوانے والی بات تو آپ کو بولنی چاہیے تھی لیکن میں بول رہا ہوں۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ صرف دو منٹ دیں۔ میں چائے بناتا ہوں۔''

''جبران! ہم کہیں باہر جا کر چائے پی لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ میری یہ فنکاری بھی دیکھ لیں۔ ایسی چائے آپ نے کبھی نہیں پی ہوگی۔''

وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں اس کے کمرے میں موجود اس کی فنکاری کے نمونے دیکھتا رہا۔ کمال کا آرٹسٹ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کو چائے بنانے کا فن بھی آتا تھا۔

کیا زبردست چائے تھی۔ ایسی چائے میں نے کہیں نہیں پی ہوگی۔ میں نے جب اس کی تعریف کی تو وہی تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔ ''یاسر صاحب! میں پھر وہی بات کہوں گا۔ ایسی فنکاری کا کیا فائدہ۔ ایک طرف تو میرے پاس وقت نہیں ہے اور دوسری طرف زندگی ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔''

''ایک بات بتاؤ۔ آخر تمہیں جلدی کس بات کی ہے؟ میں نے اپنے ایک دوست سے تمہارے لیے بات کی ہے۔ وہ ابھی امریکا میں ہے۔ پاکستان واپس آ کر وہ ٹائلز بنانے کی فیکٹری لگانا چاہتا ہے اور تم اس کے منیجر ہو گے۔ جتنا چاہے ہنر دکھا دینا۔''

''کیا..... سچ؟'' اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ میں تم سے غلط بیانی نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''اگر ایسا ہو گیا تو پھر میرا کمال دیکھیے گا۔'' اس نے کہا۔

میں اس کے گھر سے واپس آ گیا۔ میں نے اس سے غلط نہیں کہا تھا۔ میرا دوست افضل پاکستان واپس آ کر فیکٹری لگانے کی سوچ رہا تھا۔ اس نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ میں اس کے لیے کوئی مناسب بزنس کے امکانات دیکھ کر رکھوں۔ جبران جیسا آدمی اگر اس کے لیے ٹائلز تخلیق کرتا تو اس کے ٹائلز دھوم مچا سکتے تھے۔

میں بھی سوچتا ہی رہا کہ یہ دنیا کیسی ہوتی ہے۔ یہاں جس کے لیے امکانات کے دروازے کھلے ہونے چاہئیں، اسی کے لیے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور نالائقوں کے

غصہ

☆ غصے کو پی جانا نہایت ہی ضروری امر ہے کیونکہ یہ سینے کی کشادگی کی علامت ہے۔ جب تم نے غصے کو پی لیا تو گویا خداوند تعالیٰ کو خوش اور شیطان کو ناراض کر لیا۔ اپنے نفس کو مغلوب کر لیا۔ اے انسان یہی تمہاری جیت ہے۔

☆ غصے کی ابتدا جنون اور انجام پشیمانی ہے۔

☆ عقلمند کی پہچان اس وقت ہوتی ہے جب وہ غصے میں ہوتا ہے۔

☆ غریب کا غصہ غریب کی ہی جان کے لیے مصیبت ہوتا ہے۔

☆ غصے کا ضبط کرنا سرداروں کا پیشہ ہے۔ یہ تلخ ہے لیکن حقیقتاً شکر ہے۔

☆ غصہ عارضی دیوانگی ہے، اس پر قابو حاصل کر لو۔ ورنہ وہ تم پر قابو پا لے گا۔

☆ غم و غصہ اتنا نہ کرو کہ یہ تمہیں کھا جائے۔

☆ غصہ ور ہمیشہ مبتلائے رنج رہتا ہے۔

☆ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔

☆ غصے میں اٹھایا گیا ایک قدم اکثر عمر بھر کا روگ بن جاتا ہے۔

☆ غصہ شیطان کی طرح ہے۔ اس پر قابو پا لو گے تو بہت سی پریشانیوں اور ندامتوں سے بچ جاؤ گے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

مزے آتے رہتے ہیں۔

دوسرے دن میں نے افضل کو فون کر کے اسے بتایا کہ میں نے اس کے لیے ایک بزنس سوچ لیا ہے۔ ''بلکہ میری خواہش ہے کہ تم یہ کام ضرور کرو۔''

''تم کہہ رہے ہو تو ضرور کروں گا۔ لیکن وہ ہے کیا؟''

''ٹائلز بنانے کی فیکٹری۔'' میں نے بتایا۔

پھر جب میں نے اسے تفصیل سے جبران کے بارے میں بتایا تو وہ پھڑک اٹھا۔ ''واہ! یہ بات ہوئی نا۔ اپنے دوست کو سنبھال کر رکھو۔ میں واپس آ رہا ہوں۔''

میں نے فون کر کے جبران کو بتا دیا تھا۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن امریکا سے افضل کا فون آ گیا۔ ''بھائی! میں فوری طور پر نہیں آ سکوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ پیمنٹ کے معاملات اٹکے ہوئے ہیں۔ وہ حل ہو جائیں تو آتا ہوں۔ بس اپنے دوست کو بتا دینا کہ وہ کچھ دن اور انتظار کر لے.....''

''خیر، یہ کوئی بات نہیں ہے۔ وہ انتظار کر لے گا۔''

لیکن افضل کی واپسی میں کچھ دن لگ گئے۔ اس کا معاملہ حل نہیں ہوا تھا۔ اپنے ملک سے تو پیسے باہر بھیجنا شاید اتنا دشوار نہ ہو لیکن باہر سے پیسے پاکستان آنا ایک عذاب ہو جاتا ہے۔ عذاب پاکستان میں ہوتا ہے۔ منی لانڈرنگ اور نہ جانے کیا کیا۔

اور اس دوران جبران سے بھی بات نہیں ہو سکی۔ صرف اتنا پتا چلا کہ اس نے کہیں جاب کر لی ہے۔ میں نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ اچھا ہے کہ مصروف رہے اور ایک دن اچانک افضل میرے دفتر آ گیا۔ اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ ہم بہت دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے تھے۔ دس برسوں بعد ملاقات ہو رہی تھی۔

پھر اس نے مطلب کی بات کی۔ ''یار! اب میں آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ وقت ضائع کیے بغیر تم اس بندے کو بلا لو تاکہ اس سے میٹنگ بھی کر لوں۔''

''کیوں نہیں۔'' میں نے جبران کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔ اس کا موبائل نمبر بند مل رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' افضل نے پوچھا۔

''نہ جانے کیوں اس کا نمبر نہیں مل رہا۔'' میں نے بتایا۔

''وہ رہتا کہاں ہے؟'' افضل نے پوچھا۔ ''کیا ہم اس کے گھر چل سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں لیکن خدا کے بندے ایسی بھی کیا جلدی۔ چلو ہم کہیں چل کر ڈنر کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے گھر کی طرف چلے چلیں گے۔''

''یار! میں صرف تین دنوں کے لیے پاکستان آیا ہوں۔ تھوڑا کام باقی ہے پھر واپس چلا جاؤں گا لیکن جانے سے پہلے چاہتا ہوں کہ اس سے ملاقات کر کے ضروری معاملات طے کر لوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

ہم دونوں جبران کے گھر کی طرف چل دیے۔ راستے میں ہم نے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ کچھ اس نے اپنے بارے میں بتایا، کچھ میں بولتا رہا۔

پھر میں نے اسے جبران کے ہنر کے بارے میں... بتایا تو وہ جوش میں آ گیا۔ ''یہ بات ہوئی نا۔ میرا خیال ہے کہ پوری دنیا میں قالین کے پیٹرن کے ٹائٹلز نہیں ملیں گے۔ یار، تمہارا وہ بندہ تو بہت کام کا ہے۔''

''ایسا ویسا..... تم خود دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے لیکن بے چارہ بہت پریشان ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں آ گیا ہوں تو سمجھو اس کی ساری پریشانی ختم ہونے والی ہے۔''

ہم کچھ دیر میں جبران کے گھر پہنچ گئے لیکن وہاں کی صورت حال کچھ ایسی تھی کہ خود میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے گھر کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں نے گاڑی سے اتر کر ایک سے پوچھا۔ ''کیا ہوا بھائی خیریت تو ہے نا؟''

''نہیں بھائی خیریت کہاں؟ بے چارہ جبران خودکشی کر کے مر گیا ہے۔ اس کی لاش اسپتال پہنچا دی گئی ہے۔ ضروری کارروائی کے بعد گھر والوں کے حوالے کر دی جائے گی۔''

میں اور افضل یہ سن کر سکتے میں رہ گئے تھے۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے بے خود ہو کر پوچھا۔

''بے چارہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا۔''

''ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا..... لیکن کس لیے؟ کیا ہوا تھا اس کو؟''

''اوہ۔ آپ کو نہیں معلوم۔ اس کا کینسر آخری اسٹیج پر تھا۔''

ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر دور پھینک دیا ہو۔ وہ کینسر کا مریض تھا اور اس نے آج تک مجھے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

لیکن نہیں..... وہ مجھے بتاتا رہتا تھا کہ اسے جلدی ہے۔ وہ جلد سے جلد اپنے گھر والوں کے لیے کچھ کر لینا چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ کہا کرتا تھا کہ اسے بہت جلدی ہے۔ ایک جلدی میرے دوست افضل کو تھی۔ وہ امریکا واپس جانا چاہتا تھا اور ایک جلدی جبران کو تھی۔ وہ آخرت کے سفر پر جانا چاہتا تھا۔ شاید اس نے تکلیف سے تنگ آ کر اپنی جان دے دی تھی۔

اب پتا چلا کہ اسے جانے کی کیوں جلدی تھی۔ ہم اس کے لیے بہتر زندگی کی پلاننگ کر رہے تھے اور موت کی اپنی پلاننگ تھی۔ ہماری پلاننگ کچھ اور ہوتی ہے اور موت کی پلاننگ کچھ اور.....

اور پلڑا ہمیشہ موت ہی کا بھاری رہتا ہے۔

⌘⌘⌘

دھوکا

انجم فاروق ساحلی

رشتے جب بوجھ بن جائیں تو ان سے جان چھڑانے کے لیے سوچنا پڑتا ہے خاص طور پر ان لوگوں کو جنہیں رشتے تو وبالِ جان لگتے ہیں مگر ان کی دولت سے بہت پیار ہوتا ہے جس پر انہیں صرف اپنا حق محسوس ہوتا ہے...کچھ ایسی ہی چال یہاں بھی چلی گئی مگر...نتیجہ بڑا سنسنی خیز نکلا جس نے ہر ایک پر سکتہ طاری کر دیا۔

خطرناک سازشوں کے درمیان "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے" کی کھلی تفسیر

شاہد اپنے خیالی منصوبے مکمل کرتا ہوا تیز ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اس کی کرائے کی گاڑی تیزی سے اوورٹیک کرتی ہوئی اسپتال کی طرف بڑھنے لگی۔

اس کی دادی اماں کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ انہیں سانس کی شدید تکلیف لاحق تھی۔ اس کے علاوہ وہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی بھی ہو چکی تھیں۔ وہ پچھلے پندرہ روز سے اسپتال میں ایڈمٹ تھیں۔ ان کا کمرا ہوادار، کشادہ اور خوبصورت تھا۔ وہ ایک مال دار خاتون تھیں لہٰذا ڈاکٹر اور نرسیں پوری

توجہ سے ان کے علاج معالجے میں منہمک رہتے تھے۔ وہ نرسوں کی مٹھی بھی گرم کردیا کرتی تھیں۔

نرس سائرہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اخلاق اور خدمت گزار بھی تھی۔ وہ خوش گفتار بھی تھی اور دادی اماں سے گپ شپ کرتے ہوئے ان کا حوصلہ بڑھاتی جس سے دادی اماں تروتازہ دکھائی دیتیں۔

دادی اماں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ تندرست ہونے کے بعد اس کی شادی کسی اچھے لڑکے سے کروادیں گی۔ نرس خوشی سے مسکرادی۔

☆☆☆

شاہد اسپتال کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرکے تیز تیز چلتا ہوا دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اپنی دادی کی لمبی چوڑی جائداد کا اکلوتا وارث تھا۔ دادی کی طبیعت بگڑنے کی خبر سن کر اس کی طبیعت باغ باغ ہوگئی تھی۔ وہ قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور اب اسے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ گرل فرینڈ نیلوفر کی فرمائشیں۔ آخر وہ اتنا روپیہ کہاں سے لاتا۔ جوئے کی عادت نے اسے برباد کردیا تھا اور اب بربادی اور تباہی سے نکلنے کی صورت صرف یہ تھی کہ دادی اماں کل کے بجائے آج ہی دنیا سے رخصت ہوجائیں۔

زینہ طے کرکے وہ کاریڈور سے گزر کر دادی اماں کے خوبصورت کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹرز اور نرسیں دادی کے بستر کے قریب موجود تھے۔ دادی اماں اس وقت تکیے سے ٹیک لگائے مسکرا رہی تھیں۔ نرس سائرہ دادی کے بالکل قریب کھڑی انہیں ہدایات دے رہی تھی۔ ڈاکٹر باہر جانے کے لیے مڑا تو شاہد تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا دادی اماں بچ جائیں گی؟ مجھے تو کچھ سنگین اطلاع ملی تھی۔''

''بچ جائیں گی نہیں، بچ گئی ہیں۔'' ڈاکٹر مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ہیلو نرس سائرہ! دادی اماں کیسی ہیں؟''

''اب تو ٹھیک ہیں۔'' نرس اس کی طرف مڑی۔ ''مگر رات کو ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ بلڈ پریشر بڑھا اور سانس بھی سینے میں اٹکنے لگا تھا۔'' شاہد آگے بڑھا۔ اس نے پھلوں کا تھیلا اور پھولوں کا گلدستہ دادی کے سرہانے رکھ دیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ دادی اماں مسکرادیں۔ وہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا کہ کب دادی کی قبر کو پھولوں کے دستوں سے سجائے۔ وہ بری طرح حالات کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔

اس کی دادی کی موت ہی اس کی زندگی بن سکتی تھی۔ ورنہ کوئی غنڈا اسے مار کے کسی اندھیری گلی میں پھینک سکتا تھا۔ سارے قرض خواہ آگ بگولا ہو رہے تھے۔ اس کی گاڑی تو وہ چھین ہی چکے تھے اور اب وہ کرائے کی کار استعمال کر رہا تھا۔ برائی کا راستہ اسے پستی میں دھکیل چکا تھا۔

''دادی اماں! آپ تو اچھی ہیں۔'' شاہد نے آگے بڑھ کے دادی کا ہاتھ اپنے گال سے چھوتے ہوئے کہا۔

دادی نے ہاتھ اس کے سر پر پھیرا اور پُرشفقت لہجے میں بولی۔ ''شاہد! تم اچھے لڑکے ہو، میری خدمت میں پیش پیش رہتے ہو۔ میرے بعد سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ میں ساری جائداد تمہارے نام لکھ چکی ہوں۔''

''ہاں..... ہاں، دادی اماں! یو آر گریٹ، آپ جیسی دادی تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ ہمارے سارے رشتے دار — ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ اب صرف ہم دونوں ہی زندہ ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا۔''

دادی اماں اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ وہ پھر مخاطب ہوا۔

''آپ کہتی تھیں نا کہ شادی کرلو، میں نے اب ایک لڑکی دیکھ لی ہے۔ آج تو نہیں آئی پھر کسی دن لاؤں گا، آپ سے ملوانے کے لیے۔'' شاہد نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

''دادی اماں! سچ پوچھیں تو مجھے جائداد کی نہیں، آپ کی زندگی کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ کے بغیر تو میں بھری دنیا میں تنہا رہ جاؤں گا۔ پھر میں کس کے لیے پھول چنوں گا؟ پھر کون شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے گا؟ کون مجھے میری غلطیوں پر ٹوکے گا؟ کون میری اصلاح کرے گا؟''

شاہد نے جذباتی لہجے میں دادی اماں کا ہاتھ چوما اور پھر سر پر رکھ لیا۔ نرس سائرہ دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑی رہی پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

شاہد واپسی پر افسردہ اور بجھا بجھا سا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دادی اماں رخصت ہو رہی ہیں اور اب جائداد ملنے سے اس کے مسائل حل ہوجائیں گے بلکہ وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے گا۔ آخر دولت ہی تو وہ چابی ہے جس سے دنیا کے ہر عیش و آرام کا دروازہ کھولا جاسکتا ہے۔ پھر لوگ کس طرح دولت مند کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ پیار، ہمدردی، توجہ سب کچھ ملنے لگتا ہے۔

☆☆☆

وہ نیلوفر کے فلیٹ میں تھا اور وہ اس کے پہلو میں موجود تھی اور اپنی فرمائشوں سے اس کا سر کھا رہی تھی۔ شاہد

سنتے سنتے اچانک غصے سے کھولنے لگا۔ وہ چالاکی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ گال تھپتھپانے لگی۔ اسے سہانے خواب دکھانے لگی۔ شاہد کی ذہنی کیفیت بدلنے لگی اور دادی اماں کی محبت دم توڑتی چلی گئی۔ وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔ اس پر سفاکی اور بے رحمی غالب آنے لگی۔ نیلوفر کا ایک جملہ بار بار اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔ ''کسی نہ کسی طرح اسے راستے سے ہٹادو۔''

☆☆☆

اگلی اتوار کو وہ دادی کے خوبصورت کمرے میں داخل ہوا تو ڈاکٹر اور نرس اسے دیکھ کر جاچکے تھے۔ باغیچے کی جانب والی کھڑکیاں بند تھیں۔ صبح سے ہی موسلا دھار بارش برس رہی تھی اور سردی بھی بڑھ گئی تھی۔

شاہد نپے تلے قدموں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس کی دادی کندھوں تک کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ اس نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی اور صبح کا اخبار قریب ہی رکھا ہوا تھا۔

شاہد کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ایک طرف محبت تھی تو دوسری طرف دولت کا حصول۔ وہ اب زندگی بدلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ سنگ دلی سے مسکرایا اور پھولوں کا گلدستہ اور پھلوں کا تھیلا دادی کے سرہانے رکھ دیا۔ اس نے بے رحمانہ نگاہ ڈال کر اونگھتی ہوئی دادی کے سر کے نیچے سے تکیہ نکالا اور اس کے منہ پر رکھ کے دبا دیا۔ دادی اماں ذرا سا مچلیں پھر ساکت ہوگئیں۔ شاہد نے تکیہ منہ سے اٹھایا۔ سر کے نیچے رکھا اور پھر دادی اماں پر ایک اداس نگاہ ڈال کے، بدحواسی کے عالم میں باہر بھاگا۔

اس نے شور مچادیا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹرز اور نرسیں کمرے میں موجود تھے۔ شاہد بدحواسی کے عالم میں دادی اماں کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ ''میں کمرے میں داخل ہوا، بستر کے قریب پہنچا۔ پھلوں کا تھیلا اور پھولوں کا گلدستہ سرہانے رکھا۔ ان کا ہاتھ تھاما تو وہ سرد اور بے جان تھا۔ ان کی سانس رکی ہوئی تھی۔''

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر معائنہ کیا اور اعلان کیا کہ وہ مرچکی ہیں۔ سانس کے عارضے نے ان کی جان لے لی ہے۔ لیکن عین اسی وقت کمرے کے واش روم کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا اور سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہائیں..... یہ..... یہ کیا؟'' وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دادی اماں کو دیکھنے لگے جو واش روم سے نکل کے آگے بڑھ رہی تھیں۔ شاہد کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ برسوں کا بیمار دکھائی دینے لگا۔ دادی اماں شاہد کے قریب آگئیں۔

''حرامزادے، بے غیرت، لالچی، کم ظرف..... تم نے اپنی اصلیت دکھا ہی دی۔ تمہارا خون تو اچھا تھا لیکن باہر کی گندگی تمہارے اندر چلی گئی۔ تمہاری خدمت، لگاوٹ اور محبت دھوکا تھا۔'' دادی اماں نے ایک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔ ''آستین کے سانپ۔'' ان کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

''یہ..... یہ..... یہ کون ہے آخر؟'' نرسیں اور ڈاکٹر ہکلا کر پوچھنے لگے۔ وہ حیرت میں غوطہ زن کبھی بستر پر لیٹی عورت اور کبھی شاہد کے قریب کھڑی دادی اماں کو دیکھنے لگتے۔ ان کا اشارہ بستر کی طرف تھا۔

''یہ میری بڑی پرانی سہیلی ہے۔ یہ تقریباً میری ہمشکل ہے۔ بڑھاپے کی لکیروں نے خدوخال کا فرق اور بھی کم کردیا ہے۔ یہ راولپنڈی میں رہتی ہے۔ لاہور آئی تو صبح ہی صبح مجھ سے ملنے چلی آئی۔ میں چونکہ اب چلنے پھرنے لگی ہوں اس لیے باہر کھڑے گارڈ، نرسیں اور اسٹاف نے سمجھا کہ میں ہی روم سے باہر نکل کے چل پھر کر واپس لوٹ آئی ہوں۔ ہم دونوں نے اسکول کے زمانے میں ایک ڈرامے میں کام بھی کیا تھا۔ ہمیں جڑواں بہنوں کا رول دیا گیا تھا۔''

بولتے ہوئے دادی کی غضب ناک نظریں پھر شاہد پر مرتکز ہوئیں۔ ان کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ شاہد کا سر جھک گیا اور رنگ زرد پڑ گیا۔

نرس سائرہ نے مزید استفسار کیا۔ دادی اماں کے لب حرکت میں آئے۔ ''میں صبح واش روم میں گئی فارغ ہوکر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازے کی جھری سے کمرے کا منظر دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ میری سانس اکھڑ گئی۔ میری سہیلی جمیلہ تھک کے بستر پر لیٹ گئی تھی، وہ بھی بڑھاپے کے عارضوں کا شکار تھی۔ یہ بدبخت کمرے میں داخل ہوا۔'' دادی نے اشارہ کیا۔ ''پھلوں کا تھیلا اور پھولوں کا گلدستہ سرہانے رکھا۔ پھر بے رحمی سے تکیہ سر سے نکالا اور جمیلہ کے منہ پر رکھ کے دبا دیا۔ میری تو جیسے سانس ہی رک گئی اور چکر سا آگیا۔ میں نے مضبوطی سے دروازے کا ہینڈل دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھا۔ اب..... اب میں اسے جائداد نہیں دوں گی۔ ابھی وکیل کو بلوا کر وصیت نامہ تبدیل کروادوں گی۔''

دادی اماں نے منہ موڑ لیا اور شاہد ندامت کے پسینے میں بھیگا ہوا چکرا کر فرش پر گر پڑا۔

⌘⌘⌘

دوسرا اور آخری حصہ

آتش زیر پا

طاہر عمیر

وہ جو طاقت کے نشے میں گم تھے... مفادات اور خواہشات کے بے ہنگم ریلوں میں بہے چلے جارہے تھے مگر... ایک روز انہی سرور اور رنگینیوں نے ہر رشتے کو بے رنگ اور تار تار کردیا جبکہ دوسری جانب سفر درسفر اختیار کرنے والے چند بے بس لوگوں کی مجبوریاں رفتہ رفتہ ان کی طاقت بنتی جارہی تھیں۔ وہ سب مسافر تھے اور زندگی کے ہر پل سے نتیجہ نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ تلخ تجربات نے ان کے احساسات میں چبھن اور کرب کی کرچیوں کا زہر بھر دیا تھا۔ ہر شخص جینے کی خواہش میں موت سے برسرپیکار تھا اور قاتل وقت کا جوش بھی کسی کی محبت کے چراغ کو تیز آندھیوں سے بچانے کے لیے ایک طوفان سے لڑ رہا تھا کیونکہ استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابلِ نفرت ہے۔ وہ محض نامکمل بے جان پُتلے نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان تھے اور جو مکمل انسان کہلاتے تھے ان میں بچی کھچی انسانیت بھی حیوانیت کا روپ دھارنے میں مصروف تھی۔

معاشرے کے ناسوروں کے ہاتھوں جنم لینے والے سرد انتقام کی لرزہ خیز روداد

سرخاب کی بات پر تیمور بری طرح چونک گیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جیسے کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ایک جن کی جان کسی طوطے میں ہوتی ہے..... اور جادوگر اس کے پیچھے ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہم جیسے لوگوں کی جانیں بھی کسی نہ کسی مرجانے طوطے میں بند ہوتی ہیں۔ تو اتنا سمجھ لے پیارے..... تیرا وہ شاہنواز اس ڈبے میں بند ہے۔''

''اوہ! آخر ہے کیا اس کے اندر؟'' تیمور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اسے چھوڑ..... تو بس یہ بتا کہ اب کیا کرنا چاہیے..... مار دینا چاہیے یا چھوڑ دینا چاہیے۔'' اس نے تیمور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''دادا! میں قتل و غارت نہیں چاہتا..... میں بس یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اور اس بچے کو چھوڑ دیا جائے۔ ہم گمنامی میں کہیں زندگی بسر کرلیں گے لیکن سلطان عالم کے لیے خطرہ نہیں بنیں گے۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں پیارے..... تو بول نا کیا کہتا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے دادا..... اسے مارنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ وہ نہیں ہوگا تو کوئی اور آجائے گا کیونکہ وہ تو کسی اور کا حکم مان رہا ہے۔''

''دیکھ پیارے..... دو راستے ہیں تیرے پاس..... ایک یہ کہ تیرے کاکے کی زندگی تو بچ جائے لیکن یہ تجھ سے دور کردیا جائے۔ یہ مستقل حل ہوگا اور دوسرا یہ کہ وہ تیرا پیچھا چھوڑ دیں اور تو اپنے کاکے کے ساتھ ان کے خوف سے آزاد رہ سکتا ہے لیکن یہ کوئی مستقل حل نہیں ہوگا۔''

''دادا! میں اپنے بچے کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں..... اب وہی میری زندگی کا محور ہے۔''

''ٹھیک ہے رے..... تو پھر ایسا ہی ہوگا۔'' سرخاب دادا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس کے بعد اس نے تھوڑی دیر تیمور سے اور باتیں کیں اور پھر تیمور کو جانے کا اشارہ کردیا۔

تیمور واپس اپنے کمرے میں آگیا جہاں حماد ایک خواجہ سرا کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

اس بات چیت کے بعد اگلا دن جیسے کسی معجزے کا دن تھا۔ ایسا معجزہ جسے دیکھنے کا وہ ابھی خواب بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شاہنواز عرف شاہنا خود حویلی میں آیا اور اس کے ساتھ ملکہ سمیت پانچوں مغوی خواجہ سرا سلامت حالت میں موجود تھے جو اس نے سرخاب دادا کے حوالے کردیے۔ شاہنواز کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ سرخاب دادا کسی بے تکلف دوست کی طرح اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اندر اپنے کمرے میں لے گیا تھا اور تقریباً ایک گھنٹے بعد اچانک ہی تیمور کو اندر بلایا گیا اور صرف تیمور کو ہی نہیں بلکہ حماد کو بھی..... وہ حماد کو بانہوں میں تھامے ہوئے خوفزدہ انداز میں اندر داخل ہوا کیونکہ وہاں وہ شخص موجود تھا جو اس کی اور حماد کی جان کا دشمن تھا مگر کمرے کی فضا میں وہ جانی دشمن شکست خوردہ انداز میں بیٹھا تھا۔ سرخاب نے تیمور کو اپنے پاس رکھی کرسی پر بٹھایا اور شاہنواز سے بولا۔

''بول بھی مرجانیا..... اب بولتی کیوں بند ہوگئی تیری..... چل بتا اسے اپنی زبان سے..... بتا اسے کہ اب اسے تجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

شاہنواز نے گہری سانس لے کر سر اٹھایا اور تیمور اور حماد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں کو اب مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔ میں تمہارے پیچھے آؤں گا نہ ہی تم دونوں میں سے کسی کو کوئی نقصان پہنچاؤں گا..... یہ وعدہ ہے میرا۔''

تیمور پھٹی پھٹی نگاہوں سے لاہور کے سب سے خطرناک غنڈے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس وقت یوں کندھے ڈھلکائے بیٹھا تھا جیسے کوئی جواری جوئے میں اپنی آخری پونجی ہار بیٹھا ہو۔

''کیوں میرے پیارے! یقین آیا اس کی بات پر؟'' سرخاب نے تیمور سے پوچھا۔ ''نہیں آیا تو کرلے..... یہ مرجانا سچ بول رہا ہے۔''

تیمور گنگ سا کبھی شاہنواز تو کبھی سرخاب کی طرف باری باری دیکھنے لگا۔ یہ اچانک اسے کیا ہوگیا تھا، کیسے ہوگیا تھا؟ آگ برف کیسے بن گئی؟ موت ٹل کیسے گئی؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ لاہور کا سب سے بڑا غنڈا تھا کون..... شاہنواز یا سرخاب دادا؟

''میں چلوں اب.....'' شاہنواز نے اٹھتے ہوئے کہا۔ سرخاب نے اٹھ کر اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''وعدے پر قائم رہنا..... میں مرجانا اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔''

شاہنواز ایک اچٹتی نگاہ تیمور پر ڈال کر چلا گیا۔ سرخاب واپس پلٹ کر تیمور کی گود میں خاموش پڑے حماد کو

گدگدی کرنے لگا۔

''یہ..... کیا تھا دادا یہ سب؟'' تیمور نے کہا۔

''یہ تیری اور تیرے کاکے کی آزادی کا پروانہ تھا..... جا اب تو آزاد ہے پیارا..... پورے لہور میں جدھر مرضی ..... جدھر تیرا مرجانا دل کرے..... آزادی سے رہ، اپنے کاکے کے ساتھ..... کوئی تیرا بال بھی بیکا نہیں کرے گا۔''

''مگر یہ سب..... یہ سب کیسے ہوگیا؟ کہیں یہ کوئی چال تو نہیں شاہنواز کی۔'' تیمور نے کہا۔

''میرا سوہنا! مرد درندگی پر اتر آئے تو خون کی ندیاں بہا دیتا ہے۔ عورت انتقام پر اتر آئے تو عبرت کا نشان بنا دیتی ہے..... اور ہیجڑا اپنی اصلیت پر آجائے تو صرف خود نہیں ناچتا..... شاہنے جیسے مردوں کو بھی نچا دیتا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں اسے جاتے ہوئے، وہ ناچتے ہوئے جارہا تھا مرجانا۔'' سرخاب دادا کہہ رہا تھا اور تیمور گنگ بیٹھا رہا۔ سرخاب دادا نے ایسا کیا کیا تھا؟ یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا..... پھر اس کے ذہن میں وہ سفید ڈبا گھوم گیا جس کے بارے میں سرخاب نے کہا تھا کہ اس میں شاہنواز کی جان بند ہے۔ یہ شاید اسی ڈبے کا کمال تھا اور پھر اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی جب اس نے سرخاب سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ اسی وجہ سے ہے؟

''ہر انسان کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے پیارا جس کے سامنے وہ سلامت نہیں رہ سکتا..... اور دشمنوں کی کمزوریوں کو تلاش کرنا تو جنگ کا اصول بھی ہے۔ ہم بھی اسی کمزوری کی تلاش میں تھے جس سے شاہنواز کو قابو کیا جاسکے۔ بہت عرصہ پہلے سے ایک خبر کی سن گن تھی ہمارے کانوں میں..... لیکن ہم نے دھیان نہیں دیا لیکن اس دن تمہاری باتوں سے ہمیں یہ خیال آیا کہ اس خبر کے بارے میں پتا کروایا جائے..... اور پھر ہمارے ہاتھ وہ طوطا لگ گیا جس میں شاہنواز کی جان بند تھی۔ تو فکر مت کر پیارا۔ یہ کوئی چال یا چالاکی نہیں ہے..... تو سچ میں آزاد ہے۔ اب کوئی تیرے اور تیرے کاکے کے بیچ نہیں آئے گا رے۔'' سرخاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حویلی میں ایک بار پھر جشن کا سماں پیدا ہوگیا۔ مغوی خواجہ سراؤں کی آزادی کی خوشی میں خوب ہنگامہ کیا گیا۔ حماد اس ہنگامے کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ وہ ناچنے والوں کے ساتھ اچھل رہا تھا۔ اگلے دن ہی تیمور نے وہاں سے جانے کی تیاری شروع کردی۔

''تیرے جانے کی بات میں نے یونہی کہی تھی مرجانیا..... ورنہ دل تو کہتا ہے کہ یہیں رہ لے ہمارے ساتھ..... پر پتا نہیں تو میری بات کو کیا سمجھے۔'' سرخاب نے تیمور کی طرف جھک کر کہا تو تیمور چونک گیا۔ وہ سرخاب کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''دادا! میں آپ لوگوں کے بارے میں ایسا ویسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری اور حماد کی جتنی سانسیں باقی ہیں، سب آپ کی قرض دار ہیں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا لیکن اس کی وجہ وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے حماد کی خاطر اس کے مستقبل کی خاطر یہاں سے جانا ہوگا۔''

سرخاب دادا نے سر ہلا دیا اور حوصلہ افزائی کے انداز میں اس کا شانہ تھپتھپایا۔ تیمور اور حماد کو حویلی سے..... رخصت کردیا گیا۔ اسے بہت سارے تحائف دیے گئے۔ حماد کو پکڑ پکڑ کر سب نے اتنا چوما کہ وہ بے چارہ رونے لگا۔

اس کے بعد سب کی نم آنکھوں کی طرف شکریہ کے انداز میں دیکھتے ہوئے تیمور نے حماد کے ساتھ حویلی کو چھوڑ دیا۔ حویلی کی گاڑی نے اسے گلبرگ تھری میں واقع اپنے گھر تک پہنچا دیا۔ وہ گھر جہاں اس نے مینا کو لانے کا خواب دیکھا تھا..... لیکن اب وہ مینا کے بیٹے کے ساتھ اس گھر میں داخل ہورہا تھا۔

☆☆☆

آج کا دن اس گھر میں بہت خاص تھا۔ آج چھیناں کی سالگرہ تھی۔ خواجہ سراؤں کے ہاں گرو کی سالگرہ ہی سب سے بڑا تہوار ہوتی ہے۔ یہ بات چنبیلی نے اسے بتائی تھی۔ رات کو انہوں نے سالگرہ منانے کا بھرپور پروگرام بنا رکھا تھا۔ اس لیے صبح ہی صبح اٹھ کر سبھی نے اپنے اپنے حصے کے کام نمٹانے شروع کردیے۔ گھر کی صفائی تو روز ہوتی تھی لیکن آج دیواروں، چھتوں اور دروازوں تک کو بھی اچھی طرح صاف کیا گیا تھا۔ صحن کو کاغذی اور پلاسٹک کی آرائشی لڑیوں سے سجایا گیا تھا۔ پروگرام چونکہ صحن میں تھا، سو وہاں بیٹھنے کے لیے کرسیاں لگائی گئیں۔ ساؤنڈ سسٹم کو مناسب جگہ پر سیٹ کیا گیا۔ اس تہوار کو منانے کے لیے سب نے ہی اپنی اپنی جمع پونجی میں سے بچت کیے گئے تمام پیسے چنبیلی کے ہاتھ میں تھما دیے تھے..... جن میں سے کچھ بندیا کو دیے گئے کہ وہ بازار جا کر سامان لے آئے۔ بندیا جاتے ہوئے شہزادے کو یہ کہہ کر ساتھ لے گئی کہ باہر گھوم آنے سے اس کا دل تھوڑا بہل جائے گا۔ ایک خواجہ سرا کے ساتھ گلیوں اور بازار میں پھرنا اس کے لیے ایک عجیب تجربہ تھا۔ اوپر سے بندیا بھی کسی سے کم نہ تھی۔ گولی کا جواب بم سے دیتی تھی۔ گلی کے

موڑ پر موٹر سائیکل سوار ایک نوجوان نے انہیں دیکھ کر پہلے سیٹی بجائی پھر فقرہ کسا۔ ''کدھر جارہی ہے چاند تارے کی جوڑی.....؟''

بندیا نے جھٹ سے کہا تھا۔ ''تیری اماں کی برات پر.....تو چلے گا ساتھ؟''

نوجوان کھسیانی ہنسی ہنس کے بولا۔ ''میں تو جہنم میں بھی ساتھ جانے کو تیار ہوں۔''

بندیا زور کی تالی بجا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''چل تجھے وہیں چھوڑ کے آتی ہوں۔'' نوجوان نے گھبرا کر موٹر سائیکل کو کک لگائی اور ہوا ہو گیا۔ بندیا نے مڑ کر شہزادے کا ہاتھ تھام لیا اور بڑبڑائی۔ ''نامراد.....منحوس کہیں کا.....''

تھوڑا آگے جا کر ایک اور واقعہ ہوا۔ سامنے سے ایک برقع پوش خاتون اپنی چھوٹی سی بچی کی انگلی پکڑے چلی آرہی تھی۔ بندیا نے دور سے سلام کیا۔ ''سلاما لیکوم باجی.....''

خاتون نے پھرتی سے بچی کو اٹھایا اور خوفزدہ قدموں سے تقریباً بھاگتی ہوئی ان سے بچ کے نکل گئی۔ خاتون کی اس حرکت پر بندیا دانت کچکچا کر بولی۔ ''آئے ہائے سلام ہی تو کیا تھا.....میں نے کون سا پستول نکال کر دکھایا تھا۔''

شہزادے نے بندیا کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں افسردگی کے تاثرات نمایاں تھے۔ شہزادے کو اپنی طرف دیکھتا پا کر بندیا نے زبردستی مسکراہٹ سجائی اور بولی۔

''دیکھ لے شہزادے.....کیا ہوتا ہے ہمارے ساتھ جب ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں تو.....کوئی چھیڑتا ہے اور کوئی ڈرتا ہے۔ جیسے ہم انسان نہ ہوں.....کوئی جانور ہوں۔''

آخر میں اس کا لہجہ افسردہ ہوتا چلا گیا۔

شہزادہ حسبِ معمول خاموش ہی رہا۔ گلیوں سے نکل کر بازار میں پہنچے تو وہاں اس سے زیادہ سنگین ماحول تھا۔ کیا نوجوان، کیا بوڑھے.....کوئی آوازیں کس رہا تھا اور کوئی سیٹی بجا رہا تھا۔

ایک طرف دودھ دہی کی دکان کے باہر پھٹے پر بیٹھے پہلوان نے نعرہ لگاتے ہوئے خالص لاہوری لہجے میں کہا۔

''آؤ میڑھی جان.....لسی شسی پی لو.....''

بندیا شاید اسے جانتی تھی لہٰذا اس نے کوئی سخت جواب نہیں دیا۔ ''نہ پہلوان جی.....آپ کی لسی ہمیں ہضم نہیں ہوتی۔''

پہلوان بولا۔ ''میں کیہا شہزادیو.....پیڑے والی نہ پینا.....سادہ پی لو.....پر کدی ساڈے کول بہہ وی جایا کرو۔''

بندیا نے ہاتھ مچا کر کہا۔ ''نہ جی شکریہ۔''

''اے نال کون جے؟ پہلے تو کدی نہیں دیکھا؟'' پہلوان مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا شہزادے کو گھورتے ہوئے بولا۔

''اپنا ہی ہے پہلوان جی.....آج ذرا جلدی ہے پھر بتاؤں گی۔'' بندیا نے تیزی سے کہا اور شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر پہلوان کی اگلی بات سننے سے پہلے ہی آگے بڑھ گئی۔

اس کے بعد ان کی خریداری شروع ہوئی تو وہ الگ تماشا تھا۔ جس دکان میں رش ہوتا وہ انہیں ڈانٹ کر ایک طرف ہو جانے کا کہتا.....اور اس وقت بات کرتا جب سارے گاہک چلے جاتے اور کہیں کوئی دکاندار اکیلا بیٹھا ہوتا تو وہ سودا دینے سے پہلے اپنی دل پشوریوں میں لگ جاتا۔ بندیا کسی کو پٹاخ سے جواب دیتی اور کسی سے کنی کترا جاتی۔ لگتا تھا وہ یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ واپسی کا سفر بھی گرم نگاہوں، تیکھے جملوں، دھتکارے ہوئے روتیوں کے جلو میں طے ہوا۔ بندیا کے لیے شاید یہ عام سا سفر تھا لیکن شہزادے نے دو گھنٹوں کے اس سفر میں بہت کچھ محسوس کیا تھا۔

شام ڈھلی تو گھر کی بتیاں اور دیواروں پر سجائے ہوئے قمقموں کی لڑیاں روشن کر دی گئیں۔ آج سب خوب تک سک سے تیار ہوئے۔ چنبیلی نے شہزادے کو بھی اچھی طرح سے تیار کیا۔ اس نے اسے پیلے رنگ کا ایک جوڑا پہنایا اور چہرے پر میک اپ کے بعد سر پر بالوں کی ایک وگ بھی رکھ دی۔ اس نے جب شیشے میں خود کو دیکھا تو اس کی اپنی آنکھیں ہی جل اٹھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ضبط کے بھی بندھن توڑ دیتا، چنبیلی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف گھما دیا اور بولی۔

''آج باہر سے بھی کئی مہمان آئیں گے۔ اچھا ہے کہ تو ہم جیسا ہی لگے.....ورنہ خوامخواہ کی باتیں بنیں گی۔''

باہر ساؤنڈ سسٹم پر ہلکی آواز میں گانے چلا دیے گئے تھے اور مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ یہ مہمان خواجہ سرا ٹولیوں کی شکلوں میں اپنے اپنے گروؤں کے ساتھ تحائف اٹھائے چلے آرہے تھے۔ مردانہ چہروں پر میک اپ کی تہوں اور چمکیلے رنگ برنگے لباسوں سے مزین وجودوں کے ساتھ اس گھر میں الگ طرح کے انسانوں کا ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ پھر وقتِ مقررہ پر چھیناں بھی اپنے کمرے سے

باہر نکل آئی۔ وہ عمر میں ان سب سے زیادہ بڑا بلکہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ آج بھی اس نے سفید ململ کا کرتہ اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ جیسے ہی وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا سبھی نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ کرخت اور بھاری آوازوں کے ساتھ سب نے اسے مبارکباد دیں۔ تحائف پیش کیے اور لمبی عمر کی دعائیں دیں پھر تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا گیا جس کے بعد کئی گھنٹوں تک خوب ہلا گلا کیا گیا۔ مہمان گرو حضرات چھیناں کے ساتھ اس کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ باقیوں نے صحن میں ہی رونق جمائے رکھی۔ شہزادے کو دیکھ کر کئیوں نے حیرت اور مسرت کا اظہار کیا۔ کسی نے گال نوچا کسی نے چٹکی کاٹنے کی کوشش کی۔ کسی نے بات کرنا چاہی لیکن چنبیلی کسی ایسی دیوار کی طرح اس کے اور باقیوں کے درمیان موجود رہی جس کے پیچھے وہ ان کی حرکتوں سے محفوظ ہی رہا۔ حتیٰ کہ وہ چنبیلی کے کان میں بتا کر اوپر چھت پر آ گیا۔ آدھی رات کے بعد جا کر یہ ہنگامہ ختم ہوا اور مہمانوں کی واپسی ہوئی اور سب کے جانے کے بعد چنبیلی اوپر چھت پر آئی تو وہ پرانے تخت پر سکڑے ہوئے لیٹا سو رہا تھا۔ چنبیلی نے اسے ہاتھ لگایا تو وہ یوں اٹھ گیا جیسے کرنٹ لگا ہو۔

''چل میرے شہزادے! نیچے کمرے میں جا کر سو جا، سب چلے گئے ہیں۔'' چنبیلی نے اس کے سر سے وگ اتارتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چنبیلی بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

''پتا لگ گیا نا تجھے آج..... یہ جگہ تیرے لائق نہیں ہے۔ تیری دنیا الگ ہے..... دیکھا نا تو نے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں میں نے دیکھا..... میں نے آج آپ کی دنیا کو بھی دیکھا اور اپنی دنیا کو بھی دیکھا..... اگر یہ دنیا میری نہیں ہے تو وہ باہر والی بھی میری نہیں ہے۔'' اس نے ایک گہری کپکپاتی ہوئی سانس بھری اور آہستہ سے بولا۔ ''میں نے بندیا کے ساتھ بازار میں دیکھا۔ لوگ آپ لوگوں کو کیسے دیکھتے ہیں..... اور کبھی میں بھی ایسے ہی دیکھتا تھا..... نفرت سے.....''

چنبیلی خاموش رہی، شہزادے نے کہا۔ ''میں چوک بازاروں میں آپ کو دیکھتا تھا تو مجھے کراہیت آتی تھی۔ پتا نہیں کیوں..... شاید یہی بات میرے اللہ کو پسند نہیں آئی۔ اس نے مجھے آپ لوگوں کے پاس اسی لیے بھیجا کہ میں جان سکوں، آپ لوگ اتنے بھی بُرے نہیں جتنا میں سمجھتا تھا۔''

چنبیلی کی آنکھیں بھر آئیں اس نے کہا۔ ''ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تو اس عمر میں اتنی بڑی باتیں کیوں سوچتا ہے رے..... تو ہنستا کیوں نہیں..... تو اچھا اچھا کیوں نہیں بولتا..... بتاتا کیوں نہیں کہ کون ہے تو..... کہاں سے آیا ہے..... کس بات کا غم ہے تیرے اندر؟''

شہزادے نے کھوئی کھوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا۔ بس میرا کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں..... بالکل اکیلا۔''

☆☆☆

''ہاں کوئی تو تھا..... میں کون سا زمین سے اگی تھی یا آسمان سے گری تھی۔'' چنبیلی بظاہر بڑی بے پروائی سے بتا رہی تھی۔ ''کسی عورت نے ہی جنما تھا مجھے اور کوئی مرد ہی تھا جو باپ ہوگا میرا..... شاید وہ اتنے مجبور بھی نہ تھے۔ قدم قدم چلنے لگی تھی میں، تب تک اپنے پاس ہی رکھا..... پھر مجھے بھرے بازار میں چھوڑ گیا۔ خدا کے کسی نیک بندے نے اٹھا لیا تھا مجھے..... مگر جب حقیقت پتا چلی تو گھر میں رکھنا گوارا نہ کیا۔ ہوش سنبھالا تو اپنے قبیلے والوں میں پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد تقدیر کے سہارے کبھی یہاں کبھی وہاں..... آخر کار چھیناں باجی کے پاس پہنچ گئی۔ بس تب سے یہیں ہوں۔'' ایک توقف کے بعد وہ بولی۔ ''اور میں کیا..... ہم سب کی کہانی ایسی ہی ہے۔''

''تم نے کبھی اپنے گھر والوں کو ڈھونڈا بھی نہیں؟'' شہزادے نے پوچھا۔

''ڈھونڈ کر کیا کرنا تھا..... ڈھونڈتے بھی تو دروازے بند ہی ملتے۔ انہوں نے بھی صبر شکر کر لیا ہوگا، میں نے بھی کر لیا اور اس کے سوا کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔'' چنبیلی نے کہا۔

اسی لمحے چڑیا (صائمہ) کمرے میں داخل ہو گئی۔

''ارے واہ! بڑی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں بھی سنوں گی، مجھے بھی سناؤ۔'' وہ فوراً پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''تم..... تم تو خود سنانے والی ہو۔'' چنبیلی نے مسکرا کر کہا۔ ''اور یہ کیا ہے؟'' اس نے اس کے ہاتھ میں موجود ڈبا دیکھ کر کہا۔

''یہ..... ارے ہاں..... میں تو چھیناں باجی کے کمرے میں جا رہی تھی۔ یہ ان کا برتھ ڈے گفٹ ہے۔ میں ابھی دے کر واپس آتی ہوں اور واپس آ کر میں بھی سنوں گی کہ یہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ پھرتی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

''یہ لڑکی بھی نا..... طوفان ہے طوفان.....'' چنبیلی

نے کہا۔

''یہ یہاں کیوں آتی ہے؟ اس کے گھر والے اسے روکتے نہیں؟'' شہزادے نے پوچھا۔

''اس کے باپو حاجی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے ہی تو ہمیں یہ مکان دلوایا تھا۔ وہ ایسا ویسا نہیں سوچتے..... اور پھر یہ چڑیا..... یہ تو ہمارے سامنے پیدا ہوئی ہے۔ ہماری گود میں کھیلی اور بڑی ہوئی ہے۔'' چنبیلی کہہ رہی تھی۔

دوسرے کمرے میں چھیناں نے چڑیا سے کچھ کہا جس کے بعد چڑیا واپس چنبیلی کے کمرے میں جانے کے بجائے گھر چلی گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کے والد حاجی صاحب چھیناں کے کمرے میں موجود تھے۔

''میرے گوڈوں میں درد ہے حاجی صاحب..... ورنہ میں کبھی آپ کو یہاں بلانے کی گستاخی نہیں کر سکتی تھی۔''

''کوئی بات نہیں..... تم بتاؤ کیا بات کرنی ہے جس کے لیے مجھے بلوایا ہے۔'' حاجی صاحب نے نرم لہجے میں پوچھا۔

جواب میں چھیناں نے انہیں شہزادے کے بارے میں بتانا شروع کر دیا کہ وہ کیسے انہیں ملا اور اب کیسے وہ یہاں رہ رہا ہے..... اور یہ کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتا نہیں۔ حاجی صاحب نے ساری بات سن کر اسے بلانے کا کہا۔ چھیناں کی آواز پر چنبیلی اسے یہاں لے آئی۔ حاجی صاحب اسے ساتھ والے کمرے میں لے گئے..... جہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

''دیکھو بیٹا! اگر تم ناراض ہو کر اپنے گھر سے نکلے ہو یا کسی نے گھر سے نکال دیا ہے..... تب بھی بتا دو اور اگر تم واپس نہیں بھی جانا چاہتے تو بھی میں تمہیں زبردستی واپس نہیں بھیجوں گا..... لیکن تم یہاں ان کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہ سکتے۔'' انہوں نے کہا۔

''کیوں نہیں رہ سکتا.....؟ کیا یہ انسان نہیں ہیں؟''

''یہ بات نہیں ہے بیٹا..... یہ بہت اچھے لوگ ہیں لیکن یہ صرف اپنے جیسوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ بات تمہاری نہیں ان کی ہے۔ یہ تمہاری وجہ سے کسی مشکل میں پڑ سکتے ہیں..... کسی نے پولیس کو شکایت کر دی یا تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈتے ہوئے آ گئے تو تمہیں تو شاید کچھ نہ کہا جائے لیکن یہ لوگ بڑی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

''میں یہاں اپنی مرضی سے ہوں اور مجھے ڈھونڈنے کوئی نہیں آنے والا اور میں یہاں ہمیشہ نہیں رہوں گا..... چلا جاؤں گا یہاں سے بھی۔'' وہ بولا تو حاجی صاحب اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر رہ گئے۔

''اچھا تو پھر ایسا ہے کہ جب تک تم کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہو جاتے یا پھر کہیں اور جانے کی بات طے نہیں ہو جاتی..... تم میرے ساتھ چلو، میرے گھر میں رہو۔ یہ ساتھ والی گلی میں میرا مکان ہے۔ تمہاری عمر کے میرے دو بچے ہیں۔ میں تمہیں ان کے ساتھ ہی رکھوں گا۔''

''لیکن میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا۔ ہاں یہ مجھے یہاں سے نکال دیں تو الگ بات ہے..... پھر میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

حاجی صاحب گہری سانس لے کر رہ گئے پھر وہ کمرے سے باہر نکل آئے اور دوبارہ چھیناں کے پاس پہنچے۔

''یہ لڑکا تو کوئی بات مان ہی نہیں رہا، خیر..... ابھی اسے یہیں رہنے دو۔ میں پتا کرواتا ہوں کہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے..... کہیں کوئی پولیس کیس ہی نہ ہو۔''

''حاجی صاحب! حویلی والوں سے بات نہ کر لیں؟''

''حویلی کے حالات تم جانتی ہو..... وہاں اور مسئلے چھڑے ہوئے ہیں۔ ابھی وہاں جانا ٹھیک نہ ہوگا لیکن فکر کی بات نہیں..... میں پتا کرواتا ہوں۔ لگتا تو کسی اچھے گھرانے کا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور چھیناں کی طرف بڑھائے۔

''یہ رکھ لو۔ اس کے کھانے پینے کے لیے.....''

چھیناں نے ہاتھ جوڑ لیے..... ''نہ حاجی صاحب! گناہ گار نہ کرو۔ ہم نے اب تک اسے سنبھالا ہے تو آگے بھی پال لیں گے، بس آپ کو اس لیے بتایا کہ.....''

حاجی صاحب نے آگے بڑھ کر پیسے اس کے بستر کے تکیے تلے دبا دیے..... ''میں جانتا ہوں چھیناں لیکن پھر بھی رکھ لو..... ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

خوف کے سائے ختم ہو چکے تھے۔ جان لیوا خطرات ٹل چکے تھے۔ اب زندگی کی دوبارہ سے شروعات کرنا تھی۔ گلبرگ کا گھر آباد ہو چکا تھا۔ تیمور پر اب حماد اور اس کے مستقبل کی ذمے داری تھی۔ اس نے اپنا بینک بیلنس چیک کیا کیونکہ اپنی رقم سے آدھی رقم عامر کے بچوں اور ہاجرہ کی ماں کو دے آیا۔ دراصل یہ گھر پہلے کرائے کا تھا۔ تیمور نے اپنی تمام تر جمع پونجی سے اسے خرید لیا تھا۔ یہ اس وقت کی

بات تھی جب مینا اس کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی اور وہ اسے اپنے گھر میں لانے کا عزم کر چکا تھا۔ اس کے بعد اسے کام کرنے کا زیادہ موقع ہی نہیں ملا..... ابھی تو اس نے شہرت کی سیڑھیوں پر ابتدائی قدم ہی رکھا تھا۔ خاور شاہین کے ہٹ ڈراما آدھا مرد آدھی عورت کی کامیابی کے بعد خاور صاحب نے اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا جس کے مطابق اسے ان کے ساتھ اگلے دس پروجیکٹ میں کام کرنا تھا جن میں کچھ تھیٹر پلے انگلینڈ میں جا کر کرنے تھے..... لیکن جب وہ اسلام آباد والے شو کے بعد واپس آیا تو مینا کے قتل کا واقعہ ہو چکا تھا، اس کے بعد وہ اس ہنگامے میں ایسا الجھ گیا کہ کام اور خاور صاحب کا معاہدہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ اب اسے دوبارہ کام کی تلاش تھی اور کام اسے آتا ہی کیا تھا۔ ایک میک اپ آرٹسٹ کے طور پر بھرتی ہو کر اداکار بن گیا تھا..... اس کے سوا کوئی اور کام کیا ہی نہ تھا۔

اس نے دوبارہ تھیٹرز کا رخ کیا۔ وہاں جا کر اسے علم ہوا کہ اس کی ریپوٹیشن کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے..... کیونکہ تیمور کی پراسرار گمشدگی کے بعد مینا، ہاجرہ اور عامر کے قتل کے سلسلے میں کچھ لوگوں نے تیمور کے بارے میں کچھ ایسی پوچھ گچھ کی تھی جنہوں نے تیمور کے کردار کو کافی مشکوک بنا دیا تھا۔ خاور صاحب کو بھی اس کے غائب ہونے سے کافی نقصان ہوا تھا۔ وہ اس سے نالاں ہو کر انگلینڈ چلے گئے تھے۔ چند دن چکر لگانے کے بعد اس نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ اسے اب اداکار کے طور پر کوئی قبول کرنے والا نہیں ہے۔ اسے کوئی اور کام تلاش کرنا چاہیے..... اس نے کوشش کی۔ ایک ماہ کی جاں گسل کوشش کے بعد اسے اسسٹنٹ میک اپ آرٹسٹ کی نوکری مل گئی... جو اس نے قبول کرنے میں ذرا تامل نہ کیا۔ تنخواہ کم تھی۔ نوکری چھوٹی تھی لیکن وہ دوبارہ اسی جگہ سے اپنا اعتماد بحال کر سکتا تھا جہاں سے کھویا تھا۔

حماد کے لیے گھر میں ایک آیا رکھ لی گئی تھی۔ اس کے انکار کے باوجود سرخاب دادا کے دو آدمی اس کے گھر کی نگرانی کیا کرتے تھے لیکن کچھ عرصے بعد جب حالات نارمل ہی رہے تو تیمور نے اصرار کر کے انہیں واپس بھجوا دیا۔ اب اس کی زندگی کے دو ہی مقاصد تھے، کام کر کے اپنی ریپوٹیشن بحال کرنا اور دوبارہ سے عروج پانا اور دوسرا حماد کی پرورش۔ حماد اب اسے پاپا کہنے لگا تھا اور وہ حماد کے لیے ساری دنیا کی خوشیاں لانے کا عزم کر چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی اسے نہیں بتائے گا کہ وہ اس کا بیٹا

نہیں ہے اور وہ کبھی اس سے ان راتوں کا تذکرہ نہیں کرے گا جب موت ان کے تعاقب میں تھی۔ وہ حماد کو ایک بالکل نارمل اور خوشیوں بھری زندگی دے گا اور ہاں..... وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔ کیونکہ مینا کے بعد نہ تو اسے کوئی اپنے ساتھ منظور تھا نہ ہی حماد کے لیے کوئی دوسری عورت اس کی ماں بن سکتی تھی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ دو سال بیت گئے..... اور ان دو سالوں میں بہت کچھ تیزی سے بدل گیا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ حماد اسکول جانے لگا تھا..... لیکن اس نے اپنے کام کے متعلق جیسا سوچا تھا ویسا نہ ہو سکا۔ تھیٹر پلے کا آرٹ زوال کا شکار ہو چکا تھا۔ کئی معروف ڈائریکٹر ملک سے باہر چلے گئے تھے اور جو نہیں گئے انہوں نے ٹی وی کا رخ کر لیا تھا۔ جب ڈرامے ہی نہیں ہوتے تھے تو تھیٹر انتظامیہ کیا کرتی..... ٹیکنیکل اسٹاف بے روزگار ہوتا چلا گیا جن میں تیمور بھی شامل تھا۔ دوسروں کی طرح اس نے ٹی وی میں کام کی تلاش شروع کی تھی لیکن یہاں بھی اسے پرفارم کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

اس کے علاوہ وہاں میک اپ آرٹسٹ کے لیے کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ اپنے پروفیشن سے ہٹ کر چھوٹی موٹی نوکریوں کے پیچھے لگ گیا۔ زیادہ تعلیم تو تھی نہیں..... سو کچھ عرصے ایک بک شاپ پر سیلز مین کی نوکری شروع کی اور اگلے دو سالوں میں اس نے اس طرح کی کئی نوکریاں کیں اور چھوڑ دیں۔ اس دوران اس نے پوری کوشش کی کہ اس کے حالات کا اثر اس کے گھر یا بیٹے پر نہ پڑے۔ ان کے پاس ایک موٹر سائیکل تھی..... جس پر سوار ہو کر وہ پارکس اور فن فیئرز میں جاتے۔ خوب ہلا گلا کرتے۔ ایسے ہی ایک چھٹی کے دن جب وہ رات کے وقت گھر واپس آ رہے تھے تو تیمور نے موٹر سائیکل سرخ اشارے پر روکی تو ایک خواجہ سرا بھیک مانگتا ہوا ان کی طرف آ گیا۔ تیمور نے اسے دیکھا تو اسے سرخاب دادا اور دوسرے خواجہ سرا یاد آ گئے۔ کافی وقت ہو گیا تھا ان سے رابطہ کیے ہوئے..... انسان بھی کتنی عجیب چیز ہے۔ تیمور نے سرخاب دادا سے کہا تھا کہ ہماری زندگی کا ہر سانس اب ان کا قرض دار ہے..... لیکن زندگی کی الجھنوں میں کھو کر وہ ان سب احسانات کو بھول گیا جو سرخاب دادا نے اس پر کیے تھے۔ تیمور انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا جب اچانک حماد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''یہ اچھے لوگ نہیں ہوتے.....''

تیمور نے چونک کر دیکھا۔ حماد اس خواجہ سرا کی طرف دیکھ رہا تھا جو ایک گاڑی کے شیشے سے ناک لگائے اندر بیٹھے ڈرائیور سے بھیک مانگ رہا تھا۔

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' سگنل گرین ہونے پر اس نے موٹر سائیکل آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''میرا دوست اظہر کہتا ہے..... یہ بُرے لوگ ہوتے ہیں۔''

''ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے..... کچھ لوگ بُرے ہوتے ہیں کچھ لوگ اچھے ہوتے ہیں۔ ہم کسی کے بارے میں کوئی فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں کر سکتے..... بُرے لوگ وہ ہوتے ہیں جو بُرا کام کرتے ہیں۔''

''بھیک مانگنا بھی تو برا کام ہے۔'' حماد نے فوراً کہا۔

''ہاں لیکن ضروری بھی نہیں..... کچھ لوگ اپنے حالات سے مجبور ہو کر بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس کوئی اور کام نہ ہو..... یا وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے ہوں۔ یہ بھیک کیوں مانگ رہا ہے جب تک ہمیں یہ نہیں پتا چل جاتا، ہم اسے برا نہیں کہہ سکتے۔''

حماد خاموش رہا۔ تیمور نے سوچا کہ کسی دن وہ حماد کو ساتھ لے کر سرخاب دادا کے ہاں جائے گا لیکن وہ یہ عہد نبھا نہیں سکا..... کیونکہ ایک بار پھر اسے نوکری چھوڑنی پڑ گئی۔ مستقل کام وہی ہوتا ہے جس پر طبیعت آمادہ ہو۔ تیمور ایک فنکار تھا..... اس کا دل صرف پرفارمنگ آرٹ میں ہی خوش رہ سکتا تھا مگر ایک دروازہ اس کے لیے کھل رہا تھا۔ یہ کمرشل پنجابی کامیڈی تھیٹر کا پلیٹ فارم تھا..... جو اپنی عوامی تفریح کے لوازمات کی بنا پر تیزی سے مقبول ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا کام چھوڑ دیا اور اس لائن میں آنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ خوش قسمتی سے اسے کام بھی مل گیا۔ ایک ڈراما جو پہلے سے جاری تھا اس کا ایک کردار ڈراما چھوڑ گیا تھا۔ وہ رول اسے مل گیا اور اس دوران وہ تھیٹر کی اس قسم کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ اس کے ماحول میں خود کو ڈھال سکے۔

جس طرح کے آرٹ تھیٹرز میں وہ کام کر چکا تھا ان میں اور ان کامیڈی تھیٹرز میں کافی فرق تھا۔

یہاں شائقین فن کو داد دینے، ایکٹنگ پرفارمنگ دیکھنے یا مقصدیت سے بھرپور ڈائیلاگز سننے نہیں آتے تھے..... یہاں زیادہ تر شائقین ''ہنسنے'' آتے تھے۔ علم و فلسفہ، آرٹ کی باریکیاں اور گیان کا بوجھ اٹھانے نہیں آتے تھے۔ وہ اپنے دن بھر کی تھکن ہنسی میں اڑانے آتے تھے لہٰذا اس نے محسوس کر لیا کہ وہ بہت دیر تک شاید اس کام سے بھی وابستہ نہ رہ سکے۔

وقت اور آگے بڑھ گیا۔ تھیٹر ڈراما..... جو کامیڈی میں تبدیل ہو گیا تھا..... اب کامیڈی بھی تبدیل ہو گئی اور ڈراما صرف دو چیزوں کا نام بن کے رہ گیا..... جگت بازی ..... اور رقص..... تیمور ابھی تک انہی تھیٹرز کے ساتھ جڑا تھا البتہ وہ بیک دی اسٹیج کے کاموں تک محدود ہو گیا تھا۔ اس نے آن دی اسٹیج پرفارمنگ کے خواب دیکھنے بھی چھوڑ دیے تھے۔ آخری بار اسے پروڈیوسر کے دباؤ پر آن دی اسٹیج آنا پڑا تو محض اس لیے کہ وہاں پرفارم کرتے فنکار کو ایسے خاموش کردار کی ضرورت تھی جس کو وہ اپنی جگت بازیوں سے نشانہ بنا کر شائقین کو اپنا دیوانہ بنا سکے۔ تیمور اسٹیج پر اس فنکار کے سامنے آیا تو اس نے سب سے پہلے ''تیری بہن'' ..... کے صیغے کے ساتھ ایک واہیات بات اس سے منسوب کر کے سنائی جس پر تیمور کا چہرہ سرخ ہو گیا..... جبکہ ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد وہ وہاں خود کو کھڑا نہ رکھ سکا اور بیک دی اسٹیج چلا آیا۔ اس واقعے کے بعد اس نے توبہ کر لی۔ تیمور جس نے آن دی اسٹیج نہ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا' وہ اسٹیج پر آ گیا لیکن اس بار اس کا آنا بہت مختلف تھا۔ وہ اس کے لیے قطعی تیار نہ تھا لیکن اس کے پروڈیوسر اور بھاری معاوضے کی رقم کی پیشکش نے اسے منا لیا..... وہ دوبارہ اسٹیج پر آیا..... اور ایسا آیا کہ ایک عرصے بعد یہ پہلا ڈراما تھا جو گولڈن جوبلی تک پہنچ گیا۔

☆☆☆

آج رات انہیں فنکشن میں جانا تھا۔ کافی دنوں بعد ایک فنکشن ہاتھ لگا تھا اور ساری رات جاری رہنا تھا۔ چنبیلی اور چھیناں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ شہزادے کا کیا کیا جائے۔ اس سے پوچھا تو اس کا کہنا تھا کہ یا تو اسے ساتھ لے جایا جائے یا پھر وہ گھر میں اکیلا رہ لے گا۔ دوسری صورت تو قابلِ قبول ہرگز نہیں تھی اور اس کے پاس کسی کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ آخر چھیناں نے یہ فیصلہ کیا کہ شہزادے کو حاجی صاحب کے گھر آج رات کے لیے بھیج دیا جائے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد چنبیلی نے اسے بھی راضی کر لیا۔ وہ اسے ساتھ لے کر حاجی صاحب کے گھر چلی آئی۔ حاجی صاحب تو گھر میں تھے نہیں البتہ صائمہ (چڑیا) نے دروازہ کھولا اور چنبیلی کی بات سن کر اس نے فوراً شہزادے کو گھر کے اندر بلا لیا اور چنبیلی سے کہا کہ وہ بے فکر ہو جائیں۔ چنبیلی واپس چلی گئی۔ تسلی سے کھانے کے بعد صائمہ نے شہزادے سے کہا کہ وہ اسے اپنا گھر دکھائے گی کیونکہ پھر پتا نہیں وہ یہاں کب آئے گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی کے ساتھ اسے لے کر مختلف کمروں میں گھومتی رہی۔ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں کارنر پر رکھی ایک تصویر کو دیکھ کر وہ پہلی بار چونکا۔ اس تصویر میں حاجی صاحب کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے اس گھر میں یہ پہلا سوال کیا تھا۔

''یہ..... میرے ابا کے دوست تھے..... فوت ہو چکے ہیں۔'' صائمہ نے کہا پھر چونک کر بولی۔ ''کیا تم جانتے ہو انہیں؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور دوسری تصویریں دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اسے ان تصاویر کے متعلق بتانے لگی۔ یہ اس کے والدین کی جوانی اور ان دونوں بہن بھائیوں کے بچپن کی تصویریں تھیں۔ ابھی وہ ڈرائنگ روم میں ہی چیزوں کو دیکھنے میں مصروف تھے جب حاجی صاحب گھر آ گئے۔ وہ موبائل پر کسی سے گفتگو کر رہے تھے۔

''نہیں' مجھے بھی بس وہی پتا معلوم ہے اور میرے خیال میں اس کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے بھی نہیں۔ تم لوگ ایسا کرو کہ ارد گرد کے لوگوں سے پوچھو اور تلاش جاری رکھو..... جیسے ہی وہ ملے مجھے فوراً بتانا..... خدا حافظ۔'' انہوں نے موبائل آف کیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ایک سفید ڈبا صائمہ کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

''یہ جا کر میری الماری میں رکھ دو اور اپنی امی سے بولو میرا کھانا لگا دیں۔'' صائمہ ڈبا پکڑ کر وہاں سے نکل گئی۔ شہزادہ خاموشی سے سامنے کھڑا رہا۔ حاجی صاحب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئے۔

''جی بیٹا! کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''

''میں ٹھیک ہوں۔''

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا مجھے۔'' انہوں نے کہا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ ''خیر کوئی بات نہیں..... جب دل چاہے بتا دینا اور بالکل آرام سے رہو یہاں..... تم میرے لیے بالکل میرے بچوں جیسے ہو۔'' وہ پھر خاموش ہی رہا۔ اتنے میں صائمہ اندر آ گئی۔

''پاپا! یہ عامر انکل کو جانتا ہے۔'' اس نے آتے ہی دھماکا کر دیا جس پر شہزادے کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب بھی بوکھلا سے گئے۔

''واقعی..... تم جانتے ہو انہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ابھی اس نے وہ تصویر دیکھی تو پوچھا کہ یہ کون ہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہ جانتا ہے انہیں۔'' وہ شرارت آمیز لہجے میں بولی اور وہ یوں بیٹھا تھا جیسے چوری کرتے

رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

''بتاؤ نا بچے! تم کیسے جانتے ہو انہیں؟''

''ان کی تصویر دیکھ رکھی ہے میں نے..... ہمارے گھر میں بھی تھی..... ابا کے دوست تھے۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''اور تمہارے ابا..... ان کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟'' انہوں نے پوچھا۔ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور مضطرب نظر آنے لگا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر باہر سے صائمہ کی امی کی آواز سنائی دی۔

''کھانا لگ گیا ہے۔'' حاجی صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ صائمہ بھی اسے لے کر ایک کمرے میں چلی آئی جہاں دو بستر لگے ہوئے تھے۔

''تم یہاں حمید کے ساتھ سو جاؤ..... میں آج رات امی کے پاس سو جاتی ہوں۔ صبح چھٹی ہے اسکول سے..... کل کا دن خوب ہنگامے کریں گے۔'' وہ چہکتی ہوئی بولی اور وہاں سے چلی گئی۔ شہزادہ خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹ گیا اور پھر دھیرے دھیرے وہ نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

آدھی رات کا وقت تھا جب اچانک اسے جھنجوڑ کر جگایا گیا۔ جگانے والے حاجی صاحب تھے اور ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے اسے پوری طرح جگانے کی کوشش میں تھے۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اسے حاجی صاحب کی حالت کا اندازہ ہوا۔

''کہاں ہیں تمہارے ابا..... بولو..... جلدی جواب دو.....'' وہ گنگ سا خوفزدہ نظروں سے ان کی سمت دیکھنے لگا۔

''خدا کے واسطے بیٹا..... اگر تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہیں تو فوراً بتا دو..... ہم کئی دنوں سے انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ دیکھو میں جان گیا ہوں کہ تمہارے ابا کون ہیں۔ میرے دوست عامر کا وہی ایک دوست تھا۔ میں سب جان گیا ہوں لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ بہت دنوں سے وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔'' ان کی بات سن کر وہ بُری طرح چونک پڑا۔

''مم..... میں نہیں جانتا..... میں نہیں جانتا۔''

''تت..... تمہیں انہوں نے اکیلے جانے کیسے دیا..... کیا تم گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟ کہیں وہ تمہیں ڈھونڈنے میں تو گم نہیں ہوئے؟ مجھے بتاؤ..... خدا کے واسطے بیٹا..... یہ بہت سیریس مسئلہ ہے..... مجھے سب بتاؤ جو تمہیں معلوم ہے۔''

وہ تیز تیز گہری سانسیں لیتا ہوا خوفزدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر وہ بول پڑا۔ اس نے بتایا کہ ہوا کیا تھا۔

☆☆☆

''ارے چل نا..... قسم سے بہت مزہ آئے گا۔'' گیند کو ہاتھوں سے اچھالتے ہوئے لڑکے نے کہا۔

''یار! تو جانتا ہے مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ وہ کرکٹ کھیلنے کے لیے پارک میں آئے تھے..... لیکن گراؤنڈ میں پانی پھیلا ہوا تھا..... سو ٹیم واپس چلی گئی جبکہ یہ دونوں ایک طرف خشک جگہ پر بیٹھ گئے۔

''تو دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ہی تو جا رہے ہیں نا.....''

''مجھے نہیں کرنی کوئی دلچسپی پیدا.....''

''یار! گولڈن جوبلی شو ہے۔ اتنا ہٹ ہوا ہے..... وہ جمی ہے نا جمی..... چار بار دیکھ آیا ہے اور وہ ایسے چسکے لے لے کر بتاتا ہے کہ مجھے جیلسی ہو جاتی ہے یار.....''

''تو، تو صرف جمی کے لیے یہ کرنے جا رہا ہے..... کوئی جواب نہیں تیرا ویسے۔''

''نہیں صرف اس کے لیے نہیں..... تُو مال پر نہیں گیا..... یہ بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے ہیں..... گولڈن جوبلی شو..... نیناں کی شاندار پرفارمنس۔''

''یہ نیناں کون ہے؟''

''ہیجڑا ہے ہیجڑا..... کیا کمال کا ڈانس کیا ہے اس نے..... اسی وجہ سے تو اتنا ہٹ ہوا ہے ڈراما۔''

''تو، تُو ایک ہیجڑے کا ڈانس دیکھنے کے لیے جانا چاہتا ہے؟'' وہ ناگواری سے بولا۔

''اور کوئی بات نہیں..... تجھے میرے ساتھ جانا ہوگا بس۔''

وہ چلایا۔ ''نہیں..... نہیں..... نہیں.....''

مگر اس رات وہ اسے لے ہی گیا۔ گولڈن جوبلی شو..... تھیٹر آج بھی فل تھا۔

نیناں اسٹیج کے عین وسط میں ٹانگوں کو خم دیے اور دونوں بازو سر کے اوپر اٹھائے کسی مورتی کی طرح ساکن کھڑی ہوگئی۔ ہال میں شور تھما، میوزک کی آواز بلند ہوئی اور پھر اسٹیج آنکھوں کو چندھیا دینے والی تیز روشنیوں میں نہا گیا۔ ہال میں شور و غل بڑھ گیا۔ درمیانی رو میں بیٹھے دونوں لڑکے بھی باقیوں کی طرح سامنے دیکھ رہے تھے لیکن ان میں سے ایک کی کیفیت کچھ الگ تھی۔ چند لمحے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے اسٹیج کی طرف جاتا دیکھ کر اس کے دوست نے منہ میں انگلی ڈال کر سیٹی بجائی اور چلایا۔ ''واہ میرے شہزادے..... دکھا دے اپنا جلوہ۔'' اردگرد کی سیٹوں پر بیٹھے

تماشائی بھی اسے اسٹیج کی طرف جاتے دیکھ کر زور وشور سے تالیاں بجانے لگے..... مگر اس کے اسٹیج تک پہنچنے سے پہلے ہی میوزک بند ہوگیا۔ نیناں کا رقص تھم گیا تھا۔ ناچنے والے اپنی سیٹوں کی طرف واپس جانے لگے۔ ہال میں تالیاں اور وِنس مور کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ گانا اور رقص ختم ہونے کے باوجود وہ لڑکا اسٹیج کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔

اسٹیج پر نیناں کے گیٹ اپ میں موجود تیمور اپنی گہری سانسوں کو سنبھالتے ہوئے جھک جھک کر تماشائیوں سے اپنی پرفارمنس کی داد وصول کررہا تھا۔ تالیوں کی گونج اسے ایک بار پھر سے ماضی میں لے گئی۔ یہ رقص اسے مینا نے سکھایا تھا..... اور اس رقص کی پرفارمنس نے اسے پہلی بار سپرہٹ ڈراما دیا تھا لیکن پھر وہ سب کچھ اس سے چھن گیا اور اتنے سالوں بعد ناکامی اور زوال کے موسموں سے گزر کر جب وہ خود کو ایک پرفارمر کے طور پر فراموش کرچکا تھا..... تب اسی رقص کا آئیڈیا اس کے پروڈیوسر نے دیا۔

"دیکھو تیمور! میں نے تمہاری وہ پرفارمنس دیکھی تھی۔ کمال کی تھی..... یقین کرو اس اسٹیج پر اس طرح کے تماشائیوں کے سامنے یہ ایک اچھوتا خیال ہوگا۔ میں جانتا ہوں تم یہ نہیں کرنا چاہتے..... صرف ٹرم کا فرق ہے۔ وہاں تم زنانہ لباس پہن کر ناچے تھے تو لوگ اسے سائیکالوجیکل پرابلم کا شکار کریکٹر سمجھ کر دیکھتے تھے اور داد دیتے تھے۔ یہاں تم زنانہ کپڑے پہن کر وہی رقص کرو گے تو لوگ تمہیں خواجہ سرا سمجھیں گے لیکن داد تو دیں گے نا۔ تم پرفارمر ہو..... لوگ کیا سمجھتے ہیں اس سے تم کو کیا لینا دینا اور پھر معاوضہ بھی تو دیکھو..... میں جانتا ہوں کہ تمہیں پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔"

تیمور نے اس کی بات مان لی اور ایک عرصے بعد جب اس نے پہلی پرفارمنس دی تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے اتنی داد ملے گی۔ اس کا سارا خوف دور ہوتا چلا گیا اور یہ تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی پرفارمنس کی وجہ سے یہ ڈراما گولڈن جوبلی تک جا پہنچے گا۔ اس نے خیالوں کو جھٹک کر اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور مسکرا کر الوداعی نظروں سے سامنے دیکھا۔ اسٹیج کی لائٹس کی وجہ سے ہال کمرے میں دور تک صاف نظر نہیں آیا لیکن ہال کے درمیان سیڑھیوں سے اتر کر اسٹیج کے قریب آتا ایک لڑکا روشنی کے اس حصے میں پہنچ گیا تھا جہاں اسٹیج سے بھی اسے صاف دیکھا جاسکتا تھا..... تیمور نے اس کی طرف دیکھا اور بت بن کے رہ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں اس کا بیٹا تھا حماد..... جس کے چہرے پر ناقابلِ یقین حیرت اور آنکھوں میں ایسی نفرت کی بجلیاں تھیں کہ تیمور کا سارا وجود سنسنا اٹھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال اپنے حلیے کے متعلق آیا اور بے اختیار اس کے حلق سے ایک کربناک چیخ گونجی۔ یہ چیخ ڈار سے بچھڑی کونج کی کرلاہٹ سے مشابہ تھی جسے موت کا سامنا تھا اور پھر وہ پوری جان سے چیختا چلا گیا۔ ہال کمرے میں بیٹھے لوگ حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ نیناں بری طرح چیخ رہی ہے..... اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کررہی ہے۔ چیختے چیختے وہ گھٹنوں کے بل اسٹیج پر گرسی گئی۔ اس کی چیخوں میں ایک عجیب سی درد بھری دیوانگی تھی..... جس نے ہال میں موجود ہر شخص کو مبہوت سا کردیا تھا۔ تبھی اوپر سے اسٹیج کا پردہ نیچے گرنے لگا۔ حتیٰ کہ نیناں کا وجود اس کے پیچھے چھپ گیا لیکن اس کی چیخوں کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ کسی نے نوٹس نہیں کیا کہ اسٹیج کے سامنے کھڑا لڑکا کب خاموشی سی ایگزٹ ڈور سے نکل کر چلا گیا۔

☆☆☆

تھیٹر سے نکل کر وہ گھر جس طرح پہنچا یہ وہی جانتا تھا۔ ایک عجیب سی کرب کی کیفیت تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اس ایک رشتے کے سوا دیکھا بھی کیا تھا۔ یہی رشتہ اس کی تمام تر محبت، تمام تر اعتبار اور پوری کائنات کا محور تھا اور آج اس نے اپنے اس اعتبار کو کرچی کرچی ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بجڑے کے روپ میں لوگوں کے سامنے ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس منظر نے اس کے دل میں اچانک ہی ایک ایسی نفرت پیدا کردی تھی جس نے اس کی ساری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود کرکے رکھ دی تھی۔ گھر پہنچ کر جیسے سیلاب کا بند ٹوٹتا ہے ایسے ہی اس کا غصہ باہر نکلا، اس نے جو سامان ہاتھ لگا اٹھا کے پٹخ دیا۔ اپنے کمرے میں سب کچھ تلپٹ کرکے تیمور کے کمرے میں گھس گیا وہاں بھی توڑ پھوڑ کی پھر وہ اس کمرے میں داخل ہوگیا جو اس کی خواہش پر تیمور نے بنایا تھا..... اور یہ خواہش کتنی عجیب تھی۔ اس نے ایک بار تیمور سے اپنی ماں کے بارے میں پوچھا تھا تو تیمور نے کہا تھا کہ وہ اسے جنم دے کر فوت ہوگئی۔ تب اس نے کہا تھا کہ ماں کی چیزیں کہاں ہیں..... تیمور سے کوئی جواب نہ بن پایا..... جس پر اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ امی کی چیزوں سے سجا ایک کمرا ہونا چاہیے اور اس خواہش کو تیمور نے پورا کیا تھا۔ ایک پورا کمرا انہوں نے سیٹ کیا..... جہاں اس کی ماں کے نام پر جوتے، کپڑے اور میک اپ تک کا سامان رکھا گیا تھا، جب بھی اسے ماں کی شدید یاد

آتی یا وہ تیمور سے ناراض ہوتا وہ اس کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا۔ اسے لگتا کہ وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہے۔ آج بھی وہ جب اپنے غصے کا اظہار کر کے تھک گیا تو اس کمرے میں آ گیا..... وہ چیخ رہا تھا، رو رہا تھا اور چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہا تھا۔ بالآخر تھک ہار کے فرش پر بچھے قالین پر گر گیا۔ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا سسکتا رہا پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ اس نے سر اٹھایا تو سامنے سنگار میز کے شیشے میں اپنی ناگفتہ بہ حالت پر نظر پڑی۔ اس کے دماغ میں پتا نہیں کیا آیا کہ اس نے ٹیبل کی سطح پر پڑی میک اپ کٹ کھول کر منہ پر پاؤڈر ملا..... سرخ لپ اسٹک لگائی..... غازے کا چھڑکاؤ کیا..... پھر مڑ کر الماری میں سے ایک زنانہ سوٹ نکال کر پہن لیا اور شیشے کی طرف مڑ کر اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ اپنے حلیے کو دیکھتے ہوئے اسے اسٹیج پر نیناں کے روپ میں ناچتے تیمور کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس نے لپ اسٹک سے شیشے پر لکھا۔ ''مجھے نفرت ہے آپ سے۔''

اور پھر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ روتا جا رہا تھا اور کسی ایلین کی طرح رات کے اس پہر لاہور کی گلیوں میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ پھر رات ہو گئی۔ اسے علم نہیں کہ وہ کہاں پہنچ گیا ہے۔ بس جسم کی طاقت نے ساتھ چھوڑا تو ایک نیم تاریک سڑک پر گر گیا۔ وہاں سے ہوش آیا تو چھیناں کے گھر میں تھا۔

اپنی کہانی سناتے ہوئے بھی وہ روتا جا رہا تھا۔ رات بیت چکی تھی۔ فجر کی اذانیں شروع ہو گئی تھیں۔ حاجی صاحب کسی بت کی طرح بیٹھے اس کی داستان سن رہے تھے۔ حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گیا اور سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ حاجی صاحب کو سمجھ نہ آئی کہ اسے دلاسا کیسے دیں پھر انہوں نے اس کے کندھوں کو پکڑا اور اسے لٹا دیا۔

''اب تم سو جاؤ بیٹا! میں نماز پڑھ کے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اسے تھپکی دے کر باہر چلے گئے..... وہ سسکتا رہا۔

حاجی صاحب نماز پڑھ کے آئے تو وہ سو چکا تھا۔ صبح سات بجے چنبیلی اسے لینے آئی تو حاجی صاحب نے اس سے کہا کہ وہ رات دیر سے سویا ہے۔ جب بیدار ہو گا تو وہ خود اسے چھوڑ جائیں گے جس پر چنبیلی واپس چلی گئی۔ وہ گیارہ بجے بیدار ہوا۔ حاجی صاحب اس کے جاگنے کے ہی منتظر تھے۔ انہوں نے سختی سے صائمہ اور حمید کو منع کیا تھا کہ اسے کوئی خود سے نہ جگائے۔ گھر میں اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ رات کو ہوا کیا ہے۔ حاجی صاحب نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر ناشتا کروایا پھر اسے ساتھ لے کر گھر سے باہر نکل آئے لیکن وہ اسے چنبیلی کے گھر نہیں لے کر آئے بلکہ ایک اور جگہ لے آئے۔ یہ پیلے رنگ کے چونے سے ڈھکی ایک پرانی حویلی تھی اور حماد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس حویلی میں رہنے والے سارے نفوس خواجہ سرا ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ حویلی کے اندر اسے کافی تعداد میں اسلحہ نظر آ رہا تھا۔ حاجی صاحب ایک کمرے میں بیٹھے ایک خواجہ سرا کے پاس پہنچے..... جس نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اپنے ڈیل ڈول اور حلیے کے اعتبار سے وہ بھرپور مرد نظر آتا تھا..... لیکن اپنی لمبی گندھی ہوئی چٹیا کو پیچھے سے گھما کر سینے کے سامنے لٹکائے اسے مسلسل سہلاتے ہوئے جب ایک مختلف ٹون میں بولتا تو پتا چلتا کہ یہ خواجہ سرا ہے۔ وہ حاجی صاحب اور اس کے ساتھ ایک لڑکے کو دیکھ کر چونک گیا۔

''اللہ خیر کرے..... حاجی صاحب! آپ صبح صبح اور یہ کون ہے؟'' وہ ہاتھ نچا کر بولا تھا۔

''یہی بتانے تو آیا ہوں ملکہ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تیمور کا کچھ پتا چلا؟'' حاجی صاحب نے پوچھا۔

''ارے کہاں جی..... ڈھونڈا تو جا رہا ہے لیکن ابھی پتا نہیں چل سکا۔'' وہ چٹیا کو سہلاتے ہوئے مسلسل حماد کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''یہ لڑکا..... اسے پہچانے آپ؟'' حاجی صاحب نے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ تیمور کا بیٹا ہے.....''

یہ سن کر ملکہ بری طرح چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیا بول رہے ہیں حاجی صاحب..... واقعی؟ یہ وہی ہے؟''

''ہاں یہ وہی ہے جسے لے کر تیمور آپ لوگوں کی مدد لینے کے لیے ایک بار یہاں آیا تھا۔'' حاجی صاحب کی بات پر اس بار حماد چونکا تھا۔

''کتنا بڑا ہو گیا ہے رے یہ تو..... کمال ہے۔ اتنا سا تھا یہ..... میں گود میں لیے پھرتی تھی رے تجھے..... یاد ہے تجھے..... ہیں؟'' وہ پُرمسرت لہجے میں بولا لیکن حماد کے چہرے پر حیرانی کا دریا بہہ رہا تھا۔ ملکہ چونک کر بولی۔

''ارے حاجی صاحب..... یہ وہی ہے تو اسے ضرور پتا ہو گا کہ اس کا باوا کہاں ہے؟''

''میں پوچھ چکا ہوں۔ یہ نہیں جانتا..... بلکہ اس نے تو کچھ اور ہی کہانی سنا ڈالی ہے اور لگتا ہے تیمور کی گمشدگی کے پیچھے یہی وجہ ہے۔'' حاجی صاحب نے گہری سانس لیتے

ہوئے کہا اور پھر ملکہ کو وہ ساری کہانی سنانے لگے جو رات کو حماد نے سنائی تھی۔ کہانی سنانے کے بعد انہوں نے کہا۔

''تو مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے جیسے تیمور اسی کی تلاش میں کہیں گیا ہوا ہے.....''

ملکہ چند لمحے اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''کیوں رے..... اتنا غصہ کاہے کو کیا تو نے اپنے باوا پر..... بس اس بات پر کہ وہ زنانہ کپڑے پہن کر ہماری طرح ناچا تھا، پر تجھے یہ معلوم نہیں کہ تیری خاطر اس نے اپنے جسم پر گولی بھی تو کھائی تھی..... اور گلیوں میں تجھے اٹھا کر تیری جان بچانے کے واسطے قاتلوں کے آگے میلوں بھاگا بھی تھا۔''

حماد سن ہو کر رہ گیا۔ ''تجھے معلوم نہیں..... ارے تیرا سگا باپ بھی ہوتا تو تیری خاطر وہ نہ کرتا جو اس ماں کے جنے نے کیا..... تو اس سے ناراض ہو گیا۔ ارے تو تو سات جنموں تک اس کا احسان نہیں اتار سکتا رے۔'' اور پھر ملکہ نے اس کی زندگی کی کتاب کے وہ صفحے اس کے سامنے کھول دیے جن سے وہ نا آشنا تھا اور ان صفحات پر اس کے لیے ایسی ایسی حیرت موجود تھی کہ اب اگر وہ رو رہا تھا تو یہ رونا الگ قسم کا تھا۔

☆☆☆

ٹوٹے ہوئے دلوں کے اس شہر میں سب سے بڑی پناہ گاہ داتا کا دربار ہی ہو سکتا ہے۔ تیمور ایک ستون سے ٹیک لگائے، سر کو جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور کپڑے مسلے ہوئے تھے جو اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ خود سے کتنا بے پروا ہو چکا تھا..... بظاہر سکون سے بیٹھے اس کے وجود کے اندر کرب کا سمندر کئی دنوں بعد بھی ابھی تک تلاطم خیز ہی تھا۔ وہ لاکھ سر کو جھٹکتا..... لیکن وہ مناظر بار بار اس کے ذہن پر یلغار کر رہے تھے جنہوں نے اس کے اندر ایک سونامی کی طرح تباہی مچائی ہوئی تھی۔ تالیوں کا شور..... اس کا ناچتا ہوا وجود اور اس کی طرف دیکھتی حماد کی دو آنکھیں..... ان دو آنکھوں میں کیسی وحشت تھی۔ اس کا وجود راکھ بن کے رہ گیا تھا۔ حماد کا سامنا کرنے کے خوف سے وہ گھر نہیں گیا اور اگلے دن بھی جانا نہیں چاہتا تھا مگر پھر ایک موہوم سی امید جگا کر ہمت کر کے وہ گھر پہنچا تو وہاں حماد نہیں تھا۔ گھر کی کئی چیزیں بکھری پڑی تھیں اور اس کمرے میں جو اس نے حماد کے لیے مینا کی یاد میں بنایا تھا، وہاں شیشے پر اس کے لیے لکھا ہوا ایک فقرہ..... مجھے نفرت ہے آپ سے..... اس کے دل کو کاٹ کر رکھ گیا۔ وہ کتنی ہی دیر گرا روتا رہا۔ شام ڈھلی تو اسے اس دوسرے خوف نے جکڑ لیا جس کا تعلق حماد کی حفاظت سے تھا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا؟ یہ سوچ کر وہ اس کی تلاش میں نکلا۔ نہ اس کا کوئی رشتے دار تھا نہ حماد کا..... صرف اس کے دوست تھے..... لیکن پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کسی کے پاس نہیں گیا۔ وہ اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا رہا..... کئی دنوں کی تلاش کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اسے چھوڑ گیا ہے ہمیشہ کے لیے..... اب وہ اسے نہیں ملے گا..... جس کے بعد وہ نڈھال ہو کر یہاں داتا دربار آ بیٹھا تھا۔ اس نے کوئی دعا نہیں مانگی..... کوئی شکوہ نہیں کیا..... بس ایک طرف بیٹھا اپنے اندر بپا ہونے والی جنگ سے لڑتا رہا تھا..... پھر اچانک ہی زائرین کے ہجوم میں سے دو افراد اس کے قریب آ گئے۔

''تیمور.....'' اپنا نام سن کر اس نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ اس کے سامنے دو خواجہ سرا سر پر دوپٹا اوڑھے کھڑے تھے..... ان میں سے ایک کا چہرہ شناسا تھا۔

''شکر ہے خدا کا کہ تم مل گئے..... اللہ کی قسم ہم تو بڑے مایوس ہو چکے تھے..... پر یہ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے پیارے۔''

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

''وہاں تیرے گھر کے چکر لگا لگا کر ہماری جوتیاں گھس گئیں اور وہ تیرا کاکا کدھر ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' وہ سسک کر بولا..... سوال پوچھنے والے خواجہ سرا کو وہ پہچان چکا تھا..... یہ پیلی حویلی کا فرد تھا۔

''ہائے میں مر گئی۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو اور بھی برا ہوا..... تجھے پتا ہے وہ شاہنا کم بخت مارا پھر سے تم دونوں کے دوالے (پیچھے) ہوا پڑا ہے۔ تم گھر میں ہوتے تو ان کے ہتھے چڑھ چکے ہوتے..... یہی بتانے کے لیے تو ہم کئی دنوں سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ چل ہمارے ساتھ..... حویلی میں بلایا ہے تم کو..... تمہاری اور تمہارے کاکے کی جان کو پھر سے خطرہ ہے۔''

حماد کی جان پھر سے خطرے میں ہے، یہ سن کر وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

''لیکن حماد کے بارے میں تو مجھے بھی کچھ معلوم نہیں..... مجھ سے ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا ہے۔ کئی دنوں سے میں خود اس کی تلاش میں ہوں۔ کہیں وہ..... کہیں وہ شاہنواز کے آدمی اسے اٹھا کر تو نہیں لے گئے؟''

''میرے خیال میں نہیں..... کیونکہ اس موئے کے

مشٹنڈے تو ابھی تک اس کی تصویر لیے گھوم رہے ہیں۔ تو حویلی چل پھر ہم تیرے کاکے کو بھی ڈھونڈ لیں گے جیسے تجھے ڈھونڈ لیا ہے...... چل اٹھ۔"

وہ ان کے ساتھ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر کی سمت بڑھ گیا۔

"لیکن ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ سرخاب دادا نے تو ان سے معاہدہ کیا ہوا تھا۔ کیا وہ معاہدہ توڑ دیا انہوں نے؟"

تیمور کی بات سن کر وہ خواجہ سرا ٹھٹکا پھر ایک آہ بھر کے بولا۔

"معاہدہ نہیں ٹوٹا پیارے...... پر زندگی ٹوٹ گئی...... تجھے شاید معلوم نہیں...... سرخاب دادا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔"

تیمور پر یہ خبر کسی بجلی کی طرح گری تھی۔ "کیا...... کب...... یہ کب ہوا؟"

"پرسوں سات تو اس دن ہوا ہے انہیں گزرے...... اسی دن ملکہ کو دادا کی جگہ بٹھا دیا گیا ہے...... ملکہ باجی نے ہی ہمیں بھیجا ہے تم کو لینے کے لیے......" اس نے بتایا۔

دربار کے باہر ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی جس میں بیٹھ کر وہ پیلی حویلی پہنچے۔ یہ وہی حویلی تھی جس نے اسے تب پناہ دی جب موت اس کے تعاقب میں تھی اور اس حویلی میں موجود ایک "ہیجڑے" نے اسے لاہور شہر کے سب سے بڑے غنڈے سے نہ صرف بچایا تھا بلکہ کئی سالوں تک اس کے خطرے کو روکے رکھا تھا...... اور اب وہ یہاں نہیں تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ اس کی اور حماد کی زندگی کو موت کا وہ خطرہ پھر سے لاحق ہو چکا ہے جس سے وہ بچ کر اب تک زندہ تھے۔ سرخاب دادا کے کمرے میں ملکہ نے اس کا استقبال گلے لگا کر کیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ پچھلے ایک سال میں وہ سرخاب دادا سے ملنے کی فرصت نہیں نکال سکا تھا اور آج وہ اتنی دور چلے گئے تھے کہ ان سے ملاقات ناممکن تھی۔ ملکہ نے بتایا کہ ان کی موت کے اگلے دن ہی ملکہ کو اطلاع مل گئی تھی کہ شاہنے کے آدمی تیمور اور اس کے بیٹے کی تلاش میں نکل چکے ہیں...... انہیں گھر سے تمہاری اور حماد کی تازہ تصویریں مل گئی تھیں جن کو لے کر اس کے آدمی کتوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں...... لیکن یہ تیمور کی خوش قسمتی کہ وہ ان کے ہاتھ نہیں آیا۔

"لیکن حماد کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ مجھ سے شدید ناراض ہو کر گھر سے نکلا تھا اور پھر مجھے نہیں ملا۔" وہ غمناک لہجے میں بولا تو ملکہ نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ بات مجھے تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوئی ہے اور جانتے ہو کس سے؟ تمہارے کاکے حماد سے۔"

تیمور نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیسی اتفاق کی بات ہے...... تھوڑی دیر پہلے وہ یہیں بیٹھا تھا جہاں تم بیٹھے ہو۔"

"لیکن...... لیکن وہ...... لیکن وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟ وہ تو......" وہ حیرانی اور مسرت آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ کہانی تم اس سے ہی سننا...... پر خدا کا شکر ہے کہ وہ محفوظ ہے۔ وہ یہاں پیچھے اتفاقاً خواجہ سراؤں کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں انہوں نے اسے بڑا سانبھ (سنبھال) کے رکھا۔ وہاں سے حماد تمہارے پرانے دوست حاجی لطیف کے پاس پہنچ گیا۔ وہی اسے یہاں لے کر آئے تھے۔ وہ تم سے واقعی بہت ناراض تھا۔ اس نے تمہیں عورتوں کے لباس میں ناچتا ہوا دیکھا تو برداشت نہ کر سکا۔"

تیمور کی آنکھوں کے دیے اچانک سے بجھ گئے۔

"ہاں...... اس نے مجھے اس حالت میں دیکھا اور خفا ہو گیا اور میں، میں خود اس کا سامنا نہیں کر سکا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔"

"فکر مت کرو پیارے...... تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ وہ بچہ ہے...... چڑی جیسا دل ہے اس کا...... پر اب وہ تم سے خفا نہیں ہے۔ میں نے اسے سب بتا دیا...... اسے بتا دیا کہ تم نے اس کی خاطر کیا کچھ کیا ہے۔ تم نے اپنی زندگی برباد کر لی...... موت سے ٹکر لے لی...... حالانکہ تم اس کے سگے باپ بھی نہیں ہو۔"

"پھر...... اس نے کیا کہا؟" تیمور نے پژمردگی سے کہا...... کیونکہ اس نے کبھی اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کا سگا بیٹا نہیں ہے۔

"کہنا کیا تھا اس نے...... بات سمجھ میں آ گئی اس کے ننھے سے دل کو...... ناراضگی ختم ہو گئی ہے اس کی تجھ سے...... ملنے کو بے تاب بیٹھا ہے۔ میں نے واپس حاجی صاحب کے ساتھ بھجوا دیا کیونکہ تیری تو کوئی خبر نہ تھی...... ابھی بلوائے دیتے ہیں اسے......"

تیمور نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا کہ ناقابلِ بیان حد تک بگڑے ہوئے حالات یوں اچانک ٹھیک ہو رہے تھے۔

"پر ایک بات اور ہے...... میں نے تیرے پیچھے

اپنے آدمی صرف اس لیے نہیں بھیجے تھے کہ مجھے شاہنے کی نیت کا پتا چل گیا تھا۔ یہ بات تو مجھے ڈھونڈنے کے دوران پتا چلی کہ اس موئے کے ڈشکرے بھی تیرے پیچھے ہیں۔ دراصل..... سرخاب دادا نے مرنے سے ایک دن پہلے مجھے ایک امانت دی تھی اور کہا تھا کہ اسے تمہارے حوالے کردوں۔ میں نے اسی لیے تمہیں حویلی بلوایا تھا لیکن تم گھر میں ملے نہیں۔ تمہاری تلاش جاری تھی، اس دوران سرخاب دادا کے مرنے پر وہ نگوڑ مارا شاہنا خود حویلی میں اس کا افسوس کرنے آیا۔ افسوس تو بہانہ تھا۔ اس نے مجھے گدی سنبھالنے کی مبارکباد دی اور تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا کہ اس کا کچھ سامان سرخاب دادا کے پاس تھا۔ اگر میں وہ اسے دے دوں تو وہ ہمارے ساتھ پچھلی ساری دشمنیاں ختم کرسکتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ سرخاب دادا کے سامان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے لیے ہو..... اس نے مجھے اس چیز کی تفصیل بتائی..... یہ وہی چیز تھی جو سرخاب دادا نے تمہارے لیے چھوڑ رکھی تھی۔ میں نے اس سے مہلت مانگ لی کہ میں تلاش کر کے اسے بتادوں گی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے خیال گزرا کہ کہیں اس کا کوئی مخبر ہماری حویلی میں نہ ہو اور تمہاری امانت اس کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ یہی سوچ کر میں نے حاجی لطیف صاحب کو بلا کر تمہاری امانت ان کے سپرد کردی۔ اب وہ ان کے پاس ہے..... حاجی صاحب بھی تمہاری تلاش میں تھے لیکن تمہارے بجائے تمہارا کا کا ان کے ہاتھ لگ گیا۔"

"میں وہ امانت بھی دیکھ لوں گا لیکن پہلے مجھے حماد سے ملواؤ۔ میری آنکھیں ترس گئی ہیں اسے دیکھنے کو۔" ساری بات سن کر تیمور نے کہا تو ملکہ نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں..... بلکہ ہم خود چلتے ہیں۔ حاجی صاحب کا گھر ساتھ والی گلی میں ہی تو ہے..... تمہارا کا کا انہی کے گھر ہے۔"

تیمور یہ سن کر کھڑا ہوگیا۔

☆☆☆

وہ جب سے حاجی صاحب کے گھر سے آیا تھا، ایک عجیب سی کیفیت میں تھا۔ دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے تھکا تھکا سا نظر آرہا تھا۔ چنبیلی نے دو تین بار قریب آکر کبھی بال سہلاتے ہوئے تو کبھی ہلکے سے جھنجوڑ کر پوچھا بھی کہ کیا ہوا ہے لیکن اس نے جواب دینا تو درکنار آنکھیں بھی نہیں کھولیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے اردگرد کی ساری دنیا سے بے خبر بیٹھا ہے اور یہی حقیقت بھی تھی۔ پہلی حویلی کی اس ملکہ باجی نام کے خواجہ سرا نے اسے جو باتیں بتائی تھیں، وہ اس کے لیے اس "شاک" سے بڑھ کر تھیں جو اس نے تھیٹر میں اپنے باپ کو ناچتے ہوئے دیکھ کر محسوس کیا تھا..... اور ملکہ کا وہ فقرہ تو اس کی دنیا ہی تہ و بالا کر گیا تھا..... "تو اس آدمی سے ناراض ہے جس نے تیرے ساتھ وہ سلوک کیا جو تیرا سگا باپ بھی نہ کرتا....." اس کا مطلب تھا کہ تیمور اس کا سگا باپ نہیں تھا۔ یہ خبر بے شک بری تھی لیکن اس کے بعد جو تیمور نے اس کی جان بچانے کے لیے کیا وہ واقعات اپنے اندر اتنی تاثیر ضرور رکھتے تھے اور انہوں نے اس کے دل میں تیمور کے لیے محبت کے دیے پھر سے جلا دیے تھے..... وہ اس کا باپ نہیں تھا..... لیکن پھر کیا ہوا..... کیا تیمور نے اسے اپنی محبت سے اس بات کا احساس بھی ہونے دیا تھا؟ نہیں..... کیا اس نے تیمور کو باپ سے ہٹ کر کوئی درجہ دیا تھا؟ نہیں..... اس کا شدید خفا ہونا اور دیوانگی میں شیشے پر یہ فقرہ لکھنا کہ اسے تیمور سے نفرت ہے..... اور گھر چھوڑ دینا..... یہ سب اگر بغور دیکھا جائے تو اس میں نفرت نہیں بلکہ محبت کا اثر زیادہ نظر آتا تھا۔ محبت جتنی زیادہ گہری ہوتی ہے اعتماد اتنا ہی بلند ہوتا ہے۔ اس کا اعتماد بہت بلندی سے گر کر ٹوٹا تھا جس کی وجہ سے وہ گھر سے ناراض ہو کر نکلا تھا۔ ملکہ نے اسے ساری باتیں بتانے کے بعد یہ بھی بتایا تھا کہ جو خطرہ کئی سال پہلے ٹل چکا تھا، وہ دوبارہ سر اٹھا رہا ہے..... اس کے بعد انہوں نے اسے حاجی صاحب کے ساتھ واپس بھیج دیا..... لیکن واپس آتے ہوئے اس نے حاجی صاحب سے کہا کہ وہ چھیناں کے گھر جانا چاہتا ہے۔ حاجی صاحب نے قدرے تامل کے بعد اس کی بات مان لی اور اسے یہاں چھوڑ گئے۔

"میرے شہزادے! آنکھیں تو کھول..... میری طرف دیکھ تو سہی..... میرے دل میں کتنے ہول اٹھ رہے ہیں..... کیا ہوگیا ہے تجھے؟" چنبیلی ایک بار پھر اس کے پاس آبیٹھی تھی۔ اب کی بار اس نے آنکھیں کھول دیں اور چنبیلی نے پہلی بار اس کے چہرے پر آسودگی اور آنکھوں میں ایسی طمانیت دیکھی کہ وہ حیران رہ گئی۔

"میرا نام..... حماد ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا اور حیرانی کی تصویر بنی بیٹھی چنبیلی کو بتانے لگا کہ وہ کون ہے اور وہ کس بات سے ناراض ہو کر اپنے گھر سے نکلا تھا اور اب اس کی ناراضگی ختم ہوگئی ہے۔ اسے باتیں کرتا دیکھ کر بندیا، تمنا اور ستارہ بھی ان کے قریب آگئیں اور حماد کی کہانی سننے لگیں..... وہ خاموش ہوا تو ان سب کی آنکھیں آنسوؤں

سے لبریز تھیں۔ چنبیلی نے اس کا ماتھا چوم لیا اور بولی۔

''میں صدقے..... میں اپنے سوہنے شہزادے کی جان پر صدقے..... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تیرا غم ہلکا ہوگیا..... تیرا جی خوشیوں سے بھر گیا۔''

''چنبیلی باجی! میں آپ لوگوں کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کیا وجہ ہے جو میرے رب نے مجھے ایسے لوگوں کی محبت سے نوازا جو میرے سگے رشتے نہیں لیکن سگوں سے بڑھ کر پیار کیا.....'' بندیا نے جھٹ سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

''ذلیل کہیں کا..... بس چپ کر..... پہلے بولتا نہیں تھا..... اور اب بول رہا ہے تو بھی جان نکال رہا ہے۔'' اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

''دفع کرو..... جو بھی آیا ہوگا ستارہ دیکھ لے گی۔'' نیلی نے کہا لیکن تبھی باہر سے پہلے ستارہ کی چیخ اور پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ سب چونک گئے۔

''باجی ڈاکو.....'' ستارہ نے دروازے کی چوکھٹ پر نمودار ہوتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ فضا میں دھماکے کی آواز گونجی اور ستارہ منہ کے بل زمین پر گرتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی دو نقاب پوش ہاتھ میں پستول تھامے ستارہ کے گرے ہوئے جسم کو پھلانگ کر اندر داخل ہوگئے۔ چنبیلی وغیرہ چیخیں مار کر کمرے کے کونے میں جا کر کھڑی ہوگئیں۔ ان کے وجود تھر تھر کانپ رہے تھے اور آنکھیں نقاب پوشوں کے پیچھے ستارہ پر جمی ہوئی تھیں جس کا جسم ساکت ہو چکا تھا اور لہو کا ایک تالاب سا اس کے گرد پھیل رہا تھا۔

''اسے ہمارے حوالے کردو۔'' ایک نقاب پوش نے حماد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ چنبیلی نے حماد کو بازو سے پکڑ کر اپنے پیچھے کرلیا۔

''کک..... کون ہو تم.....؟'' چنبیلی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''میں کہتا ہوں اس بچے کو ہمارے حوالے کردو..... ورنہ تم سب کو جان سے ماردیں گے۔'' وہ دوبارہ غرایا۔

''نن..... نہیں..... اسے تم نہیں لے جاسکتے۔'' چنبیلی نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ عین اسی لمحے دروازے کے پیچھے سے چھیناں نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں وہ لاٹھی تھی جسے وہ آج کل کمر کے درد کی وجہ سے عصا کے طور پر استعمال کرتی تھی..... مگر اس وقت یہ لاٹھی اس نے ہتھیار کی صورت میں اٹھائی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لاٹھی ایک نقاب پوش کے سر پر دے ماری لیکن اچٹتا ہوا وار اس کے کندھے سے لگا۔ وہ ڈگمگا کر گر گیا تو چھیناں چلاتی ہوئی دوبارہ لاٹھی سونت کے آگے بڑھی لیکن تبھی فضا میں دوسرے دھماکے کی آواز گونجی اور چھیناں سینے پر ہاتھ رکھے زمین پر گرتی چلی گئی۔ اس صورت حال میں چنبیلی نے بھی فاش غلطی کردی۔ وہ فائر کرنے والے نقاب پوش پر پل پڑی اور اسے رگیدتے ہوئے زمین پر گر گئی مگر بندیا اور نیلی ہمت نہ دکھا سکیں۔ وہ زور، زور سے روتے ہوئے ایک دوسرے کو یوں تھام رہی تھیں جیسے کوئی پناہ تلاش کر رہی ہوں۔ ادھر لاٹھی کھا کر گرنے والے نقاب پوش نے اٹھ کر چنبیلی کو اپنے ساتھی سے الگ کرنے کی کوشش کی..... مگر ناکام ہونے کے بعد اس نے پستول چنبیلی کے سر سے ٹکا دیا۔ حماد نے بے اختیار آنکھیں بند کرلیں۔ تیسرے فائر کی آواز فضا میں گونجی تو اس کا دل ڈوب گیا۔ اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ وہ بیٹھتا چلا گیا۔ چنبیلی بھی جان کی بازی ہار چکی تھی۔ تبھی باہر سے ایک اور نقاب پوش اندر داخل ہوا اور چلایا۔

''کیا کر رہے ہو..... جلدی کرو..... فائرنگ کی آواز سن کر کوئی آگیا تو پھنس جائیں گے۔''

''یہ حرامزادے مزاحمت کر رہے ہیں۔''

''جو بیچ میں آتا ہے اسے ٹھوک دو..... لیکن لڑکے کو اٹھا کر نکلو جلدی.....'' یہ سن کر پہلے والے دونوں نقاب پوش دوبارہ کمرے کے تین زندہ نفوس کی سمت مڑے۔ بندیا اور نیلی مسلسل چلا رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔ حماد کو لگا کہ وہ لوگ انہیں بھی ماردیں گے۔ وہ جلدی سے کھڑا ہوگیا۔

''میں..... میں ساتھ چلتا ہوں..... لیکن ان کو چھوڑ دو۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

نقاب پوش نے سر ہلاتے ہوئے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ حماد نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے بندیا اور نیلی کی طرف دیکھا جو موت کے خوف سے کانپ رہی تھیں اور اس نقاب پوش کی سمت بڑھ گیا۔

☆☆☆

تیمور، ملکہ اور ملکہ کے کچھ ساتھی حاجی صاحب کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ جب فضا میں قدرے دور سے ایک دھماکے کی آواز سن کر ملکہ چونک گئی۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے دو اور دھماکے ہوئے۔

''یہ تو فائرنگ کی آواز ہے۔'' ملکہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ہوائی فائرنگ ہوگی باجی۔'' اس کے ایک ساتھی

نے کہا۔

''نہیں..... یہ ہوائی فائرنگ نہیں تھی رے..... اس کی آواز تو.....'' ملکہ کی بات ادھوری رہ گئی..... حاجی صاحب گھر کا دروازہ کھول کر باہر آئے اور انہیں دیکھ کر چونک گئے..... تیمور کو دیکھتے ہی انہوں نے گلے سے لگالیا اور کافی دیر تک لگائے رکھا۔ دونوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ حاجی صاحب تیمور کے دوست نہیں تھے بلکہ وہ تیمور کے دوست عامر کے دوست تھے اور ان کی دوستی اتنی پُرخلوص تھی کہ عامر نے تیمور کو جان بچانے کے لیے انہی کی طرف بھیجا تھا اور انہوں نے اس دوستی کا حق بھی ادا کیا تھا۔ اس کے بعد تیمور کے ساتھ جو ہوا، حاجی صاحب اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ انہیں گھر کے اندر ڈرائنگ روم میں لے آئے اور خود باہر چلے گئے۔ تیمور حماد کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا لیکن کچھ دیر بعد جب وہ لوٹے تو ان کے ساتھ حماد نہیں تھا بلکہ ایک سفید رنگ کا ڈبا تھا۔ انہوں نے وہ ڈبا ملکہ کے حوالے کردیا۔ ملکہ نے اس ڈبے کو تیمور کے ہاتھ میں دے دیا۔

''یہ وہ امانت ہے جو سرخاب دادا نے تمہیں دینے کے لیے سونپی تھی۔''

تیمور نے ڈھکن کھول کر ڈبے کے اندر جھانکا۔ اندر ایک ویڈیو کیسٹ پڑی تھی۔ یہ پرانے طرز کی کیسٹ تھی جس میں میگنیٹک ٹیپ استعمال ہوا کرتی تھی اور اسے دیکھنے کے لیے وی سی آر کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک جدید کومپیکٹ ڈسک (سی ڈی) بھی پڑی تھی۔ دونوں پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ ساتھ میں ایک سربمہر خط بھی تھا۔ یہ خط سرخاب دادا کی طرف سے تیمور کے نام تھا۔ اس خط میں ایک مختصر نوٹ یہ بھی تھا کہ یہ ویڈیو کیسٹ تیمور کے لیے ہے..... اور یہ شاہنواز سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ اس تفصیلی خط میں جو باتیں تھیں، وہ کافی ہوش ربا تھیں۔ انہیں پڑھ کر تیمور کو کافی حد تک یہ اندازہ ہوگیا کہ جن خونیں حالات میں وہ حماد کی زندگی بچانے کے لیے گھرا ہوا تھا اور سرخاب دادا اس کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی جان کی بازی لگا رہے تھے، وہ اچانک کیسے ختم ہوگیا اور اس معاہدے میں کیا ایسا تھا کہ شاہنے جیسے سکہ بند غنڈے نے تیمور اور حماد کی جان بخش دی تھی اور ساتھ میں اس بات کا اشارہ بھی دیا گیا تھا کہ اس ویڈیو کیسٹ میں کیا ہے۔ یہ باتیں بہت سنسنی خیز تھیں۔ تیمور کو سرخاب دادا کے ساتھ ہونے والی آخری ملاقاتوں کی باتیں یاد آتی چلی گئیں اور یہ واضح ہوتا چلا گیا کہ ان حالات میں ایسا کیا ہوا تھا جو شاہنواز جیسا غنڈا گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگیا بلکہ سرخاب دادا کی موت تک وہ تیمور یا حماد کے پیچھے نہیں آیا تھا۔

''اس کیسٹ کو دیکھنے کے لیے وی سی آر کی ضرورت پڑتی ہے لیکن ہمارے پاس وی سی آر نہیں تھے..... تو میں نے اس کی ایک سی ڈی بھی بنوالی مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے اسے دیکھا نہیں اور میں نہیں جانتی کہ اس کے اندر کیا ہے۔'' ملکہ نے کہا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے..... لیکن حماد کہاں ہے؟'' تیمور نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ محفوظ ہے۔ ادھر پچھلی گلی میں ایک گھر ہے، وہ وہاں ہے۔ آیئے اس کے پاس چلتے ہیں۔'' حاجی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا تو باقی سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ پیدل ہی حاجی صاحب کے گھر سے روانہ ہوئے لیکن پچھلی گلی میں پہنچتے ہی وہ سب بری طرح چونک گئے۔ وہاں لوگوں کا کافی رش لگا ہوا تھا۔

''کیا ہوا.....؟'' حاجی صاحب نے ایک آدمی سے پوچھا۔

''وہ جی ''کھسروں'' (خواجہ سراؤں) کے گھر میں ڈکیتی ہوگئی ہے۔ تین کھسرے بھی مار دیے ہیں ڈاکوؤں نے۔'' اس کی بات سن کر حاجی سمیت ملکہ اور تیمور بوکھلا کر بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لوگوں کے ہجوم میں طرح طرح کی آوازیں ان کے کانوں میں پڑ رہی تھیں اور ایسی دل دہلا دینے والی صورتِ حال میں بھی چند بے حس لوگ فقرے کس رہے تھے۔

''کھسروں کے گھر سے بھلا ڈاکو کیا لے جاسکتے ہیں.....؟'' کوئی پوچھ رہا تھا۔

''سنا ہے دو کو زندہ چھوڑ گئے ہیں..... پتا نہیں ان کے ساتھ کیا مک مکا کیا ہوگا۔'' ایک معنی خیز آواز ابھری۔

ایسے ہی کئی زہریلے فقروں کو سماعت کے اندر انڈیلتے ہوئے ملکہ، حاجی صاحب اور تیمور اس گھر میں داخل ہوئے جہاں کا منظر خوفناک تھا۔ برآمدے میں تین لاشیں پڑی تھیں..... جن کے گرد خون پھیلا ہوا تھا..... ایک خواجہ سرا ان لاشوں پر سر رکھے رو رہا تھا۔ دوسرا اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بین کر رہا تھا جبکہ ان کے اردگرد محلے کے ''مکمل انسانوں'' کا ہجوم خاموش کھڑا انہیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی تماشا لگا ہو۔

''بندیا..... بندیا..... یہ سب کیا ہوگیا؟'' حاجی

صاحب نے بین کرنے والے خواجہ سرا کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہم برباد ہو گئے..... ہم لٹ گئے..... خدا کی مار ہو ان پر..... ہم سے ہماری چھت چھین لی..... ہائے ہماری چنبیلی باجی..... چھیناں باجی..... ہم برباد ہو گئے۔'' وہ بین کیے جا رہی تھی۔

''حماد کہاں ہے؟'' تیمور نے خوفزدہ انداز میں ادھر اُدھر یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے اسے خوف ہو کہ ابھی اس کی لاش بھی نظر آ جائے گی۔

''حماد کہاں ہے بندیا..... وہ لڑکا کہاں ہے؟'' حاجی صاحب نے پوچھا۔

''وہ لے گئے..... اس معصوم کو بھی لے گئے..... ہائے ہم اس کی خوشی منا رہے تھے..... وہ ہماری خوشیاں لوٹ کر لے گئے.....'' بندیا یہ کہتے ہوئے چنبیلی کی لاش پر بے سدھ ہو کر گر گئی۔ فضا میں پولیس سائرن کی آوازیں گونجنے لگیں۔

☆☆☆

صبح ہو چکی تھی۔ وہ پیلی حویلی میں ملکہ کے ساتھ اس کے خاص کمرے میں موجود تھا۔ پولیس نے چھیناں کے گھر پہنچ کر ضروری کارروائی کی تھی اور لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دی تھیں۔ بندیا اور نیلی کے بیانات لینے کے بعد پولیس چلی گئی تو ملکہ ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ پیلی حویلی میں لے آئی۔ اس کے بعد اپنے خاص کمرے میں آ کر ملکہ نے سی ڈی پلیئر منگوایا۔ تیمور اور ملکہ نے ایک ساتھ وہ ویڈیو دیکھی جس کی وجہ سے شاہنواز جیسے غنڈے کو سرخاب دادا کے سامنے گھٹنے ٹیکنا پڑے تھے۔ اس کے بعد تیمور نے اس معاملے کے متعلق وہ ساری باتیں ملکہ کو بتا دیں جو وہ سمجھ چکا تھا۔ سرخاب دادا اور شاہنواز کا ہونے والا معاہدہ اتنا خفیہ تھا کہ اس کی تفصیلات کے بارے میں سرخاب دادا کے خاص ساتھی ملکہ کو بھی معلوم نہ تھا اور اپنے گرو کی بات سمجھتے ہوئے اس نے اس بارے میں جاننے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔

''میں آج کئی سالوں بعد پھر اس موڑ پر کھڑا ہوں جہاں سے بھاگ کر میں نے یہاں پناہ لی تھی۔'' تیمور نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے یہ موت کا خوف ہی حقیقت ہے۔ اس درمیان جو وقت میں نے حماد کے ساتھ امن میں گزارا، وہ صرف ایک خواب تھا اور اب وہ خواب ختم ہو گیا ہے۔''

''تو فکر کیوں کرتا ہے..... سرخاب دادا نہیں ہیں تو کیا ہوا..... اس حویلی نے پہلے بھی تیری مدد کی تھی اور اب بھی کرے گی۔''

''میں اور میرا بیٹا..... ہمارے ساتھ موت کا لفظ جڑ چکا ہے۔ جو ہمارے ساتھ آئے گا وہ مارا جائے گا۔ یہ کل رات تین خواجہ سراؤں کی اموات نہیں ہوئیں، اس سے پہلے بھی کئی لوگ ہمیں بچاتے ہوئے مرے ہیں اور کتنی جانیں لے گی ہماری زندگی..... کتنے لوگ ہمیں بچاتے ہوئے مر جائیں گے..... لیکن نہیں..... اب اور نہیں۔ میں ایک زندگی کو بچانے کے لیے مزید زندگیاں برباد نہیں کر سکتا۔'' تیمور نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

ملکہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن تبھی ان کا موبائل فون بج اٹھا۔ اس نے کال ریسیو کی اور قدرے چونک گئی۔ پھر چند ہوں ہاں کے بعد اس نے اچانک موبائل تیمور کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ..... تمہارے واسطے ہے۔'' تیمور نے ملکہ کی بات سن کر حیرانی سے موبائل تھام کر کان سے لگایا..... اور بری طرح چونک گیا۔ دوسری طرف کوئی اور نہیں..... شاہنواز خود تھا۔

''میں جانتا تھا تو اس وقت یہیں ملے گا اور میں یہ بھی

جانتا ہوں کہ تمہارے پاس وہ سامان پہنچ گیا ہوگا جس نے ایک عرصے سے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں لیکن اب وہ سب تیرے لیے بے کار ہے..... کیونکہ تیرا بیٹا میرے پاس ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ایک گاڑی تجھے لینے آئے گی..... اس سامان کے ساتھ اکیلے میرے پاس چلا آ..... ورنہ.....'' وہ بولتے بولتے دھمکی آمیز لہجے میں رک سا گیا..... پھر دوبارہ بولا۔'' دو گھنٹے تک تو میرے پاس نہیں پہنچا تو میں تیرے بیٹے کو مار ڈالوں گا اور تو جانتا ہے یہ محض دھمکی نہیں ہے۔''

اس کے بعد کال کٹ گئی۔

''کیا ہوا..... کیا کہا اس ذلیل نے.....؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''ایک گاڑی آرہی ہے مجھے لینے..... میں جارہا ہوں شاہنواز کے پاس..... اپنے بیٹے کے پاس..... اکیلا۔'' وہ دھیرے دھیرے بولا۔

''نہیں..... یہ ٹھیک نہیں ہے رے..... میں تجھے ایسے موت کے منہ میں جانے نہیں دوں گی..... دیکھ..... ادھر دیکھ..... وہ تجھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسے اس ویڈیو کی ضرورت ہے۔ ابھی کھیل تیرے ہاتھ میں ہے۔'' ملکہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''لیکن اس کے ہاتھ میں میرے بیٹے کی زندگی ہے ملکہ..... میں اس کھیل میں جیت کر کیا کروں گا۔ اگر میں اپنا بیٹا ہی ہار گیا تو.....''

''نہیں رے نہیں..... وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ملکہ نے غصے سے کہا۔

''اب کوئی چارہ نہیں ہے..... اب کوئی چارہ نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا تو ملکہ..... چپ ہوگئی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے چونک کر کہا۔

''اور وہ جو ہم نے طے کیا تھا کہ سلطان عالم سے ملنے کی راہ نکالتے ہیں..... وہ کیا ہوا؟''

''اب اس کے لیے وقت نہیں بچا ملکہ..... وہ سی ایم ہے..... سی ایم..... اس سے ملنے کے لیے کئی دن پہلے وقت لینا پڑتا ہے اور کوئی دوسرا طریقہ ایسا ہے نہیں کہ اس سے براہِ راست مل لیا جائے اور ویسے بھی شاہنواز نے دو گھنٹے کا وقت دیا ہے..... اتنے سے وقت میں کچھ نہیں ہوسکتا۔'' تیمور نے کہا۔

ملکہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ وہ اپنی چٹیا کو پکڑے بار بار سہلا رہی تھی اور سوچ کر نئے نئے حل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن شاید تیمور صحیح کہہ رہا تھا کہ اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ تیمور شاہنے کے پاس اس ویڈیو سمیت چلا جائے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں اطلاع دی گئی کہ حویلی کے باہر ایک گاڑی تیمور کو لینے آئی ہے۔

تیمور اٹھ کھڑا ہوا ملکہ نے ویڈیو کیسٹ والا ڈبا اٹھایا اور تیمور کو تھما دیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

''حوصلہ مت ہارنا..... کچھ نہیں ہوگا تجھے اور نہ ہی تیرے کاکے کو..... اور اگر کچھ ہوا تو میں اس غنڈے کی نسلیں برباد کردوں گی..... میں وعدہ کرتی ہوں۔'' تیمور نے ڈبا تھاما اور باہر چلا گیا۔ باہر ایک لینڈ کروزر کھڑی تھی جس میں چار مسلح افراد سوار تھے۔ انہوں نے تیمور کو بٹھایا اور ساتھ لے گئے۔ ان کے جاتے ہی ملکہ نے آواز دی۔

''گل بدن..... رانی.....'' اس کی آواز پر دو خواجہ سرا بھاگتے ہوئے آئے اور سوالیہ نظروں سے ملکہ کی طرف دیکھنے لگے..... ملکہ نے سی ڈی پلیئر کے اندر سے سی ڈی نکالی اور کہا۔'' پتا کرواؤ..... آج کے دن سلطان عالم شہر کی کون سی سڑکوں سے گزرنے والا ہے۔''

☆☆☆

اس کے دونوں بازو اس کے سر سے اوپر اٹھا کر ایک زنجیر کے ساتھ دیوار میں لگے ہک سے بندھے ہوئے تھے اور پیروں کے نیچے برف کا بلاک تھا جس کی ٹھنڈ کسی تیز دھار آلے کی طرح اس کے سن ہونے والے پیروں سے لے کر رانوں تک پھیل رہی تھی۔ اوپر کے برہنہ جسم پر نیل کے نشان واضح نظر آرہے تھے۔ چہرے پر بھی تشدد کے نشان ابھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ ایک آنکھ سوج کر بند ہوچکی تھی اور دوسری بھی مشکل سے کھل رہی تھی۔ ماتھے کے اوپر سر سے بہنے والا لہو اب جم رہا تھا۔ تکلیف کے اندوہناک سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے وہ کبھی پیروں تلے برف کی کند لہروں سے بچنے کے لیے کلائیوں سے بندھی زنجیر پر جسم کا سارا وزن ڈال کر پیر اوپر اٹھاتا لیکن تبھی لوہے کی زنجیر کی کڑیاں کلائیوں کے گھاؤ میں کھب جاتیں اور وہ دوبارہ برف پر پیر رکھنے پر مجبور ہوجاتا۔

پیلی حویلی سے اسے شاہنے کے آدمیوں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا اور کچھ دور جا کر انہوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی جس کے بعد ان کا یہ سفر مسلسل ایک گھنٹے تک جاری رہا پھر یہ گاڑی کسی جگہ رکی جہاں اسے بازوؤں سے پکڑ کر باہر نکالا گیا اور گھسیٹتے ہوئے کچھ دور لے جا کر ایک خالی کمرے میں پھینک دیا گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر لگی پٹی اتار دی۔ یہ کمرا بالکل خالی تھا اور اس میں

کوئی کھڑکی بھی نہ تھی، صرف ایک بند دروازہ تھا۔ وہ ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ کمرے سے باہر بھی کسی قسم کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ ویڈیو کیسٹ والا ڈبا تو وہ گاڑی میں ہی اس سے لے چکے تھے۔ کافی دیر یونہی گزر گئی..... پھر اچانک دروازہ کھلا اور اندر آنے والے کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ یہ وہی کالا بھجنگ آدمی تھا جس نے ایک بار اسے ماڈل ٹاؤن سے اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ بعد میں تیمور کو پتا چلا تھا کہ یہ شاہنے کا خاص آدمی ہے اور اس کا نام بھی اس کی شخصیت پر پورا اترتا تھا..... کالو..... وہ نیلی پتلون اور کالی شرٹ پہنے ہوئے اسے کچھ دیر یوں گھورتا رہا جیسے قصائی بکرے کا جائزہ لے رہا ہو پھر وہ بنا کچھ کہے باہر چلا گیا۔ البتہ دروازہ کھلا رہا۔ چند لمحوں بعد دو آدمی اندر داخل ہوئے اور تیمور کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکلے۔ باہر ایک کوریڈور سے ہو کر وہ ایک اور کمرے میں پہنچے..... جہاں کالو اسی کا منتظر تھا۔ اس کے بعد کے حالات ناقابلِ بیان تھے۔ بڑے بے رحمانہ طریقے سے کالو نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اس پر غیر انسانی تشدد کی انتہا کر دی اور پھر اسے یوں دیوار کے ساتھ برف پر کھڑا کر کے چلے گئے..... اور اب اسے اس حالت میں تقریباً آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔

☆☆☆

سڑک کے دونوں اطراف کے راستے بلاک کیے جا چکے تھے۔ پولیس والے الرٹ کھڑے تھے۔ بلاک کیے گئے راستوں پر دور تک گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں اور کئی ایسے لوگ بھی جمع تھے جنہیں پیدل سڑک پار کرنا تھی لیکن وہ پار نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ سی ایم کا کانوائے گزر نہ جائے۔ انہی لوگوں میں ملکہ اور اس کے ساتھی بھی کھڑے تھے۔

"ملکہ باجی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ آج کل کے جو حالات ہیں، یہ موئے پولیس والے دور سے گولی مار دیتے ہیں۔ ہمیں کچھ اور سوچنا چاہیے۔"

"سوچنے کا وقت نہیں ہے رے..... بس تم لوگ اپنا کام برابر کرنا اور اگر مجھے کچھ ہو جائے تو پھر یہ کام تم نے کرنا ہے..... اور تم سے نہ ہو پائے تو گل بدن تم تیار رہنا۔ ایک کے بعد ایک جان دیں گے پر..... اس سی ایم سے ملے بغیر کوئی پیلی حویلی واپس نہیں جائے گا رے..... سمجھ گئے نا؟" ملکہ نے کہا تو سب ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے..... وہ سب مردانہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے اور ان کے چہرے میک اپ سے عاری اور مردانہ کرختگی سے بھرپور تھے۔ کیونکہ جو کام وہ کرنے والے تھے اس کے لیے نزاکت کی نہیں مردانگی کی ضرورت تھی اور پھر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا وہ انتظار کر رہے تھے۔ پولیس ہوٹر کی آوازوں کے ساتھ کانوائے قریب آ رہا تھا۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں..... ملکہ نے جست لگائی اور دوڑتی ہوئی باؤنڈری بنے پولیس کے جوان کو دھکیل کر سڑک کے عین درمیان میں آ کھڑی ہوئی۔ فضا میں چلاتی ہوئی کئی آوازیں گونجیں اور اردگرد کے پولیس آفیسر بوکھلا کر اس کی سمت بھاگے..... مگر تبھی دونوں اطراف کے پولیس والوں کے پیچھے سے خواجہ سراؤں کے ایک جتھے نے انہیں چھاپ لیا۔ کسی نے انہیں واپس کھینچا تو کسی نے زمین پر گرا لیا اور کوئی بھی ملکہ تک پہنچ نہ پایا۔ کانوائے کی پائلٹ گاڑی جو بڑی اسپیڈ سے آ رہی تھی اس نے بڑی مشکل سے اچانک سامنے آ جانے والی ملکہ کو کٹ کر کے بچایا۔ فضا میں بریکوں کی آوازیں گونج اٹھیں۔ سڑک کے اطراف میں کھڑے لوگ بھی چلاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگے۔ ان کی دانست میں شاید کوئی دہشت گردی کا حملہ ہونے والا تھا۔ پائلٹ گاڑی کے پیچھے ایلیٹ فورس کی گاڑی کے ڈرائیور نے زوردار بریک سے گاڑی روکی اور اس کے رکنے سے پہلے ہی ہاتھوں میں گنیں تھامے کمانڈوز اچھل کر باہر آ گئے۔ ان کی گنوں کا رخ ملکہ کی طرف تھا مگر ملکہ سڑک پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہاتھوں کو اوپر اٹھائے سر کو جھکائے بیٹھی تھی اور اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ گولی چلے گی یا نہیں۔ یہ زندگی کا رسک تھا اس میں کوئی دوسری رائے نہیں تھی۔ ادھر سڑک کے اطراف میں پولیس والے اور خواجہ سرا ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور... اردگرد سے پولیس کے مزید آدمی آ جانے کی وجہ سے خواجہ سراؤں کی فوج ان کے زیر آ رہی تھی۔ ایلیٹ کمانڈوز بجلی کی طرح ملکہ کے قریب پہنچے اور اسے خالی ہاتھ اٹھائے دیکھ کر اس پر پل پڑے۔ انہوں نے اسے سڑک پر الٹا گرا لیا اور گنوں کی نالیں اس کی پشت سے لگا دیں۔ وہ چلائی۔

"میں نہتی ہوں..... میری بات سنو..... سی ایم کی جان کو خطرہ ہے..... سی ایم کی جان کو خطرہ ہے۔"

تب تک کانوائے کی باقی گاڑیاں اسپیڈ بڑھاتی ہوئی سائڈ سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ جیسے ہی کانوائے دور ہوا، فورسز نے ملکہ کو پکڑ کر گاڑی میں دھکیلا اور آگے بڑھ گئے۔ سڑک پر پولیس والوں نے ہلا بولنے والے سارے خواجہ سرا مار دھاڑ کے بعد قابو کر لیے تھے اور اب

انہیں پولیس اسٹیشن لے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔
ادھر ملکہ کی چلتی ہوئی گاڑی میں ہی کمانڈوز نے اچھی خاصی دھلائی کر دی تھی..... کیونکہ اس کی وجہ سے جو سیکیورٹی لیپ پیدا ہوا تھا اس پر آگے بہت ہنگامہ ہونے والا تھا..... مگر جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ جسے وہ مار رہے ہیں، وہ چیخ نہیں رہا..... چیخ رہی ہے تو اور زیادہ حیران رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ فورسز کے ایک خفیہ سیل میں تھا..... جو کہ بظاہر ایک کوٹھی کی شکل میں تھا۔
''تجھے پتا بھی ہے کہ کیا کچھ ہو سکتا تھا..... تجھے گولی ماری جا سکتی تھی۔'' پوچھنے والا کافی برہم نظر آ رہا تھا۔
''میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا صاحب۔'' وہ ہتھکڑیوں سے بندھے ہاتھوں کو اٹھا کر ہونٹوں سے بہنے والا خون پونچھتے ہوئے بولی۔
''چارے کا بچہ.....'' وہ مزید برہم ہو گیا۔
''صاحب جی! میری بات سنیں..... جتنی گالیاں دینی ہیں دے لیں، پر خدا کے واسطے میری بات کا یقین کریں۔ سی ایم صاحب کی جان کو خطرہ ہے۔''
''یہ بات تو کسی اور طریقے سے بھی بتا سکتا تھا..... اس ہیر دگیری کی کیا ضرورت تھی؟'' انہوں نے میز پر مکا مارتے ہوئے پوچھا۔ ''جی تو چاہتا ہے کہ پہلے تجھے ڈرائنگ روم کی سیر کرواؤں..... پر.....'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔
''چل اب بھونک..... جو بھونکنا ہے۔''
''صاحب جی! سی ایم کی جان کو خطرہ ہے۔''
''حرام کے تخم..... آگے بھی تو بول..... کیسے پتا چلا تجھے..... اور خطرہ کون ہے؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔
''نہیں صاحب جی! یہ بات..... میں صرف سی ایم صاحب سے ہی بولوں گی.....'' اس نے کہا تو جواب میں آفیسر نے زوردار تھپڑ اسے جڑ دیا اور اس کی لمبی چٹیا کو کھینچ کر پکڑتے ہوئے بولا۔
''سیدھی طرح بکواس کر..... نیا پنڈورا بکس نہ کھول.....''
''آپ جو مرضی کر لو صاحب جی..... پر میری دو باتوں پر یقین کر لو۔ ایک تو یہ کہ میں یہ بات صرف سی ایم کو ہی بتاؤں گی اور دوسرا آپ کے پاس صرف ایک گھنٹا ہے..... اور اس ایک گھنٹے کے بعد جو ہو گا اس کی میں ذمے دار نہیں ہوں گی۔'' ملکہ نے کہا۔
''حرامزادے! میں تیری چمڑی ادھیڑ دوں گا..... تو سمجھتا کیا ہے خود کو..... ادھر کوئی فلم چل رہی ہے کیا۔'' وہ بھنا کے بولا۔
''جو مرضی کر لو صاحب جی! ہڈیاں توڑ دو..... جان سے مار دو لیکن ایک گھنٹے میں سی ایم صاحب کو بچانا ہے تو میری ان سے بات کروانی پڑے گی۔''
آفیسر چند لمحے اس کی طرف غصے سے دیکھتا رہا پھر جھنجلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا..... ملکہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

☆☆☆

تیمور ابھی تک دیوار کے ساتھ لٹکا ہوا برف کی سل پر ناقابلِ بیان تکلیف میں گھرا ہوا تھا لیکن وہ اب اس جگہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے عین سامنے ایک کرسی پر شاہنواز خود موجود تھا۔
''میں نے اپنی پوری زندگی کسی کو مارنے کے لیے اتنا انتظار نہیں کیا جتنا تم نے مجھے کروایا ہے۔'' سامنے کرسی پر بیٹھے شاہنواز نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو نے اس بچے کی خاطر مجھے خوب دوڑایا اور پھر اس کھسرے (خواجہ سرا سرخاب دادا) کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ کیوں کیا تو نے ایسا؟ کیا لگتا ہے۔۔ وہ بچہ تیرا؟''
''وہ..... میرا..... بیٹا..... ہے۔'' تیمور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔
''بیٹا ہوتا تو بات سمجھ میں آ جاتی میرے..... مگر مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ تیرا بیٹا نہیں ہے..... پھر بھی..... پھر بھی تو نے اپنی جان اس کے پیچھے گنوا دی۔''
تیمور نے کچھ نہیں کہا۔ بس برف کے بلاک پر کھڑا کپکپاتا ہوا اسے ایک آنکھ سے دیکھتا رہا۔
''تو سمجھتا کیا ہے خود کو..... میرے شکار کو مجھ سے چھین لے گا اور زندہ رہے گا؟ تو سمجھتا ہے کہ اس کھسرے کی وجہ سے تجھے زندگی کا پروانہ مل گیا تھا؟ نہیں نہیں..... تجھے اور اس بچے کو اگر زندہ رہنے کی مہلت دی بھی تو اس کی وجہ کچھ اور تھی مگر مہلت تو مہلت ہوتی ہے..... ایک نہ ایک دن ختم ہو ہی جاتی ہے..... تیری مہلت بھی ختم ہو گئی ہے۔''
تبھی دروازہ کھلا اور کالو حماد کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔ حماد کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ لگائی ہوئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے تیمور کو قابلِ رحم حالت میں دیوار کے ساتھ بندھا دیکھا تو تڑپ اٹھا۔ وہ چیختے ہوئے اس کی طرف بھاگنا چاہتا تھا لیکن نہ تو اس کی چیخ نکل سکی اور نہ ہی وہ اس کی طرف بھاگ سکا۔ غوں غاں کرتا ہوا وہ کالو کے مضبوط ہاتھ میں تڑپ کر ہی رہ گیا۔ تیمور حماد کو دیکھ کر چلانے لگا۔ اس کا بس

نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود کو آزاد کروا لے مگر یہ آسان نہ تھا۔ ایک دیوانگی سی اس کے اعصاب پر طاری ہونے لگی۔ وہ شاہنواز اور کالو کو گالیاں دینے لگا اور ایسی دھمکیاں جن کے پورا ہونے کی کوئی امید نہیں نظر آ رہی تھی۔ باپ اور بیٹے کی اس حالت کو دیکھ کر شاہنواز کمینگی کے ساتھ مسکرایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سگریٹ پھینک دیا اور جیب سے اپنا پستول نکال لیا۔ اس کے بعد وہ حماد کی طرف آیا اور اسے پکڑ کر کسی جانور کی طرح گھسیٹتا ہوا تیمور کے قریب لے آیا۔ حماد کسی ایسی مرغی کی طرح پھڑک رہا تھا جسے ذبح کرنے کے لیے پنجرے سے نکالا گیا ہو۔

''تو اسے بچانا چاہتا تھا نا... تو پھر دیکھ..... ابھی اسے تیری آنکھوں کے سامنے ماروں گا۔'' شاہنواز نے غراتے ہوئے کہا اور حماد کو جھٹکا دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر سا گیا۔ شاہنواز نے پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ تیمور کا گلا چیخ چیخ کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ اب گالیوں کے بجائے منتیں کر رہا تھا اور اسے خدا کے عذاب سے ڈرا رہا تھا مگر اس کی کسی بات کا شاہنواز پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حماد نے آنسوؤں سے لبریز اور موت کے خوف سے بھری ہوئی آنکھوں سے جیسے تیمور کا آخری نظارہ کیا اور تیمور نے اس کی طرف دیکھا تو جیسے خود کو مرتا ہوا محسوس کیا۔ شاہنواز نے بڑی بے رحمی کے ساتھ پستول کے ٹریگر پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا اور پھر موت کے اس کمرے میں گولی کا دھماکا گونج اٹھا۔

☆☆☆

ملکہ کے سامنے سول لباس میں بیٹھا نیا آدمی فورسز کا کوئی بڑا افسر ہی تھا۔

''دیکھو، تمہیں جو بھی بتانا ہے وہ ہمیں ہی بتانا ہوگا۔ یوں سمجھ لو کہ تمہارے سامنے سلطان عالم ہی بیٹھے ہیں۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

''صاحب جی! آپ صرف وقت ضائع کر رہے ہیں اور ادھر موت سلطان عالم کے قریب پہنچتی جا رہی ہے۔''

''اس کی فکر مت کرو، وہ ہائی پروفائل سیکیورٹی میں ہیں..... وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔''

''آپ کی یہ بات کچھ دیر میں غلط ثابت ہو گئی تو؟ آپ ان کی جان کا رسک لے رہے ہیں۔ بس ایک بار میری ان سے بات کروا دیں۔''

''تم سمجھ نہیں رہے..... سلطان عالم صاحب یوں کسی سے بات نہیں کر سکتے..... یہ ناممکن ہے۔''

''میں نے اپنی جان پر کھیل کے جو کچھ کیا صاحب

جی..... وہ ناممکن ہی تھا..... آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگادی۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے؟ آپ ایک بار ان سے بات کر کے تو دیکھیں۔''

وہ ہونٹ بھینچتا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک اسمارٹ فون تھا۔ اس نے فون ملکہ کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ فون کی اسکرین پر ویڈیو کال جاری تھی اور سلطان عالم نظر آ رہا تھا۔

''صاحب جی! جو بات میں آپ کو بتانے والا ہوں وہ بہت اہم ہے۔ کیا آپ کا یہ افسر قابلِ اعتماد ہے؟ ورنہ اسے کمرے سے باہر جانے کا حکم دیں۔'' ملکہ نے بنا وقت ضائع کیے فوراً کہا۔

''تمہیں جو کہنا ہے اس کے سامنے کہو۔'' سلطان عالم نے کہا۔

''صاحب جی! میں نے ان سب سے جھوٹ بولا کہ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں.....'' ملکہ کی بات سن کر سلطان عالم کے ساتھ ساتھ فون پکڑے افسر بھی چونک گیا..... لیکن ملکہ کی بات جاری تھی۔ ''جان کا خطرہ ہے..... لیکن آپ کو نہیں..... بلکہ آپ کے بیٹے کی جان کو ہے۔ حوالے کے لیے میں آپ کو صرف ایک نام بتاتا ہوں اور وہ نام ہے..... مینا..... مینا آفندی۔ کچھ یاد آیا؟ مینا..... آپ کی بیوی!'' سلطان عالم اچھل پڑا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''صاحب جی! وقت ضائع نہ کریں..... کسی طرح مجھ سے ملاقات کر لیں۔ وقت بہت کم ہے۔ آپ کا بیٹا کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ آپ فوراً مجھ سے ملیے..... کیونکہ یہ لمبی کہانی ہے۔'' ملکہ نے کہا۔

''شاہ زیب!'' سلطان عالم نے پکارا تو افسر نے موبائل اپنی طرف گھما لیا۔

''یس سر!''

''میں ابھی اس آدمی سے ملنا چاہتا ہوں لیکن کسی کو پتا نہ چلے..... اسے خفیہ طریقے سے پوائنٹ فائیو پر لے آؤ.....''

شاہ زیب نے یس سر کہا اور کال منقطع کر دی۔

اس کے بعد شاہ زیب باہر جانے والا ہی تھا کہ ملکہ نے کہا۔ ''صاحب جی..... سلطان عالم سے ملنے سے پہلے آپ کو ایک کام اور کرنا ہوگا۔ میرے ایک ساتھی کے پاس ایک ڈسک ہے۔ وہ سلطان عالم کے لیے ہے..... وہ منگوانی ہوگی..... فکر مت کریں۔ آپ بے شک چیک کر لیجیے گا..... اس میں کوئی بارودی شے نہیں ہے۔''

شاہ زیب سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ہی اچانک پہلے والا افسر اندر آیا۔ اس نے ملکہ کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی اور اسے ہتھکڑیوں سمیت باہر لے گیا۔ اس کے بعد گاڑی کے پندرہ منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک خفیہ جگہ پر سلطان عالم کے روبرو بیٹھا تھا۔

''کون ہو تم..... اور مینا کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟ اور کس بیٹے کی بات کر رہے ہو..... میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر ملکہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''مم..... مجھے بھی یہی لگ رہا تھا صاحب کہ آپ کو اس بات کا علم نہیں ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مینا نے آپ کے بیٹے کو جنم دیا تھا..... میں یہ سب کیسے جانتی ہوں اور آپ کیوں نہیں جانتے..... میں یہ ساری کہانی تفصیل سے بتاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر ملکہ نے اسے بتانا شروع کیا کہ کس طرح مینا نے طلاق کے بعد اس کے بچے کو جنم دیا تھا اور کس طرح اسے دنیا سے چھپا کر رکھنے کی کوشش کی لیکن سلطان عالم کا خاص آدمی شاہنواز اس بچے کے پیچھے پڑ گیا..... اس نے نہ صرف مینا کو جان سے مار دیا..... بلکہ اس بچے کو مارنے کے لیے کئی قتل اور بھی کیے مگر وہ بچہ خدا کی قدرت اور تیمور اور سرخاب دادا کی کوششوں سے بچتا رہا لیکن اب وہ شاہنواز کے پاس پہنچ گیا ہے اور شاہنواز نے اسے اگر اب تک مارا نہیں تو مارنے والا ضرور ہوگا۔

''لیکن میں کیسے مان لوں کہ وہ میرا ہی بچہ ہے؟ اور شاہنواز کو پتا تھا تو اس نے مجھے بتایا کیوں نہیں اور میرے حکم کے بغیر وہ اس بچے کو جان سے کیوں مارنے لگا؟'' سلطان عالم نے سوالات کیے۔

''وہ آپ کا بچہ ہے یا نہیں..... یہ بات تو میڈیکل ٹیسٹ سے ثابت ہو جائے گی لیکن شاہنواز نے آپ کو نہیں بتایا..... اس کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ ہے اور اس بچے کو قتل کرنے کا حکم ابھی تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ آپ نے دیا ہے اس لیے آپ سے ملنے کی کوشش نہیں کی گئی مگر دراصل اس کے پیچھے کون تھا، ان باتوں کو سمجھنے کے لیے آپ کو ایک ویڈیو دیکھنی ہوگی۔''

''کون سی ویڈیو.....؟'' وہ چونک کر بولا۔

''میں نے آپ کے افسر سے کہا تھا کہ میرے ساتھی سے ایک ڈسک منگوا دیں..... کیا وہ آ گئی ہے؟''

سلطان عالم نے انٹرکام پر شاہ زیب سے بات کی تو

چند لمحوں بعد ڈسک کمرے میں آ گئی۔

''آپ یہ دیکھ لیں..... آپ کو وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔''

سلطان عالم ڈسک لے کر کمرے کے کونے میں موجود ٹی وی ریک کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سی ڈی پلیئر میں ڈسک ڈال کر آن کی اور پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ دیکھ نہ سکا..... ٹی وی آف کر کے وہ واپس آیا اور صوفے پر گر سا گیا۔ اس کے چہرے پر پسینا چمک رہا تھا۔

''جی صاحب جی! یہ سچ ہے..... آپ کی بیگم صاحبہ اور شاہنواز کے ''تعلقات'' ہی وہ وجہ ہیں..... جس وجہ سے آپ کو اس بچے کے بارے میں بتایا نہیں گیا..... کیونکہ آپ کی بیگم صاحبہ سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور بیگم صاحبہ کو شاہنواز کے ذریعے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ مینا کے بطن سے آپ کا بچہ پیدا ہوا ہے تو انہوں نے ہی شاہنواز کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا تاکہ وہ اسے ختم کر دے۔ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ آپ کے لیے جو وارث وہ پیدا نہیں کر سکیں، وہ آپ کو کسی اور عورت سے بھی نہ ملے۔ یہ ڈسک میرے گرو سرخاب دادا نے حاصل کی تھی..... اور اسی ڈسک کی وجہ سے انہوں نے شاہنواز کو یہ کہہ کر اس بچے کے قتل سے روک دیا تھا کہ اگر شاہنواز نے اس بچے کے ساتھ کچھ غلط کیا تو وہ یہ ڈسک سلطان عالم کو پہنچا دیں گے۔ جب تک سرخاب دادا زندہ رہے..... شاہنواز باز رہا۔ پتا نہیں اس نے بیگم صاحبہ کو کیسے مطمئن کیا ہو گا۔ شاید یہ کہہ کر کہ اس نے بچے کو مار دیا ہے..... لیکن سرخاب دادا کے مرنے کے بعد وہ اس ڈسک کی اصل کاپی بھی حاصل کر چکا ہے..... اور آپ کے بیٹے کو بھی اور اس بیٹے کو باپ بن کے پالنے والے کو بھی۔ صاحب جی! خدا کے واسطے، وقت ضائع مت کریں۔ وہ ظالم کسی بھی وقت ان باپ بیٹے کو قتل کر دے گا..... کچھ کیجیے صاحب جی..... اللہ کے واسطے کچھ کیجیے.....''

سلطان عالم سر پکڑے بیٹھا تھا۔

ملکہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کا وجود مکمل طور پر ایک التجا میں ڈھل چکا تھا۔ سلطان عالم نے اس کی طرف دیکھا اور قریب پڑا فون اٹھا کر ایک نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

تیمور نے وحشت ناک نظروں سے سامنے دیکھا۔ جو ہو چکا تھا اس پر یقین کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔ یہ کیسے ہوا..... کیوں ہوا..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

گولی کے دھماکے کی بازگشت ابھی تک اس کے کانوں میں جاری تھی اور اس کے سامنے شاہنواز زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کے سر کے آس پاس خون کا تالاب پھیل رہا تھا۔ تیمور نے سر کو گھما کر بائیں طرف دیکھا۔ دروازے کے پاس کالو ایک ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے دوسرے ہاتھ سے وہ پستول سیدھا کیے کھڑا تھا جس سے اس نے ابھی ابھی شاہنواز کو مارا تھا اور اب وہ فون پر کہہ رہا تھا۔

''یس سر..... میں نے ختم کر دیا ہے اسے۔''

حماد اٹھ کر بھاگتا ہوا تیمور کی طرف آ رہا تھا..... مگر تیمور جس ذہنی دباؤ کو جھیل رہا تھا، اس کے آگے بے بس ہوتا ہوا بے ہوشی کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

جانے کتنا وقت بیت گیا تھا لیکن اسے تو ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اس نے اپنی آنکھیں یوں کھولیں جیسے مرنے کے بعد قبر میں زندگی لوٹائی گئی ہو۔ لیکن وہ قبر نہیں کمرا تھا۔ قیمتی آسائشوں سے سجا ہوا نیم تاریک کمرا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا وہ ایک بڑے سے بیڈ پر لیٹا ہے۔ کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھ کر اس نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ جسم میں تکلیف کی لہریں مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئی تھیں۔ بازو، سینہ اور خاص طور پر جسم کا نچلا حصہ پیروں تک اب بھی درد کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے حواس ہوش میں آتے چلے گئے تو اس نے اپنا دایاں ہاتھ کسی کے ہاتھ میں محسوس کیا..... یہ ملکہ تھی۔

''ملکہ! تم..... یہ..... یہ ہم کہاں ہیں؟'' تیمور نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

''ہم محفوظ ہیں پیارے..... سب ٹھیک ہے۔'' وہ اس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بولی۔

''حماد کہاں ہے؟'' اسے یاد آیا تو فوراً پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہے..... بالکل محفوظ ہے..... ابھی آ جائے گا۔''

''وہ..... ادھر..... وہ شاہنواز اسے گولی مارنے لگا تھا اور پھر..... اور پھر..... یہ سب کیسے ہو گیا ملکہ..... یہ سب کیسے ہو گیا؟'' تیمور حیرانی سے بولتا چلا گیا۔

''کچھ بھی نہیں پیارے..... بس مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ تم اور تمہارا کاکا..... جیسے سالوں پہلے ان مارنے والوں سے بچتے رہے..... اس بار بھی بچ گئے ہو..... لیکن وہ مارنے والا اس بار نہیں بچا۔ وہ خود مارا گیا ہے۔ اب تمہیں یا تمہارے کاکے کو کوئی خطرہ نہیں۔ تم آزاد ہو..... بالکل آزاد۔''

''پر کیسے.....؟''

تیمور نے پوچھا تو ملکہ اسے بتانے لگی کہ کیسے وہ سلطان عالم تک پہنچی اور اسے ساری حقیقت بتادی۔ جس کے نتیجے میں سلطان عالم نے شاہنواز کے ساتھی کالو کو فون کیا۔ اس نے وہاں کی صورتِ حال بتائی تو سلطان صاحب نے کالو کو فوراً شوٹ کرنے کا آرڈر دے دیا اور اس آرڈر پر عین اس وقت عمل ہوا جس وقت وہ حماد کو مارنے والا تھا۔ اس کی تفصیل سن کر تیمور نے اسے گلے لگالیا۔ ملکہ کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ملکہ..... میں نے جس طرح موت کو اپنے سامنے دیکھا مجھے لگا کہ جیسے اب ہمیں کوئی نہیں بچا پائے گا۔''

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور تیمور نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ سلطان عالم نے حماد کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور دونوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ تیمور کو ہوش میں دیکھ کر حماد بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا اور لپٹ گیا۔ کتنی ہی دیر وہ اسے گلے سے لگائے سہلاتا رہا۔

''دیکھو، تم لوگوں کی جانیں بچ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے مینا کے متعلق سنائی ہوئی تمہاری کہانی پر یقین آگیا ہے۔ یہ بچہ کون ہے اور کس کا ہے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس بات کا فیصلہ ایک کہانی نہیں کرسکتی اور حقیقت جاننے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو کیا صرف اس لیے کہ شاہنواز کے متعلق مجھے پہلے بھی کئی شکایتیں مل چکی تھیں وہ میرا پالتو کتا تھا جو پاگل ہوگیا تھا اس لیے اس کا خاتمہ ضروری تھا۔ لیکن تم تینوں ایک بات کان کھول کے سن لو۔ اگر تم نے اپنی اس بے سروپا کہانی سے میرے لیے کوئی مشکل پیدا کرنے کی کوشش کی تو میں شاہنواز سے بڑھ کر تمہارے لیے خطرہ بن جاؤں گا..... سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' سلطان عالم پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے کہہ رہا تھا..... اس کی بات پر تیمور اور ملکہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سلطان صاحب! میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے میری اور میرے بچے کی جان بچائی۔'' تیمور نے ''میرے بچے'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اور میرا بیٹا ہمیشہ آپ کے احسان مند رہیں گے... اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کریں گے۔''

''گڈ! اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکا پھر بولا..... ''ویسے تم لوگ آزاد ہو..... جب جانا چاہو یہاں سے جاسکتے ہو۔'' وہ واپس جانے کے لیے پلٹا لیکن پلٹنے سے پہلے اس نے ایک بھرپور نظر سے حماد کی طرف دیکھا..... اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سا رنگ تھا۔ تذبذب، خوف اور محبت کا رنگ اور جس وقت اس نے حماد کو دیکھا حماد نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے تیمور کو چومتے ہوئے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ سلطان عالم سر کو جھٹک کر واپس مڑ گیا۔

''پیاریا! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی..... سرخاب دادا کو وہ ویڈیو مل جانے کے بعد ان باتوں کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے پیچھے سلطان عالم نہیں اس کی بیگم صاحبہ ہیں تو انہوں نے سلطان عالم سے بات کیوں نہیں کی؟ شاہنواز سے معاہدہ کیوں کیا؟ اگر تبھی سلطان عالم کو بتا دیا جاتا تو شاہنواز کا خطرہ اسی وقت مکمل طور پر ختم ہوجاتا۔'' ملکہ نے پوچھا۔

''کیونکہ دادا کو شاید یہ یقین نہیں تھا کہ سلطان عالم یہ سب جاننے کے بعد کیا کرے گا۔ کیا ہوتا اگر اسے اس سارے معاملے کا پہلے سے پتا ہو یا پھر کیا ہوتا کہ معلوم ہوجانے کے بعد وہ بھی ہمیں مارنے کا حکم دے دیتا..... کیونکہ تب وہ اپنی سیاست کے اس مقام پر تھا جہاں کوئی ایسا اسکینڈل افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا سرخاب دادا نے یہی فیصلہ کیا کہ ساری حقیقت کھول دینے کے بجائے شاہنواز سے ڈیل کرلیتے ہیں اور پھر میں بھی سرخاب دادا پر یہی زور ڈال رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح فوری طور پر کوئی ایسا کام ہوجائے کہ زیادہ خون خرابا بھی نہ ہو اور ہماری جان بھی بچ جائے..... یہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا۔'' تیمور نے تفصیل بتائی تو ملکہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شام تک وہ وہیں رہے۔ یہ سلطان عالم کی ایک خفیہ کوٹھی تھی..... پھر انہیں پیلی حویلی تک پہنچا دیا گیا۔ جہاں سے تیمور حماد کو لے کر اگلے دن واپس اپنے گلبرگ والے مکان میں پہنچ گیا..... اس دن اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر لگی تھی جس کے مطابق..... سلطان عالم نے اپنی بیگم کو طلاق دے دی تھی۔ چند دن گزر جانے کے بعد تیمور کو سلطان عالم کی طرف سے حماد کے لیے بھیجے گئے تحائف موصول ہوئے، جن میں ایک بینک اکاؤنٹ کی تفصیل اور چیک بک بھی تھی۔ جس میں حماد کے نام پر کافی سارا پیسا جمع کروایا گیا تھا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ حماد واقعی مینا کے بطن سے پیدا ہونے والا اس کا اپنا خون ہے۔ تیمور اداکاری چھوڑ چکا تھا اور حماد کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

ختم شد

''سارہ! تم میرے ساتھ گھر چل رہی ہو اور یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔'' سوٹ میں ملبوس دبلے آدمی نے زور سے لکڑی کے بنے ہوئے راستے پر اپنا پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ اس کی دھمک سے تمام تختے ہل گئے۔ اس ارتعاش کو جوزی نے بھی محسوس کیا جو کیس کیڈ مرکنفائل کے سامنے کھڑی تھی۔

''اور میں تمہیں بتا چکی ہوں جیمس کہ میں کہیں نہیں جا رہی۔'' سارہ نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ تبھی جوزی کی نظر اس کے بالوں میں لگے ہوئے سرخ گلاب پر گئی اور وہ سوچنے لگی کہ کیا یہ گلاب اصلی ہے؟

سارہ نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر رکھے اور بولی۔

''اب یہی میرا گھر ہے۔''

''یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ تمہیں ایک بہتر اور باعزت زندگی گزارنی ہے۔''

ڈرتے ڈرتے قدم اٹھانے والی دوشیزہ کی ایک لمبی چھلانگ

گواہی

شاہ زین رضوان

سچ بولنا اچھی بات سہی مگر... کبھی کبھی سچ کسی کے گلے کا پھندا بھی بن جاتا ہے۔ اسے بھی یہ خوف تھا لیکن شاید وہ کسی کو بے گناہ موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی لہٰذا ... وہی ہوا جس کا ڈر تھا... سچ زیادہ دیر چھپا نہ رہ سکا اور... وہ بھی۔

جوزی نے اپنے برابر میں میری کی موجودگی محسوس کی۔ سنیچر کی سہ پہر آدھی کاؤنٹی وہاں آئی ہوئی تھی کیونکہ انہیں اپنی ڈاک اور اشیائے خورونوش لینے کے علاوہ اپنے لوگوں سے بھی ملنا ہوتا تھا۔ وہ ایک گرم دن تھا اور اگست کے وسط میں یہ گرمی کی آخری لہر تھی۔ دکانوں اور تجارتی مراکز کے باہر ایک شور مچا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ شیرف بھی سڑک کے پار جیل کے دروازے پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

''باعزت زندگی سے تمہاری مراد یہ ہے کہ ایک ایسے شخص سے شادی کرلوں جس سے میں محبت نہیں کرتی۔ اس کے اشاروں پر ناچوں اور وہ مجھے حاصل کر کے شیخی بگھارے۔ نہیں جیمس! اگر تم مجھے فلاڈلفیا واپس لے جانا چاہتے ہو تو اس سے پہلے مجھے جان سے مار دو کیونکہ اس سونے کے پنجرے میں زندگی گزارنا میرے لیے موت سے بدتر ہوگا۔''

سارہ نے اپنے بالوں کو سمیٹتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی نظر میری پر گئی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اور مونٹانا کوئی ویران جگہ نہیں ہے---- کیوں میری! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ یہاں سینٹ پیٹر کے گرجا میں اس وقت کتنی نن رہ رہی ہیں..... نصف درجن اور دو پادری! ان کے علاوہ ہیلینا میں دریا کے کنارے بشپ بھی رہتا ہے۔ وہ سب تمہارے لیے دعا کرتے ہیں۔''

''مس اسٹار۔'' میری نے جواب دیا۔ ''تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔''

جوزی نے میری کی طرف دیکھا۔ وہ حیران تھی کہ میری اس عورت کو جانتی ہے۔

''یہ کافی نہیں ہے۔'' جیمس نے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''تم گناہ آلود زندگی گزار رہی ہو۔ تمہاری نیگروز سے بھی دوستی ہے۔''

''میں ان کی دوست ہوں جنہیں خوش رکھتی ہوں۔'' سارہ نے کہا۔ ''اور جب میں کسی دوست کو خوش کرتی ہوں تو مجھے معقول معاوضہ ملتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز تیز ہوگئی اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس آدمی نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں لیکن سارہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

میری نے جوزی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تمہیں ایسی باتیں سننا پڑ رہی ہیں۔'' وہ جوزی کو مرکنٹائل سے آگے لے گئی جہاں دوسرے راہ گیر چھٹنا شروع ہو گئے تھے اور ان کے چہروں سے بے چینی عیاں تھی۔

''میری..... یہ گناہ آلود زندگی کیا ہوتی ہے؟''

''کیا؟'' میری نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنے زیادہ سوالات کرو گی.....''

لیکن وہ جو کچھ کر چکی تھی، کیا وہ بھی جوزی جانتی تھی لیکن وہ یہ نہ کہہ سکی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکی تھیں۔

☆☆☆

''میری! اگر تم اپنی پیاس بجھانے آئی ہو تو مجھے اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن یہ لڑکی.....'' بار کے پیچھے بیٹھے ہوئے مونچھوں والے آدمی نے کہا۔ ''میں اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

میری نے اپنے سیاہ اسکرٹ پر سے گرد جھاڑی اور جیب میں رکھے ہوئے پستول کو چھوا جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ بار میں بیٹھے ہوئے دو آدمی گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ وہ بار ٹینڈر سے لڑنا شروع کر دے گی۔ اس کا قد چھ فٹ تھا اور وہ صرف بار ٹینڈر ہی نہیں بلکہ قصبے کے دوسرے کئی مردوں سے بھی لمبی تھی اور اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ بہت سے لوگ اسے مطلبی سمجھتے ہیں۔

اگر جوزی کوئی سفید فام لڑکا ہوتی تو بار میں بیٹھا کوئی شخص اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا اور اگر وہ سفید فام لڑکی ہوتی تو بار ٹینڈر میری سے کہتا کہ وہ اسے کینڈی لینے کے لیے نیچے مرکنٹائل میں بھیج دے اور شاید اسے ایک یا دو سکے بھی دے دیتا لیکن وہ دوسری تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا تھا۔

میری کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس مسئلے پر لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے جوزی سے کہا۔ ''تم دریا کی طرف چلی جاؤ اور دیکھو اگر تمہیں کچھ جنگلی پھول مل جائیں۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم میری بات سن رہی ہو نا؟''

''ہاں مس میری۔'' جوزی نے جواب دیا اور میری نے کونے کی میز پر سے کسی کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنی۔ لڑکی کے قدموں کی آواز پورچ کے فرش پر گونج رہی تھی لیکن اس کے سڑک پر پہنچتے ہی وہ آواز غائب ہوگئی۔ میری پلٹ کر واپس آئی اور اس نے اپنی موٹی انگلیوں سے مشروب کا گلاس اٹھا لیا۔

جوزی کو جوتے کاٹ رہے تھے لیکن وہ انہیں اتارنا نہیں چاہتی تھی۔ جوتوں کے بغیر اس کی شخصیت ادھوری رہ

جاتی۔ وہ قصبے کے شمال مغرب میں واقع سینٹ پیٹر کی ارسلائن اکیڈمی کی طالبہ تھی۔ وہ واحد انڈین لڑکی تھی جو موسم گرما میں بھی یہاں رکی رہی۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور باپ مویشیوں کے فارم میں کام کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ سفید فام لوگ انڈین بچوں کو پڑھانے کے خلاف ہیں لیکن مدرا میڈس، جنہیں میری ہمیشہ مس ڈولی کہتی تھی، انہوں نے کبھی یہ فرق نہیں رکھا۔ وہ پادریوں کی درخواست پر انڈین لڑکیوں کو پڑھانے کے لیے اس اکیڈمی میں آئی تھی۔

ایک موڑ پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس کے دائیں جانب دریا تھا لیکن اسے پہلی بار اپنے طور پر شہر دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ لہٰذا وہ بائیں جانب مڑ گئی۔ میری ایک دفعہ اسے اپنے ساتھ مرکنٹائل لے گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ دوسرے گاہکوں کی نظریں ان پر جم گئی تھیں۔ وہ ایک لحیم شحیم سیاہ فام عورت کے ساتھ چھوٹی سی لڑکی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن ان کا رویہ غیر دوستانہ نہیں تھا۔ کیونکہ یہ میری ہی تھی جو ہر ہفتے کو گاڑی لے کر قصبے جاتی اور ان لوگوں میں ڈاک یا سامانِ خورونوش تقسیم کرتی جو چرچ کے قریب رہتے تھے اور کسی وجہ سے گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ میری ہی ڈاکٹر یا پادری کو بلا کر لاتی تھی اس لیے لوگ اس پر بھروسا کرتے تھے۔

جب جوزی اس شوکیس کے سامنے رکی جس میں کینڈی کے جار رکھے تھے تو میری نے برا سا منہ بنا کر اسے کھینچ لیا اور بڑبڑاتے ہوئے اسے منع کرنے لگی۔ اس کے خیال میں قصبے کی سیر ہی کافی تھی۔ اب جوزی نے سوچا کہ وہ ایک بار پھر ان بوتلوں کو دیکھ سکتی ہے۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے لیکن انہیں دیکھ کر ہی وہ ان کے ذائقے کو محسوس کر سکتی تھی۔

''اے دوغلی نسل کی لڑکی..... گھر جاؤ۔'' ایک کرخت مردانہ آواز آئی اور جوزی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ لوگوں کے ہجوم میں وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ اس پر چلانے والا کون ہے۔ اس کے گال شرم سے سرخ ہو گئے۔ وہ تیزی سے گلی میں چلی گئی لیکن کسی کے چلانے کی آواز اس کا پیچھا کرتی رہی۔

گلی میں تھوڑی دور جا کر ایک جگہ رک گئی۔ میری نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی مشکل میں نہ ڈالے اور دریا کی طرف چلی جائے پھر اس نے اس کے کہنے پر عمل کیوں نہیں کیا؟ وہ کافی دیر تک وہاں کھڑی رہی جب تک اس کے دل کی دھڑکن اور سانس قابو میں نہ آ گئی۔ گرجا میں نن کہا کرتی تھیں کہ جب تمہارے اندر خاموشی ہو تو تم اوپر والے کی سرگوشیاں بھی سن سکتی ہو۔

لیکن اس وقت جوزی نے جو کچھ سنا، وہ اس سے مختلف تھا۔ دو مرد اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی لیکن گلی خالی تھی۔ اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کے باوجود چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گلی کے پار ہوٹل کی تیسری منزل پر ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

یہ آوازیں سن کر وہ بری طرح سہم گئی، بالکل ایسے ہی جب باپ اس کی ماں پر چلاتا اور پھر دونوں ماں، بیٹی کو مارنے لگتا۔ ماں کے مرنے کے بعد گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے باپ سے محبت کرتی تھی لیکن وہ اسے گرجا میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ اکثر اپنی ماں کو یاد کر کے روتی لیکن وہاں کی نن بڑی مہربان تھیں، وہ بھی اپنی پڑھائی پر توجہ دے رہی تھی۔ میری اور خانساماں اس کا خاص خیال رکھتے تاکہ اسے مناسب خوراک ملتی رہے۔

آوازوں کے شور سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے ایک بار پھر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔ یہ وہی تھا جو سڑک پر اس خوب صورت عورت سے بحث کر رہا تھا اور اس عورت نے اسے جیمس کہہ کر پکارا تھا پھر اسے کھڑکی میں ایک اور ہاتھ نظر آیا۔ اس نے انگلی سے جیمس کی طرف اشارہ کیا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اب کھڑکی میں دوسرا آدمی نظر آ رہا تھا۔ وہ بھاری بدن اور لمبے قد کا تھا لیکن وہ نیچے گلی سے انہیں صرف بحث کرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ وہ دونوں کھڑکی کے سامنے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے لیکن وہ ان کی باتیں نہیں سن سکتی تھی۔ تاہم اسے یقین تھا کہ ان کے درمیان زبردست قسم کا جھگڑا ہو رہا ہے۔

قریب ہی کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ اس نے گلی میں دیکھا لیکن وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ اوپر نظر اٹھائی لیکن کھڑکی بھی خالی تھی۔ جوزی کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کب تک وہاں چھپی رہے گی لیکن اسے اتنی دیر وہاں رکنا تھا جب تک وہ آدمی نہ چلا جائے جس نے اس پر آوازہ کسا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھی اور گلی کے کونے سے جھانکنے لگی۔

''ہیلو چھوٹی لڑکی۔'' اس کے عقب سے ایک آواز آئی اور وہ چونک کر اچھل پڑی۔ یہ وہی سنہرے بالوں والا شخص تھا جسے اس نے کھڑکی میں دیکھا تھا۔

''ہیلو۔'' وہ بولی۔
وہ نیچے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''تم ہماری جاسوسی کیوں کر رہی ہو؟''
''کوئی نہیں۔'' جوزی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
اس آدمی نے قہقہہ لگایا اور سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے چھوٹی لڑکی! یہ راز تم تک رہے گا۔'' پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چاندی کا سکہ نکالا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب ایک ہی جگہ پر خرچ مت کر دینا۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھ ماری اور وہاں سے چلا گیا۔
جوزی حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ سکہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کیا وہ اسے خرچ کرنے کی ہمت کر سکتی ہے؟ اس نے سڑک پر دیکھا۔ میری کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور مرکنٹائل میں چلی گئی۔ کوئی اسے نہیں روکے گا جب وہ دیکھیں گے کہ اس کے پاس پیسے ہیں۔
چند منٹوں بعد وہ کینڈی اس کی جیب میں تھی۔ جوزی آرام آرام سے چہل قدمی کرتی ہوئی دریا کی طرف گئی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ میری اس کا انتظار نہ کر رہی ہو۔ ویسے تو وہ سیلون میں کافی وقت لگاتی تھی لیکن کبھی کبھار وہ جلدی بھی آجاتی تھی۔ اس کا نشہ زیادہ دیر نہیں رہتا تھا لیکن بہتر تھا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے دریا پر پہنچ جاتی۔
بھربھرے پتھر سے بنی ہوئی وہ چٹان جس پر وہ اور میری بیٹھا کرتے تھے، دھوپ کی تپش سے گرم ہو چکی تھی۔ جوزی اس پر چڑھ گئی اور جیب سے پیپرمنٹ کی اسٹک نکال لی۔ اس کے ذائقے میں کچھ ایسا سرور تھا کہ جوزی پر غنودگی طاری ہو گئی اور اسے میری کے آنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ میری کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ لڑھکتا ہوا دریا کے کنارے پر چلا گیا۔ اس کی آواز سن کر جوزی ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے جلدی سے کینڈی اپنے اسکرٹ کی جیب میں رکھ لی اور ہاتھ پھیر کر اپنا منہ صاف کر لیا۔
''اوہ، یہ بوڑھی ہڈیاں۔'' میری نے جوزی کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا پھر اس نے اپنے اسکرٹ سے ایک پاؤچ نکالا جس میں پائپ اور تمباکو کا ٹن تھا۔ پائپ میں تمباکو بھر کر اسے دیا سلائی دکھائی اور گہرا کش لیتے ہوئے بولی۔ ''کتنا خوبصورت منظر ہے۔''
جوزی خاموش بیٹھی دریا کی سطح پر تیرتے ہوئے آبی پرندوں کو دیکھ رہی تھی پھر اچانک بولی۔ ''میری! تم اس عورت کو جانتی ہو جو سڑک پر اس سوٹ والے سے لڑ رہی تھی؟''
''کون عورت؟ اچھا وہ مس اسٹار۔'' میری نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''وہ اپنے گھر جانا کیوں نہیں چاہ رہی تھی جبکہ ہر کوئی گھر جانا چاہتا ہے؟''
میری نے اپنا پائپ نیچے کیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم گھر جانا چاہتی ہو..... اپنے ڈیڈی کے پاس؟''
''نہیں۔'' جوزی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ اب یہ مشن ہی میرا گھر ہے۔ یہاں میں پڑھ رہی ہوں لیکن مس اسٹار نے اس آدمی سے کہا کہ وہ گھر جانا نہیں چاہتی۔ اگر وہ اس کا شوہر نہیں تو کون تھا؟''
''مس اسٹار کی شادی نہیں ہوئی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کیوں لڑ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی.....''
''جیمس..... وہ اسے جیمس کہہ کر بلا رہی تھی۔''
''مجھے یقین ہے کہ جیمس اس کا بھائی ہے جسے اس کے گھر والوں نے مس اسٹار کو واپس لانے کے لیے بھیجا تھا۔''
''کیا اس کا نام واقعی اسٹار ہے؟'' جوزی نے کہا۔ ''جو آسمان پر چمکتا ہے اور کیا یہ اس کا پہلا نام ہے یا آخری؟ وہ اسے سارہ کہہ رہا تھا۔''
میری نے دوبارہ پائپ کا کش لیا۔ ''تم سوال بہت کرتی ہو۔ یہاں سب اسے مس اسٹار ہی کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کے والدین نے یہ نام نہ رکھا ہو لیکن اگر اس نے اپنے لیے یہ نام پسند کیا ہے تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''
''تمہارا مطلب ہے کہ اس نے اپنا نام تبدیل کر لیا ہے؟'' جوزی بولی۔ ''جس طرح نن گرجا میں آنے کے بعد اپنا نام تبدیل کر لیتی ہیں۔''
میری نے کھانسنا شروع کر دیا اور اپنا گلا صاف کرنے کے لیے آگے کی طرف جھک گئی۔ کافی دیر بعد وہ سیدھی ہوئی اور اپنی انگلی سے گال صاف کرنے لگی۔
''میرا خیال ہے کہ مس اسٹار بھی میری ماں کی طرح ہے۔'' جوزی نے کہا۔ ''یہ لوگ مختلف جگہوں کے لیے مختلف نام اختیار کر لیتے ہیں۔ میرے پاپا اسے اینی کہتے تھے جبکہ اسکول میں اس کا نام واٹ سیکا تھا۔ مدر میڈس بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔ تم اسے مس ڈولی کہتی ہو جو اس کا گھریلو نام ہے۔ وہ آدمی اسے سارہ کہہ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس کا گھریلو نام ہو لیکن وہ اسے گھر کیوں لے جانا چاہ رہا تھا؟ مس ڈولی کے بھائی نے تو کبھی یہ نہیں چاہا بلکہ اس نے تمہیں اس کا خیال رکھنے کے لیے کہا ہے۔''
''اوہ میرے خدا! میں تمہارے سوالات سے عاجز آگئی ہوں۔'' میری نے پائپ خالی کیا اور اس کی راکھ جھاڑی

میں پھینک دی پھر اس نے پائپ دوبارہ پاؤچ میں رکھ لیا۔
''بہت دیر ہوگئی ہے، اب ہمیں اپنے کام پر نکلنا چاہیے۔''
جوزی نے اپنی جیب پر آہستہ سے ہاتھ مارا جس میں اس نے کینڈی رکھی تھی پھر چٹان سے چھلانگ لگا دی۔ اس نے دوپہر میں دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا اور ان میں سے ایک نے خاموش رہنے کے لیے ایک چاندی کا سکہ دیا جس سے اس نے کینڈی خریدی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن میری کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

آنے والے سنیچر کو میری اسے اپنے ساتھ لے کر جاتی۔ اسے جوزی کی کمپنی میں مزہ آتا تھا۔ وہ اچھی لڑکی تھی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کا مستقبل روشن ہوسکتا تھا۔ البتہ اسے سوال کرنے کی عادت تھی لیکن اگر میری اس پر ناراض ہونے کے بجائے اس سے لطف اٹھاتی۔ اتفاق سے اس روز خانساماں کو جوزی کی ضرورت پڑ گئی۔ لہٰذا میری اپنے کتے کو ساتھ لے کر اکیلے ہی قصبے کی طرف چلی گئی۔ ویسے بھی اسے اکیلے رہنا پسند تھا۔

ایک میل دور جانے کے بعد اس نے تازہ بریڈ اور مکھن کی ٹوکری اس آدمی کے حوالے کی جس کی بیوی اور نومولود بچہ چند ہفتے قبل فوت ہوگئے تھے۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی موت سے اسے شدید صدمہ پہنچا لیکن پڑوسیوں اور گرجا کی راہباؤں نے اس کا اور دو چھوٹے بیٹوں کا بہت خیال رکھا۔

مرکنٹائل پہنچ کر اس نے راہباؤں کے سامان کی فہرست متعلقہ شخص کے حوالے کی اور اپنے لیے تمباکو کے نئے ٹن کے علاوہ ایک نوجوان راہبہ کے لیے فیس کریم بھی خریدی۔ اس کے خیال میں کریم لگانا کوئی گناہ نہیں تھا۔

وہ شراب خانے پہنچی تو بارٹینڈر نے اس کے لیے گلاس تیار کیا۔ ابھی اس نے چند گھونٹ ہی لیے تھے کہ بار کا دروازہ کھلا اور براؤن سوٹ میں ملبوس ایک فربہ اندام شخص تین لوگوں کے ساتھ داخل ہوا۔ انہوں نے سیاہ لباس اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ میری کے قریب ہی ایک گول میز پر بیٹھ گئے۔ براؤن سوٹ والے نے بارٹینڈر کو بہترین مشروب کی بوتل لانے کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اور میرے دوست ایک نئے کاروبار کا جشن منا رہے ہیں۔''
بارٹینڈر نے ایک بوتل اور چار گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس قسم کا کاروبار ہے؟''
''بہت اچھا نفع آور کاروبار ہے۔'' اس آدمی نے جواب دیا اور اس کا دوست مسکرانے لگا۔

''اس میں ضروری خدمات مہیا کی جائیں گی۔'' اس پر ایک قہقہہ پڑا۔
''میں نے تمہارے ان دوستوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' بارٹینڈر نے کہا۔ ''تم یہ کاروبار کہاں شروع کرو گے؟''
''ہیلینا میں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ اس کے تلفظ سے لگ رہا تھا کہ وہ اس قصبے میں نیا ہے۔'' اس کاروبار میں بہت پیسا اور طلب ہے۔''
براؤن سوٹ والے نے اپنا گلاس اٹھایا اور بولا۔ ''دوستو! ایسٹرن اسٹار کے نام۔''
میری سوچنے لگی کہ شاید یہ کسی کان یا ریلوے لائن کا نام ہے۔ مشروب کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے اپنی نظریں ان آدمیوں پر رکھیں۔ ان میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے چوکنا کر دیا تھا۔ ان چاروں میں صرف براؤن سوٹ والا بول رہا تھا اور بقیہ تینوں اس کی باتوں پر قہقہے لگا رہے تھے لیکن میری نے محسوس کیا کہ جب وہ اس کی طرف دیکھتے تو ان کی آنکھیں سکڑ جاتیں۔ وہ جو کوئی بھی تھا اور جو منصوبہ بنا رہا تھا، وہ تینوں اس پر پوری طرح بھروسا نہیں کر رہے تھے۔

میری نے اپنا گلاس خالی کر کے بار پر رکھا اور شراب خانے سے باہر آگئی۔ اب اسے اپنے کام نمٹانے تھے۔ اگلے ہفتے جوزی بھی اس کے ساتھ گھوڑوں کے اصطبل گئی تاکہ وہ اپنی گاڑی کے لیے مناسب گھوڑے کا انتخاب کر سکیں۔ جیسے ہی اس نے ایک سیاہ گھوڑے پر ہاتھ رکھا، اصطبل کا مالک بھی آگیا اور گھوڑے کے سموں کا معائنہ کرنے لگا۔
''یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ''میری! یہ تمہاری گاڑی کے لیے مناسب ہے۔''
میری نے سر ہلا دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے قصبے میں ہونے والی واردات کے بارے میں سن لیا ہوگا۔'' اصطبل کا مالک بولا۔
میری نے جوزی کی طرف دیکھا پھر اس آدمی کو لے کر دور چلی گئی تاکہ جوزی ان کی باتیں نہ سن سکے۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی دیکھ کر جوزی ڈر گئی۔ وہ سمجھی کہ شاید میری کو معلوم ہوگیا ہے کہ اسے کسی اجنبی نے چاندی کا سکہ دیا تھا جس سے اس نے کینڈی خریدی۔ اس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ اگر میری اس وجہ سے پریشان ہے تو وہ باقی سکے خرچ کرنے کے بجائے مدر میڈس کو دے دے گی۔

اسٹور کی طرف جاتے ہوئے جوزی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سڑکوں پر سناٹا تھا اور دکان میں بھی ایک عورت کے سوا کوئی گاہک نہیں تھا جبکہ اس کا شوہر باہر کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے بھی پریشانی عیاں تھی جیسے اسے گھر جانے کی جلدی ہو۔ میری نے کچھ کہے بغیر سامان کی فہرست دکاندار کے حوالے کی۔ اس نے ایک نظر دیکھنے کے بعد کہا کہ تمام چیزیں اسٹاک میں موجود ہیں اور وہ اس کی واپسی تک انہیں پیک کر دے گا پھر وہ جوزی کو دیکھ کر مسکرایا اور کینڈی کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔ جوزی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میری نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دکان سے باہر لے گئی۔

''جوزی! اس وقت قصبے کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ تم تنہا کہیں جاؤ۔ بہتر ہے کہ تم اچھے بچوں کی طرح میرے ساتھ رہو اور اپنی زبان بند رکھو۔''

جوزی اندر سے کانپ گئی۔ ''یہ سب کیا ہے میری؟ کیا کوئی واقعہ پیش آیا ہے اور اسی وجہ سے لوگ گھروں سے باہر نہیں آئے؟''

''تم سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' میری نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ تم نے ایک آدمی کو اپنی بہن کے ساتھ سڑک پر بحث کرتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''مسٹر جیمس اور مس اسٹار۔'' جوزی نے کہا۔

''ہاں، گزشتہ جمعرات کی شب ہوٹل کی عقبی گلی میں جیمس کی لاش ملی تھی۔ اسے چاقو سے ہلاک کیا گیا اور اس احمق شیرف نے اس کی بہن کو گرفتار کر لیا ہے۔''

''مس اسٹار... کیا اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا؟''

لیکن میری نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ گاڑی رکنے کا انتظار کرنے لگی پھر فٹ پاتھ پر اتر کر جیل کی طرف چل دی۔ جوزی بھی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ جیل کے باہر میری نے ایک بینچ کی طرف اشارہ کیا اور جوزی اس پر بیٹھ گئی جبکہ میری نے لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ جوزی کافی دیر بیٹھی رہی لیکن میری واپس نہیں آئی تو اسے بے چینی ہونے لگی۔ اب وہ مزید ایک منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ وہ بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانکنے لگی۔ شیرف وردی میں ملبوس دونوں پاؤں میز پر رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔

جوزی کو وہاں ایک لوہے کا دروازہ نظر آیا جس پر تالا لگا ہوا تھا۔ کیا انہوں نے میری کو بھی بند کر دیا تھا یا وہ دروازے کے پیچھے مس اسٹار سے باتیں کر رہی تھی؟ اس نے چھلانگ لگائی اور چلتی ہوئی عمارت کے عقب میں آ گئی جہاں ایک کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں لیکن کوئی شیشہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ یقیناً اندر سردی ہو گی۔ کیا وہ موسم سرما میں بھی مس اسٹار کو یہیں رکھیں گے یا اسے پھانسی دے دیں گے؟ اس نے سن رکھا تھا کہ یہ بڑی اذیت ناک سزا ہوتی ہے لیکن یہ تو قاتلوں کو دی جاتی ہے۔

اس کے پورے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ پتھر کی دیوار پر جھک گئی۔ کھڑکی سے اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ ان میں ایک مس اسٹار کی تھی۔

''تم میرا یقین کرو۔ میں جیمس کو یہ اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ مجھے واپس فلاڈلفیا لے جائے اور نام نہاد باعزت زندگی کے نام پر مجھے قید کر دے لیکن میں نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا۔ میری! مجھے معاف کر دو۔ مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

جوزی، میری کا جواب نہ سن سکی لیکن مس اسٹار کے الفاظ اسے واضح طور پر سنائی دیے۔ ''شیرف نے مجھے صرف یہ دکھانے کے لیے گرفتار کیا ہے کہ وہ یہاں کا انچارج ہے۔''

''وہ ایسا کیوں کرے گا؟'' میری نے کہا۔ ''وہ جانتا ہے کہ تم اس قصبے کے لیے کتنی اہم ہو۔ لوگ شراب پی کر تمہارے پاس آتے ہیں اور وہ اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''ہاں، ایسا ہی ہے اور اسی سے مسئلہ شروع ہوا۔ اس نے اپنے حصے میں اضافے کا مطالبہ کر دیا جو کہ سراسر زیادتی تھی۔'' مس اسٹار کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ''میں کاروباری عورت ہوں لہٰذا میں نے دوسرے منصوبے بنائے۔''

''کیا مس اسٹار شیرف کو حصہ دے رہی تھی؟ اسے ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' جوزی نے اپنے چہرے سے مکھی اڑاتے ہوئے سوچا۔

''ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میری نے کہا۔ ''لیکن جب تک تم یہ وضاحت نہیں کرو گی کہ تمہارا بھائی کیوں مارا گیا، کوئی تمہاری بات پر یقین نہیں کرے گا۔''

''میری! تم تو جانتی ہی ہو کہ لوگ کس طرح الزام تراشی کرتے ہیں جبکہ ہم نے کچھ نہیں کیا ہوتا..... تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔''

میری بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ تمہاری کس طرح مدد ہو سکتی ہے لیکن میں کوشش کروں گی۔''

جوزی واپس عمارت کے سامنے آ کر ایک بینچ پر بیٹھ

گئی۔ کچھ دیر بعد میری عمارت سے باہر آئی، شیرف بھی اس کے پیچھے تھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ اس نے مجھے دھمکی دی تھی۔'' وہ بولا۔ ''یہ دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ سرِراہ سب لوگوں کے سامنے۔ آدھے قصبے نے سنا ہوگا۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔'' میری نے جواب دیا۔ ''البتہ ایک عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا ہوگا۔''

''جج ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔'' شیرف نے کہا۔ ''اس کے آنے کے بعد ہی انصاف ہوگا۔''

میری نے جوزی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر دریا کی طرف جانے والی سڑک پر چل دی۔ ''ہونہہ..... انصاف۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''میں جانتی ہوں کہ یہ کس انصاف کی بات کر رہا ہے۔''

وہ دونوں اپنی مخصوص چٹان کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔ میری نے اپنے پاؤچ میں سے پائپ نکالا لیکن اس میں تمباکو نہیں بھرا۔ جوزی سوچ رہی تھی کہ جو کچھ اس نے سنا وہ میری کو بتا دے یا اپنی زبان بند رکھے جیسا کہ میری اور مدر امیڈس اکثر اسے تلقین کرتی تھیں کہ دوسروں کی باتیں چھپ کر سننا اچھا نہیں ہوتا۔

''مس اسٹار بہت مشکل میں ہے۔'' بالآخر میری نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''وہ کہتی ہے کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا اور میں اس کی بات کا یقین کرنا چاہتی ہوں لیکن کیسے کر لوں؟ ہم نے ان دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھا اور اسے یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ اس کے ساتھ فلاڈلفیا جانے سے پہلے مر جائے گی۔ کیا ان کے درمیان دوبارہ جھگڑا ہوا؟ کیا ان کے بیچ کشمکش ہوئی اور مس اسٹار نے اپنے بھائی کو چاقو سے ہلاک کر دیا جیسا کہ شیرف کا کہنا ہے۔''

''میری۔'' جوزی نے کہا۔ ''اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں اور اسے جاننے کے بعد تم یہ سمجھو کہ میں نے تمہارا کہنا نہیں مانا تو کیا مجھے اس کی سزا ملے گی؟''

میری نے جوزی کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''میری بچی! تم کیا بتانا چاہ رہی ہو؟''

''میں نے ایک ایسی بات سنی ہے جس سے شاید مس اسٹار کو کچھ مدد مل سکے۔''

''بتاؤ۔'' میری نے نرم لہجے میں کہا۔

جوزی نے میری کو ہوٹل میں مسٹر جیمس اور سنہرے بالوں والے آدمی کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بتا دیا۔ میری منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''تم نے ان کی کوئی بات سنی؟''

''میں صرف اتنا سن سکی کہ مسٹر جیمس فلاڈلفیا جانے والی ٹرین کی بات کر رہے تھے اور دوسرا آدمی ان پر ہنس رہا تھا۔'' جوزی رکی جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''اس نے کہا تھا..... جہنم میں جاؤ۔''

''اگر تم اس آدمی کو دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گی؟''

''ہاں۔'' جوزی نے کہا۔ ''اس نے مجھے چاندی کا ایک سکہ دیا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے یہ بات نہیں بتانی چاہیے تھی۔ اب واقعی اس کے لیے مشکل ہو سکتی تھی۔

''اس نے تمہیں چاندی کا سکہ دیا تھا؟'' میری نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اس نے اپنا پائپ واپس پاؤچ میں رکھا اور جوزی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے ساتھ آؤ۔ تمہیں یہ کہانی دوبارہ سنانا ہوگی اور دعا کرو کہ یہ کافی ہو۔''

جوزی اس کے ساتھ واپس قصبے کی جانب چل دی۔ اس نے کبھی میری کو اتنا تیز چلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

جب وہ اپنی بات ختم کر چکی تو شیرف نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا پھر میری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی میز پر ایک چاقو رکھا ہوا تھا۔

''میں تمہاری کہانی پر کیسے یقین کر لوں جو تم نے اس طوائف کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کے لیے اس دوغلی نسل کی لڑکی کے ساتھ مل کر گھڑی ہے؟''

جوزی کے سر میں تیزی سے خون گردش کرنے لگا پھر اس نے اپنے کندھے پر میری کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا جو اسے پُرسکون رکھنا چاہ رہی تھی۔

''کیونکہ یہ سچ ہے۔ اس نے اس آدمی سے وہ چاندی کا سکہ لیا اور اسٹور سے پیپرمنٹ کی کینڈی خریدی۔ تم .... دکاندار سے پوچھ سکتے ہو۔ اسے یہ بات یاد ہوگی۔''

شیرف نے میری کی طرف دیکھا پھر جوزی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نے وہ پورا سکہ کینڈی خریدنے میں خرچ کر دیا؟''

''نہیں جناب!'' جوزی نے جیب سے ایک سفید سوتی پوٹلی نکالی اور اس میں سے دو چھوٹے سکے نکال کر دکھائے جو کینڈی خریدنے کے بعد بچ گئے تھے۔

''اور تم کہتی ہو کہ اس شخص کو گزشتہ ہفتے شراب خانے میں دیکھا تھا؟''

''ہاں، وہ وہی تھا۔ کیا اب بھی دو اور دو جمع کرنا مشکل ہے؟ تم لالچی ہو گئے تھے۔ اسی لیے تم نے مس اسٹار پر دباؤ ڈالا لیکن وہ تمہارے مطالبات پورے نہیں کرے گی۔''

جوزی یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ میری کس بارے میں بات کر رہی ہے لیکن شیرف کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اچھی طرح پوری بات سمجھ گیا ہے۔

شیرف نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ سب سچ ہے تب بھی میں کیسے یقین کر لوں کہ اس شخص نے جیمس کو قتل کیا ہے جس کا نام بھی تمہیں معلوم نہیں جبکہ میرے پاس ایک مشتبہ ہستی موجود ہے۔''

''کیونکہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ تم نے اس غریب لڑکی پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ قصبہ چھوڑ کر چلی جائے۔'' میری نے جواب دیا۔ ''یا تم نے اسے سبق سکھانے کے لیے گرفتار کیا ہے۔''

جوزی جانتی تھی کہ وہ سنہرے بالوں والے آدمی کے بارے میں بات کر رہے تھے جس نے اسے چاندی کا سکہ دیا تھا۔ اس نے چھوٹے سکوں والا رومال جیب میں رکھ لیا اور سوچنے لگی کہ ان کا کیا کرنا ہے؟

''جیمس سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ اسی روز مس اسٹار کو لینے آ گیا جب اس کا مددگار ہیلینا سے سودا طے کرنے یہاں آیا تھا۔ جب اسے جیمس اور اس کی بہن کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے ہوٹل میں جیمس سے باز پرس کی لیکن اس نے ہار نہیں مانی۔ وہ اپنی بہن کو یہاں سے لے جانے کے لیے پُرعزم تھا اور وہ شخص جانتا تھا کہ جیمس اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس نے اپنے منصوبوں میں حائل رکاوٹ کو دور کر دیا اور اس قتل کو ڈاکا زنی کا رنگ دے دیا۔''

''اور تم سمجھتی ہو کہ اسی شخص نے یہ قتل کیا ہے؟''

''میں سمجھتی ہوں کہ تم اس کا چاقو تلاش کر لو گے اور اس کا کوئی ایک ساتھی اسے شناخت کر لے گا۔ مس اسٹار تمہیں اس کا نام اور اس کے ملنے کی جگہ بتا دے گی۔ تم ایسے شخص نہیں ہو جو ایک عورت کو اس جرم کی پاداش میں لٹکا دو جو اس سے سرزد نہیں ہوا۔''

شیرف کافی دیر تک میری کو دیکھتا رہا پھر اس نے میز پر سے چاقو اٹھا کر دراز میں رکھا اور جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر مقفل دروازے کی طرف چل دیا۔ اس کے بعد کے مراحل بڑی آسانی سے طے ہو گئے۔ قاتل کے پاس سے نہ صرف آلۂ قتل برآمد ہوا بلکہ اس نے جیمس کے قتل کا اعتراف بھی کر لیا کیونکہ مقتول نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مس اسٹار کو اس کے حوالے کر دے گا اور اس کے عوض اس نے پیشگی رقم بھی وصول کر لی تھی لیکن مس اسٹار نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور جب اس شخص نے اس سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ جلد ہی مس اسٹار کو لانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن وہ شخص سمجھ چکا تھا کہ یہ جیمس کے بس کی بات نہیں کیونکہ مس اسٹار کو گرجا کے لوگوں کی حمایت حاصل تھی اور جیمس اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لا سکتا تھا چنانچہ اس نے اشتعال میں آ کر جیمس کو قتل کر دیا۔

☆☆☆

''میری! تم آ گئیں۔'' سارہ نے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

میری نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ تھام لیے اور انہیں مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔ ''تم نے قسم کھائی تھی کہ کبھی واپس نہیں جاؤ گی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اس عہد پر قائم رہیں۔ تمہیں یہ آزادی مبارک ہو۔''

''گو کہ میں اس کی مداخلت پر ناراض ہوئی لیکن اتنی ظالم نہیں ہوں کہ اپنے بھائی کو قتل کر دیتی۔'' اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور انگلی سے اپنے گال پر آیا ہوا آنسو پونچھنے لگی۔ ''یہاں آ کر مجھے جو آزادی نصیب ہوئی اس سے میں نے پورا لطف اٹھایا لیکن اس کی وجہ سے میرا بھائی قتل ہو گیا۔''

''اسے اس آزادی نے قتل نہیں کیا مس سارہ بلکہ لالچ نے اس کی جان لے لی۔'' میری نے دھوپ سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''تم مونٹانا جا کر کیا کرو گی؟''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔'' اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ وہاں کی راہبائیں مجھے قبول کر لیں گی؟''

''گاڑی تیار ہے مس۔'' گاڑی بان نے آواز لگائی تو سارہ نے سر ہلا دیا اور میری سے مخاطب ہوئی۔

..... ''تم میری طرف سے جوزی کا شکریہ ادا کرنا۔ اس کی گواہی کی بدولت صرف میں ہی رہا نہیں ہوئی بلکہ قاتل بھی پکڑا گیا۔'' پھر اس نے اپنے بیگ سے چاندی کے کئی سکے نکالے اور انہیں میری کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولی۔

''یہ اسے دے دینا تاکہ وہ ہر روز کینڈی کھاتی رہے۔''

⌘⌘⌘

جب کسی دل میں عبادتِ الٰہی کا شوق اور رمزِ کائنات کو سمجھنے کا ذوق ہو تو اس دل کی تڑپ اسے جگہ جگہ لیے پھرتی ہے اور جب تک یہ پیاس بجھ نہ جائے اسے بیٹھنے نہیں دیتی... حسین بن منصور حلاج کا شوق اور ذوق بھی انہیں مسلسل سفر میں رکھے ہوئے تھا... جہاں بھی موقع ملا تصوف کے اسرار و رموز سیکھتے رہے مگر ان کی وحشت انہیں کہیں بھی سکون سے رہنے نہ دیتی۔ ہمیشہ ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول رہتے۔

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ

رضوانہ ساجد

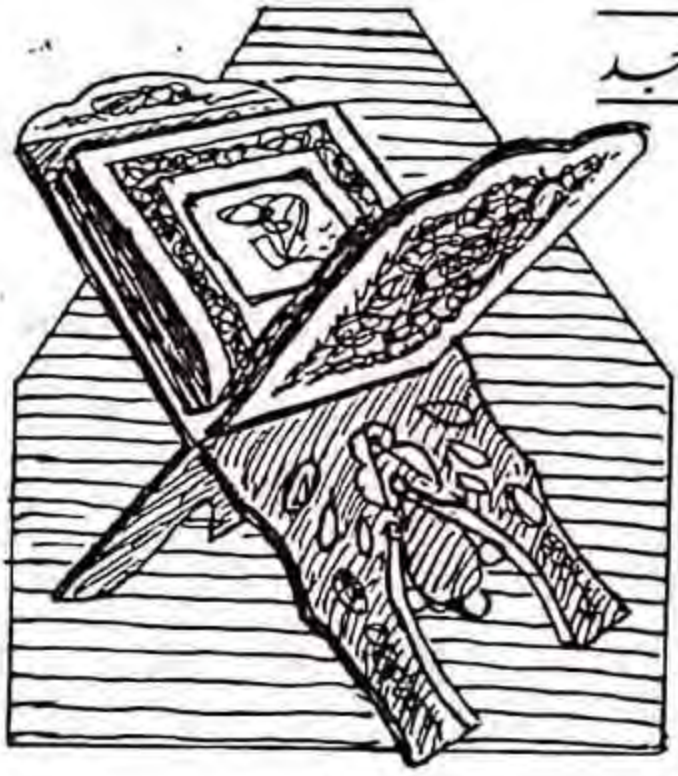

حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ تذکرۃ اولیاء میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''آپ قتیل فی سبیل اللہ ہیں۔ آپ کی حالت نہایت عجیب و غریب گزری ہے اور اپنے طریقے میں خود ہی مخصوص و لاثانی ہیں۔ ہر وقت غایت سوز و فراق میں مست و بے قرار رہا کرتے تھے۔ پاکباز، عاشق الٰہی مشہورِ زمانہ تھے۔ حقائق و معارف اور اسرار معانی میں نہایت کامل اور فصاحت و بلاغت میں ماہر و بے بدل تھے۔ بعض لوگوں نے آپ کا انکار کیا مگر بعض آپ کو اکابر مشائخین میں سے مانتے ہیں اور بعض آپ کے حق

میں قطعی خاموش ہیں۔

حضرت علی ہجویریؒ ''کشف المحجوب'' میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''حضرت شیخ الشائخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابوالعباس شقانیؒ کے زمانے میں حسین بن منصور حلاجؒ کو صاحب ''سر'' مانتے تھے اور ان لوگوں کے نزدیک حسین بن منصور حلاجؒ ایک عارف، کامل بزرگ تھے۔ حضرت شیخ شبلیؒ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں اور حسین بن منصور حلاج ایک ہی طریق پر ہیں مگر مجھے میرے دیوانے پن نے آزاد کرادیا اور حسین بن منصور کو اس کی عقل مندی نے ہلاک کرادیا۔''

بعض ظاہر بیں علماء نے آپ کے کلام کو کفر سے تعبیر کیا جبکہ بعض نے آپ کو حلول قرار دیا۔ عقیدت مندوں نے آپ کی کرامات کے بیان میں اتنا غلو اختیار کیا کہ بات الجھ کر رہ گئی۔ حاسدین کو موقع مل گیا۔ آپ کی ذات متنازعہ ہو کر رہ گئی۔ طبقۂ صوفیہ میں آپ سے زیادہ شاید ہی کوئی دوسری شخصیت اتنی متنازعہ ہو یا شاید حسین بن منصور حلاجؒ اکیلے نظر آئیں۔

کسی نے عاشقِ جانباز کہا تو کسی نے ساحر و شعبدہ گر۔ اس نے کسی کی پروا نہیں کی اور عشق کے معنی سمجھاتے دار پر چڑھ گیا اور محققین کے لیے کبھی نہ بند ہونے والے دروازے کھول گیا۔ سوال پھر بھی یہ رہتا ہے کہ اس جیسا ہی کوئی عاشق ہو تو عشق کا بھید کھولے۔

یہ تھے حضرت حسین بن منصور بن حلاجؒ جو اپنے جذب و کیف اور سرور و مستی کے لیے ایران و عراق اور برصغیر پاک و ہند میں متنازع شہرت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

آپ کا اسمِ گرامی حسین اور والد کا... نام منصور حلاج تھا۔ اس لیے انہیں حسین بن منصور حلاج ہونا چاہیے تھا لیکن عجیب بات ہے کہ انہیں منصور حلاج یعنی والدِ گرامی کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ ان کا اصل نام کتابوں تک محدود ہو کر رہ گیا اور منصور حلاج زبانوں پر چڑھ گیا۔

آپ کی تاریخِ پیدائش کے بارے میں کوئی معتبر روایت نہیں ملتی البتہ تذکرہ نگاروں نے کسی مستند حوالے کے بغیر ولادت کا سال 244ھ قرار دیا ہے۔

لفظ حلاج کے بارے میں بھی مختلف آراء ملتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپ کے والد روئی دھننے کا کام کرتے تھے اس لیے ''حلاج'' کہلاتے تھے۔ حلاج عربی زبان میں جلاہے کو کہتے ہیں۔

مشہور مؤرخ خطیب بغدادی نے ابوعبدالرحمٰنؒ کے حوالے سے ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک بار حضرت منصور حلاج عراق کے شہر واسط میں ایک روئی دھننے والے کی دکان پر پہنچے اور اسے کسی کام سے بھیجنا چاہا۔ وہ دکان چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی مصروفیت کا عذر پیش کیا۔

''میں آپ کے حکم کی ضرور تعمیل کرتا لیکن میرے پاس کام آیا ہوا ہے۔ یہ روئی مجھے شام تک دُھن کر دینی ہے ورنہ مجھے اُجرت نہیں ملے گی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تم میرا کام کردو، میں تمہارا کام کردوں گا۔''

وہ جلاہا چونکہ آپ کے مرتبے سے واقف تھا اس لیے انکار نہ کرسکا اور دکان چھوڑ کر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جلاہا کام نمٹا کر واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دکان میں جتنی روئی ہے سب دھنی رکھی ہے۔ یہ روئی اتنی زیادہ تھی کہ اگر جلاہا اسے دھنتا تو تین چار ماہ لگ سکتے تھے۔

یہ کام نہیں تھا، کرامت تھی۔

اس جلاہے نے یہ راز دوسروں پر فاش کردیا۔ بس اسی دن سے لوگ انہیں منصور ''حلاج'' کے نام سے پکارنے لگے۔

ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ آپ پُراسرار گفتگو کیا کرتے تھے اور لوگوں کے پوشیدہ راز ظاہر کردیتے تھے۔ یعنی چھپے ہوئے اسرار روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے تھے اس لیے آپ کو ''حلاج الاسرار'' کہا جانے لگا تھا۔ کثرتِ استعمال سے ''اسرار'' تو غائب ہو گیا اور حلاج زبانوں پر رہ گیا۔ ''حسین'' (آپ کا اصلی نام) پہلے ہی لوگ بھول چکے تھے۔ اب منصور حلاج ہو گئے۔

یہ دلچسپ حقیقت اپنی جگہ کہ تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی بیٹے نے اپنے باپ کے نام سے شہرت حاصل کی ہو۔

حضرت منصور کے دادا مجوسی تھے یعنی آتش پرست تھے۔ حضرت شیخ کے والد نے مذہب اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا حضرت حسین بن منصور کی پرورش اسلامی ماحول میں ہوئی۔

مؤرخ خطیب نے بیان کیا ہے کہ حسین بن منصور کی پیدائش ایران کے شہر بیضا کے موضع ''طور'' میں ہوئی اور ''تستر'' میں نشوونما ہوئی۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں تاریخ کے صفحات خاموش ہیں۔ بس اتنا پتا چلتا ہے کہ جب آپ کی عمر سولہ سال یا اس سے کچھ زیادہ ہوئی (بعض نے اٹھارہ سال لکھا ہے) تو مشہور صوفی بزرگ حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ حاضری یقیناً تصوف کے اسرار و رموز کی آگاہی کے لیے تھی۔

☆☆☆

حضرت سہل تستری نہایت پائے کے صوفی بزرگ تھے۔ تین سال کی عمر ہی میں عبادت میں مشغول رہنے لگے تھے۔ چھ برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور سات سال کی عمر سے باقاعدگی سے روزے رکھنا شروع کر دیے۔ بارہ برس کی عمر میں علوم شرقیہ میں ممتاز ہو گئے۔ اسی عمر میں ایک فقہی مسئلہ پیش آیا تو آپ مشہور بزرگ حضرت شیخ حبیب حمزہ کی خدمت میں بصرہ حاضر ہوئے اور ان کے زہد اور علم و فضل سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اپنے وطن ''تستر'' لوٹ آئے۔ واپس آ کر آپ کا معمول بن گیا کہ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو ''جو'' کی دو ٹکیاں کھا کر شکم کی آگ بجھا لیتے۔ ممنوعہ ایام کے سوا ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور راتیں یادِ الٰہی میں گزارتے تھے۔

حضرت فریدالدین عطارؒ نے لکھا ہے کہ صحرائے طریقت کے سیاح دریائے حقیقت کے غواص حضرت سہل بن عبداللہ اکابر اہلِ تصوف میں سے تھے۔ اپنے وقت کے سلطانِ طریقت تھے۔ بھوکے رہنے اور جاگنے میں شانِ عظیم سمجھتے تھے۔

آپ صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ تذکرہ نگاروں نے آپ کی بے تحاشا کرامات درج کی ہیں۔ ایک بزرگ آپ کے بارے میں واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں جمعے کے دن حضرت سہل تستری کے پاس گیا۔ میں نے ان کے حجرے میں ایک سانپ کو دیکھا۔ میں ایک قدم آگے بڑھاتا تو پھر ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا۔ حضرت سہلؒ نے آواز دی۔ ''اندر آ جاؤ۔ کیوں ڈرتے ہو۔ جس کا ایمان اللہ تعالیٰ پر ہو اس سے ہر چیز ڈرتی ہے۔'' پھر فرمایا۔ ''تم جمعہ پڑھنا چاہتے ہو؟'' میں نے عرض کیا۔ ''ہاں مگر ہمارے اور جامع مسجد کے درمیان ایک رات اور دن کی مسافت ہے۔'' انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور چل پڑے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سامنے جامع مسجد دکھائی دینے لگی۔ ہم نے اس مسجد میں نماز ادا کی اور باہر نکل آئے۔

یہ آپ کی کرامت ہی تھی کہ دور کی مسجد قریب آ گئی۔

حضرت منصورؒ نے ابتدائی تربیت ایسے باکمال صوفی کے زیرِ نگرانی طے کی لیکن آپ کی بے قرار طبیعت نے وہاں دو سال سے زیادہ نہ ٹھہرنے دیا۔ اس عظیم خانقاہ میں ان کی بے چین طبیعت کو سکون نہ مل سکا۔ وہ اس خانقاہ سے نکلے اور کسی نئی تربیت گاہ کی تلاش میں بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بصرہ تک کا سفر ریاضتوں اور عبادتوں میں کٹتا رہا۔ بصرہ پہنچے تو آپ کے بدن پر دو رنگین کپڑوں، چادر اور تہ بند کے سوا کچھ نہ تھا۔ علماء و مشائخ سے ملاقاتیں کیں تو ہر طرف حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکی کا شہرہ سنا۔ ان کا قیام تلاش کرنا کون سا مشکل تھا۔ آپ ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ بعض کے نزدیک باقاعدہ حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تھے۔

حضرت مکی صاحبِ علم بھی تھے اور تقویٰ میں بھی بے مثال تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد تھے اور اس شاگردی پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے۔

مثل مشہور ہے کہ ولی کو ولی پہچانتا ہے۔ حضرت مکیؒ نے اس نوجوان کی دل سے قدر کی اور دل و جان سے اس کی تربیت کرنے لگے۔ شاگرد بھی ایسا کہ نہایت ذہین اور دین کی جستجو کرنے والا۔

اکتسابِ فیض کرتے ہوئے اٹھارہ ماہ ہو گئے تھے۔ یہ سلسلہ اور نہ جانے کب تک جاری رہتا کہ پے در پے دو واقعات ایسے ہو گئے کہ حضرت منصور اور حضرت عثمان مکیؒ کے تعلقات میں فاصلہ حائل ہو گیا۔

حضرت ابویعقوب الاقطع آپ کی ذہانت و کمالات سے اتنے متاثر تھے کہ اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دینے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت منصورؒ کے لیے ضروری تھا کہ مرشد سے اجازت لیتے اور اجازت لی بھی لیکن مرشد نے واضح الفاظ میں انکار کر دیا۔

''تمہارے لیے یہ شادی نفع بخش ثابت نہیں ہوگی۔ اس ارادے سے باز رہو۔''

حضرت منصورؒ کے لیے جس طرح مرشد کو بتانا ضروری تھا اسی طرح ان کا حکم ماننا بھی ضروری تھا لیکن آپ نے مرشد کی مرضی کے خلاف شادی کر لی۔

شادی کا عمل سنت ضرور ہے لیکن حضرت منصورؒ ابھی معرفت کا سفر طے کر رہے تھے۔ یہ راستہ مرشد کی راہنمائی میں طے کیا جاتا ہے، روگردانی میں نہیں۔ وہ مرشد کی حکم عدولی کے مرتکب ہوئے تھے اس لیے مرشد کا خفا ہونا لازمی تھا۔

اس کشیدگی نے اس وقت خطرناک صورت اختیار کر لی جب عمرو بن عثمانؒ کا ایک قلمی رسالہ آپ کے حجرے سے کسی نے چرا لیا۔

فریدالدین عطار لکھتے ہیں کہ ایک دن گنج نامہ کا ترجمہ مصلے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ آپ طہارت کو گئے، جب واپس آ کر وضو کرنے لگے تو یاد آیا۔ دیکھا تو ترجمہ وہاں نہیں تھا۔

اس گنج نامہ میں یہ لکھا گیا تھا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کے قالب میں روح ڈال کر فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو ابلیس کے سوا سب نے خاک پر سر رکھ دیا مگر ابلیس نے کہا کہ میں سر دے دوں گا لیکن سر نہ رکھوں گا، خواہ مجھ کو فاسق و فاجر اور لعنتی ہی کیوں نہ کہیں۔ غرض اس نے سجدہ نہ کیا کیونکہ اس نے حضرت آدمؑ کا راز دیکھ لیا تھا۔ ابلیس کے سوا کسی نے حضرت آدم علیہ السلام کے راز پر اطلاع نہ پائی، اس لیے وہ مردود ہو گیا کہ اس کی آنکھ پر گنج رکھی گئی اور شرط یہ ہے کہ گنج کو ایک شخص دیکھے مگر اس کا سر کاٹ لیا جائے تاکہ غمازی نہ کرے۔ ابلیس نے فریاد کی اور مہلت مانگی۔ فرمایا کہ ہم نے تجھے مہلت دی مگر تجھ کو ''متہم'' کر دیا تاکہ کوئی تجھے سچا نہ جانے.....

اس کے علاوہ بھی تصوف کے دیگر اسرار و رموز لکھے تھے جسے ایک عام انسان تو کیا، عالم و فاضل لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔

آپ حیران تھے کہ رسالہ گیا تو کہاں گیا اور اگر کسی نے لیا بھی ہے تو اس کے کس کام کا۔ آپ نے اسی عالمِ افسردگی میں اپنے تمام شاگردوں کو جمع کیا اور ان سے رسالے کی بابت پوچھا۔ کسی نے اقرار نہ کیا اور لاعلمی کا اظہار کیا۔

دراصل وہ رسالہ حضرت منصور حلاجؒ نے پیر و مرشد کے حجرے سے اٹھایا تھا مگر مسلسل پوچھنے کے باوجود آپ خاموش رہے۔

حضرت شیخ کو بذریعہ کشف معلوم ہو گیا تھا کہ رسالہ منصور حلاج کے پاس ہے لیکن وہ ان کی زبان سے سننا چاہتے تھے۔

دراصل حضرت منصور کی نیت رسالہ چوری کرنے کی نہیں تھی۔ ان کا ذوقِ تجسس اور بے قراری انہیں اس رسالے تک لے گئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے اس رسالے کی نقل کر کے شیخ کو رسالہ واپس کر دیا تھا لیکن قصور اپنی جگہ تھا۔ شیخ کا دل ان کی طرف سے صاف نہ ہو سکا۔ صرف اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

''حسین! تجھے اس رسالے کی نقل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ وہ اسرار ہیں جن تک تیری پہنچ ممکن نہیں۔''

حضرت منصورؒ نے مرشد کی اس تنبیہہ کی بھی پروا نہیں کی اور نہایت بے باک جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس رسالے کے مسائل کو منبروں پر کھڑے ہو کر بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہ اسرار و رموز عامۃ الناس کی سمجھ سے بالاتر تھے لہٰذا ایک شور مچ گیا۔ مخالفت کا طوفان امڈ آیا۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے انہیں پھر سرزنش کی لیکن حضرت منصور کی جذب و مستی کا عالم تھا یا ہوش مندی..... وہ اپنی راہ پر قائم رہے۔ حضرت شیخ نے انہیں ان رموز کے افشا پر بددعا دی اور اپنی مجلس سے علیحدہ کر دیا۔

ابر کا ایک ٹکڑا ہٹ گیا تھا لیکن آسمان پر کئی پارۂ ابر اب بھی موجود تھے۔

ان کی بے چین طبیعت کسی جگہ ٹکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی صحبت سے اٹھے تو حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں پہنچ گئے اور اب ان کی ناراضی کا بوجھ اٹھائے بغداد کی طرف جا رہے تھے جہاں حضرت جنید بغدادیؒ کا آستانہ تھا۔

ان کی وحشت انہیں حضرت جنید بغدادیؒ کے آستانے پر لے آئی۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے نہ صرف انہیں مکتب میں داخل ہونے کی اجازت دی بلکہ بیعت سے بھی سرفراز کیا۔

حضرت منصور حلاجؒ تقریباً ایک سال حضرت جنیدؒ کی خدمت میں رہے۔ ان کی ذہانت اور حصولِ دین کے شوق نے

یہاں بھی ان کی قدر و منزلت کو قائم رکھا لیکن ان کی وحشت نے انہیں یہاں بھی نہیں رہنے دیا۔ ایک دن جی میں کچھ ایسی سمائی کہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک جوان ابوقبیس کی پہاڑی کے ایک تپتے ہوئے پتھر پر بیٹھا ہے۔ پورا بدن پسینے سے شرابور ہے۔ وہ خود سب سے بے خبر آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے۔ عشق کی آگ نے اسے ایسا جلا دیا ہے کہ سورج کی گرمی بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

وہ ریاضتیں اور مجاہدے کرنے ہی مکہ معظمہ آئے تھے۔

قیام مکہ کے دوران آپ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔ ایک مرتبہ چند مفلوک الحال اور حاجت مند آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصرار کرنے لگے کہ ہماری کچھ مدد کرو۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو تم سے بھی زیادہ خستہ حال ہوں۔''

''آپ مستجاب الدعوات ہیں۔ آپ ہمارے حق میں دعا کریں، اللہ تعالیٰ ضرور سنے گا۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں مستجاب الدعوات ہوں؟''

''آپ ہمارے لیے مانگ کر تو دیکھیے۔ اللہ تعالیٰ ضرور سنے گا۔''

آپ مختلف حیلے بہانوں سے ٹالتے رہے لیکن وہ لوگ بضد تھے لہٰذا حضرت منصور نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور لبوں کو جنبش ہوئی۔

''اے رب کریم! جب تُو نے اپنے بندوں کو میری طرف متوجہ کیا ہے تو پھر ان کی حاجت بھی پوری کر۔''

یہ کہہ کر جب آپ نے ہاتھ نیچے کیا تو اس میں بہت سے درہم موجود تھے۔ آپ نے وہ درہم حاجت مندوں میں تقسیم کر دیے۔

آپ کی اس کرامت کی دھوم لوگوں میں عام ہو گئی۔ پھر تو جس حاجت مند تک یہ خبر پہنچی، اپنی ضرورت لے کر آپ کے پاس پہنچ جاتا۔ آپ فضا میں ہاتھ بلند کرتے اور مٹھی میں بھرے ہوئے درہم اس کے حوالے کر دیتے۔

یہ خبریں جب تواتر سے پہنچنے لگیں تو آپ ایک شعبدہ باز کے طور پر مشہور ہونے لگے۔ کچھ لوگ مشہور بزرگ حضرت ابن عطا کی خدمت میں پہنچے اور اس واقعے کا ذکر کر کے آپ کی رائے دریافت کی۔ آپ نے فرمایا۔ ''اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ منصور حلاج کے قبضے میں ''جن'' ہوں گے جو ان کا کام کر دیتے ہیں۔''

یہ باتیں گردش کر ہی رہی تھیں کہ ایک اور واقعہ سامنے آ گیا۔ حضرت منصور حلاج حسب معمول ریاضت میں مشغول تھے۔ استغراق کا عالم یہ تھا کہ اردگرد کا ہوش جاتا رہا تھا۔ ایک عقیدت مند ملاقات کے لیے حاضر ہوا لیکن آپ کو اس طرح محو عبادت دیکھ کر ایک طرف بیٹھ گیا کہ آپ جب وظیفے سے فارغ ہوں گے اور آنکھیں کھولیں گے تو خود ہی دیکھ لیں گے۔ اچانک اس شخص نے ایک بہت بڑا بچھو دیکھا جو آپ کے عقب سے نکلا اور آپ کے گرد چکر لگانے لگا۔ جس وقت اس کی نظر بچھو پر پڑی، وہ بچھو حضرت منصور حلاج کی عبا میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ شخص بے اختیار چیخ اٹھا۔ انسانی چیخ سن کر حضرت منصور کی توجہ میں خلل واقع ہوا۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور اس شخص کو اپنے قریب بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''اے شخص تو کون ہے اور تجھے کیا تکلیف پہنچی تھی کہ تو چیخ اٹھا؟''

''ایک بہت بڑا بچھو ابھی میں نے دیکھا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے آپ کی عبا میں چھپ گیا۔''

''میری عبا میں چھپا ہے..... پھر تو کیوں چیختا ہے؟''

''آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ بچھو پھر نظر آیا۔ ''یہ دیکھیے یہ رہا۔'' اس شخص نے کہا اور اسے مارنے کے لیے اٹھا۔

''خبردار! اسے کچھ نہ کہنا۔'' حضرت منصور نے فرمایا۔ ''تم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ یہ میرا ساتھی ہے۔ میرے ساتھ برسوں سے ہے۔ مجھے نقصان پہنچانے والا نہیں، میری حفاظت کرنے والا ہے۔''

اس شخص کے چہرے سے خوف کے آثار ابھی تک ظاہر تھے لیکن کسی نہ کسی طرح بیٹھا رہا۔ دل ہی دل میں قائل بھی ہوتا رہا کہ یہ واقعی ولی اللہ ہیں۔ یہ زہریلا بچھو تک ان کا تابعدار ہے۔

اس شخص نے یہ واقعہ دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے بھی آپ کے ولی اللہ ہونے کی گواہی دی۔

''آپ یقیناً باکرامت ولی ہیں۔''

یہ واقعہ جب علمائے ظاہر تک پہنچا تو اول تو وہ ماننے ہی کو تیار نہیں تھے لیکن جب اس شخص کو لایا گیا اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے تو انہوں نے شعبدے کے سوا اسے کچھ نہ گردانا۔

''منصور حلاج ولی اللہ نہیں شعبدہ باز ہیں۔ ان کی عبادتیں دکھاوے کے لیے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ شعبدہ باز ہیں۔''

اب علمائے ظاہر کو تشویش ہوئی کہ اگر یہ شعبدے اسی طرح جاری رہے تو منصور حلاج کے عقیدت مندوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ سب اس کے پاس چلے جائیں گے تو ہمارے پاس کون آئے گا۔ انہوں نے بڑے پیمانے پر مخالفت شروع کردی۔ برملا آپ کو شعبدہ باز کہنے لگے۔

اس مخالفت کا آغاز ہوگیا جس کے نہایت بھیانک اثرات عنقریب ظاہر ہونے والے تھے۔ ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ آپ کی ایک اور کرامت کا چرچا ہوگیا۔

آپ اپنے حجرے میں مشغولِ عبادت تھے۔ تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ اندر گئے تو دیکھا حجرہ خالی پڑا ہے۔ اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ سب حیران تھے کہ آپ لوگوں کی نظروں کے سامنے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ باہر بھی نہیں نکلے۔ پھر کہاں غائب ہو گئے؟ ایک شخص دوسرے سے پوچھ رہا تھا کہ شیخ کہاں چلے گئے اور کب چلے گئے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سب نے ایک خواب کی طرح یہ منظر دیکھا کہ حضرت منصور اس طرح تشریف لے آئے کہ شیر پر سوار تھے۔ لوگ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ آپ شیر سے اترے اور اس سے کہا..... بس اب تم جاؤ۔ شیر سر جھکا کر چل دیا اور چند قدم چل کر غائب ہوگیا۔

شیر کے چلے جانے کے بعد عقیدت مندوں نے پوچھا۔ ''حضرت! یہ کیا معاملہ تھا؟''

آپ نے شانِ بے نیازی سے فرمایا۔ ''مجھے ایک سفر درپیش تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے غیب سے یہ سواری میرے لیے بھیج دی۔ کائنات میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کا نور ہے اور اسی کے حکم کا تو پابند ہے۔''

اس کرامت کا چرچا ہوا تو اس کرامت کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ عام لوگوں نے تو اسے کرامت کہا اور حضرت منصور کے اعلیٰ مناصب کے قائل ہوئے لیکن بعض علماء نے اسے بھی جادوگری سے تعبیر کیا۔

دوسرے لفظوں میں وہ زمین تیار ہونے لگی جس میں حضرت منصور کی مخالفت کی فصل تیار ہونی تھی۔ شعبدہ بازی اور جادوگری کے یہ قصے بڑھ کر خوفناک انجام تک پہنچنے والے تھے۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ آپ کی شخصیت متنازع بن گئی۔ کوئی انہیں ولیِ کامل قرار دے رہا تھا، کوئی کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اور کھلے عام شعبدہ باز اور ساحر کہہ رہا تھا۔

یہ مخالفتیں اتنی بڑھیں کہ مکہ معظمہ میں ایک سال گزارنے کے بعد آپ ایک مرتبہ پھر بغداد آگئے لیکن اس شان سے کہ فقیروں اور درویشوں کی ایک جماعت ساتھ تھی اور یہ جماعت اس طرح حضرت منصور سے عقیدت و احترام کا سلوک کر رہی تھی جیسے مرید اپنے پیر کا احترام کرتے ہیں۔ حضرت منصور کی گفتار و ادا سے بھی مجذوبانہ شان ظاہر ہو رہی تھی۔ خانقاہ میں داخل ہوئے تو خرقہ پہنے ہوئے تھے جبکہ خانقاہ کا اصول یہ تھا کہ شیخ کی اجازت کے بغیر خرقہ نہیں پہنا جاسکتا تھا۔

یہ سب باغیانہ حرکات تھیں جو حضرت منصور سے سرزد ہو رہی تھیں۔ حضرت جنیدؒ کو یہ باتیں ناگوار ضرور معلوم ہو رہی تھیں لیکن آپ نے کسی کدورت کا اظہار نہیں کیا۔

حضرت جنیدؒ ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے حضرت منصور سے نہایت محبت سے پیش آئے اور بہت دیر تک ان سے گزشتہ حالات پوچھتے رہے۔

اسی گفتگو کے دوران حضرت حسین بن منصور حلاج نے اپنے مرشد جنید بغدادیؒ سے معرفت کا ایک مسئلہ دریافت کیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

حضرت منصور نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ حضرت جنیدؒ نے پھر سکوت اختیار کیا اور جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

حضرت منصور نے تیسری بار بھی وہی سوال کیا اور حضرت جنیدؒ نے اس مرتبہ بھی خاموشی اختیار کی۔

مرشد کی طرف سے جواب میں سکوت پا کر خفا ہوگئے اور اپنے درویشوں کو لے کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔

احادیثِ نبویؐ کا پہلا مجموعہ

عہدِ نبویؐ میں اخبار و سیر اور احکام و سُنن کا تحریری سرمایہ جمع ہونا شروع ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا تھا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ابو شاہؓ ایک یمنی صحابی کی درخواست پر آپؐ نے یہ خطبہ لکھ کر اُن کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطینِ عالم کے نام جو خطوط روانہ کیے وہ لکھے ہوئے تھے (ساٹھ ستر سال قبل) آپؐ کا وہ خط جو مقوقس شاہِ مصر کے نام بھیجا گیا تھا۔ ایک عیسائی گرجے کی کسی کتاب کی جلد میں لگا ہُوا ملا ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ بعینہٖ وہی نامہ ہے جو آپؐ نے لکھوایا تھا۔ یہ پُرانے عربی خط میں ہے۔ اس کی بعینہٖ وہی عبارت ہے اور مُہر میں نام کے وہی الفاظ اور صورتِ تحریر ہے جس طرح (صدیوں پہلے کی بیان کردہ) حدیثوں میں بیان آیا ہے۔ یہ اسلامی روایات کی صداقت کی کتنی بڑی دلیل ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے سوا مجھ سے زیادہ کسی کو زیادہ حدیث یاد نہیں۔ اور مجھ سے زیادہ اُن کے پاس حدیثوں کا سرمایہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرتؐ سے جو کچھ سُنتے، اس کو لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ ابُوداؤد اور مسند ابنِ حنبل میں ہے کہ بعض لوگوں نے عبداللہ بن عمروؓ سے کہا:

"آنحضرتؐ کبھی غصّے کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوش رہتے ہیں اور تم سب کچھ لکھ لیتے ہو!" عبداللہ بن عمروؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرتؐ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے دہنِ مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ "تم لکھ لیا کرو۔ اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔" عبداللہ بن عمروؓ نے اپنے اس مجموعے کا نام "صادقہ" رکھا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنی زندگی کی آرزو صرف دو چیزوں نے پیدا کردی ہے جن میں ایک یہ صادقہ ہے اور صادقہ وہ صحیفہ ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھا ہے۔

ماخوذ از خطبات مدارس، مصنفہ سید سلیمان ندوی

اب یہاں دو سوال اٹھتے ہیں۔ کیا وہ سوال اتنا مشکل تھا کہ جنید بغدادیؒ ان کا جواب نہ دے سکے یا پھر یہ سوال ایسا تھا جس کا جواب دینا خلافِ مصلحت تھا یا فساد کا باعث بنتا؟ ایک سوال اور بھی سامنے آتا ہے۔ کیا آزردگی کے باعث سوال کا جواب نہ دینا تھا یا کچھ اور؟

اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ سوال کیا تھا تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا لیکن کسی مؤرخ نے اس سوال کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ صرف اتنا لکھا کہ حضرت منصور اپنے اساتذہ سے عجیب عجیب سوال کرتے تھے۔ ان کی حالت ایک وحشت زدہ آدمی کی سی تھی جبکہ صوفیانہ مراحل میں صبر اور قرار کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت منصور کا اضطراب انہیں کسی جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔ اس لیے وہ آشیانے بدلتے رہتے تھے۔ یہاں بھی سوال کا بہانہ بن گیا۔ ان کے اندر کا اضطراب تھا جس نے یہاں بھی نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ بغداد سے نکلے اور تستر پہنچ گئے۔ یہاں بھی آپ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔ ان کرامات نے عوام سے لے کر خواص تک کو حیرت میں ڈال دیا اور بہت سے حاسد پیدا کر دیے۔

ایک دن حضرت منصور حلاج اپنے عقیدت مندوں کے ہمراہ مجلس میں بیٹھے تھے کہ اچانک کسی طرف سے ایک شخص نمودار ہوا اور نہایت بے ہودگی سے حضرت منصور کو مخاطب کیا۔

"احمقوں کا مجمع لگائے کیا بیٹھے ہو۔"

"آؤ تم بھی بیٹھ جاؤ۔" حضرت منصور نے نہایت شاندار جواب دیا کہ احمقوں کا مجمع ہے، بس تمہاری کمی تھی۔

"میں تمہارے دام میں آنے والا نہیں۔ تم صرف ان لوگوں کو متاثر کر سکتے ہو۔ بڑے ولی اللہ بنے پھرتے ہو مگر مجھے معلوم ہے تم شعبدہ باز ہو۔"

"میں ولایت کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن مجھے تیرے حال کی خوب خبر ہے۔" حضرت منصور نے فرمایا اور اس کے ماضی کے حالات بتانے شروع کر دیے۔

اس شخص نے اپنے پردے چاک ہوتے ہوئے دیکھے تو چیخ اٹھا۔ "بس کرو حسین! میں تمہارا قائل ہو گیا۔"

وہ شخص قائل تو ہو گیا لیکن اس واقعے کی شہرت بھی ہو گئی۔ بہت سے لوگوں کو یقین آ گیا لیکن حاسدوں کی تعداد بھی بڑھ

گئی۔ خاص طور پر تستر کے بااثر لوگ آپ سے خائف رہنے لگے۔ ایسے ہی بااثر لوگوں نے ایک شخص کو لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کرلیا کہ منصور حلاج کو اتنا تنگ کرو کہ وہ تستر چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس شخص نے اپنے چند بدمعاش ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ ملالیا اور موقع کی تاک میں لگا رہا۔ ایک دن اسے موقع مل گیا۔ حضرت منصور غسل کرنے کے بعد حمام سے نکلے۔ بازار میں لوگوں کا کافی رش تھا۔ وہ شخص چپکے چپکے آپ کے پیچھے چلا اور آپ کی گدی پر زور سے تھپڑ مار دیا۔ اس بے ہودہ حرکت پر آپ کو جلال آگیا اور ڈانٹ کر پوچھا۔ ''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے..... تم نے مجھے کیوں مارا؟''

اس شخص نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ''میں نے یہ حرکت اپنی مرضی سے نہیں کی۔ اس کا حکم مجھے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔'' یہ جواب سن کر آپ کو مزید جلال آگیا۔

''اگر یہ حکم تجھے اللہ تعالیٰ نے دیا تھا تو وہی تجھے روک بھی دے گا۔ دوبارہ مار کر دیکھ۔'' حضرت منصور نے فرمایا۔

وہ شخص زور سے ہنسا اور مارنے کے لیے پھر ہاتھ اٹھایا۔ وہ پوری جان لڑا رہا تھا لیکن ہاتھ اٹھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہاتھ مفلوج ہوگیا ہے۔

پھر سب نے دیکھا کہ چند دنوں ہی میں اس گستاخ کا ہاتھ سوکھ گیا۔ وہ زندگی بھر کے لیے معذور ہوگیا۔ اس کے بعد کس کی ہمت تھی کہ آپ کو تنگ کرتا۔

تستر ہی کا واقعہ ہے کہ درویشوں کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مالی امداد کی طالب ہوئی۔ ان لوگوں نے سن رکھا ہوگا کہ آپ غیب سے لوگوں کی مدد کرتے ہیں ورنہ ظاہری حالت تو ایسی نہیں تھی کہ کوئی آپ سے کچھ مانگ سکتا۔ یہی جواز آپ نے پیش بھی کیا۔

''میں تو خود مفلوک الحال ہوں۔ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''ہم آپ کی ظاہری نہیں، باطنی قوت کی شہرت سن کر آئے ہیں۔''

''تمہیں میری باطنی قوت کا کیا علم..... میں تو عام سا آدمی ہوں۔''

وہ لوگ واقعی ضرورت مند تھے اس لیے کسی طرح ٹلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مجبور ہوکر آپ نے قریب بیٹھے ہوئے عقیدت مندوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیے۔

''کیا تم میں کوئی ایسا متمول شخص ہے جو ہمارے ان مہمانوں کی مالی ضروریات کو پورا کرسکے؟''

کسی بھی عقیدت مند نے آپ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر ایک خادم اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں ایک آتش کدہ ہے جہاں پر مجوسی بیش قیمت نذرانے اور تحائف پیش کرتے ہیں، اگر ان سے کہا جائے اور مجبور کیا جائے تو ان درویشوں کی مدد ہوسکے گی۔''

''میرے ساتھ آؤ۔ یہ مجوسی تمہاری ضرورت ضرور پوری کریں گے۔''

تمام لوگ آپ کے ساتھ اٹھے اور کافی فاصلہ طے کرکے آتش کدے تک پہنچ گئے۔ رات کا وقت تھا۔ اندھیرا تھا اور سناٹا تھا۔ آتش کدے کے باہر محافظ پہرا دے رہا تھا۔ اس نے اتنے لوگوں کو دیکھ کر للکارا۔ ''کون ہو تم لوگ؟''

''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ اندر جانا چاہتے ہیں۔''

''کیوں؟ آخر کیوں..... ہماری عبادت گاہ میں تمہارا کیا کام؟''

''ہم تمہارے آتش کدے میں بھڑکنے والی آگ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''اس وقت آتش کدہ بند ہے۔ دیکھتے نہیں، دروازے پر تالا ہے۔''

''چابی تو ہوگی تمہارے پاس۔''

''تالے کی چابی میرے پاس نہیں۔ چابی بڑے پجاری کے پاس ہے۔ کل صبح آجانا۔''

''ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ کل دوبارہ نہیں آسکتے۔''

''میں اس وقت کچھ نہیں کرسکتا۔ دروازہ چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتا۔''

''اگر ہم خود تالا کھول دیں؟''

''یہ تالا چابی کے بغیر نہیں کھل سکتا۔ یہ تو وہ تالا ہے جسے توڑا بھی نہیں جاسکتا۔''

''اللہ کے فضل سے ہم مجبور نہیں۔'' آپ نے فرمایا اور اپنی آستین کو جھٹکا دیا۔ پلک جھپکتے میں تالا کھل گیا۔ آپ نے

فرمایا۔ ''تالا ہم نے کھول دیا، دروازہ تم کھول دو۔''

محافظ تالے کو کھلتے ہوئے دیکھ کر حیرانی سے بت بنا کھڑا تھا۔ پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ آگے بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر تشریف لے گئے۔ اندر آگ بھڑک رہی تھی۔

''اب تم یہ بتاؤ، اس آگ کی حقیقت کیا ہے؟'' حضرت منصور نے محافظ سے پوچھا۔

''یہ اس آگ کا حصہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈالا گیا تھا۔''

''یہ آگ کبھی بجھتی بھی ہے یا ہمیشہ جلتی رہتی ہے؟''

''یہ اس وقت بجھے گی جب قیامت آئے گی۔''

''تمہاری کتابوں کے مطابق کون اس آگ کو بجھائے گا؟''

''ہماری کتابوں کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی بھی اس آگ کو نہیں بجھا سکتا۔''

حضرت منصور حلاج نے ایک نظر آگ کی طرف دیکھا اور اپنی آستین کو جھٹکا دیا۔ آگ فوری طور پر بجھ گئی۔ آتش کدے کے محافظ پر تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ دیوانہ وار چیخ اٹھا۔ ''قیامت آ گئی، قیامت آ گئی۔''

''کون سی قیامت ... کس قیامت کی بات کر رہے ہو؟'' حضرت منصور نے محافظ سے پوچھا۔

''ہمارے عقیدے کے مطابق مشرق و مغرب میں مجوسیوں کی آگ کو بجھا دیا جائے گا تو قیامت آ جائے گی۔''

''اپنا عقیدہ خود دیکھ لو اور اس کی حقیقت سے واقف ہو جاؤ۔ دیکھ لو ابھی قیامت نہیں آئی اور آگ بجھ گئی۔''

''یہ بھی تو کسی قیامت سے کم نہیں۔''

''یہ آگ دوبارہ کیسے روشن ہوگی، اس بارے میں تمہاری کتابوں میں کیا لکھا ہے؟''

''ہماری کتابوں میں صاف لکھا ہوا ہے کہ وہی شخص اس آگ کو دوبارہ روشن کر سکتا ہے جو اسے بجھانے کی طاقت رکھتا ہو۔''

''اگر تم بلا سکتے ہو تو اسے بلاؤ جو اس بجھی ہوئی آگ کو روشن کر دے۔''

''یہ آگ آپ ہی کے ایک اشارے سے بجھی ہے، آپ ہی اسے روشن کریں گے۔'' محافظ نے آپ کا دامن پکڑ لیا اور فریاد کرنے لگا۔

اس کی آہ و زاری دیکھ کر حضرت منصور نے فرمایا۔ ''تیرے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ان درویشوں کو پیش کی جا سکے؟''

''میں اگر دیناروں سے بھرا ہوا صندوق پیش کر دوں؟''

''تو پھر یہ آگ بھی روشن ہو جائے گی۔''

محافظ بھاگتا ہوا گیا اور دیناروں سے بھرا ہوا صندوق اٹھا کر لے آیا۔ حضرت منصور نے وہ صندوق درویشوں کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ آپس میں تقسیم کر لو۔''

حضرت منصور نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور اپنی آستین کو جھٹکا دیا۔ معبد کی آگ اسی شدت کے ساتھ دوبارہ بھڑکنے لگی۔

یہ آپ کی ایک کرامت تھی لیکن اسے نہایت غلط رنگ دیا گیا۔ کچھ ان کے نادان عقیدت مندوں نے نمک مرچ لگایا، کچھ حاسدین نے رنگ آمیزی کی اور یہ مشہور ہو گیا کہ منصور حلاج نے خود کو عیسیٰ علیہ السلام کے برابر ثابت کرنے کی کوشش کی کیونکہ محافظ کہہ چکا تھا کہ اس آگ کو عیسیٰ علیہ السلام ہی بجھا سکتے ہیں۔ منصور حلاج نے یہ جسارت کی کہ آگ بجھا کر اور پھر روشن کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ معمولی کام تو وہ بھی کر سکتے ہیں۔ سوال کرنے والوں نے پوچھا کہ انہوں نے یہ آگ کیسے بجھا دی تو جواب وہی پرانا تھا کہ منصور حلاج یہ سب کام جادو کے زور پر کرتے ہیں۔

انہیں اب تک ساحر اور شعبدہ گر کہا جا رہا تھا۔ اب ایک الزام اور شامل ہو گیا کہ نعوذ باللہ وہ عیسیٰ علیہ السلام ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

آپ اپنے حاسدوں سے ہی نہیں عقیدت مندوں سے بھی پریشان تھے۔ آپ اپنے مزاج کی گرمی سے مجبور تھے۔ کرامات کے ظہور میں وہ بے اختیار تھے۔ عقیدت مند ان کرامات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے پہنچتے بات کچھ سے کچھ ہو جاتی تھی اور مخالفین اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

حضرت منصور نے اس شورش سے گھبرا کر تستر چھوڑ دیا اور بصرہ چلے گئے۔ یہاں بھی آپ کی ریاضت اور مجاہدوں

کا وہی عالم تھا۔ یہاں کے صوفیہ نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن علمائے ظاہر بیں کا وہی فتویٰ تھا کہ حضرت منصور ساحر و شعبدہ گر ہیں۔

عقیدت مند یہاں بھی نادانی سے ان کرامتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے اور مخالفین ان داستانوں میں رنگ بھر رہے تھے۔ ان شورشوں سے تنگ آ کر انہوں نے بصرہ بھی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

تاریخ کے صفحات میں رقم ہے کہ ابوالحسن محمد بن عمر قاضی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے ماموں مجھے حسین بن منصور حلاج کے پاس لے گئے جو اس وقت بصرہ کی جامع مسجد میں عبادت میں مشغول تھے۔ میں ان دنوں کم سن تھا اس لیے دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو پر ہی اکتفا کر سکتا تھا۔ حضرت منصور نے میرے ماموں سے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ اب زیادہ دن بصرہ میں نہ ٹھہروں۔

''یہ تو ہمارے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی کہ ہم آپ کی زیارت سے محروم ہو جائیں گے۔''

''اہلِ بصرہ نے میرے بارے میں عجیب و غریب باتیں بیان کرنا شروع کر دی ہیں۔'' حضرت منصور نے فرمایا۔ ''ان باتوں کو سن کر میرا دل تنگ ہوتا ہے اور طبیعت میں بے چینی پیدا ہوتی ہے۔''

''آخر ایسی کیا بات ہو گئی؟''

''یہ لوگ بہت سی ایسی باتیں بھی مجھ سے منسوب کر دیتے ہیں جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

''آپ لوگوں کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔''

حضرت منصور نے اس مشورے پر دھیان نہ دیا اور اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ ''ابھی کل ہی کا واقعہ ہے کہ ایک امیر آدمی نے میرے پاس چند درہم اس غرض سے بھیجے کہ میں ان کو فقراء میں تقسیم کر دوں۔ اتفاق سے اس دن کوئی حاجت مند نہ آیا۔ میں نے وہ درہم اپنے مصلے کے نیچے رکھ دیے۔ اگلے دن چند فقراء میرے پاس آئے تو میں نے مصلے کے نیچے سے درہم نکال کر انہیں دے دیے۔ بعد میں یہ واقعہ یہ رنگ اختیار کر گیا کہ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ حلاج مٹی پر ہاتھ مارتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔''

ایک اسی واقعے پر منحصر نہیں، ایک واقعہ اور مشہور ہو گیا تھا اور لوگوں نے کسی تحقیق کے بغیر آنکھیں بند کر کے اس پر یقین بھی کر لیا تھا۔ یہ مشہور کر دیا تھا جن دنوں وہ عمرو بن عثمان مکیؒ کے پاس تھے کہ ایک دن بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ حضرت عثمان نے پوچھا۔ حسینؒ کیا لکھ رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا۔ ایک ایسی تحریر لکھ رہا ہوں جو قرآن کا جواب ہو۔ ظاہر ہے ایسے کلمات برسرِ عام کوئی کافر بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد حضرت منصور، حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے بیعت ہوئے تھے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو حضرت مکیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ کا عقیدہ ان پر ضرور ظاہر کرتے کیونکہ حضرت مکیؒ، جنید بغدادیؒ کے شاگرد تھے اور ان کے درمیان خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت منصور کے خلاف باقاعدہ ایک سازش تیار ہو رہی تھی۔

بہر حال حضرت منصورؒ بصرہ سے بھی نکل گئے اور تستر آ گئے۔ ان کی کرامات کی شہرت ان سے پہلے اہلِ تستر تک پہنچ گئی تھی لہٰذا جیسے ہی انہوں نے تستر میں قدم رکھا، لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ عقیدت مندوں نے ہر دروازہ چھوڑ کر حضرت منصور کا دامن پکڑ لیا۔ آپ جس راستے سے گزرتے، آپ کی زیارت کرنے والوں کی اتنی بھیڑ جمع ہو جاتی کہ راستے بند ہو جاتے۔ دنیا دار علماء کی دکانیں بند ہو گئیں۔ بہت سے صوفیہ بھی آپ سے حسد کرنے لگے۔

''میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ یہ لوگ مجھ سے کیوں حسد کرتے ہیں؟'' آپ سوال کرتے۔

''ان کی دکانیں بند ہو گئی ہیں۔'' لوگ جواب دیتے۔

''اگر میں اپنی دکان بند کر دوں؟''

(جاری ہے)

کار تیزی سے نیوجرسی سے نیویارک کی جانب جارہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں کیوں یہ وعدہ کر بیٹھا تھا کہ میں نادرہ کے گھر ضرور آؤں گا اور اگر وعدہ کر ہی بیٹھا تھا تو آج جب اس کا فون آیا تھا تب ہی مجھے اس سے کسی مصروفیت کا بہانہ کر دینا چاہیے تھا۔

''کہیں میرے دل میں اب بھی نادرہ کے لیے وہی جذبات تو نہیں ہیں جو گیارہ برس پہلے تھے؟'' میں نے خود کو ٹٹولا اور پھر فوراً ہی اپنے اس خیال کی تردید کرنی چاہی۔

''وہ اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے اس لیے مجھے اس طرح سے سوچنا بھی نہیں چاہیے۔'' میں نے پُرزور انداز میں اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا لیکن پھر فوراً ہی مجھے اپنی دلیل بے معنی سی محسوس ہوئی تھی۔

چار روز قبل جب مجھے نادرہ نیویارک میں ہی ملی تھی تب سے کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزر پایا تھا کہ اس کا خیال میرے ذہن سے ہٹا ہو، میں اس وقت لنچ کرنے ایک

زندگی کے حسین موڑ پر بچھڑ جانے والی محبتوں کی دل نگار روداد

ہر انسان اپنی قوتِ برداشت کے مطابق کوئی بوجھ سہار سکتا ہے... مگر عذاب تو قوتِ برداشت کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے اور وہ بھی ایک ایسے ہی عذاب سے گزرتے ہوئے آزمایا جارہا تھا... آزمائشیں نہ بتا کر آتی ہے اور نہ ہی رخصتی کی کوئی درخواست دیتی ہیں... مگر جب اس کے کاندھوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو لگا شاید اس کی آزمائش نے رختِ سفر باندھ لیا ہے۔

نصیب

غلام قادر

انڈین ریسٹورنٹ کی جانب جارہا تھا تب اچانک اس سے ملاقات ہوگئی۔

''رضا، کیا یہ واقعی تم ہو؟'' اس نے چیخنے والے انداز میں کہا تھا۔ ''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح تم سے ملاقات ہوجائے گی۔'' اس نے اپنا فقرہ دو حصوں میں مکمل کیا تھا۔

''میں نے تو یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ تم سے دوبارہ ملاقات ہو بھی سکتی ہے۔'' میں نے جواب میں کہا اور وہ... کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

''کہاں جارہے تھے اور کب سے یہاں ہو؟'' اس نے ایک ساتھ دو سوال کیے تھے۔

''مجھے امریکا آئے ہوئے تو ایک ماہ ہوگیا ہے لیکن ایک ہفتے سے نیوجرسی میں ہوں اور شاید دس بارہ دن اور رہوں گا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''چلو اس کونے والی بنچ پر بیٹھتے ہیں۔'' اس نے اچانک کہا اور میں اس سے یہ کہتے کہتے رک گیا کہ میں کھانے کے لیے نکلا تھا اور پارک سے اس لیے گزر رہا تھا کہ پارک کی ایک جانب میرے بھائی کا اسٹور تھا اور دوسری جانب وہ انڈین ریسٹورنٹ تھا۔

''یہ تو اچانک ملاقات ہوگئی ورنہ یہ کتنی بری بات ہوتی کہ تم امریکا آتے اور مجھ سے ملے بغیر واپس چلے جاتے۔'' اس نے بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ تمہارا پتا کس سے لیتا اور دوسری بات یہ کہ شاید میں یوں بھی نہ ملتا کہ تمہارے شوہر کیا سوچتے۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس دی۔

''وسیم ایسے نہیں ہیں۔'' اس نے پوری سنجیدگی سے کہا تھا۔

''انہیں ہر بات معلوم ہے۔'' اس نے بدستور اسی انداز میں کہا لیکن میں اس سے یہ سوال کرنے کی ہمت نہ کرسکا کہ ''وہ بات بھی جو ہم دونوں کے علاوہ کسی اور کو نہیں معلوم۔''

''تم خوش ہو نا؟'' میں نے موضوع بدلنے کی غرض سے سوال کیا۔

''کیا میں تمہیں غمزدہ دکھائی دے رہی ہوں؟'' اس نے جواب میں کہا اور پھر ہنس دی تھی۔

''تمہاری ہنسی تو یہی ظاہر کررہی ہے۔'' میں نے کہہ تو دیا لیکن مجھے فوراً ہی یہ احساس ہوا کہ میں نے غلط بات کہہ دی ہے شاید کیونکہ فوراً ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے لیکن پھر اس نے اسی تیزی کے ساتھ ان پر قابو بھی پالیا۔

''غم اور خوشی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''یہ تو ہے۔'' میں نے بھی اپنے فقرے کے تاثر کو کم کرنے کے لیے اس کی تائید کی تھی۔

''یہاں کی زندگی یوں بھی اتنی مصروف ہے کہ ان باتوں پر غور کرنے کا موقع ذرا کم کم ہی ملتا ہے۔'' اس نے کہا اور میں نے اس بار بھی اس کی تائید کی۔

''ایک ماہ سے اور خصوصاً ایک ہفتے سے میں یہی دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا تو اس کے چہرے پر سوال ابھر آئے۔

''یہ خصوصی ہفتے والی کیا بات ہے؟'' اس نے سوال کیا تو میں ہنس دیا۔

''ایک ہفتے سے بھائی کے گھر پر ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ بھابی صبح گھر سے بچوں کو لے کر نکلتی ہیں، اسکول ڈراپ کرکے جاب پر جاتی ہیں اور بھائی اپنے اسٹورز کی جانب نکل جاتا ہے۔ دوپہر کو بچوں کو اسکول سے پک کرکے انہیں گھر چھوڑتا ہے اور پھر دوبارہ کام پر نکل جاتا ہے۔ البتہ رات کا کھانا وہ سب ساتھ کھاتے ہیں۔'' میں نے تفصیل بتائی تو وہ بھی مسکرانے لگی۔

''ہماری زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہے لیکن فی الحال تم اپنی سناؤ۔'' اس نے اچانک گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے سوال کیا۔

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا تھا۔

''پھر..... بھی.....'' اس نے اصرار کیا۔

''جیل سے آنے کے بعد میں دبئی چلا گیا تھا۔'' میں نے زندگی کے اس حصے کو نظرانداز کردیا تھا جہاں مجھے اس سے شکایت تھی۔

''پھر جس کمپنی میں تھا اس نے مجھے جدہ بھیج دیا۔ چار سال جدہ میں رہنے کے بعد دبئی آیا اور سال بھر پہلے مستقل طور پر پاکستان شفٹ ہوگیا۔'' میں نے مختصراً اپنی روداد سنا دی تھی۔

''شادی کرلی؟'' اس نے دلچسپی لینے والے انداز میں کہا۔

''چار برس پہلے کی تھی لیکن ساتھ زیادہ چل نہ سکا۔'' میں نے ایک بار پھر تفصیل میں جانے سے گریز کیا تھا۔

''کوئی خاص بات؟'' اس نے ایک اور سوال کردیا۔

''ایک بات تو یہ کہ وہ امیر باپ کی بیٹی ہے اور شاید ہم دونوں کے مزاج میں بھی بہت فرق ہے۔'' میں نے

اصل وجہ اختلاف کو چھپاتے ہوئے اسے اور شاید خود کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

''تو کیا طلاق ہوگئی؟'' اس نے پھر کریدنے کی کوشش کی۔

''فی الحال تو نہیں ہوئی لیکن حالات اسی جانب جارہے ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا تو اس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

''امریکا کس سلسلے میں آنا ہوا؟'' اس نے موضوع تبدیل کیا تو میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔

''امریکی حکومت کی دعوت پر پاکستانی تاجروں کا ایک گروپ یہاں آیا تھا جس میں میری بھی رسائی ہوگئی اور میں یوں بھی آنا چاہتا تھا کہ دونوں بھائی اور والدہ یہیں ہیں۔'' میں نے آدھا سچ کہہ دیا اور یہ چھپا لیا کہ آٹھ ماہ قبل اس وفد میں شمولیت میں میرے سسر کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

''گھر کب آرہے ہو؟'' اس نے اچانک اس طرح سے سوال کیا کہ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم وسیم سے اور میری بچی سے ملو۔'' اس نے اصرار کیا۔

''لیکن نادرہ.....'' میں نے انکار کی وجہ سمجھانی چاہی مگر وہ ہنس دی۔

''میں نے کہا نا کہ وسیم ایسے نہیں ہیں۔'' اس نے اپنی بات دہرائی۔

''تمہارے لیے بعد میں مسائل نہ ہوں۔'' میں نے اپنی بات کہہ دی۔

''میری انکم وسیم سے ڈھائی گنا زیادہ ہے اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' اس نے ایک فقرے میں سب کچھ کہہ دیا۔

''اب میں چلتی ہوں۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''تم اتوار کو ہمارے گھر آرہے ہو۔'' اس نے زور دینے والے انداز میں کہا تھا۔ ''میرا آف اتوار اور پیر کو ہوتا ہے اور وسیم کی چھٹی ہفتہ اور اتوار کی ہوتی ہے۔'' اس نے یہ کہا اور اپنا پرس کھول کر اسے چیک کرنا شروع کیا اور پھر بولی۔ ''میرا کارڈ اس وقت نہیں ہے تم ایسا کرو کہ میرا موبائل نمبر لکھ لو اور اپنا دے دو ویسے بھی اتوار کو فون کر کے تمہیں یاد بھی دلوا دوں گی۔'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے بہت جلدی میں ہو۔

اس نے جو نمبر بتایا تھا وہ میں نے اپنے موبائل پر اس کے نام کے ساتھ نوٹ کیا تو وہ جانے کی تیاری میں تھی۔

''میں کچھ دیر مزید رکتی لیکن نتاشا کو اسکول سے پک کرنا ہے۔'' اس نے یہ کہا اور میرا جواب سنے بغیر ایک جانب بڑھتی چلی گئی اور میں اپنی جگہ سن بیٹھا رہ گیا۔

اس نے اپنی بیٹی کا نام لیا تھا لیکن وہ نام میرے ذہن پر ایک بم کی طرح گرا تھا۔ وہ ایک نام ایک داستان کا عنوان تھا۔ ایسی داستان جس کا علم میرے اور نادرہ کے علاوہ اور کسی کو نہ تھا۔

وہ چلی گئی تھی لیکن میں ایک سکتے کے عالم میں اپنی جگہ بیٹھا رہا تھا۔ ذہن ماؤف ہو چکا تھا صرف ایک نام تھا جو گونج رہا تھا۔

نادرہ سے میری ملاقات میری ایک کزن کے ذریعے ہوئی تھی۔ انہوں نے فون کر کے مجھے اپنے گھر بلوایا اور وہیں نادرہ اور اس کی والدہ سے میرا تعارف ہوا تھا۔

''رضا، یہ آصف کی چچی ہیں اور یہ ان کی بیٹی ہیں نادرہ۔'' شائستہ باجی نے اپنے سسرالی رشتے داروں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے ادب کے ساتھ سلام کیا جس کے جواب میں مجھے روایتی قسم کی دعائیں ملیں۔

''رضا یہ فیملی سمیت دو ماہ قبل ہی پنڈی سے شفٹ ہوئے ہیں اور نادرہ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتی ہیں۔'' شائستہ باجی نے بات آگے بڑھائی۔

میرا دل چاہا کہ میں کہہ دوں۔ ''یونیورسٹی میں داخلے کا اختیار وائس چانسلر کے پاس ہے اور میں وائس چانسلر نہیں ہوں۔'' لیکن معاملہ چونکہ شائستہ باجی کی سسرال کا تھا اور یوں بھی وہ پہلی ملاقات تھی اس لیے بھی میں مؤدب رہا۔

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' میں نے مہذب انداز میں سوال کیا۔

سوال میں نے نادرہ کی امی سے کیا تھا لیکن جواب کے لیے ان کی نظریں بیٹی کی جانب اٹھ گئی تھیں۔

''میں انٹرنیشنل ریلیشن پڑھنا چاہتی ہوں لیکن میرے بابا جان کا کہنا ہے کہ مجھے صرف اور صرف اکنامکس پڑھنی چاہیے۔'' اس نے کہا لیکن میں تو اس کے پہلے دو لفظوں کے ساتھ ہی اس کی آواز میں کھو گیا تھا۔

پہلی نظر میں وہ بالکل ایک عام سی لڑکی لگی سانولی سی لیکن قدرے کھلتا ہوا رنگ، بہت دبلی۔ چہرے پر سب سے زیادہ جو نمایاں تھیں وہ اس کی آنکھیں تھیں لیکن جب اس نے بولنا شروع کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں ہر

طرف جلترنگ بج رہے ہوں۔

''آپ کے بابا اپنے تجربے کی بنیاد پر شاید صحیح کہہ رہے ہوں لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ انسان کو وہی کچھ کرنا چاہیے جس میں اسے... سکون ملتا ہو لیکن فی الحال تو آپ کے پاس تین برس ہیں ماسٹرز کرتے ہوئے آپ یہ فیصلہ کر لیجیے گا۔'' میں نے کہا تو وہ یکدم شرما گئی جبکہ اس کی والدہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور شائستہ باجی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

''تم کیا سمجھ رہے ہو؟'' شائستہ باجی نے مجھ سے سوال کیا اور میں، جو ان کے قہقہے سے پہلے ہی بوکھلا گیا تھا مزید بوکھلا گیا۔

''نادرہ وہاں سے بی اے کر کے آئی ہے اور اب اسے ایم اے میں ایڈمیشن لینا ہے۔'' شائستہ باجی نے وضاحت کی اور میری نظریں نادرہ کی جانب اٹھیں تو اس نے نظریں ملتے ہی نظریں جھکا لیں۔

''اب کچھ کہو گے بھی یا یونہی خاموش رہو گے؟'' شائستہ باجی نے مجھے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں؟'' میں نے نادرہ کی جانب نظریں اٹھائے بغیر کہا تھا۔

''تم اکنامکس میں ایم اے کر رہے ہو اس لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔'' شائستہ باجی نے وضاحت کی۔

''میں نے اکنامکس کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ اکنامکس میں میرا انٹرسٹ تھا۔'' میں نے جواب میں کہا تو نادرہ نے ماں کی جانب دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ دیکھیں یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

''نادرہ کے ابو فوج میں ہیں اور فوج ان کے مزاج میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ان کا خیال ہے... گھر پر بھی سب کو ان کا حکم ماننا چاہیے۔'' نادرہ کی امی نے وضاحت کی۔

''معاف کیجیے گا پھر تو یہ بحث ہی فضول ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''تاہم میں اتنی مدد کا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ اکنامکس میں انہیں جو بھی مشکل آئے گی میں اس میں ان کی مدد کے لیے حاضر ہوں۔'' میں نے اس بار بھی نادرہ کی امی کو مخاطب کیا تھا۔

''بی اے میں میرے پاس اکنامکس تھا اور میرے مارکس بھی بہت اچھے ہیں اکنامکس میں لیکن میرا انٹرسٹ آئی۔آر ہے۔'' نادرہ نے لب کھولے تو ایک بار پھر میرے آس پاس جلترنگ سے بجنے لگے۔

''میرے والد چاہتے تھے کہ میں جرنلزم پڑھ کر ان کے نقش قدم پر چلوں لیکن وہ چونکہ فوج میں نہیں تھے اس لیے میں نے اکنامکس پڑھ لی لیکن ان کی خواہش اس طرح پوری کر رہا ہوں کہ مضامین اور افسانے لکھ لیتا ہوں۔'' میں نے اس بار براہ راست اسے مخاطب کیا تھا۔

''آپ یہ کہہ رہے ہیں چونکہ میرے والد فوج میں ہیں اس لیے آپ کے برعکس مجھے پڑھنا تو اکنامکس چاہیے لیکن آئی آر میں اپنی دلچسپی کے لیے مطالعہ کرنا چاہیے؟'' اس نے میری وضاحت کے بغیر بات سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

''آپ کے ساتھ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ آپ لڑکی ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''میں سمجھی نہیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''آپ میری طرح کچھ دنوں کے لیے گھر چھوڑ کر ہاسٹل شفٹ نہیں ہو سکتیں۔'' میں نے وضاحت کی تو نادرہ نے بغیر کچھ کہے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں۔''

اس کے بعد میں کچھ دیر مزید وہاں رکا اور پھر اس وعدے کے ساتھ کہ دو روز بعد جب نادرہ یونیورسٹی آئے گی تو میں بھی وہاں موجود رہوں گا، میں وہاں سے چلا آیا لیکن اس رات دیر تک میرے کانوں میں اس کی آواز گونجتی رہی۔ جب تک نیند کی دیوی مکمل طور پر مجھ پر حاوی نہیں ہو گئی میں یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ یہ 48 گھنٹے مجھ سے کس طرح گزیں گے لیکن پھر کسی نہ کسی طرح دو دن کٹ ہی گئے۔

اس روز میں سویرے ہی جامعہ پہنچ کر اس مقام پر انتظار کر رہا تھا جہاں میں نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے بھی آنے میں دیر نہیں کی، میری توقع کے برخلاف وہ اکیلی ہی آئی تھی۔

''بابا نے کہا تھا کہ مجھے چونکہ اب یونیورسٹی اکیلے ہی جانا ہوگا اس لیے بہتر ہے کہ میں پہلے دن سے ہی اکیلے جاؤں۔'' میرے استفسار پر اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اس روز اس کا کام آدھے گھنٹے سے بھی کم مدت میں ہو گیا تھا اور تب میں نے اس سے کہا تھا۔

''اب چونکہ آپ کو یونیورسٹی کی کینٹین میں بھی کھانا ہوگا اس لیے بہتر ہے کہ پہلے دن سے ہی یہ کام شروع کر دیں۔'' میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ ہنسی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کئی ہزار گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' میں محویت کے عالم میں تھا کہ اس کے سوال نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔

''کچھ نہیں.....'' میں نے بوکھلا کر کہا تھا۔ ''دراصل

آپ کی ہنسی.....'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
''آپ مجھ سے فلرٹ کی ابتدا کر رہے ہیں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔
''خدا کی قسم نہیں۔'' میں نے جواب میں کہا لیکن اس کی نظریں اس کے باوجود مجھ پر جمی رہیں۔
''وہ دراصل آپ کی آواز مجھے بہت اچھی لگی تھی اور اس سے اچھی ہنسی میں نے آج تک نہیں سنی تھی اس لیے شاید گستاخی ہوگئی۔'' میں نے جواب میں کہا تو اس کے چہرے پر اطمینان سا آگیا۔
''وہاں پنڈی میں بابا کے ایک دوست ریڈیو کے ریجنل منیجر تھے انہوں نے بھی مجھے ریڈیو کے لیے آفر کی تھی لیکن بابا نے سختی سے انکار کر دیا۔'' اس نے کہا تو میں سوچنے لگا کہ اس کا باپ کس طرح کا آدمی ہے۔
''لو جی ہم آپ کے پتے کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔'' ڈرائیور نے مجھ سے کہا تو میں چونک کر ماضی سے نکل کر حال میں پہنچ گیا۔
''رضوان مجھ سے ایک غلطی ہوگئی؟'' میں نے کہا۔
''کیسی غلطی جناب.....؟'' اس نے سوال کیا۔
''میں پہلی بار ان کے گھر جا رہا ہوں مجھے اس طرح خالی ہاتھ ان کے گھر نہیں جانا چاہیے.....'' میں نے کہا۔
''شاید آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔'' ڈرائیور نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''لیکن اب تو ہم یہاں پہنچ ہی گئے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں خاموش ہوگیا۔
''کچھ اور نہیں تو مجھے نتاشا کے لیے چاکلیٹ کا پیکٹ ہی لے لینا چاہیے تھا۔'' میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن نتاشا کے نام کی جانب گھوم گیا۔
نادرہ نے یہ نام ہماری بچی کے لیے تجویز کیا تھا۔ ''جب یہ نام لیتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے منہ میں کسی نے بتاشا گھول دیا ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
''یہ مکان ہے لیکن یہ تو شاید بند ہے۔'' ڈرائیور نے ایک بار پھر مجھے مخاطب کیا تھا۔
وہ چھوٹا سا ایک خوبصورت گھر تھا لیکن گھر کا بیرونی گیٹ بند تھا اور کار بھی نظر نہیں آرہی تھی۔
''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے سوچا تھا۔
''نادرہ نے دوپہر خود مجھے فون پر تاکید کی تھی۔'' میں یہ سوچتے ہوئے کار سے اتر آیا.... ایڈریس وہی تھا اور مکان پر وسیم احمد کی نیم پلیٹ بھی موجود تھی۔ میں نے نادرہ کو فون کرنا چاہا لیکن اس سے قبل کہ میں اسے فون کرتا برابر کے مکان سے ایک شخص باہر آیا اور مجھے وہاں دیکھ کر میری جانب ہی بڑھا۔
''میں موہن داس ہوں۔'' اس نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا.....'' آپ شاید وسیم صاحب سے ملنے آئے ہیں۔'' اس نے اپنا تعارف کروانے کے ساتھ میری پریشانی بھی بھانپ لی تھی۔
''جی.....'' میں نے مختصراً جواب دیا لیکن ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا جواب بہت ہی مختصر ہے۔ ''میں علی رضا ہوں اور پاکستان سے آیا ہوں۔'' میں نے اپنے تعارف میں مزید کہا تھا۔
''دراصل ہر اتوار کو وسیم صاحب اس وقت قبرستان جاتے ہیں لیکن ابھی کچھ دیر میں وہ آتے ہی ہوں گے۔'' موہن داس نے کہا تو میں سوچنے لگا کہ قبرستان کیوں جاتے ہیں لیکن میں یہ سوال کر نہ سکا۔
''جب تک وسیم صاحب تشریف لاتے ہیں آپ کچھ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔'' اس نے ستھری اردو میں کہا۔
''میں ضرور ایسا کرتا لیکن یہاں آتے ہوئے مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے اور میں چاہوں گا کہ اب موقع ملا ہے تو اس غلطی کی تلافی کر دوں۔'' میں نے کہا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔
''دراصل ایک ماہ ہوگیا ہے مجھے امریکا میں اور شاید اسی کا اثر ہے کہ میں اپنی روایات سے کچھ دور ہوگیا ہوں۔'' میں نے اس کی حیرت میں مزید اضافہ کیا تھا۔ اگرچہ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن اس کے چہرے پر موجود حیرت بہت کچھ بتا رہی تھی۔
''ہماری اور آپ کی مشترکہ روایت کہ ہم کم از کم پہلی بار کسی کے گھر خالی ہاتھ نہیں جاتے لیکن نہ جانے میں کن خیالوں میں گم تھا کہ مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہا۔'' میں نے جونہی اپنی بات مکمل کی اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آگئی۔
''یہ تو آپ نے بالکل صحیح کہا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اور کچھ نہیں تو کم از کم نتاشا کے لیے چاکلیٹ کا پیکٹ ہی لے آتا۔'' میں نے کہا۔ وہ شخص نہ جانے کیوں مجھے اچھا لگا تھا۔
''یہ تو شاید بہت ہی اچھا ہوا کہ آپ چاکلیٹ نہیں لائے۔'' موہن داس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔
''آپ لاتے تو شاید وہ انہیں چکھ بھی نہیں سکتی۔'' اس کی

مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی تھی اور اب شاید میرے چہرے پر حیرت کے آثار آگئے تھے۔

''وہ کینڈیز کی دیوانی ہے لیکن اسے چاکلیٹ سے الرجی ہے۔'' موہن داس نے کہا تو میرے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا۔

''چاکلیٹ سے تو میں بھی الرجک ہوں۔'' میں نے سوچا لیکن مجھ سے کہا نہیں گیا۔

''میں آپ کے ڈرائیور کو کچھ دور ایک کینڈی اسٹور کا پتا بتا دیتا ہوں آپ وہاں سے خریداری کر سکتے ہیں۔ وہ اسٹور یوں بھی نتاشا کا فیورٹ اسٹور ہے۔'' موہن داس نے کہا تو میں سوچ میں گم اس کے ساتھ کار کی جانب بڑھ گیا۔

جتنی دیر موہن داس پتا سمجھاتا رہا میں گم صم رہا اور جیسے ہی رضوان نے پتا سمجھا ہم روانہ ہوگئے۔ موہن داس نے رخصت کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا۔ ''وسیم صاحب کے ساتھ آپ ہمارے بھی مہمان ہوں گے۔''

''نادرہ بھی تو چاکلیٹ کی دیوانی تھی۔'' میں نے سوچا اور میرا ایک بار پھر ماضی کا سفر شروع ہوگیا۔

یونیورسٹی میں اس کے ایڈمیشن کے بعد ہم روز ہی ملتے تھے۔ مجھے اس کے ساتھ ملنے، اس سے بات کرنے، اس کے ساتھ مسائل شیئر کرنے میں مزہ آتا تھا اور اس کی بھی یہی کیفیت تھی لیکن پہلی بار اس کا اظہار اس نے اس وقت کیا جب مجھے ایم بی اے میں داخلہ مل گیا اور بینک کی نوکری بھی میری منتظر تھی۔ تمام گھر والوں کا خیال تھا کہ مجھے ایم بی اے میں داخلے کا یہ چانس نہیں کھونا چاہیے۔

''میں چاہتی ہوں رضا کہ آپ بینک کی نوکری کا چانس ضائع نہ کریں۔'' میں نے نادرہ کے ساتھ وہ پرابلم شیئر کیا تو اس نے کہا تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے اس حد تک بور ہو چکی ہو اور تم چاہتی ہو کہ میں نوکری پر چلا جاؤں تاکہ تمہارا مجھ سے پیچھا چھوٹ جائے۔'' میں نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا لیکن اس نے مجھے عجیب سا کی نظروں سے دیکھا۔

''میں یہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میرے گھر والے ایسے شخص سے میرا رشتہ کریں گے جو نوکری کرتا ہو اور میرا خرچ اٹھا سکے۔'' اس نے روانی میں کہا تو میں جیسے آسمانوں میں پرواز کرنے لگا تھا۔

ہم روز ملتے تھے اور ہر موضوع پر ہمارے درمیان بات ہوتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم ایک دوسرے کے جذبات سے واقف بھی تھے لیکن اس طرح کھل کر ہمارے درمیان کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

''یہ بات ہے تو میں کل صبح ہی نوکری جوائن کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا تو اس نے کچھ کہے بغیر شرما کر گردن نیچے کر لی لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔

''ایم۔بی۔اے تو آپ ایوننگ میں بھی جوائن کر سکتے ہیں۔'' اس نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ کہا تھا۔

''خود سے دور کرنے کی تم نے کتنی مکمل منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس دی تھی۔

''ایوننگ کلاسز تین روز ہوتی ہیں اس لیے چار دن آپ فارغ ہوں گے اور ایک بات یہ بھی کہ بابا کا ٹرانسفر ہوگیا ہے اور اگلے ماہ کی یکم سے میں ہاسٹل شفٹ ہو رہی ہوں۔'' اس نے ہنسی روک کر کہا تو میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ارادی طور پر اسے چھوا تھا ورنہ اس سے پہلے ہم دونوں کے درمیان ایک فاصلہ رہتا تھا۔

''رضا پلیز.....'' کچھ دیر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہنے کے بعد اس نے کہا تو میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

اس نے بھی اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں نادرہ۔'' میں نے کہا تو اس نے کچھ کہے بغیر اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا، اس کی آنکھوں میں موجود سوال بہت واضح طور پر پڑھا جا سکتا تھا لیکن میں نے فوراً ہی جواب دینے سے گریز کیا۔

''میں شاید کبھی اتنی ہمت جمع نہ کر سکتا کہ تم سے اظہار کرتا۔'' میں نے اس کی نظروں میں موجود اس کے سوال کا جواب دیا تو اس کی نظریں ایک بار پھر جھک گئیں۔

''لفظوں میں تو شاید نہیں مگر اظہار تو آپ نے پہلے روز ہی کر دیا تھا۔'' اس نے جھکی نظروں کے ساتھ کہا تھا۔

''کب.....؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''جس طرح آپ نے آواز کی تعریف کی تھی، وہ کیا تھا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب میں کہا تو میں ہنس دیا۔

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ شیخ سعدی غلط کہہ گئے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر کچھ کہے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔

''وہ کیا کہہ گئے ہیں؟'' مجھے خاموش دیکھ کر اس نے سوال کر دیا۔

''شیخ سعدی کہہ گئے ہیں کہ عشق اول دل معشوق پیدا می شود'' یعنی عشق پہلے عاشق کے نہیں بلکہ معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔'' میں نے وضاحت کی تو وہ ہنس دی تھی۔

''غلط وہ بھی نہیں ہیں۔'' اس نے کہا تو میں اس کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگا۔

''وہ پہلا دن جس روز آپ شائستہ باجی کے یہاں ملے تھے آپ اسی روز مجھے اچھے لگے تھے۔'' اس نے کہا تو میں ہنس دیا۔

''سر! یہ اسٹور آ گیا۔'' ڈرائیور ایک بار پھر مجھے ماضی سے حال میں کھینچ لایا اور میں بغیر کچھ کہے کار سے اتر آیا۔

وہ کینڈی کا ایک بڑا اسٹور تھا اور اس میں داخل ہونے سے پہلے تک میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو پیکٹ خریدوں گا لیکن پھر مجھے نہ جانے کیا ہوا کہ میں چیزیں خریدتا چلا گیا۔

آٹھ مختلف طرح کی کینڈیز کے پیکٹ اٹھا کر میں واپس آیا تو ڈرائیور بھی مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں بلکہ میرے ہاتھوں سے وہ پیکٹ لے کر اس نے پچھلی سیٹ پر رکھ دیے۔

کینڈی اسٹور سے واپسی کا سفر شروع ہوا تو ایک نامعلوم سی وحشت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ ایک ایسی وحشت جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ میں ڈرائیور سے کہہ دوں کہ سب کچھ چھوڑ کر واپس گھر کی جانب چل دو لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ کار واپسی کے سفر پر گامزن تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ مناسب یہی ہوگا کہ میں نادرہ کے اصرار کے باوجود وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔

''تم سے وعدہ کر لیا تھا اس لیے آ گیا ہوں..... اور اگر تم قبرستان نہ گئے ہوتے تو ہمیں کچھ وقت مزید مل جاتا لیکن ایک سسرالی عزیز کے گھر جانا بہت ضروری ہے اس لیے میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گا۔'' میں نے دل ہی دل میں اسکرپٹ بھی ترتیب دینا شروع کر دیا تھا جو مجھے جاتے ہی کہنا تھا۔

''نادرہ لاکھ کہے کہ وسیم بہت لبرل ہیں لیکن امریکا میں رہنے کے باوجود اب بھی یقیناً ایک ایشیائی مرد اس کے اندر زندہ ہوگا جو اپنی بیوی کے پرانے عاشق کو برداشت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوگا۔'' میں نے سوچا۔

''میرے بارے میں بھی لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ میں بہت لبرل ہوں لیکن نینا کے بارے میں حقائق جاننے کے بعد میں اپنا تمام لبرل ازم بھول چکا تھا۔'' ذہن کے کسی باغی گوشے نے سرگوشی کی۔

''میرا اور نینا کا معاملہ مختلف ہے۔'' باغی گوشے کی سرگوشی کو میں نے سختی سے دبانا چاہا لیکن پوری طرح اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

''نادرہ اور نینا ایک ہی طرح کے حالات سے گزری تھیں۔'' باغی گوشے نے ایک اور سرگوشی کی۔

''نینا کا جرم بہت بڑا ہے۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔

''صرف نینا ہی نہیں اس کے گھرانے کا ایک ایک فرد اس جرم میں شریک ہے۔'' نینا کا تقابل نادرہ سے ہو، مجھے یہ منظور نہیں تھا اور اسی لیے میں نے ڈرائیور کو مخاطب کیا تھا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

''میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔'' میں نے کہا تو ڈرائیور صرف سر ہلا کر رہ گیا لیکن ساتھ ہی اس نے مجھے دیکھا ضرور تھا جیسے وہ یہ کہنا چاہ رہا ہو کہ آپ کم عرصہ وہاں رکیں یا زیادہ دیر گزاریں میرا اس سے کیا تعلق؟

وہ بے چارہ کیا جانتا تھا کہ میں نے اسے مخاطب صرف اس لیے کیا تھا کہ اپنے اندر کی جنگ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس بغاوت کو کچلنا چاہ رہا تھا جو میرے اندر سر اٹھا رہی تھی۔

نادرہ نے جب مجھ سے شادی کے بارے میں سوال کیا تھا تو میں نے اسے بڑی خوب صورتی سے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ امیر ماں باپ کی بیٹی ہے اور ہم دونوں کے مزاج بھی نہیں ملتے ..... نیتا بے شک امیر ماں باپ کی بیٹی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جب تک مجھے اس سچ کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی تنازعہ نہیں ہوا تھا۔ میں جو کچھ کہتا تھا نیتا اس پر حرف بہ حرف عمل کرتی تھی، میرے کچھ کہے بغیر اس نے میری ہر پسند کا خیال رکھا تھا۔

شادی سے پہلے وہ کچن کا رخ بھی نہیں کرتی تھی لیکن شادی کے بعد روایتی کھانوں میں میری دلچسپی محسوس کرتے ہوئے اس نے بہت تیزی سے کھانوں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ صرف نیتا ہی نہیں اس کی فیملی نے بھی مجھے سہارا دینے میں کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد جب دبئی کے حالات خراب ہونے لگے تو اس کے والد ایک روز اچانک دبئی پہنچ گئے تھے۔

''کراچی میں ایک گارمنٹس فیکٹری فروخت ہو رہی ہے۔'' انہوں نے مجھے تنہائی میں بلا کر کہا تھا۔ ''فیکٹری کے جو مالک ہیں وہ میرے پرانے جاننے والے ہیں۔'' وہ کہتے رہے اور میں حیران تھا کہ وہ یہ بات مجھ سے کیوں کر رہے ہیں۔

''معاملہ کچھ یوں ہے کہ جو قیمت وہ مانگ رہے ہیں وہ قیمت انہیں مل نہیں رہی جبکہ میرا خیال ہے کہ وہ رقم زیادہ نہیں مانگ رہے ہیں۔'' انہوں نے کہا تو میں وہ سوال کر بیٹھا جو میرے ذہن میں تھا۔

''لیکن انکل آپ یہ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟'' میں نے سوال کیا تو وہ مسکرا دیے۔

''اگر تم مجھے میری بات مکمل کرنے دیتے تو یہ سوال کرنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔'' انہوں نے جواب میں کہا تھا۔ ''عبدالکریم یعنی میرا وہ دوست جس کی وہ فیکٹری ہے..... اس کی دو بیٹیاں تھیں جن کی وہ شادی کر چکا ہے اور دونوں ہی امریکا میں سیٹل ہیں۔'' انہوں نے نئے سرے سے اپنی بات شروع کی۔

''پانچ ماہ قبل اسے شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا جس کے بعد اس کی بیٹیاں اسے علاج کے لیے امریکا لے گئی تھیں جہاں سے وہ کچھ دن قبل واپس آیا ہے اور اب وہ بھی مستقل طور پر امریکا جانا چاہتا ہے۔'' انہوں نے کہا تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس تمام گفتگو میں میرا سوال اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا لیکن میں نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا تھا۔

''دبئی کے حالات تمہارے سامنے ہیں اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اس فیکٹری کو خرید لو اور پاکستان واپس آ جاؤ۔'' انہوں نے اپنا مقصد بتایا تو میں ہنس دیا۔

''پہلی بات تو یہ ہے انکل کہ میرے پاس کچھ بچت ہے لیکن یہ اتنی نہیں ہے کہ میں فیکٹری کے خواب دیکھنے لگوں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہنا شروع کیا۔

''اور دوسری بات یہ کہ مجھے اس کاروبار کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری دوسری بات کا جواب تو یہ ہے کہ پانچ ماہ جب عبدالکریم کی غیر موجودگی میں فیکٹری چل سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اسٹاف قابلِ اعتماد ہے اور تمہیں کچھ زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی اور یوں بھی اس کا ٹوٹل بزنس ایکسپورٹ بزنس ہے۔'' ان کا جواب بہت واضح تھا۔ ''اب رہ گئی پہلی بات..... اس کے دو تین راستے ہیں۔'' انہوں نے کہا تو اپنی گفتگو میں ایک مختصر سا وقفہ دے دیا۔

''اس میں ایک راستہ یہ ہوگا کہ آپ اس فیکٹری کی قیمت دے دیں۔'' میں نے کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

''یہ راستہ بھی تھا اور اگر میں ایسا کرتا تو شاید غلط نہ ہوتا کیونکہ جتنا حق میرے دونوں بیٹوں کا مجھ پر ہے اتنا ہی حق میری اکلوتی بیٹی کا بھی ہے لیکن تمہارے مزاج کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے یہ سوچا بھی نہیں ہے۔'' انہوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''شکریہ.....'' میں نے مختصراً انہیں جواب دیا۔

''میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ کہنے کی بھی اجازت دو کہ والدین کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں وہ ضرور کریں۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''اگر ایسا کبھی موقع آیا تو میں سب سے پہلے آپ ہی کی طرف آؤں گا۔'' میں نے اپنے لہجے کو نرم ہی رکھا۔

''میں اس بات کو دہرانا نہیں چاہتا لیکن جب تمہاری شائستہ باجی نے تمہارے رشتے کی بات کی تھی اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ تم جہیز میں کوئی شے قبول نہیں کرو گے تب ہی میں نے جان لیا تھا کہ میں کبھی تمہارے اصولوں کے سامنے نہیں آؤں گا۔'' انہوں نے کہا تو میں مسکرا دیا۔

''لیکن آج مجھے صورت حال مختلف نظر آ رہی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے ہی کہا تو وہ بھی مسکرا دیے تھے۔

''ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا.... ''عبدالکریم کو رقم تم قسطوں میں ادا کرو گے یعنی جو کچھ تم فیکٹری سے کماؤ گے، اس کا ایک بڑا حصہ تم اسے ادا کرتے رہو گے۔'' انہوں نے جواب میں کہا۔ ''اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ عبدالکریم کے داماد جو کینیڈا اور امریکا میں عبدالکریم کا سامان منگواتے ہیں کم از کم اس وقت تک تمہارے ہاتھ میں رہیں گے۔'' انہوں نے کہا تو پہلی بار میں کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔

''میں نینا سے مشورہ کرنے کے بعد ہی آپ کو جواب دے سکوں گا۔'' میں نے کہا تو ان کے چہرے پر کسی قدر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔

''میں نے تو جب اس سے بات کرنی چاہی تھی تب اس نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔'' انہوں نے اس انداز میں کہا تھا کہ جس میں خوشی بھی تھی اور فخر بھی تھا۔

میں جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا یقیناً نینا نے شادی کے پہلے دن سے ہر کام میری مرضی سے، مجھ سے اجازت لے کر کیا تھا۔ شادی پر میری جانب سے جہیز سے انکار پر اس کے والدین نے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کے نام پر وہ اکاؤنٹ کھلوا دیں گے اور جو رقم وہ جہیز پر خرچ کرتے، وہ اس اکاؤنٹ میں ڈال دیں گے۔ اس کے علاوہ وہ ہر ماہ وہ رقم بھی جمع کروائیں گے جو وہ نینا کو پاکٹ منی دیا کرتے تھے اور میں نے یہ کہہ کر اس سے پیچھا چھڑوا لیا تھا کہ یہ باپ اور بیٹی کا معاملہ ہے اور میرا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ لیکن پہلی رات میں ہی نینا نے اس اکاؤنٹ کی چیک بک یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کر دی تھی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ کبھی میرے دل میں یہ خیال بھی آئے کہ میں آپ کے علاوہ کسی کی دی ہوئی رقم میں سے کچھ خرچ کروں۔''

''صاحب جی، ہم پہنچ گئے ہیں۔'' ڈرائیور نے ایک بار پھر مجھے متوجہ کیا تو میں چونک گیا۔

کار اس مکان کے باہر پہنچ گئی تھی جہاں سے ہم کچھ دیر پہلے روانہ ہوئے تھے لیکن صورتِ حال میں یہ تبدیلی تھی

میری بچی کی یہ انگوٹھی پہلے والیوں سے شاندار ہے!

کہ مکان کے باہر ایک کار موجود تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک شخص موجود تھا جس کی نظریں ہماری کار کی سمت ہی تھیں۔

''یہی وسیم ہے شاید۔'' میں نے سوچا اور کار سے اتر آیا۔ وہ شخص بھی میری جانب بڑھا لیکن اس کے چہرے پر موجود تاثرات دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ صورتِ حال کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔

''نادرہ نے اس شخص کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔'' اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر میں نے سوچا۔

میں ہر طرح کی سچویشن کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا لیکن قریب آ کر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ''میں وسیم ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروانے والے انداز میں کہا۔

''میں رضا ہوں۔'' میں نے جوابی تعارف کروایا تو اس کے چہرے پر سختی کچھ اور نمایاں ہو گئی۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ بہ ظاہر اس کا لہجہ سخت نہیں تھا لیکن مجھے اس میں ایک سختی سی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سختی جو کسی سے نفرت کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے اگلے ہی فقرے نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔

''نادرہ کے پاس آپ کی تصویریں تھیں اور ویسے بھی موہن نے مجھے بتا دیا تھا۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہی تھا کہ اگلے ہی لمحے اس نے ڈرائیور کو مخاطب کیا جو کینڈیز کے پیکٹ کار سے نکال کر لایا تھا۔ ''فی الحال انہیں کار میں ہی رکھو۔''

اس کا انداز حاکمانہ تھا لیکن اس کے باوجود میں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ وہ واپس چلا جائے اور وہ بغیر کچھ کہے پلٹ بھی گیا لیکن جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جتنے سوال تھے ان میں سے ایک کا جواب بھی میرے پاس نہیں تھا۔

''موہن نے مجھے آپ کی آمد کے بارے میں بتایا تو مجھے حیرت ہوئی لیکن بہت اچھا ہوا کہ آج کے دن ہی آپ آئے ہیں۔'' وسیم نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

''تو کیا آپ کو.....'' میں کہنا چاہ رہا تھا کہ کیا نادرہ نے آپ کو میری آمد کے بارے میں نہیں بتایا لیکن وسیم نے درمیان میں سے ہی میرا فقرہ اچک لیا۔

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اندر چل کر بات کریں۔'' وسیم نے کہا اور میرا جواب سنے بغیر گھر کی جانب چل پڑا لہٰذا میں اس کے پیچھے چل دیا۔

''تشریف رکھیں۔'' اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ.....'' کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

وسیم کا برتاؤ اور نادرہ کی وہاں غیر موجودگی میرے لیے ایک بہت ہی حیرت انگیز بات تھی، اتنی زیادہ حیرت انگیز کہ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''آپ کچھ لینا پسند کریں گے؟'' اس نے الماری سے ایک بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

''صرف پانی.....'' میں نے جواب میں کہا۔

''جی بہتر.....'' اس کے لہجے میں کسی حد تک نرمی آ گئی تھی شاید وہ بھی ابتدائی ہیجان سے باہر نکل رہا تھا۔

ایک بوتل اور گلاس لے کر وہ کچھ ہی دیر میں دوبارہ نمودار ہوا اور پھر میرے سامنے وہ دونوں چیزیں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ اس حرام چیز سے دور ہیں لیکن مجھے خود کو پُرسکون رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوگی اس لیے مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے لیے ایک پیگ بنالوں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا، اس کی آواز میں بھی ٹھہراؤ آ چکا تھا۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' میں نے جواب میں کہا تو وہ اپنے لیے ایک لارج پیگ بنانے میں مصروف ہو گیا پھر وہیں کھڑے کھڑے ایک دو گھونٹ لیے اور گلاس ہاتھ میں لیے ہوئے میرے سامنے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

''میں کوئی تیز و تند گفتگو، ہنگامہ یا فساد نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے بیوی اور بچوں کو کچھ دیر کے لیے موہن کے گھر بھیج دیا ہے۔'' وسیم نے کہا اور یوں مجھے نادرہ کی غیر موجودگی کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ ''یوں بھی جو کچھ ہوا اسے اتنا عرصہ ہو چکا ہے کہ اب اس پر کوئی بات کرنا فضول ہے۔'' اس نے ایک اور گھونٹ لیا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے اس طرح کی گفتگو کا سامنا کرنا پڑے گا تو میں کبھی نہیں آتا۔'' میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

''آپ یہاں تشریف لائے، آپ نے بہت اچھا کیا۔'' وسیم نے میرے سخت لہجے کے باوجود نرم انداز اختیار کیا تھا۔ ''مجھے ڈھونڈنے میں آپ کو یقیناً مشکلات سے گزرنا پڑا ہوگا۔'' وسیم نے کہا تو میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ کو میں کیوں ڈھونڈوں گا؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''آپ مجھ کو ڈھونڈتے ہوئے میرے مکان تک پہنچ گئے اور اب میرے سامنے بیٹھے ہیں اور مجھ سے ہی کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے کیوں ڈھونڈیں گے۔'' وسیم کا لہجہ مجھ سے بھی زیادہ طنزیہ تھا۔

''نہ میں آپ کو جانتا تھا، نہ اب جاننا چاہتا ہوں اور نہ ہی مجھے آپ سے ملنے کی کوئی خواہش کبھی تھی نہ اب ہے۔'' میرا لہجہ جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔

''تو پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' وسیم نے سوال کیا لیکن اس کا لہجہ ایک بار پھر نرم ہو چکا تھا۔

''میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ مجھے یہاں بلوایا گیا تھا۔'' میں نے کہا تو وسیم جیسے چونک گیا۔

''مجھے دعوت دی گئی تھی اور اس دعوت کو آج کنفرم بھی کیا گیا تھا وگرنہ میرا آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔'' میں نے اپنا جارحانہ لہجہ جاری رکھتے ہوئے اسے بتایا۔

''کس نے دی تھی آپ کو دعوت؟'' وسیم نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

''آپ کی بیوی نے.....'' میں نے جواب میں کہا تو وسیم بری طرح چونک گیا۔

''میں نہیں جانتا کہ اس کا منصوبہ کیا تھا اور اسے کون سا بدلہ لینا تھا کہ اس نے مجھے بااصرار بلایا اور آپ کو بھی نہیں بتایا.....اور مجھے آپ کے سامنے لا کر خود چپکے سے کھسک گئی۔'' میں نے کہا تو وسیم سوچ میں پڑ گیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟'' وسیم نے کچھ دیر بعد کہا اور ایک اور گھونٹ لے کر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

''اس کا جواب تو وہی دے سکے گی کہ کس مقصد کے تحت اس نے یہ منصوبہ بندی کی تھی۔'' میں نے جواب میں

کہا.....''یہاں کا پتا دینے والی بھی وہی تھی ورنہ مجھے کیا الہام ہورہا تھا کہ میں نیوجرسی سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔'' میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''شاید آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔'' وسیم کا لہجہ بالکل ہی دبا ہوا تھا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ وسیم اتنی جلدی میری بات مان لے گا لیکن پھر فوراً ہی جب اس نے وضاحت کی تو بات سمجھ میں آ گئی۔

''ٹیلی فون میرے نام پر نہیں ہے کہ آپ ڈائریکٹری سے میرا پتا معلوم کر لیں اور بہت عرصے سے میں پاکستانی کمیونٹی سے مل بھی نہیں رہا ہوں کہ انہیں میرے اس نئے مکان کا ایڈریس معلوم ہو۔'' اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا۔

''مجھے کچھ اسی طرح کے ردعمل کی توقع تھی اور اسی لیے میں آنے سے انکاری بھی تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ آپ بہت لبرل شخص ہیں اور بہت کھلے ذہن کے مالک ہیں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا تھا، سچ تو یہ تھا کہ مجھے نادرہ پر واقعی شدید غصہ آرہا تھا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ وہاں نہیں تھی ورنہ شاید میں کوئی سخت حرکت کا بھی مرتکب ہو سکتا تھا۔

''میں لبرل ضرور ہوں لیکن جن معنوں میں اس نے لبرل کہا تھا شاید میں اتنا لبرل بھی نہیں ہوں۔'' وسیم نے کہا۔

''مجھے آپ اجازت دیں تاکہ میں.....'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا لیکن وسیم نے میرا فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔

''میرا یہاں رکنا فضول ہی ہے۔'' میں نے اصرار کیا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں کوئی ہنگامہ آرائی پسند نہیں کرتا۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''تو میں کب کوئی ہنگامہ کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''دیکھیں کورٹ جانے میں ہم دونوں کی جگ ہنسائی ہے اور اس سے بھی زیادہ اس بچی کے مستقبل کا سوال ہے۔'' وسیم نے کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وسیم کورٹ کی بات کیوں کر رہا ہے اور کس جگ ہنسائی کی بات کر رہا ہے۔ چونکہ اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اس لیے میں حیرت کی زیادتی کی وجہ سے خاموش رہا۔

''میں جانتا ہوں کہ کورٹ میں میرا کیس بہت کمزور ہے اور شاید ایک مرحلہ ایسا بھی آئے کہ میں خودکشی پر مجبور ہو جاؤں اسی لیے میں آؤٹ آف دی کورٹ آپ کی مرضی کے مطابق سمجھوتا کرنے پر تیار ہوں۔'' اس نے کہا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔

''میں سمجھ رہا ہوں کہ سلویا نے یہ کھیل کیوں کھیلا ہے۔'' وسیم نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہا۔

''کون سلویا.....؟'' میں نے بے اختیار سوال کیا۔

''سلویا.....میری بیوی۔'' وسیم کا جواب تھا لیکن اس کے لہجے میں حیرت کا عنصر شامل تھا۔

''لیکن میں تو اس سے نہیں ملا۔'' میں نے کہا تو وسیم مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میرے سر پر سینگ اگ آئے ہوں۔

''آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ میری بیوی نے آپ کو یہاں آنے کی دعوت دی تھی اور آپ کو ایڈریس بھی دیا تھا۔'' وسیم نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تو نادرہ کا ذکر کر رہا تھا۔'' میں نے کہا تو وسیم اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ کو یہاں کا پتا نادرہ نے دیا تھا۔'' اب اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ غصہ تھا۔

''جی، اسی نے دیا تھا۔ آپ اسے بلا کر معلوم کر لیں۔'' میں نے کہا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ امریکا کے قانون کے مطابق نادرہ کی موجودگی میں وہ دوسری بیوی کیسے رکھ سکتا ہے۔

''کیا آپ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے آئے ہیں؟'' وسیم کا لہجہ تیز ہو گیا۔

''اس میں بے وقوف بنانے والی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا تو وسیم مجھے صرف گھورتا رہا۔

''کب ملے تھے آپ نادرہ سے؟'' اس نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''چار روز قبل.....'' میں نے جواب میں کہا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔

''نادرہ کو دنیا سے گئے ہوئے چودہ ماہ اور سات دن ہو گئے ہیں۔'' وسیم نے کہا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو لیکن فوراً ہی

میرے ذہن میں خیال آیا کہ وسیم جھوٹ بول رہا ہے۔
''اس نے آج بھی مجھے فون کیا تھا اور تاکید کی تھی کہ میں ضرور یہاں پہنچوں۔'' میں نے کہا۔
''کیا نمبر ہے اس کے فون کا......'' وسیم نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا تو میں نے موبائل میں سے اس کا نمبر نکال کر اسے بتا دیا۔ اس بار حیرت زدہ ہونے کی باری وسیم کی تھی۔
''یہ نمبر اسی کے موبائل کا ہے لیکن اس کی موت کے کچھ دن بعد ہی میں نے یہ نمبر بند کروا دیا تھا۔'' وسیم نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے صوفے کی پشت پر سر لگا دیا۔
''تم سچ کہہ رہے ہو کہ نادرہ......'' سوال کرتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا تھا اس لیے میں نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔
میں وسیم کی بات کو تسلیم نہ کرتا لیکن اچانک مجھے پارک میں اس وقت جب نادرہ میرے ساتھ تھی پاس سے گزرنے والے لوگوں کے رویے یاد آ گئے تھے۔ وہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے کچھ اس انداز سے دیکھتے تھے جیسے وہ کسی پاگل کے پاس سے گزر رہے ہوں۔ [illegible] یہ بات مجھے اس وقت بھی عجیب لگی تھی لیکن چار روز گزرنے کے بعد میں اسے تقریباً بھول گیا تھا مگر وسیم کے فقرے کے ساتھ ہی مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا تھا۔
''کون سا ثبوت درکار ہے آپ کو؟'' وسیم نے کچھ توقف کے بعد کہا اور ایک بڑے گھونٹ کے ساتھ اس نے اپنا گلاس ختم کر دیا۔
''لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بھی غلط نہیں ہے۔'' میں نے کہا لیکن وسیم میری بات کا جواب دیے بغیر دوسرا پیگ بنانے بوتل کی جانب بڑھ گیا۔
''میں نے آپ کو غلط نہیں کہا۔'' پیگ بنانے کے دوران میری جانب رخ کیے بغیر اس نے کہا۔
''تم بھی صحیح ہو اور غلط میں بھی نہیں ہوں، یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کہا۔
''اگر میں اور آپ اس کی کوئی سائنسی توجیح ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے تو ایسا ممکن نہیں ہو سکے گا۔'' وسیم نے اپنی جگہ کھڑے ہوئے کہا.... ''لیکن ایسی بہت سی باتیں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں جن کا کوئی جواز آج کی ترقی یافتہ سائنس بھی نہیں ڈھونڈ... پاتی ہے۔'' اس نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ دوبارہ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا تھا۔ میرے پاس اس دوران خاموش رہنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔
''ہم دونوں میں سے میں شاید بہتر پوزیشن میں ہوں کہ اسے سمجھ سکوں کیونکہ اس کی آخری باتیں مجھ سے ہی ہوئی تھیں اور بہت تفصیل سے ہوئی تھیں۔'' وسیم نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات شروع کی تھی۔
''اس آخری بات پر پہنچنے سے پہلے میں چاہوں گا کہ شروع سے بات کروں۔'' وسیم نے اجازت طلب کرنے والے انداز میں کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور وسیم یوں خاموش ہو گیا جیسے سوچ رہا ہو کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کرے۔
''میں بہن کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان گیا ہوا تھا اور شادی کی اس تقریب میں ہی میں نے نادرہ کو دیکھا اور اس سے میری کچھ گفتگو بھی ہوئی تھی۔'' وسیم نے کہنا شروع کیا لیکن میں اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکا تھا۔
''نادرہ نے بتایا تھا کہ شادی کے دو روز بعد ہی آپ نے اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیج دیا تھا۔'' میں نے دخل اندازی کی۔
''میں پاکستان پہنچنے سے قبل [illegible] ہی میرے گھر والے [illegible] ''وسیم نے بات وہیں سے شروع کی۔ جہاں سے اس نے چھوڑی تھی۔
''میں نے اپنی پسند بتائی تو انہوں نے بھی اپنی رضامندی دے دی۔'' وسیم نے کہا۔
''میں جانتا ہوں کہ اس کے ڈکٹیٹر باپ نے رشتہ قبول کرنے میں دیر بھی نہیں لگائی کیونکہ آپ ان میں سے ہی تھے اور نادرہ اس وقت تک اپنی پسند کے بارے میں اپنے گھر والوں کو آگاہ کر چکی تھی۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ لیکن وسیم پر میرے تلخ فقرے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔
''جب نادرہ مجھ سے ملی اور اس نے مجھ سے یہ کہہ کر شادی سے انکار کیا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے تو میں نے اس کی بات مان لی تھی۔'' وسیم نے کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔
''نادرہ تم سے ملی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔
''نادرہ نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں شادی سے انکار کر دوں کیونکہ اس کے گھر کا ماحول شاید اسے ایسا نہ کرنے دے۔'' وسیم نے میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس بار کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ نادرہ نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کوئی ایسا قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔
''میرے گھر والے اس بات پر حیران تھے کہ جس

لڑکی کو میں نے خود منتخب کیا تھا، ان کی جانب سے رشتہ منظور ہونے کے بعد میں کیوں انکار کر رہا ہوں لیکن میں نے کوئی وجہ بتائے بغیر انکار کر دیا تھا۔'' وسیم نے کہا۔

''کوئی اور شاید نہ سمجھا ہو لیکن اس کا باپ یہ بات سمجھ چکا تھا اور اسی لیے اس نے مجھے بدترین نتائج کی دھمکی دی تھی۔'' میں نے کہا تو وسیم کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''نادرہ سے آخری گفتگو سے قبل میں نہیں جانتا تھا کہ رضا کون ہے اور وہ کون سی وجوہات تھیں کہ میری واپسی سے آٹھ دن قبل وہ دوبارہ مجھ سے ملی اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اب وہ شادی کے لیے تیار ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ شادی تین روز میں ہو جانی چاہیے۔'' وسیم نے کہا تو میں خاموش نہ رہ سکا۔

''وہ جان چکی تھی کہ مجھے ایک جھوٹے کیس میں پھنسوا کر جیل بھجوانے والا کوئی اور نہیں اس کا باپ ہے اور یہ شرط بھی اس کے باپ کی جانب سے تھی کہ جب وہ شادی کر لے گی تو وہ مجھے رہا کروا دے گا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''بات کسی حد تک صحیح ہے لیکن مکمل سچ نہیں ہے۔'' وسیم نے تردید کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ بات نادرہ نے شائستہ باجی سے کہی تھی اور شائستہ باجی نے مجھے بتائی تھی۔'' میں نے کہا تو وسیم خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

''نادرہ سے اگر مجھے کوئی شکایت ہے تو اتنی کہ میرے لیے قربانی دینے سے قبل ایک بار مجھ سے مشورہ تو کر لیتی۔'' میں نے افسردہ لہجے میں کہا لیکن وسیم خاموش ہی رہا۔

''میں نہیں جانتا کہ نادرہ نے وہ کیوں کہا لیکن جو کچھ اس نے کہا وہ پورا نہیں، بلکہ آدھا سچ تھا۔'' وسیم نے جواب میں کہا۔

''آدھا سچ؟'' میں نے سوال کیا اور وسیم کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

''وہ یہ تو جان چکی تھی کہ آپ کو جیل بھجوانے والا اس کا باپ ہے لیکن شادی کے لیے مجبور کرنے والا اس کا باپ نہیں تھا۔'' وسیم نے کہا لیکن میں اس کی بات سمجھ نہ سکا۔

''اگر اس کا باپ نہیں تھا تو پھر.....؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''میری بات مکمل ہو گی تو ہر چیز واضح ہو جائے گی۔'' وسیم نے کہا تو مجھے خاموش ہونا پڑا۔

''نادرہ جب دوسری بار مجھ سے ملنے آئی تو اس میں ایک بہت بڑی تبدیلی میں نے یہ دیکھی تھی کہ اس کی خود اعتمادی بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔'' وسیم یہ کہہ کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ جن حالات سے وہ گزر رہی تھی اس میں اس کا اعتماد کیونکر مجروح نہ ہوتا، اس کا باپ مجھے جیل بھجوا چکا تھا اور اس کے پاس کوئی دوسرا سہارا بھی نہیں تھا۔ لیکن میں خاموش رہا۔

''اس نے آتے ہی سوال کیا تھا کہ کیا میں اب بھی اس سے شادی کے لیے تیار ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس نے تین دن والی شرط بھی رکھی تھی۔'' وسیم نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''آپ نے تبدیلی کی وجہ تو معلوم کی ہو گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے معلوم کرنی چاہی تھی۔'' وسیم کا جواب تھا۔

''اس نے کیا جواب دیا تھا۔'' میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

''اس کا جواب تھا کہ اگر وہ اس کا جواب دے گی تو وہ سچ نہیں ہو گا اور جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہے گی۔'' وسیم نے جواب میں کہا۔

''تم نے اس کے باوجود اسے قبول کر لیا؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''مجھے وہ نادرہ پسند آئی تھی جو پہلی بار پوری خود اعتمادی سے شادی میں ملی اور پھر مجھے بلوا کر بات کی تھی۔ مگر اس بکھری بکھری نادرہ کو دیکھ کر میں تڑپ اٹھا

مختصر... مختصر...

دوست سے چھ سال بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''کیوں بھئی شادی کروائی یا ابھی تک اپنے کپڑے خود ہی دھو رہے ہو؟''

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ ''تمہاری دونوں باتوں کا جواب ہاں ہے۔''

☆☆☆

آج کافی عرصے بعد صابن سے منہ دھویا .....تو چہرے کا رنگ ہی بدل گیا اور صابن کا بھی۔

☆☆☆

جوس کے ڈبے میں جوس باقی ہو اور اسٹرا سے بھی نہ آ رہا ہو تو بندہ پریشان ہی ہو جاتا ہے کہ کیا کروں..... پھینک دوں یا ایک دو ٹرائیاں اور کر لوں۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

تھا۔'' وسیم نے کہا تو میں مسکرا دیا۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے ترس کھا کر اس سے شادی کی تھی؟'' میں نے سوال کیا تو وسیم نے احتجاجی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''جو کچھ میں نے محسوس کیا تھا شاید میں لفظوں میں بیان نہ کر سکوں لیکن میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔'' اس نے کہا..... ''وہ پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا تھا کہ کسی وجہ سے وہ خوشیوں سے دور ہو رہی ہے اور مجھے اسے خوشیاں دینی ہیں۔'' وسیم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اس تمام عرصے میں جب وہ تمہارے ساتھ تھی تمہارے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس سے اس بارے میں سوال کرو؟'' میں نے سوال کیا اور وسیم کچھ دیر کے لیے اس طرح سے خاموش ہو گیا جیسے ماضی میں کہیں کھو گیا ہو۔

''جو وقت میں نے اس کے ساتھ گزارا ایسا وقت شاید ہی کسی شوہر نے اپنی بیوی کے ساتھ گزارا ہوگا۔'' وسیم اس انداز میں بول رہا تھا جیسے وہ کہیں دور تنہا ہو۔ اسے شاید یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کسی سے مخاطب ہے۔ ''وہ میرے ساتھ وزٹ ویزا پر پاکستان سے آئی تھی۔'' وسیم کہہ رہا تھا اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔

''یہاں پہنچنے کے فوراً بعد اس نے میری ہر ذمے داری اپنے ذمے لے لی تھی پھر ایک ہفتے کے اندر ہی اس نے میری اجازت کے ساتھ جاب بھی شروع کر دی لیکن اپنی کمائی سے بھی اس نے میری اجازت کے بغیر ایک ڈالر بھی خرچ نہیں کیا یہاں تک کہ اپنے اوور ٹائم کی رقم بھی وہ مجھ پر ہی خرچ کرتی تھی۔'' وسیم ایک رو میں کہے جا رہا تھا یہاں تک کہ جب وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوا تب بھی میں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔

''کاش وہ مجھے وہ سچ بھی نہ بتاتی جو اس نے اپنی آخری سانس سے تین روز قبل بتایا تھا۔'' وہ اس انداز میں بڑبڑایا۔ جیسے خود سے بات کر رہا ہو۔

میں اس سے یہ سوال کرنے ہی والا تھا کہ وہ آخری سچ کیا تھا... کہ اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔

''موہن کا فون ہے۔'' اس نے موبائل کو دیکھنے کے بعد مجھ سے کہا... ''جی..... موہن.....'' اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''سب خیریت ہے کوئی بھی گھبرانے کی بات نہیں۔'' اس نے کہا اور پھر کچھ دیر موہن کی جانب سے جو کچھ کہا گیا، وہ سننے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔

''نادرہ کے بعد موہن اور اس کی فیملی نے بھی جس انداز میں میرا ساتھ دیا اس پر میں زندگی بھر اس کا شکر گزار رہوں گا۔'' وسیم نے کہا لیکن میں تو وہ کچھ سننا چاہتا تھا جسے وسیم آخری اور مکمل سچ کا نام دے رہا تھا لیکن میں اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

''نادرہ نے جو کچھ کہا اس کا اثر مجھ سے زیادہ نتاشا نے لیا تھا۔'' وسیم نے کہا اور اس بار میں خود کو کچھ کہنے سے روک نہ سکا۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔'' میں نے ایک ہیجانی سی کیفیت میں کہا۔

''کبھی کبھی یوں ہوتا ہے رضا صاحب کہ انسان کی ایک چھوٹی سی غلطی اس کے لیے زندگی بھر کا عذاب بن جاتی ہے۔'' وسیم نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات کی۔

''میں اب بھی نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آپ کس تناظر میں یہ بات کہہ رہے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

''نادرہ میرے لیے سب کچھ تھی اور میں بھی آخر وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ نادرہ کے لیے بھی میں ہی سب کچھ ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔'' وسیم نے ایک بار پھر میرے فقرے کو نظر انداز کیا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟'' میری ہیجانی کیفیت مزید بڑھ گئی۔

''میں نادرہ کے لیے ایک ایسا سائبان تھا جہاں اس نے پناہ تو لے لی تھی لیکن اپنے دل سے وہ اپنی پہلی محبت کو کبھی نکال نہیں سکی تھی اور شاید وہ نکال بھی نہیں سکتی تھی۔'' وسیم نے کہا تو میں اس سے نظریں چرا گیا۔

''لیکن ابھی کچھ دیر پہلے آپ کچھ اور کہہ رہے تھے۔'' میں نے شاید اپنے بچاؤ میں دلیل دی تھی۔

''اس نے میری کسی بات کو کبھی رد نہیں کیا۔ جو کچھ میں اس سے کہنا چاہتا تھا وہ بات کہنے سے پہلے پوری ہو جاتی تھی۔ مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں اس کی توجہ کا مرکز ہوں لیکن آخر میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو صرف ڈیوٹی دے رہی تھی۔''

''کیسی ڈیوٹی؟'' میں نے سوال کیا لیکن اس سے قبل کہ وسیم جواب میں کچھ کہتا، اس کا موبائل ایک بار پھر بول پڑا۔

اس نے بغیر کچھ کہے فون ریسیو کیا لیکن دوسری جانب سے جو کچھ کہا گیا، اسے سننے کے بعد وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے

اٹھ گیا تھا۔

''میں ابھی حاضر ہوا۔'' اس نے جانے سے پہلے کہا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا وہ تقریباً بھاگتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

جس انداز سے وہ وہاں سے روانہ ہوا تھا اور جب میں نے باہر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی نہیں سنی تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ برابر میں موہن کے گھر ہی گیا ہے۔ وسیم وہاں سے گیا تو میری سوچ کا رخ نینا کی جانب ہوگیا۔ جو خوبیاں وسیم نادرہ کی بتا رہا تھا وہی سب کچھ نینا میں اس فرق کے ساتھ تھیں کہ نینا جاب نہیں کرتی تھی لیکن پہلے فیکٹری خریدنے اور پھر اسے چلانے میں جس طرح اس نے تعاون کیا تھا، وہ شاید نادرہ سے بھی بڑھ کر تھا۔

جب میں نے اس سے فیکٹری خریدنے کی آفر کے حوالے سے بات کرنی چاہی تو اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا ..... ''آپ کا جو بھی فیصلہ ہوگا میں اس میں پوری طرح آپ کے ساتھ ہوں۔''

''میں تم سے مشورہ مانگ رہا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ کچھ دیر سوچ میں گم ہوگئی۔

''یہاں کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا تھا۔ ''آج نہیں تو زیادہ سے زیادہ چھ ماہ بعد ہمیں واپس تو جانا ہوگا؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''اس پر مجھے تم سے اختلاف نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''جب کل بھی جانا ہے تو آج کیوں نہیں جبکہ ہمارے سامنے ایک بہتر موقع بھی ہے۔'' نینا نے اپنی دلیل دی۔

''گارمنٹس کے بارے میں میری معلومات صفر ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا تو اس کے چہرے پر اور زیادہ سنجیدگی آگئی۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں۔'' اس نے جواب میں کہا تھا۔

''کیسی مدد؟'' میں نے چونک کر سوال کیا تھا۔

''آپ کے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہے کہ شادی سے پہلے میں پاپا کے ساتھ کام کرتی رہی ہوں۔'' اس نے کہا تو مجھے سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔

''میں ان کی دو فیکٹریوں کے پروڈکشن یونٹ سنبھال رہی تھی۔'' نینا نے کہا تو میرے ذہن سے جیسے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

''اس بہانے شاید میں زیادہ دیر آپ کے ساتھ رہ سکوں گی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا تھا اور وہ مجھے اس انداز سے دیکھنے لگی تھی کہ جیسے پوچھ رہی ہو کہ میں ہنس کیوں رہا ہوں؟

''تم یہ کہہ رہی ہو کہ اب تم دفتر میں بھی مجھ پر نظر رکھا کروگی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا لیکن وہ میری اس بات پر سنجیدہ ہوگئی۔

''میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہوں کہ اگر کبھی آپ یہ سمجھیں کہ میرے علاوہ بھی آپ کسی اور کو اپنی زندگی میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو میں خوشی خوشی یہ سمجھ کر کہ مجھ سے ہی کوئی کوتاہی ہوئی ہے، آپ کو اجازت دے دوں گی لیکن اتنی درخواست مان لیجیے گا کہ کبھی مجھے خود سے جدا مت کیجیے گا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے میرے پیروں میں بیٹھ گئی تھی۔

''میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔'' اس نے اس بار مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دیا۔

''اچھی خاصی گفتگو کرتے ہوئے ہم نہ جانے کس جانب نکل پڑے تھے۔'' میں نے موضوع ختم کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ نینا اب میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور کسی سوچ میں گم تھی۔

''میں آپ سے ایک چیز مانگنا چاہتی ہوں رضا، پلیز انکار مت کرنا۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''ہر شے تو تمہاری ہے نینا۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

''نہیں رضا، پہلے وعدہ کریں جو میں کہوں گی اس سے انکار نہیں کریں گے۔'' اس نے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''ایسے نہیں، میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ آپ مجھے انکار نہیں کریں گے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ دیا تھا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے۔'' میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تو وہ صرف مجھے دیکھتی رہی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس کے بعد زندگی بھر آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔'' اس نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد کہا تھا۔

''ماننے والی بات ہوئی تو ضرور مانوں گا لیکن قسم نہیں

کھاؤں گا اور تمہاری قسم تو بالکل بھی نہیں کھاؤں گا۔'' میں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں جیسے دیپ سے جل اٹھے... لیکن پھر فوراً ہی اس کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔

''پاپا نے مجھ سے بات کرنی چاہی تھی لیکن میں نے ان سے صرف ایک سوال کیا تھا کہ وہ یہ آفر ہمیں کیوں کر رہے ہیں۔ ہمیں آفر کرنے کے بجائے وہ خود کیوں نہیں خرید لیتے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ان سے مزید کام نہیں ہو رہا ہے اور ساجد چاہتا ہے کہ وہ کینیڈا شفٹ کر جائے۔'' نیتا نے پہلی بار اپنے میکے کا سیکرٹ مجھ سے شیئر کیا تھا۔

''ساجد چاہتا ہے یا اس کی بیوی چاہتی ہے؟'' میں نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ ساجد کی بیوی کینیڈین امیگرینٹ تھی۔

''ایک ہی بات ہے۔'' نیتا نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اور دوسرا بھائی.....؟'' میں نے کہا تو اس کے چہرے کی سنجیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''جو شخص بارہ بجے سے پہلے اٹھنا گناہ سمجھتا ہو اس سے کام کی توقع کرنا فضول ہے۔'' نیتا نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''تم نے گفتگو شاید کسی اور پیرائے میں شروع کی تھی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' اس کا جواب تھا۔ ''میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ پاپا اس لیے آرڈر واپس کر رہے ہیں کہ وہ وقت پر کام پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور ہم وہ بھی آرڈر ان سے لے سکتے ہیں یعنی ان کے حصے کا کمیشن انہیں دینے کے بعد۔'' نیتا نے اس تمہید کے آخر میں مجھے سمجھایا۔

''میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس بزنس کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے۔'' میں نے اپنی کم مائیگی کا ایک بار اور اعتراف کر لیا۔

''لیکن جو بات میں آپ سے منوانا چاہ رہی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ میرا مان نہیں توڑیں گے، وہ یہ ہے کہ آپ مجھ سے قرض لیں گے۔'' نیتا نے کہا تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''قسطوں میں آپ جو بھی شے لیتے ہیں اس کی قیمت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔'' اس نے میرے چہرے پر ابھرنے والے سوالوں کے جواب میں کہا تھا۔

''آپ پاپا سے پیسے نہیں لینا چاہتے، نہ لیں لیکن میرے پاس جو رقم ہے اس پر تو آپ کا حق ہے۔'' نیتا نے کہا تو میں بات کی تہ تک پہنچ گیا۔

''تم اس بحث کا آغاز کر رہی ہو جو ہمارے درمیان طے ہو چکی ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''میں تو صرف اتنی سی بات کہہ رہی ہوں کہ اس تمام عرصے میں جو میں نے آپ کے ساتھ گزارا ہے، آپ کو میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو تو آپ مجھ سے قرض نہ لیں۔'' نیتا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''نیتا.....تم.....؟'' میں اس کے بدلتے ہوئے لہجے سے کنفیوز ہو گیا تھا۔

''آپ میرا مان ہو رضا، میں آپ پر فخر کرتی ہوں۔'' اس نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ کہا تھا۔ ''میرا باپ میرا آئیڈیل ہے لیکن میں آپ کو ان سے بھی بلند دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے اسی طرح جھکی نظروں کے ساتھ کہا تو میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔

مجھے اس کی بات ماننی پڑی تھی۔ اس نے پہلی بار کوئی فرمائش کی تھی اور اس کی فرمائش کا انداز بھی عجیب تھا۔ کراچی شفٹ ہونے کے بعد تو جیسے وہ سب کچھ، یہاں تک کہ مجھے بھی بھول گئی تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز فیکٹری تھی اور مہینوں نہیں بلکہ ہفتوں میں چیزیں یوں تبدیل ہو گئی تھیں کہ ہم بھی گارمنٹس انڈسٹری کا ایک قابلِ اعتماد نام تھے۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔'' وسیم نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا... میں نے اسے واپس آتا ہوا دیکھ لیا تھا۔

''نادرہ کے بعد سے حنا شا کو کبھی کبھی ایک عجیب سا دورہ پڑ جاتا ہے۔'' اس نے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیسا دورہ؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''وہ اچانک رونے لگتی ہے اور پھر روتے روتے اس پر ایک دورے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگتے ہیں۔'' وسیم نے افسردہ انداز میں کہا۔

''یہ تو خطرناک بات ہے۔'' میں نے کہا لیکن اس نے تردید کرنے والے انداز میں گردن ہلائی۔

''علاج کے بعد وہ ٹھیک تھی۔ آج شاید تین ماہ بعد اس کی یہ کیفیت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں تنہائی یا اکیلے پن کے احساس میں ایسا ہو جاتا ہے۔'' وسیم نے کہا تو میرے ذہن میں ان گنت سوال ابھرے... لیکن میں نے وہ سوال کرنے سے گریز کیا... کیونکہ بہرحال یہ ان کے گھر کا مسئلہ تھا۔

''آپ کہہ رہے تھے نادرہ نے آپ کو محض وقتی سائبان سمجھا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا کہ وہ کہاں تھا۔ میں وہاں سے جلد سے جلد جانا چاہتا تھا۔

''اس وقت جب نادرہ نے شادی کی رضامندی دی

تھی تب میرے ذہن کے کسی گوشے میں وہ نہیں آسکا تھا جو بعد میں ظاہر ہوا۔'' وسیم نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد کہا اور پھر اچانک ہی خاموش ہوگیا۔

''کیا ظاہر ہوا؟'' اس کی بڑھتی ہوئی خاموشی سے تنگ آکر میں نے ایک ہیجانی کیفیت میں سوال کیا۔ بے شمار سوال تھے جو اپنے جواب کے منتظر تھے لیکن اس کی خاموشی کا دقفہ تھا کہ طویل تر ہوتا جارہا تھا۔

''آپ کو یاد ہے وہ دن جب نادرہ نے آپ کو ایک ہی دن میں اپنی دو کامیابیوں کی خبر دی تھی؟'' وسیم نے کہا تو میرے ذہن میں جیسے ایک ساتھ کئی دھماکے ہوئے تھے۔

''تو کیا.....؟'' میں نے صرف اتنا سوچا اور اس کے ساتھ ہی میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب سی ہوگئی۔ خود وسیم کا انداز ایسا تھا جیسے اسے خود کو پرسکون رکھنے میں بڑی دشواری ہورہی ہو۔

''اسی روز نادرہ نوکری حاصل کرنے اور مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔'' وسیم نے جیسے میری یادداشت تازہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے تو سب کچھ پہلے ہی یاد تھا۔ اس تمام عرصے میں کبھی بھی وہ یادداشت میرے ذہن سے مٹی نہیں تھی۔

میں نادرہ سے پہلے اس کی اس دوست کے گھر پہنچا تھا جہاں ہم پہلے بھی ملتے رہے تھے لیکن اس روز اس کی سہیلی ایک ہفتے کے لیے شوہر اور بچے کے ساتھ لاہور جارہی تھی۔

''فرمان آفس سے ائرپورٹ پہنچ جائیں گے، اب تم چابی سنبھالو اور گھر کو جاتے وقت بند کرجانا۔'' اس نے میرے پہنچتے ہی چابی مجھے تھماتے ہوئے کہا تھا۔

''بیڈروم بھی کھلا ہوا ہے اگر موڈ ہو تو.....'' اس نے شوخ لہجے میں کہا تھا۔

''تم جانتی ہو کہ ہمارے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے سخت انداز میں کہا تو وہ ہنس دی تھی۔

''مذاق کررہی تھی بابا، تم تو ناراض ہی ہوگئے۔'' اس نے کہا تو میں مسکرا کر رہ گیا تھا۔

''وہ سب کچھ کیسے ہوا، میں نہیں جانتا لیکن اس نے ہم تینوں کی زندگیوں پر اثر ڈالا تھا۔'' وسیم کی آواز کانوں میں آئی تو میں ماضی سے حال میں آیا لیکن پھر ایک بے خودی کے عالم میں ماضی میں پہنچ کر میں نے بولنا شروع کردیا۔

''نادرہ جب وہاں پہنچی تو بہت خوش تھی، اتنی خوش کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم اتنے قریب آئے تھے۔'' میں نے کہا تو وسیم نے اس کے ساتھ ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس نے بھی یہی بتایا تھا۔'' وسیم نے کہا لیکن مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''میں بہت خوش ہوں رضا، بہت خوش۔ آج میں نے ہر دیوار گرادی ہے۔ اس نے مجھے بھینچتے ہوئے کہا تھا۔'' میں اپنی رو میں بولے جارہا تھا۔

''پہلی خوشی تو یہ ہے کہ مجھے نوکری مل گئی ہے اور اب میں بابا کی محتاج نہیں ہوں اور دوسری یہ کہ میں بابا کے منتخب امیدوار کو منع کرآئی ہوں اور اس نے کہا ہے کہ وہ خود اس رشتے سے انکار کردے گا۔'' میں نے نادرہ کا کہا ہوا فقرہ دہرایا اور خاموش ہوگیا۔

''اور پھر خوشی کے اس ماحول میں آپ دونوں اتنے آگے بڑھ گئے کہ آپ دونوں نے تمام حدیں عبور کرلیں۔'' میں خاموش ہوا تو وسیم نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا لیکن.....'' میں کہتے کہتے رک گیا۔

''جو کچھ ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا یا شاید اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا جس طرح ہوا۔'' وسیم نے کہا اور میں خالی نظروں کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

''آپ نے نادرہ کو حاملہ کیا اور جیل چلے گئے۔'' وسیم نے کہا تو میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''تم کہہ رہے ہو کہ.....'' میں بہ مشکل صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

''جب آپ جیل چلے گئے تو نادرہ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ اس کے باپ نے آپ کو پھنسوایا ہے۔'' وسیم نے کہا اور میں جیسے سن ہوگیا۔

''لیکن وہ بہ آسانی.....'' میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اسے وسیم نے ہاتھ اٹھا کر کہنے سے روک دیا۔

''اس کے باپ نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا کہ جب تک نادرہ شادی نہیں کرلیتی وہ آپ کو جیل سے واپس نہیں آنے دیں گے۔'' وسیم نے میرا سوال سنے بغیر جواب دیا۔

''اس شخص کا ہر فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا تھا۔'' میں نے کہا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''نادرہ آپ کو مزید جیل میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور نہ ہی آپ کی نشانی کو خود سے دور کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے مجھ سے شادی کرلی۔'' وسیم نے کہا۔

''شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا

لیکن وسیم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے نادرہ سے نہیں، اپنی قسمت سے شکایت ہے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

''نادرہ کی بیماری کا پتا اس وقت چلا۔۔ جب وہ کینسر کے آخری اسٹیج پر پہنچ چکی تھی۔'' وسیم نے کہنا شروع کیا۔ ''اگر وہ بیماری کا شکار نہ ہوتی تو زندگی اسی طرح گزر جاتی جس طرح گزر رہی تھی۔'' وسیم نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔

میرے اندر ایک لاوا ابلنے کو بے تاب تھا لیکن میں کسی نہ کسی طرح اسے دبا رہا تھا۔ مجھے وسیم کے جذبات کا احساس تھا لیکن میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

''میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں نے اعتراف کیا لیکن اس اعتراف کے ساتھ ہی میں چاہتا تھا کہ وسیم جلد سے جلد وہ کہہ دے جو میں سننے کے لیے بے قرار تھا۔

''میں اس زندگی سے بہت خوش تھا لیکن نادرہ کی بیماری نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا، یہاں تک کہ مجھ سے یہ احساس بھی چھین لیا کہ میں باپ بن سکتا ہوں۔'' وسیم نے ایک اور انکشاف کیا اور میں بغیر کچھ کہے اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔

''شادی کے چار سال بعد ہم نے یہ ٹیسٹ کروائے تھے کہ ہمارے یہاں دوسرے بچے کی ولادت میں کیا رکاوٹ ہے لیکن نادرہ نے کبھی میری رپورٹ مجھے نہیں دکھائی صرف اتنا کہا کہ دونوں کی رپورٹس بالکل ٹھیک ہیں اور ہر بار کی طرح اس بار بھی میں نے اس کے کہے کا یقین کر لیا۔'' وسیم نے اپنی بات مکمل کی تو میں کسی وجہ کے بغیر شرمندہ ہو گیا۔

''نادرہ نے وہ رپورٹ اپنا راز چھپانے کی غرض سے غائب کی ہو گی۔'' میں نے سوچا لیکن فوراً ہی میرا ذہن نینا کی جانب چلا گیا لیکن وسیم کی آواز نے مجھے وہاں رکنے نہیں دیا۔

''میرے خیال میں بہت کچھ واضح ہونے کے بعد اب وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنی بیٹی سے مل لیں۔'' وسیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''وہ جانتی ہے کہ.....'' میں ایک بار پھر اپنا فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔

''صرف وہی نہیں بلکہ سلویا، اس کا بیٹا اور موہن کی فیملی بھی اس حقیقت سے واقف ہیں۔'' وسیم کا جواب تھا۔

''سلویا تمہاری بیوی.....؟'' میں نے کہا تو وسیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سلویا کا تعلق میکسیکو سے ہے، وہ نادرہ کی ڈاکٹر تھی۔'' وسیم نے جواب میں کہا..... ''موہن کا بیٹا کشن اور نتاشا ہم جماعت ہیں اور موہن اور اس کی فیملی نے جس انداز میں ہمارا ساتھ دیا، ہم سب اس کے شکر گزار ہیں۔'' وسیم نے میرے کچھ کہے بغیر ہی موہن کی فیملی کا تعارف کروا دیا۔

''موہن سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔'' میں نے اپنے اندرونی خلفشار کو دباتے ہوئے کہا۔

''میں یوں کرتا ہوں کہ نتاشا کو لے آتا ہوں۔'' وسیم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا سانس رکنے لگا ہو۔

''میں اس کا سامنا کس طرح کر پاؤں گا؟'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا لیکن وسیم میری کیفیت سے لاعلم تھا۔

''میرا خیال ہے باقی لوگ یہاں موجود نہ ہوں تو بہتر ہے۔'' اس نے یہ کہا اور پھر قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ باہر کی جانب چل دیا..... میری خاموشی کو وہ میری رضامندی سمجھا تھا۔

''شاید یہی زیادہ بہتر ہے۔'' میں نے سوچا۔ ''اکیلے میں جو کچھ وہ مجھ سے کہے گی کم از کم وہ دیگر لوگوں کے علم میں تو نہیں آئے گا۔'' میں نے خود کو تسلی دی ... کہ نتاشا مجھے بہت کچھ کہے گی۔ یہ بھی کہ میں نے اسے دنیا میں لانے کا جرم کرنے کے بعد اس کی خبر کیوں نہ لی یا یہ بھی کہ میں نے اس کی ماں کو کیوں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ ''جرم جو بھی تم نے اور نادرہ نے کیا تھا وہی جرم تو نینا سے بھی سرزد ہوا تھا پھر تم نینا کو سزا کیوں دے رہے ہو؟'' ذہن کے باغی گوشے نے بغاوت کی۔

''وہ مجھ سے یہ بات چھپاتی رہی تھی۔'' میں نے ابھرتی ہوئی بغاوت کو کچلنا چاہا لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

''نینا تو اس سے ناواقف تھی کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ ہو گیا ہے جبکہ نادرہ تو آخر وقت تک اپنا جرم سب کچھ جاننے کے باوجود چھپاتی رہی ..... جب تم اپنے اور نادرہ کے جرم کو اپنانے کے لیے تیار ہو تو نینا کے جرم پر اسے سزا کس طرح دے سکتے ہو؟'' میرے اندر کی بغاوت کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی اور میں نہ چاہنے کے باوجود اس دور میں پہنچ گیا جب ہمارے راستے جدا ہوئے تھے۔

اولاد کے نہ ہونے کا دکھ ہم دونوں کو ہی تھا اور اسی لیے ہم نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تھا اور جب ہم دونوں کی

رپورٹ آئی اور اس کے ساتھ ہی اپنے جرم کو قبول کرلیا تو میرے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں علیحدگی اختیار کرلیتا۔

''رضا صاحب! باقی تمام باتیں ٹھیک ہیں صرف اتنا سا پرابلم ہے کہ آپ کی وائف کے پہلے ابارشن کے وقت ڈاکٹر نے احتیاط نہیں کی جس کی وجہ سے کچھ پیچیدگی ہوگئی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ دو چھوٹے چھوٹے آپریشن سے صورت حال صحیح ہوسکتی ہے۔'' ڈاکٹر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تھا اور میرا ذہن ماؤف ہوگیا تھا اور پھر اسی ماؤف ذہن کے ساتھ میں گھر پہنچا تھا۔ ایک ہی سوال تھا جو میرے ذہن میں بار بار اٹھ رہا تھا لیکن اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ''تو کیا اب تک نینا مجھے بے وقوف بناتی رہی تھی؟''

شادی سے پہلے مجھے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ نینا کی ایک منگنی ہوئی تھی اور اس کا منگیتر مزید تعلیم کے لیے امریکا گیا تھا لیکن پھر امریکا سے کچھ ہی عرصے بعد اس نے منگنی ختم کرنے اور وہیں پر کسی لڑکی سے شادی کرنے کا پیغام بھجوادیا لیکن حقائق کچھ اور بتا رہے تھے۔ اس کی چاہت، اس کی وفاداری، اس کی سپردگی ایک ڈراما ثابت ہورہی تھی۔

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' گھر پہنچ کر میں نے رپورٹ نینا کے ہاتھ میں دی تو اس نے پڑھنے کے بعد سوال کیا تھا۔

''اس کے بعد بھی کچھ کہنے یا سننے کے لیے رہ گیا ہے؟'' میں نے جوابی سوال کیا۔

''آپ کا ہر فیصلہ میرے لیے قابل قبول ہوگا لیکن اگر آپ کچھ کہنے کی اجازت دیں تو یہ آپ کا احسان ہوگا۔'' نینا نے کہا لیکن میں کچھ سنے بغیر ہی گھر سے نکل آیا اور اس وقت واپس آگیا تھا جب مجھے اطلاع ملی کہ نینا گھر سے جاچکی ہے۔

نینا سے تو میں نے کچھ بھی سننے سے انکار کردیا تھا لیکن اگلے ہی روز شائستہ باجی نے مجھے وہ سب کچھ بتادیا جو نینا نے ان سے کہا تھا۔

''منگنی کی رسم کے چوتھے دن نینا کے منگیتر کی روانگی تھی اور اس نے جانے سے قبل نینا سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور وہیں پر نینا کے بقول وہ جذبات میں بہتی چلی گئی جس کے نتائج کا اب اسے سامنا ہے۔'' شائستہ باجی نے کہا تھا لیکن میرے لیے یہ دلیل قابل قبول نہیں تھی۔

''یہ سب کچھ وہ اب سے پہلے بھی مجھ سے کہہ سکتی تھی۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''شاید وہ ایسا کرسکتی تھی لیکن رضا، تم تو اب بھی اس پوزیشن میں ہو کہ اسے معاف کرسکتے ہو۔'' شائستہ باجی نے کہا لیکن میں خاموش رہا۔

میں ماضی کی بھول بھلیوں میں شاید کچھ اور دیر بھٹکتا رہتا کہ قدموں کی چاپ نے مجھے متوجہ کرلیا۔ وہ اکیلی ہی آگئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کئی برس پیچھے چلا گیا ہوں اور آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔ وہ چپکے سے آئی تھی اور سلام کرکے سامنے کے صوفے پر اس جگہ بیٹھ گئی تھی جہاں کچھ دیر پہلے وسیم بیٹھا تھا۔

''میں رضا ہوں۔'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میں گفتگو کا آغاز کہاں سے کروں۔

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے مدھم سی آواز میں صاف اردو میں کہا اور دوبارہ نظریں جھکالیں۔

خاموشی کا ایک سلسلہ تھا جو اس کے بعد شروع ہوا جیسے ہم دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو۔

''آپ ماں سے ملے تھے؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

''ہاں.....'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے ابھی چند دن پہلے.....؟'' اس نے اپنے سوال کو مزید واضح کیا۔

''ہاں.....'' میں نے اپنا جواب دہرایا تو اس کے رخسار پر آنسو نظر آئے لیکن وہ آنسو بے آواز تھے، اس نے ایک سسکی بھی نہیں لی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھ ڈالوں لیکن میں اس کی ہمت نہیں کرسکا۔

''میں اس کی کوئی تشریح شاید نہ کرسکوں لیکن میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔'' میں نے نہ جانے کیوں وہ کہہ دیا تھا۔

''مجھے یقین ہے آپ کی بات پر۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔۔۔ ''ماں ایسی ہی تھی، وہ کچھ بھی کرسکتی تھی۔'' اس نے کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔

''تم اسے ماں کہتی تھیں؟'' میں نے سوال کیا تو اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا میں نے اور نادرہ نے سوچا تھا۔'' میں نے تڑپ کر سوچا۔

''میرے بچے مجھے ماں کہیں گے اور تمہیں بابا۔'' اپنے مستقبل کی پلاننگ کرتے ہوئے ایک بار اس نے کہا تھا۔

''ممی اور ڈیڈی کیوں نہیں؟'' میں نے سوال کیا تو اس نے گھور کر مجھے دیکھا تھا۔

''جو مٹھاس ماں میں ہے وہ نہ امی میں ہے اور نہ ممی

میں۔'' اس کا جواب تھا۔

''ماں نے کہا تھا کہ جب میں آپ سے ملوں تو آپ کو بابا کہوں۔'' اس نے مجھ سے کہا تو میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور ایک روبوٹ کی طرح میں نے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور اس نے بھی میرے سینے میں چھپ جانے میں دیر نہیں کی۔

ہم دونوں نہ جانے کتنی ہی دیر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے آنسو بہاتے رہے۔ اس کی سسکیاں میرے کانوں تک آرہی تھیں لیکن میں نے اسے خاموش کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس سے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ مجھے معاف ہی کردے۔

''ماں نے کہا تھا کہ ایک دن آپ آئیں گے اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔'' اس کی سسکیاں کچھ کم ہوئیں تو اس نے کہا۔

''کاش زندگی اسے اتنی مہلت دیتی کہ میں اس سے مل سکتا۔'' میں نے بے اختیار کہا لیکن ہم دونوں ہی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ہم اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کرسکے کیونکہ ہم دونوں نے ہی ایک ساتھ وسیم اور موہن کے ساتھ دو خواتین اور دو لڑکوں کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وسیم کے چہرے پر سنجیدگی تھی لیکن موہن مسکرا رہا تھا۔

''تو تنھی پری۔'' موہن نے آتے ہی نتاشا کو مخاطب کیا۔

''آج تمہاری سب سے بڑی خواہش پوری ہوگئی۔'' اس نے نتاشا کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو نتاشا مسکرا دی اور میں نے سوالیہ نظروں سے موہن کی جانب دیکھا لیکن قبل اس کے کہ موہن کچھ کہتا نتاشا نے موہن کے میٹے کشن کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''تمہاری یہ بہت بری عادت ہے کہ تم ہر بات اپنے ڈیڈ کو بتا دیتے ہو۔''

موہن کا بیٹا خاموش رہا لیکن وہاں موجود سب کی سمجھ میں سب کچھ آگیا تھا لیکن وسیم کی آنکھوں کی اداسی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''لکشمی کھانا بعد میں کھاتے رہیں گے فی الحال تو چائے ہی پلوا دو۔'' موہن نے ماحول کی گمبھیرتا کو کم کرنے والے انداز میں کہا لیکن اس سے پہلے کہ اس کی بیوی کچھ کہتی لکشمی کے ساتھ موجود خاتون آگے بڑھی۔

''میں سلویا ہوں۔'' اس نے انگریزی میں اپنا تعارف کرایا..... ''یہ میرا بیٹا احسان ہے۔'' اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے ایک بچے کو آگے بڑھایا۔

میں نے بچے سے ہاتھ ملا کر اسے پیار کیا لیکن یہ سوال ذہن میں ابھرا تھا کہ سلویا کا بیٹا ''احسان؟''

سلویا اور موہن کی بیوی نے کچن کا رخ کیا تو نتاشا اور دونوں لڑکے بھی وہاں سے ہٹ گئے۔

''ڈاکٹر سلویا کے شوہر نعمان کا تعلق انڈیا سے تھا، وہ تعلیم کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے تھے اور یہیں انہوں نے سلویا سے شادی کی لیکن یہ بات چھپائی کہ وہاں انڈیا میں بھی ان کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہے۔'' موہن نے شاید میری آنکھوں میں ابھرنے والے سوال کو پڑھ لیا تھا۔

''تو کیا.....؟'' میں اپنا سوال پورا نہ کرسکا۔

''ایک حادثے میں ان کا انتقال ہوا تب معلوم ہوا کہ انڈیا میں ان کی بیوی اور دو بچے ہیں۔'' موہن نے جواب میں کہا۔ ''سلویا نے اس انشورنس سے ملنے والی تمام رقم کے ساتھ ان سے وابستہ ایک ایک چیز اپنی سسرال کے حوالے کردی تھی۔'' موہن نے مزید وضاحت کی۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ آپ نتاشا کو آج کے بجائے ایک دو روز بعد..... اپنے ساتھ لے جائیں؟'' وسیم جو اس وقت تک خاموش تھا اچانک بول پڑا۔

''وسیم یہ بات تو طے ہے کہ.....'' موہن نے میرے کچھ کہنے سے قبل کہا لیکن وسیم ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''جس روز سے حقیقت میرے علم میں آئی تھی میں نے اسی روز سے نتاشا کو اپنے پاس ایک امانت سمجھا تھا۔'' وسیم کی آواز یہ کہتے ہوئے بھرا گئی۔ اس نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے کچھ دیر کے لیے اپنا چہرہ بھی دوسری جانب کرلیا تھا۔

''مجھے اعتراف ہے کہ میں نادرہ سے کیے گئے وعدے کو اس طرح پورا نہ کرسکا جس طرح مجھے کرنا چاہیے تھا لیکن شاید اس کے پیچھے بھی میری یہ خودغرضی شامل تھی کہ میں نتاشا کو خود سے جدا نہیں کرسکتا تھا۔'' وسیم نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیسا وعدہ.....؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''نادرہ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں پاکستان میں آپ کو تلاش کرکے نتاشا کو آپ کے حوالے کردوں گا اور میں نے کچھ کوشش بھی کی لیکن اس طرح نہیں کی جس طرح شاید مجھے کرنی چاہیے تھی۔'' وسیم نے کہا تو میں بے اختیار اپنی نظروں میں خود شرمندہ ہوگیا۔

ایک یہ شخص ہے کہ سب کچھ جاننے اور نادرہ کے اعتراف کے باوجود اس حد تک جارہا ہے کہ خود اپنے آپ کو

معاف نہیں کر رہا اور ایک میں ہوں کہ..... میں اس سے آگے نہیں سوچ سکا۔ میری نظروں کے سامنے نینا کا وہ چہرہ آ گیا جب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے دونوں ہاتھ معافی کے لیے میرے سامنے جڑے ہوئے تھے۔

''پہلے دبئی اور پھر جدہ میں وقت گزارنے کی وجہ سے میرے رابطے ختم ہو گئے تھے۔'' میں نے وسیم کے جواب میں کہا... لیکن وسیم سے مخاطب ہونے کے دوران بھی میرے ذہن پر نینا کا قبضہ رہا تھا۔

''مجھے اگر نادرہ سے جو ایک شکایت ہے وہ صرف اتنی ہے کہ کاش وہ مجھے بہت پہلے حقیقت سے آگاہ کر دیتی تو شاید میں کچھ بہتر کر سکتا تھا۔'' وسیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''جو کچھ ہمارے نصیبوں میں لکھا جا چکا ہے اسے تو پورا ہونا ہے۔'' میرے بجائے موہن نے کہا۔

''آپ نے میری گزارش کا جواب نہیں دیا۔'' وسیم نے مجھے مخاطب کیا۔

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان واپسی پر وہ میرے ساتھ ہو۔'' میں نے کہا تو وسیم کی آنکھوں میں تشکر اتر آیا۔

''آج پندرہ تاریخ ہے، اٹھارہ تاریخ تک ویزا لگوا کر میں اسے آپ کے پاس چھوڑ آؤں گا۔'' وسیم نے کہا۔

اس نے پندرہ تاریخ کسی خاص مقصد کے تحت نہیں کہا تھا لیکن میرے ذہن میں جیسے کوئی جھماکا سا ہوا... نصیر ایڈووکیٹ نے کہا تھا کہ میرے اور نینا کے درمیان طلاق کے مقدمے کی پیشی 16 تاریخ کو ہو گی۔

''وہاں اس وقت رات ہو رہی ہو گی۔'' میں نے فون کرنے سے پہلے گھڑی کی جانب نگاہ ڈالتے ہوئے ارادہ ملتوی کرنے والے انداز میں سوچا لیکن اس پر عمل نہیں کر سکا اور نمبر ڈائل کر دیا لیکن جب دوسری جانب سے جواب نہیں آیا تو میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

موہن کی بیوی چائے کے لوازمات کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی..... اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی جیسے وہ ماحول میں موجود تناؤ کو اپنی مسکراہٹ سے کم کرنا چاہ رہی ہو اور جب اس نے گفتگو کی تو وہ بھی اسی انداز سے کی تھی۔

''مجھے بھوک لگ رہی تھی تو میں نے سوچا کہ آپ لوگ بھی بھوک محسوس کر رہے ہوں گے۔'' اس نے ٹرالی ہمارے درمیان روکتے ہوئے کہا۔

''دراصل تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ کھانے میں ابھی دیر ہے۔'' موہن نے بھی تقریباً اسی کا انداز اپنایا۔

''کاش آپ میری باقی باتیں بھی اسی طرح سمجھ لیا کریں۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''یہ ممکن ہے کہ میں قبرستان.....'' میں اپنا فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔

''چائے پی لیں تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' موہن نے کہا۔

''میں بھی جاؤں گی۔'' نتاشا کی آواز آئی اور میں نے گھوم کر دیکھا، سلویا تینوں بچوں کو ساتھ لے کر داخل ہو رہی تھی اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شاید نتاشا نے ہم دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' موہن نے جواب دیا۔

موہن نے نتاشا کی بات مان لی تھی لیکن میں چاہتا تھا کہ میں تنہا وہاں جاتا اور تنہائی میں نادرہ سے باتیں کرتا، اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگتا۔ اس سے وہ تمام شکایتیں کرتا جو میں کبھی نہیں کر سکا تھا۔

چائے آئی اور ختم ہو گئی لیکن تینوں بچوں میں صرف نتاشا کو چائے پیتا دیکھ کر میں ایک بار پھر ماضی میں چلا گیا۔

''جتنی چائے تم پیتے ہو اس سے تو مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہارے جسم میں خون کے بجائے چائے گردش کرتی ہے۔'' نادرہ نے کہا تھا۔ وہ کافی کی رسیا تھی لیکن اس طرح نہیں جس طرح میں چائے کا دیوانہ تھا۔

''تم دراصل مستقل چائے بنانے کی مشقت سے بچنا چاہتی ہو۔'' میں نے کہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح صرف مجھے گھور کر رہ گئی تھی۔

''تم دیکھنا میں اپنے کسی بچے کو چائے کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دوں گی۔'' نادرہ نے کہا تو میں ہنس دیا تھا۔

''اگر وہ میرے بچے ہیں تو ان کی رگوں میں بھی چائے ہی دوڑے گی۔'' میں نے کہا اور پھر ہم دونوں ہی ہنس پڑے تھے۔

میرے فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک گیا... وکیل کا نمبر دیکھتے ہی میں نے فون ریسیو تو کر لیا لیکن وہاں موجود تمام افراد سے معذرت کرتا ہوا گھر سے باہر آ گیا تاکہ بہ آسانی بات کر سکوں۔

''آپ کا فون آیا تو میں اس وقت واش روم میں تھا۔'' وکیل صاحب نے میرے ہیلو کہتے ہی معذرت کی ..... ''ایک شادی میں شرکت کے لیے ہم سب حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ بس ابھی آدھ گھنٹا پہلے ہی پہنچے ہیں۔''

کوئی سوال کیے بغیر ہی اس نے کہنا شروع کر دیا تھا۔
''وکیل صاحب! میں نے کیس کے سلسلے میں فون کیا تھا۔'' میں نے اپنی بات شروع کرنی چاہی۔
''اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ انشاءاللہ تین پیشیوں میں ہی ہم کیس جیت لیں گے۔'' وکیل صاحب نے میری گفتگو کو درمیان میں سے اچک لیا۔
''میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اس کی تردید کرنی چاہی لیکن اس نے ایک بار پھر میرا فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا۔
''میں نے تو ان کے وکیل کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کورٹ کے باہر سمجھوتا کر لیں یا پھر خلع کا کیس کر دیں لیکن اس کا جواب تھا کہ آپ کی بیگم کا کہنا ہے کہ وہ خلع نہیں لیں گی چاہے طلاق میں ان کی کتنی ہی بدنامی ہو۔'' وکیل صاحب بغیر کچھ سنے بولتے ہی جا رہے تھے۔
''آپ کیس واپس لے لیں۔'' میں نے تمہید کو غیر ضروری جان کر براہ راست بات کرنا مناسب سمجھا۔
''جی!'' وکیل صاحب کی حیرت زدہ سی آواز میرے کانوں میں آئی۔
''آپ کل ہی کیس واپس لے لیں۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔
''آپ سے ان کا رابطہ ہوا ہے کیا؟'' وکیل کا لہجہ بجھا بجھا سا ہو گیا۔
''انہوں نے رابطہ نہیں کیا لیکن میں ان سے رابطہ کروں گا۔'' میں نے جواب میں کہا اور اس کے ساتھ ہی لائن کاٹ دی۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چکا تھا اب مزید کسی سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔
میرا نینا کو فون کرنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن وکیل سے بات کرتے ہوئے میں کہہ چکا تھا کہ میں ان سے رابطہ کروں گا شاید اس لیے غیر ارادی طور پر میں نینا کے نمبر ڈائل کرتا چلا گیا۔
دوسری جانب پہلی بیل ہوئی تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ نینا تو جلدی سو جانے والے لوگوں میں سے تھی۔ لیکن دوسری بیل کے ساتھ ہی اس نے فون اٹھا لیا۔
''رضا؟'' اس نے سوالیہ انداز میں میرا نام لیا تھا۔
''تم جاگ رہی ہو؟'' میں نے سوال کے جواب میں سوال دہرایا۔
''معاف نہ کرو رضا لیکن مجھے خود سے دور نہ کرو۔''
نینا نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
''صبح گھر چلی جانا۔'' میں نے کہا تو وہ جیسے سکتے میں آ گئی۔
''میں نے وکیل سے کہہ دیا ہے وہ کیس واپس لے لے گا۔'' اس کی خاموشی کے دوران میں نے کہا۔
''رضا! آپ اجازت دیں تو میں ابھی.....'' وہ اس سے آگے نہیں کہہ سکی۔
''رات خاصی ہو چکی ہے۔'' میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے میرا فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا۔
''میری تو صبح ہو گئی ہے رضا۔'' اس نے کہا... اس کے ہر لفظ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔
''جیسا تم مناسب سمجھو۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔
میں نے دوبارہ ڈائل کیا لیکن دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا صرف بیل ہوتی رہی۔ جس طرح سے لائن کٹی تھی اور جس طرح وہ جواب نہیں دے رہی تھی، وہ باعث تشویش تھا لیکن کوئی دوسرا راستہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔
میں ابھی باہر ہی تھا کہ موہن اور نتاشا مجھے باہر آتے ہوئے دکھائی دیے.... اور میں اپنی تشویش کے باوجود لائن کاٹنے پر مجبور ہو گیا۔
''میں کار نکالتا ہوں۔'' موہن نے کہا اور یہ کہتے ہوئے اپنے گھر کے باہر موجود کار کی جانب بڑھ گیا جبکہ نتاشا میرے پاس رک گئی۔
''آپ کا ڈرائیور یہیں باہر رکے گا؟'' نتاشا نے سوال کیا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔
.....''موہن انکل نے اس سے گھر میں بیٹھنے کے لیے کہا تھا تو اس نے انکار کر دیا تھا بلکہ چائے تک نہیں پی.....'' نتاشا نے وضاحت کی تو... میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔
موہن کے ساتھ روانہ ہونے سے قبل میں نے رضوان کو ہدایات دی تھیں۔ میرے لہجے سے اس کے چہرے پر اطمینان دیکھا جا سکتا تھا۔
ہم خاموشی سے وہاں سے روانہ ہوئے لیکن پھر یہ خاموشی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکی... میرے فون کی بیل بجی اور نمبر دیکھتے ہی میں نے فوراً فون ریسیو کیا۔
''میں بول رہا ہوں رضا۔'' دوسری جانب نینا کے والد تھے۔
''نینا کہاں ہے؟'' میں نے بے اختیار سوال کیا۔

''وہ ٹھیک ہے اور نماز پڑھ رہی ہے۔'' انہوں نے مختصراً جواب دیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''میں کچھ دیر بعد فون کرلوں گا۔'' میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔

''میں جب تک زندہ رہوں گا رضا..... تمہارا یہ احسان نہیں بھلا سکوں گا۔'' انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ نے اب تک مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی اس لیے بہتر ہوتا کہ.....'' میں نے انہیں مزید کچھ کہنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک بار پھر انہوں نے میرا فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

''کچھ نہ کہنے کا سبب یہ تھا کہ میں تمہیں غلط نہیں سمجھتا تھا۔'' انہوں نے درمیان سے بات اچک لی تھی۔

''کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ چند روز بعد جب میں پاکستان پہنچ جاؤں تب ہم بات کریں؟'' میں نے انہیں مزید گفتگو سے روکنے کی ایک اور کوشش کی اور اس بار میں کامیاب ہوگیا۔

''نینا کو اس کے گھر تک چھوڑنے میں خود جاؤں گا اور جب تم آؤ گے تو ائرپورٹ پر لینے بھی آؤں گا۔'' انہوں نے بھی بات ختم کی۔

وہ دونوں خاموشی سے میری گفتگو سنتے رہے لیکن جیسے ہی میں نے فون آف کیا، موہن بول پڑا ....''نینا آپ کی وائف کا نام ہے؟''

''جی!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''آپ کے بچے.....'' موہن نے اس انداز میں سوال کیا تھا جیسے اسے خطرہ ہو کہ میں اس کے سوال کا برا نہ مان لوں۔

''چند ماہ پہلے ڈاکٹرز نے بتایا تھا کہ نینا کے ماں بننے میں کچھ رکاوٹیں ہیں۔'' میں نے بہت سی باتیں چھپاتے ہوئے جواب میں کہا۔

موہن نے جواب میں کچھ کہا نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر ایک اطمینان سا میں نے محسوس کیا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہیں لگا تھا لیکن میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

''بابا! ایک سوال کرسکتی ہوں؟'' نتاشا نے کہا تو میں نے گھوم کر اسے دیکھا۔

''نینا آنٹی جاب کرتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہماری ایک گارمنٹ فیکٹری ہے جس میں پروڈکشن والا کام وہ سنبھالتی ہیں لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا؟'' میں نے جواب دینے کے ساتھ ساتھ سوال کردیا۔

''آپ نے پوچھا تھا کہ نینا کہاں ہے؟'' نتاشا نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

''وہاں اس وقت رات ہے اور وہ نماز پڑھ رہی تھی۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ وہاں رات ہوگی۔'' نتاشا نے جواب میں کہا اور ایک لمحے کے لیے رکی بھی تھی۔ ''ماں مجھے پاکستان کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی ہیں اتنا بہت کہ پاکستان میں مجھے اجنبیت نہیں ہوگی۔'' نتاشا نے بات مکمل کی۔

ہم قبرستان پہنچے تو موہن نے گاڑی میں رکنا مناسب سمجھا۔

''آپ دونوں ہو آئیں۔ میں یہیں انتظار کروں گا۔'' اس نے کہا تو میں نتاشا کے ساتھ اترا۔

''بابا میری درخواست ہے کہ آپ ماں کی قبر پر رونا نہیں۔'' اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کیوں.....؟'' میں پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔

''ماں نے کہا تھا کہ جب تم اپنے بابا کے ساتھ آنا تو انہیں رونے نہیں دینا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تھامنے میں سختی آگئی تھی۔

''کب کہا تھا؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''ڈیتھ سے ایک روز پہلے۔ جب میں اور وہ اکیلے تھے۔'' نتاشا کا جواب تھا۔

جتنی دیر ہم اس قبر پر رہے نتاشا میرا ہاتھ تھامے رہی۔ جیسے وہ ''ماں'' کو دکھا رہی ہو کہ جو کچھ وہ کہہ گئی تھی اس پر وہ پوری طرح عمل کر رہی ہے۔ ہم واپس ہوئے تو میں نے نتاشا کے چہرے پر ایک اطمینان دیکھا۔

''ماں کی ایک اور بات میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔'' نتاشا چلتے چلتے رک گئی۔

''وہ کیا.....؟'' میں بھی اس کے ساتھ ہی رک گیا۔

''ماں نے کہا تھا کہ پاکستان میں آپ کسی کو نہ بتائیں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں ورنہ وہاں کا معاشرہ مجھے قبول نہیں کرے گا۔'' نتاشا نے کہا تو میں صرف اسے دیکھتا رہا۔

''ماں نے کہا تھا۔'' نتاشا نے وضاحت کی۔

''شاید اس نے صحیح کہا تھا لیکن نینا کو میں یہ سچ بتاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس سچ کو اپنے تک رکھے گی۔'' میں نے کہا تو نتاشا نے کچھ نہیں کہا۔

واپس ہوئے تو موہن کار کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا... اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوگیا لیکن اس بار ہمارا موضوع میرا بزنس تھا۔

''میری بیوی کے بھائیوں کی یہاں ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کی چین ہے۔ وہ انڈیا اور بنگلا دیش سے امپورٹ کرتے ہیں، آپ چاہیں تو میں ان سے آپ کی ملاقات کروا سکتا ہوں۔'' موہن نے ایک نئے موضوع کا آغاز کیا۔

میں رات میں وسیم کے گھر سے واپس آیا تو بہت سے معاملات طے ہوگئے تھے۔ یہ بھی کہ نتاشا کی ولدیت وہی رہے گی جو اس کے اسکول میں درج ہے۔ اپنے خاندان سمیت میں ہر جگہ یہی کہوں گا کہ وہ نادرہ کی بیٹی ہے جس کی وفات کے بعد اس کے شوہر نے دوسری شادی کرلی تھی اس لیے میں اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ یہ بھی کہ نتاشا فلائٹ سے کچھ گھنٹے قبل ہی میرے پاس آئے گی اور ہم ایک ہی فلائٹ میں پاکستان جائیں گے لیکن میں روز رات کا کھانا ان لوگوں کے ساتھ کھاؤں گا۔

رات واپسی کے سفر میں میری کوشش تھی کہ نینا سے بات کرلوں لیکن بات ہو نہ سکی کیونکہ گھر منتقل ہونے کے بعد وہ سو رہی تھی لیکن پھر اگلے روز اس نے خود ہی فون کر دیا۔ اس کی آواز میں شرمندگی تھی۔

''ملازمین نے بتایا ہے کہ آپ فون کرتے رہے ہیں لیکن میں سوتی رہی۔'' نینا نے کہا۔

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے لیکن اس سے پہلے میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا لیکن اس نے فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں رضا۔'' نینا نے جیسے تڑپ کر کہا۔

''پہلے میری بات سکون سے سن لو اور پھر یہ فیصلہ کرنا کہ تم میں مجھے معاف کرنے کا حوصلہ ہے، مجھے میری غلطیوں..... میرے گناہوں سمیت اپنانے کا حوصلہ ہے تو.....'' میں کہتے کہتے رکا تو وہ ایک بار پھر بول پڑی۔

''میں پورے سکون سے آپ کی بات سنوں گی لیکن فیصلہ میں ابھی سنا دیتی ہوں۔'' اس نے کہا تو میری جیسے سانس رک گئی۔

''میں ہر حالت میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' اس نے فیصلہ سنا دیا۔

''جلد بازی نہ کرو، پہلے میری پوری کہانی سن لو۔'' میں نے اسے فیصلے سے روکتے ہوئے کہا۔

''جی بہتر.....'' اس نے کہا اور میں یہ سوچنے لگا کہ ابتدا کہاں سے کروں۔

میں نے کہنا شروع کیا تو پھر کہتا چلا گیا، پوری تفصیل کے ساتھ..... تمام جزئیات سمیت اور وہ خاموشی سے سنتی رہی تھی، میں اپنی بات مکمل کر چکا تب بھی اس کی جانب سے کچھ دیر خاموشی رہی۔

''میرا فیصلہ اب بھی وہی ہے رضا۔'' کچھ لمحوں بعد اس کی اعتماد میں ڈوبی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔ .....''جو کچھ ہوا اسے ہم ایک خواب سمجھ کر بھول جاتے ہیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی، ہر لفظ کے ساتھ اس کی آواز کا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔

''ایک ایسی زندگی جس میں آپ ہوں گے..... میں ہوں گی اور ہم دونوں کی بیٹی نتاشا ہوگی۔'' وہ خاموش ہوئی تو جیسے میرے سینے سے ایک بوجھ اتر گیا۔

نینا سے بات کرنے کے چھ روز بعد ہم پاکستان کے لیے روانہ ہوئے..... دبئی ائرپورٹ کے ٹرانزٹ تک نتاشا نے پلک نہیں جھپکائی تھی لیکن دبئی سے جہاز روانہ ہوا تو اس کا سر میرے کاندھوں پر آ کر ٹک گیا۔

''اب جب یہ آنکھ کھولے گی تو اس کی بھی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔'' میں نے نیند میں ڈوبی اپنی بیٹی کو دیکھ کر سوچا اور تب ہی وہ نیند میں مسکرائی، خواب کا کوئی حسین لمحہ تھا شاید اس کا.....

''بلّے ماں!'' وہ نیند میں بڑبڑائی تھی۔ ''ڈونٹ وری آئی ول بی ہیپی!'' وہ کہہ رہی تھی۔

''میں خوش رہوں گی..... آپ بھی اپنا خیال رکھنا۔'' وہ یہ کہہ کر کسمسائی... اور تب ہی ائرہوسٹس کی آواز کانوں میں آئی۔ وہ کچھ دیر بعد ائرپورٹ پر اترنے کی نوید دے رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی نتاشا نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

''ہم کراچی پہنچنے والے ہیں۔'' میں نے اس خواب کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد کہا۔

.....''تمہاری نینا آنٹی ائرپورٹ پر تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''آنٹی نہیں، ماں۔'' اس نے جواب میں کہا تو میں خاموش ہوگیا۔

ooo

میں نے کھڑے ہو کر اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ ماحول نہایت خوب صورت تھا۔ حالانکہ قبرستان میں تو ویرانے ہوتے ہیں لیکن مجھے اس جگہ سے ایک عجب لگاؤ تھا۔ جب سے زیبو یہاں آ بسی تھی، میں اکثر یہاں آ جاتا اور اس کی آرام گاہ کو بناتا، سنوارتا رہتا۔ کبھی کبھی ہمارے درمیان مکالمہ بھی ہو جاتا لیکن اگر کوئی مجھے یہاں بیٹھے، زیبو سے باتیں کرتا دیکھتا تو شاید اسے یہی گمان گزرتا کہ میں خود کلامی میں مصروف ہوں۔ اب یہ ساعتیں ہی میری زندگی کا حاصل تھیں۔ آج بھی میں اسی لیے

دھند

سلیم اختر

چاروں جانب پھیلی دُھند عموماً دو طرح سے کام کرتی ہے ایک تو وہ دوسروں کی نگاہوں پر پردہ سا ڈال دیتی ہے اور دوسرے دُھند کی اس چادر میں کسی نہ کسی کو تحفظ مل جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ بھی دنیا کی بیشتر آنکھوں سے اوجھل تھا مگر کوئی تو تھا جو اس کی اصلیت سے واقف تھا۔

بعد از مرگ بھی ساتھ نبھانے والی شریک حیات کا قصہ

یہاں چلا آیا تھا اور کافی دیر سے مٹی ہٹا رہا تھا۔ میں نے اس مٹی کا کافی حصہ ہٹا دیا تھا جو کہ اتنے برسوں میں، میں یہاں ڈال چکا تھا۔ بے ترتیب سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے میں کسی ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح مٹی کے باقی ماندہ ڈھیر پر گر گیا۔ مٹی جو وطن کی ہو تو حفاظت کے لیے خون، کھیت کی ہو تو پسینا اور قبر کی ہو تو آنسو مانگتی ہے۔ میں یہاں چند لمحوں کے لیے ہی آیا تھا۔ ان احساسات کے ساتھ جیسے کوئی اپنے عزیز سے آخری ملاقات کرنے آتا ہے۔ میں نے مٹی کے اس ڈھیر پر سر ٹیکتے ہوئے بڑی آہستگی سے پکارا۔

''زیبو!'' جواب میں خاموشی رہی۔ اس خاموشی نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے چند لمحوں کے بعد پھر آواز دی۔

''زیبو! میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ آخری مرتبہ۔''

''تم تو یہ بات ایسے کہہ رہے ہو جیسے ہمیشہ صرف مجھ ہی سے ملنے آتے ہو۔'' جانے یہ آواز قبر کے اندر سے آئی تھی یا میرے اندر کسی نے کچھ کہا تھا۔

''میں ہمیشہ صرف تم سے.....'' اس آواز نے تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جھوٹ بالکل جھوٹ، تم یہاں صرف خیر وشاہ سے پڑیا لینے آتے ہو۔ میں تو بس راستے کا ایک پڑاؤ ہوں جہاں تم کچھ دیر سانس لینے کو ٹھہر جاتے ہو۔'' زیبو کی اس بات پر میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اس کی آواز میں وہی بے خوفی، طنز اور صاف گوئی تھی جس کے باعث میں اکثر زیبو سے جھگڑ پڑتا تھا۔ اس میں تو خیر کوئی شک نہیں کہ میں اکثر خیر وشاہ سے پڑیا لینے کے چکر میں ادھر آتا رہا ہوں مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب زیبو زندہ تھی۔ مجھے ہمیشہ قبرستان میں بیٹھ کر نشہ کرنے سے چڑ رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بڑی بدذوقی کی بات تھی۔ میں نے قبرستان میں پی بھی اور نہ ہی کبھی مجھے اس کا خیال آیا تھا۔ ان دنوں میرے ٹھکانے اور ہی ہوتے۔ کبھی کسی سنسان پارک کا کوئی گوشہ تو کبھی کسی یار کی کوٹھری۔ ہم پانچ سات دوست اکٹھے ہو کر چوکڑی جماتے، دھواں اڑاتے اور خوب خوب لطف اٹھاتے۔ وہ بھی کیا فراغت اور آسودگی بھرے دن تھے۔ میرے رکشے کا پہیا خوب دوڑتا اور اسی رفتار سے میری جیب تنگ ہوتی جاتی۔ گھر میں تو مجھے وہی رقم دینی ہوتی جو میں دیتا آیا تھا۔ کبھی کبھی سوچتا بھی کہ زیبو کا ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ اسے کچھ اوپر سے بھی دے دیا کروں لیکن پھر یہ سوچ کر باز رہتا کہ مبادا عادت بگڑ جائے۔

سارے دن کی محنت کے بعد یاروں کے ساتھ یہ کچھ دیر کی محفل تو بہر حال میرا حق تھا۔ اکثر گھر پہنچنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ زیبو کو تو روز ہی شدت سے میرا انتظار رہا کرتا تھا۔ وہ پوچھتی۔

''نہیم! اتنی دیر کہاں رہے ہو؟''

''ہواؤں میں۔'' میں ہنس کر جواب دیتا۔

''کیا مطلب؟'' اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔

''میری جان، پہلی بات تو یہ کہ میں دوسروں کی طرح رکشا زمین پر نہیں چلاتا بلکہ ہواؤں میں اڑاتا ہوں۔ دوم یہ کہ سارا دن اپنے لیے تمہارے لیے اور اپنے ان ننھے منے بچوں کے لیے میں جو خواب دیکھتا ہوں، ان کی تعبیریں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔'' میری اس بات سے وہ مطمئن نہ ہو پاتی۔ اکثر وہ مجھ سے الجھ پڑتی کہ میں اتنے زیادہ کی ہوس کیوں کرتا ہوں۔ مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے وہ یہ بات جانتی ہو کہ میں اس رقم سے کہیں زیادہ کماتا ہوں جتنی میں اسے دیا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ غور سے میرا چہرہ تکنے لگتی تو میں گھبرا کر اپنا چہرہ پھیر لیتا کہ کہیں اسے میرا چہرہ ہی سب کچھ نہ بتا دے۔

میں ایک زمانے سے اپنے اندر جو زہر اتار رہا تھا، آخر آہستہ آہستہ اس نے ظاہر ہونا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجھے اب نہ اپنے خواب یاد تھے، نہ زیبو اور نہ ہی پیارے پیارے معصوم بچے۔ اب تو میری بس ایک ہی طلب تھی، پڑیا..... جسے حاصل کرنے کے لیے مجھے بڑے جتن کرنے پڑتے۔ جب نشہ ٹوٹنے لگتا تو رفتہ رفتہ اعضا ڈھیلے پڑنے شروع ہو جاتے اور پھر میں بالکل ہی ناکارہ ہو جاتا۔ اور بس یہی نہیں جب اور دیر ہوتی تو میری نس نس میں جیسے کوئی چھری چلانے لگتا۔ ایسی اینٹھن، وہ درد کہ الامان میری چیخیں نکل جاتیں۔ اس کیفیت میں میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم پڑیا بن جاتی اور پڑیا مفت میں تو ملتی نہیں، اس کے لیے تو مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جب تک ہاتھ پیروں میں جان تھی، اس وقت تک تو خیر کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن یہ ظالم نشہ تو بدن سے لہو بھی کھینچ لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ میرے جسم میں اتنی جان بھی نہ رہی کہ میں رکشا سنبھال سکتا۔ اب ظاہر ہے جب رکشا کے پہیے رک گئے تو میری سانس بھی اٹکنے لگی۔ رحمت خان کب تک صبر کرتا۔ آخر ایک دن وہ بھی رکشا لے گیا۔ اب گویا میں ہر چیز سے محروم ہو گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ ہیروئین بڑا موذی نشہ ہے مگر جب پہلی بار ہیروئین کا سگریٹ پیا تو وہ لطف آیا کہ بس۔ خواب جیسے رنگین ہو گئے۔ میں سگریٹ سلگاتا اور پھر خیالوں ہی خیالوں میں کسی تاج محل کی تعمیر شروع ہو جاتی۔ میں دیکھتا کہ زیبو محل میں رانیوں کی طرح راج کر رہی ہے۔ خواب تو بس

''میں ہمیشہ صرف تم سے.....'' اس آواز نے تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جھوٹ بالکل جھوٹ، تم یہاں صرف خیر وشاہ سے پڑیا لینے آتے ہو۔ میں تو بس راستے کا ایک پڑاؤ ہوں جہاں تم کچھ دیر سانس لینے کو ٹھہر جاتے ہو۔'' زیبو کی اس بات پر میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اس کی آواز میں وہی بے خوفی، طنز اور صاف گوئی تھی جس کے باعث میں اکثر زیبو سے جھگڑ پڑتا تھا۔ اس میں تو خیر کوئی شک نہیں کہ میں اکثر خیر وشاہ سے پڑیا لینے کے چکر میں ادھر آتا رہا ہوں مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب زیبو زندہ تھی۔ مجھے ہمیشہ قبرستان میں بیٹھ کر نشہ کرنے سے چڑ رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بڑی بدذوقی کی بات تھی۔ میں نے قبرستان میں پی تھی اور نہ ہی کبھی مجھے اس کا خیال آیا تھا۔ ان دنوں میرے ٹھکانے اور ہی ہوتے۔ کبھی کبی سنسان پارک کا کوئی گوشہ تو کبھی کسی یار کی کوٹھری۔ ہم پانچ سات دوست اکٹھے ہو کر چوکڑی جماتے، دھواں اڑاتے اور خوب خوب لطف اٹھاتے۔ وہ بھی کیا فراغت اور آسودگی بھرے دن تھے۔ میرے رکشے کا پہیا خوب دوڑتا اور اسی رفتار سے میری جیب تنگ ہوتی جاتی۔ گھر میں تو مجھے وہی رقم دینی ہوتی جو میں دیتا آیا تھا۔ کبھی کبھی سوچتا بھی کہ زیبو کا ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ اسے کچھ اوپر سے بھی دے دیا کروں لیکن پھر یہ سوچ کر باز رہتا کہ مبادا عادت بگڑ جائے۔

سارے دن کی محنت کے بعد یاروں کے ساتھ یہ کچھ دیر

میں ایک زمانے سے اپنے اندر جو زہر اتار رہا تھا، آخر آہستہ آہستہ اس نے ظاہر ہونا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجھے اب نہ اپنے خواب یاد تھے، نہ زیبو اور نہ ہی پیارے پیارے معصوم بچے۔ اب تو میری بس ایک ہی طلب تھی، پڑیا..... جسے حاصل کرنے کے لیے مجھے بڑے جتن کرنے پڑتے۔ جب نشہ ٹوٹنے لگتا تو رفتہ رفتہ اعضا ڈھیلے پڑنے شروع ہو جاتے اور پھر میں بالکل ہی ناکارہ ہو جاتا۔ اور بس یہی نہیں جب اور دیر ہوتی تو میری نس نس میں جیسے کوئی چھری چلانے لگتا۔ ایسی اینٹھن، وہ درد کہ الامان میری چیخیں نکل جاتیں۔ اس کیفیت میں میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم پڑیا بن جاتی اور پڑیا مفت میں تو ملتی نہیں، اس کے لیے تو مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جب تک ہاتھ پیروں میں جان تھی، اس وقت تک تو خیر کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن یہ ظالم نشہ تو بدن سے لہو بھی کھینچ لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ میرے جسم میں اتنی جان بھی نہ رہی کہ میں رکشا سنبھال سکتا۔ اب ظاہر ہے جب رکشا کے پہیے رک گئے تو میری سانس بھی اٹکنے لگی۔ رحمت خان کب تک صبر کرتا۔ آخر ایک دن وہ بھی رکشا لے گیا۔ اب گویا میں ہر چیز سے محروم ہو گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ ہیروئین بڑا موذی نشہ ہے مگر جب پہلی بار ہیروئین کا سگریٹ پیا تو وہ لطف آیا کہ بس۔ خواب جیسے رنگین ہو گئے۔ میں سگریٹ سلگاتا اور پھر خیالوں ہی خیالوں میں کسی تاج محل کی تعمیر شروع ہو جاتی۔ میں دیکھتا کہ زیبو محل میں رانیوں کی طرح راج کر رہی ہے۔ خواب تو بس

خواب ہوتے ہیں نا اور اب تو میں اس قدر بے بس ہو چکا تھا کہ میرے خواب بھی پڑیا میں بند ہو گئے تھے۔

جب پہلی بار زیبو کو میری اس حرکت کا پتا چلا تو وہ تو جیسے اسی لمحے مر گئی مگر میری زیبو اتنی خوش نصیب کب تھی کہ اتنی آسان موت مر سکتی۔ اس رات وہ دیر تک میلے کچیلے تکیے میں منہ دیے روتی رہی مگر رونے دھونے کا وقت تو اب گزر چکا تھا۔ کچھ دن تو اس نے بک بک، جھک جھک کی مگر پھر آہستہ آہستہ عادی ہوتی چلی گئی۔ آخر اب اس نے چپ رہنا سیکھ لیا تھا۔ نشہ صرف نشئی کو ہی شکار نہیں کرتا بلکہ اس کے گھر میں بھی بھوک، محرومی اور دکھ کی فصل بو دیتا ہے۔ میرے بچے بھی چیزوں کو ترسنے لگے۔ زیبو کا چولہا ٹھنڈا رہنے لگا اور اس کے چہرے پر زردی اور آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے مگر میں پڑیا کے حصار میں تھا۔ ان دنوں مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

زیبو کو شاید پہلے سے اندازہ تھا کہ یہ دن بھی آنے ہیں۔ اس نے سلائی مشین کے سہارے گھر کا خرچہ اپنے ذمے لے لیا۔ ایک احساس جو کبھی کبھی سر اٹھا کر مجھے اپنے گھر کے افراد کے لیے ذلیل کیا کرتا تھا، زیبو کی کمائی کے نوالے کھا کر اس نے بھی دم توڑ دیا تھا۔ مجھے جیسے نیند سی آ گئی تھی۔ میں بے فکری کے دن گزارنے لگا، ہاں ابتدا میں کچھ دن پڑیا کی فکر نے ضرور ستایا مگر زیبو سے پیسے چھین کر میں نے اس مشکل پر بھی قابو پا لیا۔ میں نے زیبو کو تو زندگی میں کبھی کچھ نہیں دیا لیکن ہاں ہمیشہ اس کے حلق سے نوالے ضرور چھینے۔ وہ شاید دوسروں کو سکھ دینے کے لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔ راتوں کی نیند، دن کا آرام، اپنی آنکھوں کا نور سب کچھ ہی تو وہ دیتی رہی اور آخر ایک دن اس نے جان بھی وار دی۔ لوگ پتا نہیں کیا کیا کہتے رہے کہ وہ کیسے مری، کیوں مری لیکن حقیقت صرف میں جانتا تھا۔ وہ لمحہ لمحہ ایک نئے عذاب سے لڑ لڑ کر تھک گئی تھی۔ آخر کب تک لڑتی۔ بالآخر وہ ہمت ہار گئی۔

کچھ دن بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ اکیلی نہیں مری بلکہ اپنے تین بچوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مار گئی تھی۔ زندگی کی حرارت جیسے باقی ہی نہیں رہی تھی۔ دھواں چولہے سے نکلے تو مکینوں کے پیٹ کی آگ بجھتی ہے لیکن جب وہ میری پڑیا سے نکلتا تو میں اس دھوئیں سے اپنے خیالات کے مطابق شکلیں بناتا۔ انہیں ہر روز ایک نئے رنگ میں دیکھتا، اگرچہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سراب ہے مگر پھر بھی اس کے پیچھے بھاگنا مجھے اچھا لگتا۔ کافی دنوں سے نہ تو میرے گھر کے چولہے سے دھواں اٹھا ہے اور نہ ہی میری پڑیا سے، مگر اتنی بربادی کے باوجود دھوئیں کی طلب میرے اندر اب بھی زندہ ہے۔ تب ہی تو آج قدرت نے ایک سمبل پیدا کر دی اور اسی وجہ سے آج میں زیبو کی قبر کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ جگہ بدنصیب زیبو کی آخری آرام گاہ ہے اور انتہائی خوب صورت جگہ پر واقع ہے۔ یہ جگہ اتنی خوبصورت ہے کہ میں آج تک حیران ہوں کہ زیبو کو زندگی میں تو کوئی اچھا گھر نہ مل سکا مگر مرنے کے بعد قبر کے لیے اتنی اچھی جگہ کیسے مل گئی؟

اس سارے قبرستان میں اتنی پُرسکون اور حسین جگہ کہیں کوئی اور نہیں تھی۔ میں اکثر قبرستان کا حساب کتاب رکھنے والے منشی سے فخریہ انداز میں کہا کرتا تھا کہ اتنی خوب صورت جگہ کسی اور کی بیوی کو نصیب نہیں ہوگی۔ منشی سمجھتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے بے انتہا محبت ہے جب ہی تو میں یہاں کافی ٹائم گزارتا ہوں مگر شاید آج کے بعد وہ بھی مجھے یہاں نہ دیکھ سکے۔ ''زیبو.....'' میں پھر پکارنے لگا۔ ''زیبو کچھ تو کہو۔ خدا کے واسطے کچھ تو بولو۔'' جواب میں قبرستان کا سناٹا مجھے پھر سے چبھن کرنے لگا۔ میں نے پھر خاموشی توڑی۔ ''زیبو تو واقعی اچھی بیوی تھی۔ اتنی اچھی کہ مرنے کے بعد بھی میرے کام.....'' میرا جملہ پورا نہ ہو سکا۔ کسی نے میرا کندھا زور زور سے ہلایا۔ میں نے نم آنکھوں سے سر اٹھا کر دیکھا اور تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہی قبرستان کا منشی اور ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی گردن اکڑائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے، کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے گرد آلود ہاتھوں سے آنسو پونچھے۔ سیٹھ صاحب تعریفی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے آخر بولے۔

''ٹھیک ہے۔ یہ جگہ بالکل ٹھیک رہے گی۔'' پھر انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو مگر آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا اور نہ ہی کسی کو بتانا کہ تمہاری بیوی کی قبر کبھی یہاں ہوا کرتی تھی۔ یہاں اب میری بیوی کی قبر بنے گی۔ شان دار اور اس کے اسٹیٹس کے مطابق۔'' میں نے مزید کچھ سنے بغیر وہ نوٹ جھپٹ لیے۔ مجھے ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آ رہا تھا۔ زندگی کا دھواں۔ حتیٰ کہ زیبو کی قبر بھی دھوئیں میں کہیں گم ہو گئی۔ اس نے مرنے کے بعد بھی میری مدد کی تھی۔ میرا ساتھ دیا تھا مگر..... اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں زندگی کے بارے میں بدنصیب ہوں کہ اپنی زندگی دھوئیں میں اڑا دی یا خوش نصیب ہوں کہ زیبو جیسی شریکِ حیات ملی تھی۔

⌘⌘⌘

ساشا

عمر عبداللہ

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر
عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دادا باپ کا
بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی
تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا
سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے
اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب
دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے
خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کے "آگاہ" رہنے کی صلاحیت
کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ
چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں
زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی
رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل
نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور
آنکھوں میں سنہرے خواب تھے جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل
مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

اس نے ایک تحیر کے عالم میں دور تک پھیلے ریت کے بے کراں سمندر کو دیکھا۔ سنہری ریت سورج کی روشنی میں سونے کے ذرات کی طرح چمک رہی تھی اور اس منظر کو دیکھتی اس کی آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔ اس کے لیے یہ کوئی خوش کن منظر نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی طے شدہ منصوبے کے تحت اس صحرا کی خاک چھاننے نہیں آیا تھا کہ اس کے پاس اس صحرا کو زیر کرنے کے سارے لوازم موجود ہوتے۔ وہ تو ایک پریشان حال اور تھکا ہارا مسافر تھا، نہ جانے کیسے اس صحرا کی طرف نکل آیا تھا اور اب کھڑا تذبذب میں مبتلا تھا کہ کیسے اس تپتی ریت کے سمندر میں اپنی بقا کی جنگ لڑے گا۔ وہ سچ مچ حالتِ جنگ میں تھا اور اس کے جانی دشمن خون آشام بلاؤں کی طرح اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وقتی طور پر وہ اپنے دشمنوں کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس جدوجہد میں اس نے اپنے وفادار گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا تھا اور اجنبی راستے کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا بالکل اچانک اس صحرا میں نکل آیا تھا۔ وہ جن راستوں سے گزر کر یہاں پہنچا تھا، وہ بھی کوئی ایسے آسان نہیں تھے اور حقیقتاً ان راستوں پر سفر کرتے ہوئے اس کے اور اس کے گھوڑے کے جسم سے تیل نکل آیا تھا۔ سنگلاخ چٹانیں، غیر ہموار پگڈنڈیاں، خطرناک موڑ، بپھرتی ندیاں جانے کیا کچھ تھا جنہیں عبور کر کے وہ یہاں پہنچا تھا اور جہاں پہنچا تھا اس جگہ کو دیکھ کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ جن صعوبتوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے اس سے کہیں زیادہ صعوبتیں اس کی منتظر ہیں۔

صحرا کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے اور ایک ایسے شخص کے لیے جو صحرا میں سفر کے رمز ہی نہ جانتا ہو، صحرا کسی بہت بڑے عفریت سے کم نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس کی..... بے کراں وسعتوں میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن اس کے پاس واپس پلٹنے کا راستہ بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ واپس پلٹتا تو ان خون آشام بلاؤں کو اپنے سامنے پاتا جن سے اب تک وہ بڑی کامیابی سے بچتا چلا آ رہا تھا۔ راستے میں کئی مقام ایسے آئے جہاں اس نے ان بلاؤں کی آہٹیں اپنے بہت قریب سے سنیں اور اسے لگا کہ وہ شکار کر لیا جائے گا لیکن پھر اس کی قسمت نے یاوری کی اور وہ انہیں جُل دے کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک جگہ تو انہوں نے سچ مچ اسے گھیر ہی لیا تھا اور اس نے خود کو ان کے نیزوں، بھالوں اور تلواروں کی زد پر پایا تھا لیکن پھر اس کی فطری بہادری عود کر آئی۔ اس کے اندر کوئی برق سی کوندی اور اس نے اتنی برق رفتاری سے اپنی تلوار کو حرکت دی کہ ان کا حصار توڑ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس موقع پر اس کے وفادار گھوڑے نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اسے لیے ہوئے تیر کی طرح دشمنوں کے حصار سے نکلا تھا۔ وہ بھی کچھ ایسی فنکاری سے کہ اپنی پیٹھ پر بیٹھے متحرک سوار کو اپنی پیٹھ سے گرنے نہیں دیا تھا۔ دشمنوں کا حصار توڑ کر بھاگ نکلنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس کوشش میں خود اسے اور اس کے گھوڑے کو بھی چند زخم آئے تھے لیکن اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ ان زخموں کی مرہم پٹی کے بارے میں سوچ سکتا۔ وہ گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا تھا اور اس کی سرتوڑ کوشش ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ تعاقب میں آتے دشمنوں کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اسے آنے والے زخموں میں سے کوئی بھی زخم اتنا گہرا نہیں تھا کہ حد سے زیادہ جریانِ خون کا سبب بنتا۔ زخموں سے خون بہا ضرور تھا لیکن اپنی قدرتی خصوصیت کے مطابق جم کر مزید بہنے سے رک گیا تھا۔ جان بچا کر بھاگتے ہوئے تو اسے ان زخموں کی تکلیف کا بھی احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب اپنے دشمنوں سے کافی فاصلے پر نکل آنے کے خیال سے شاید وہ تھوڑا سا مطمئن ہو گیا تھا جو زخم ٹیسیں دینے لگے تھے اور اب دل میں خواہش اٹھ رہی تھی کہ ان زخموں کو کوئی مرہم میسر آ جائے لیکن مرہم کہاں سے آتا؟ وہ جس بے سروسامانی کے عالم میں بھاگ رہا تھا، اس کے پاس تو زادِ راہ کے طور پر کچھ موجود ہی نہیں تھا۔ صرف ایک پانی کی چھاگل تھی جس سے اس نے راستے میں موقع ملنے پر چند گھونٹ پانی پیا تھا اور تھوڑا سا گھوڑے کو پلایا تھا لیکن وہ پانی پیے ہوئے بھی بہت دیر گزر چکی تھی اور اب اسے اپنے حلق میں اگ آنے والے کانٹے پریشان کر رہے تھے۔

اس گرم علاقے میں جسم سے پسینا بھی خوب بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے جسم میں تیزی سے پانی کی قلت ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے گھوڑے کا حال اس سے بھی کچھ زیادہ ابتر تھا۔ اس بے چارے کا جسم بری طرح بھیگا ہوا تھا اور گھنٹوں کے حساب سے مسلسل دوڑتے رہنے کی وجہ سے وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے پانی پینے کے لیے چھاگل کا منہ کھولا تو گھوڑے کی درماندگی پر اس کا دل پسیج گیا اور اس نے ذرا دیانت داری سے سوچا تو اسے گھوڑا خود سے زیادہ پانی کا مستحق محسوس ہوا۔ جان بچانے کی اس جدوجہد میں اس بے زبان نے اس سے زیادہ مشقت اٹھائی تھی۔ اپنی

پشت پر اس کا وزن سنبھالے وہ اس کے اشارے پر لگاتار دانتھک بھاگتا رہا تھا اور اب جبکہ وہ تذبذب کے عالم میں اس جگہ رکے تھے تو بری طرح ہانپتے گھوڑے کی زبان بھی یقیناً پانی کی طلب میں باہر نکلی ہوئی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ چھاگل میں اب بہت کم پانی موجود ہے اور گھوڑے کو پانی پلانے کی صورت میں اسے کچھ نہیں ملے گا لیکن وہ اپنے وفادار گھوڑے کو اس کی وفاداری کا یہ صلہ نہیں دے سکتا تھا کہ اس کی پیاس سے بے نیاز ہو کر خود پانی پی لیتا۔ اس نے چھاگل گھوڑے کے منہ سے لگا دی۔ گھوڑا ایک ہی سانس میں پورا پانی پی گیا۔ اس کی پیاس شاید اب بھی نہیں بجھی تھی لیکن کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑا تھا اور اب اس نے بری طرح ہانپنا بند کر دیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی پشت کو دائیں ہاتھ سے سہلایا پھر جانے کس امید پر خالی چھاگل کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر الٹ کر دیکھا۔ چھاگل سے پانی کا صرف ایک قطرہ برآمد ہوا اور اس کی خالی ہتھیلی پر آ ٹھہرا۔ اس نے ہتھیلی پر آ ٹھہرنے والے شفاف قطرے کو غور سے دیکھا، وہ کسی بے داغ ہیرے کی طرح دکھائی دے رہا تھا جس میں سے صحرا کی تیز دھوپ کی کرنیں گزر کر قوس قزح کے رنگ بکھیر رہی تھیں۔ اس ہیرے جیسے قطرے کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ اتر آئی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں سچ مچ کا ہیرا بھی ہوتا تو اسے بے وقعت لگتا کیونکہ سامنے پھیلے وسیع صحرا کو عبور کرنے میں وہ ہیرا اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ پانی کا وہ ننھا سا قطرہ اس کی خشک ہتھیلی کی جلد میں جذب ہو کر تیزی سے معدوم ہو گیا تو اس نے ایک بار پھر اپنے سامنے پھیلی لامحدود ریت کے سمندر کو دیکھا۔ اس صحرا میں سفر کرنے کے خیال سے وہ اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن پھر گھوڑے کی ہنہناہٹ نے اسے فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس کا گھوڑا تھا اور وہ اس کی ہنہناہٹ کے سارے رمز پہچانتا تھا۔ اب بھی اس نے جان لیا تھا کہ خطرہ قریب آ چکا ہے اور اب رکے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ جو گھوڑے کو پانی پلانے کے لیے نیچے اتر گیا تھا، بڑی پھرتی سے ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اسے ایڑ لگائی۔ سدھایا ہوا وفادار گھوڑا اس کے اشارے پر چل تو پڑا لیکن اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔ اس کے یوں لڑکھڑانے پر وہ ٹھٹکا اور چند قدم مزید چل کر گھوڑے کو روک کر نیچے اتر آیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ گھوڑے کی پچھلی دائیں ٹانگ اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔

نیچے اتر کر اس نے متاثرہ ٹانگ کا جائزہ لیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ دائیں ران کے اندرونی حصے پر ایک خاصا گہرا زخم موجود ہے اور اس زخم سے خون نکل کر ٹانگ کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا زمین پر گرتا رہا ہے لیکن عجلت اور پریشانی میں وہ اسے دیکھ ہی نہیں سکا تھا اور آفرین تھی اس بے زبان جانور کی وفاداری پر کہ وہ اتنے گہرے زخم کے ساتھ مالک کی جان بچانے کے لیے سرپٹ دوڑتا رہا تھا لیکن آخر کہاں تک.....؟ تکلیف اور خون کے شدید جریان نے اس وفادار کی ہمت کو بھی نچوڑ لیا تھا اور اب مزید دوڑنا اس کے بس سے باہر تھا۔

''بچپن کے ساتھیوں اور نعمتوں سے بھرے ٹھکانے کے چھوٹنے پر میرے دل نے اتنا غم محسوس نہیں کیا تھا جتنا میں تیرا ساتھ چھوٹنے پر افسردہ ہوں کیونکہ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ تو ان سب سے بڑھ کر میرا وفادار ہے۔'' وہ جان چکا تھا کہ اس کا پیارا گھوڑا اس لق و دق صحرا کے سفر میں اس کا ساتھ نہیں دے سکے گا چنانچہ اس کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غمگین لہجے میں بولا۔ جواب میں گھوڑا یوں ہنہنایا جیسے اپنے مالک کا غم سمجھ رہا ہو۔

''تو اپنے حصے کی آزمائش میں کامیاب ہو چکا ہے۔ افسوس کہ میں تیری وفاداری کے صلے میں تجھے کوئی انعام دینا تو دور کی بات تیرے زخموں کے لیے مرہم کا انتظام بھی نہیں کر سکتا۔ میرے بس میں بس اتنا ہے کہ میں صحرا کے کٹھن سفر میں تجھے اپنے سنگ نہ لے جاؤں۔ جا..... یہیں سے واپس لوٹ جا۔ شاید کہ تجھے کوئی رحم دل مسافر یا قافلہ مل جائے اور تیرے زخموں کا علاج ہو جائے۔'' اس نے محبت سے گھوڑے کی پشت تھپک کر اسے واپس پلٹنے کا اشارہ کیا۔ تربیت یافتہ گھوڑا اس کا اشارہ نہ سمجھتا، یہ کیسے ممکن تھا لیکن وفاداری نے مالک کا ساتھ یوں بیچ راہ چھوڑنے پر تذبذب دکھایا اور وہ شش و پنج میں مبتلا یوں منہ اٹھائے اسے دیکھنے لگا جیسے اس سے حکم کو سمجھنے میں غلطی پیش آ گئی ہو۔

اپنے پیارے گھوڑے کی اس ادا پر اسے ٹوٹ کر پیار آیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ تھام کر یوں اسے دیکھنے لگا جیسے ماں وقتِ رخصت اپنے لاڈلے بیٹے کو دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی بھی امڈ آئی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور گھوڑے کی تھوتھنی سہلاتے ہوئے بولا۔

''تم نے میرا بہت ساتھ دیا دوست اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے وفاداری کا حق ادا کر دیا لیکن میں جانتا ہوں کہ آگے کے سفر میں تمہیں ساتھ رکھنا تمہیں یقینی موت کے

منہ میں لے جانے والی بات ہے۔ میں اپنے اتنے وفادار دوست کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرسکتا اس لیے تمہیں یہیں سے واپس جانا ہوگا۔ واپس جانے میں شاید تمہیں زندگی کی نوید مل جائے۔ جاؤ.....بس اب تم چلے جاؤ تاکہ میں بھی اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔"

وہ بے زبان جانور تھا اور اس کی ان باتوں کے جواب میں زبان سے کچھ نہیں بول سکتا تھا لیکن پھر بھی اسے لگا کہ گھوڑے کی آنکھیں کچھ بول رہی ہیں اور ان آنکھوں میں نمی سی آگئی ہے۔ اپنے ان محسوسات کو وہ اپنا جذباتی پن سمجھ کر دھیرے سے استہزائیہ ہنسی ہنسا اور ایک بار پھر گھوڑے کی پیٹھ تھپک کر اسے واپسی کے لیے اشارہ کیا۔ اس بار وہ حرکت میں آگیا لیکن بالکل اس انداز میں جیسے اسے بادل ناخواستہ نہایت مجبوری کے عالم میں حکم کی بجا آوری کرنا پڑ رہی ہو۔ وہ بہت آہستگی سے واپسی کے راستے کی طرف پلٹا، اس کے تھپکی دینے پر چند قدم آگے بڑھا اور پھر یوں پیچھے مڑ کر دیکھا جیسے حکم دینے والے نے غلطی سے اسے یہ حکم دے دیا ہے اور اس کے مڑ کر دیکھنے پر وہ اسے دوبارہ واپس بلالے گا لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے گھوڑے کو پلٹ کر دیکھتے، دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور یوں جیسے اس فرمانبردار جانور کے لیے آخری گنجائش بھی ختم ہوگئی اور اپنی تربیت کی لاج رکھنے کے لیے اسے حرکت میں آنا ہی پڑا۔

گھوڑا دھیمی رفتار سے چلتا پیچھے کی طرف چلنا شروع ہوا تو اس نے بھی اپنا رخ پلٹ کر صحرا کی طرف کرلیا۔ یوں بھی وہ اپنا کافی وقت ضائع کرچکا تھا اور اس کے حالات اسے اتنی دیر رکے رہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسے خود کو بچانا تھا تو ہر حال میں چلتے رہنا چاہیے تھا۔ اس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان فاصلہ بڑھانے کی یہی واحد صورت تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے حوصلے کو مجتمع کیا اور چلنا شروع کردیا۔ چند قدم چل کر ہی اسے احساس ہوگیا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ وہ سر سے پیر تک بری طرح پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور پیروں میں فل بوٹ ہونے کے باوجود اسے اپنے پیر جلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ بہر حال جدوجہد ترک کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے آنکھوں پر چھجا سا بنا کر دور تک پھیلے ہوئے صحرا کا جائزہ لیا اور پھر کچھ سوچ کر ریت کے اونچے سے ٹیلے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا اندازہ تھا کہ ٹیلے کے اس طرف اسے تھوڑا سا سایہ میسر آسکتا ہے اور اس تپتے صحرا میں تھوڑا سا سایہ میسر آجانا بھی ایک بڑی عیاشی تھی۔ جلد سے جلد ٹیلے تک پہنچنے کی خواہش میں شاید وہ اپنے اطراف سے بالکل غافل ہوگیا تھا اس لیے اسے اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ وہ چاروں کب اس کے سر پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ اس کی چھٹی حس تھی جس نے بالکل آخری وقت میں اسے خطرے کا احساس دلایا اور وہ تیزی سے نیچے گر کر چند قلابازیاں کھا گیا۔ تپتی ہوئی ریت پر یہ چند قلابازیاں بھی کسی کارنامے سے کم نہیں تھیں اور ان ہی کی وجہ سے اسے اپنی جان بچانے کے لیے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔ وہ پیچھے سے کیے جانے والے تلوار کے وار سے بال بال بچا تھا۔ اگر اسے حرکت میں آجانے میں ذرا سی بھی تاخیر ہوجاتی تو اس کا سر اور دھڑ ایک دوسرے سے الگ الگ پڑے تڑپ رہے ہوتے اور صحرا کی پیاسی زمین اس کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کی سعی کر رہی ہوتی۔

دل ہی دل میں اس انجام سے بچ جانے پر شکر کرتے ہوئے اس نے پھرتی سے اپنی تلوار نکالی اور پامردی سے ان چاروں کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ ان چاروں کے چہرے ڈھاٹوں میں چھپے ہوئے تھے اور وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کون ہیں لیکن بہر حال اسے اس بات کا ادراک تھا کہ وہ اس کے دشمن ہیں اور اسے ہر حال میں ان سے مقابلہ کرنا ہے۔ کچھ دیر قبل اسے اپنی حالت اتنی خراب محسوس ہو رہی تھی کہ چند قدم چلنا بھی بوجھ محسوس ہو رہا تھا لیکن اب دشمنوں کو سامنے پاکر یکایک اس کے اندر نئی توانائی امڈ آئی تھی اور وہ کسی چاق و چوبند سپاہی کی طرح ان کے مقابل ڈٹ گیا تھا۔ وہ چار تھے اور چاروں سمتوں سے اسے گھیر کر زیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان لمحات میں اس کی تیزی اور پھرتی بھی قابلِ داد تھی۔ وہ پھرکی کی طرح گھومتا اور برق کی طرح کوندتا نہ صرف ان کے حملوں کو روک رہا تھا بلکہ خود بھی بڑھ بڑھ کر وار کرتا جا رہا تھا۔ آخر کار اس کا ایک وار کام دکھا گیا اور اس کا ایک دشمن زوردار کریہہ چیخ مارتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ اس دشمن کے انجام کو دیکھ کر خوش ہو پاتا۔ اسے باقی تین سے نمٹنا تھا جو اپنے ایک ساتھی کو گرتے دیکھ کر مزید شدت اور نفرت سے اس پر حملے کر رہے تھے۔ اس نے جھکائی دے کر خود کو ایک کے وار سے بچایا اور دوسرے کا وار اپنی تلوار پر روکا۔ اس کے وار روکنے میں بھی ایسی قوت تھی کہ مقابل کی تلوار جھنجھنا اٹھی اور قدم ذرا سے اکھڑ گئے۔ اس نے اس موقع کو ضائع نہ کیا اور اپنے حریف کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر ایک اور وار کیا۔ وہ بوکھلا کر الٹی سیدھی

تلوار چلانے لگا اور بالکل اچانک ہی اس کی مدد کے لیے قریب آنے والا اس کا ایک ساتھی اس کی تلوار کی زد پر آ گیا۔ ساتھی کو زخمی ہو کر گرتے دیکھ کر اس کی حواس باختگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور ایسے حالات میں بوکھلاہٹ نقصان میں اضافے کے سوا کچھ نہیں کرتی۔ وہ بھی جلد اس کی تلوار کی دھار پر آ کر اپنی زندگی گنوا بیٹھا اور صحرا کی پیاسی زمین اس کا خون چوسنے لگی۔

چوتھا حریف ذرا زیادہ سخت جان اور پھرتیلا تھا اور ابھی تک اس کی تلوار کی زد پر نہیں آیا تھا۔ اب اس نے پوری توجہ سے اس آخری حریف سے نمٹنے کی ٹھانی اور خود حملہ کرنے میں پہل کی۔ وہ ہوشیار تھا، اس نے اس کا وار اپنی تلوار پر روکا اور پھر تو جیسے وہاں تلواروں کی جھنکار کے سوا کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ وہ دونوں پیترے بدل بدل کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے اور تیز دھوپ میں ان کی تلواروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہاں دور تک پھیلی ریت اور بے کراں آسمان کے سوا کوئی نہیں تھا جو ان کو ان کی مشاقی کی داد دے پاتا۔ اگر کوئی انسان موجود بھی ہوتا تو شاید اسے لپکتے، جھپٹتے گوندوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ وہ دونوں ہی اس وقت برق بنے ہوئے تھے اور دونوں کو معلوم تھا کہ ذرا بھی ہلکا پڑنا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ زندگی اور موت کی اس جنگ نے دونوں کو انسانوں کے بجائے وحشی جانور بنا دیا تھا۔ دونوں ہی کے منہ سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جنہیں سن کر لگتا تھا کہ دو درندے غضب ناک حالت میں ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے ہیں۔ آخرکار اس کی خوش قسمتی نے اس کا ہاتھ تھاما اور جانے کیسے اس کے مقابل کی دائیں ٹانگ کٹ کر دور جا گری۔ ٹانگ کٹتے ہی وہ بھی گر گیا۔ ایک ٹانگ پر وہ اس کے مقابل کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور بے بسی کی تصویر بنا یوں تپتی ریت پر پڑا تھا کہ اس کے تڑپتے مچلتے بدن سے تیزی سے خون نکل کر ریت میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ مقابل کی اس لاچاری کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس پر وار کر پاتا۔ اس کے چیختے اور تڑپتے ہوئے وجود سے نظریں چرا کر اس نے قریب پڑی اس کے دوسرے ساتھی کی لاش کو دیکھا اور اس کے جسم پر موجود لباس سے اپنی تلوار پر لگا خون صاف کر کے اسے واپس نیام میں رکھ لیا۔

وہ یکایک خود کو بہت تھکا ہوا اور درماندہ محسوس کر رہا تھا۔ دشمن کو سامنے پا کر جو شعلہ سا اس کے اندر لپکا تھا، اب بجھ سا گیا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی وہیں ان کے قریب ہی کہیں لیٹ کر ستانے لگے لیکن پھر اس کی نظر ان میں سے ایک کے قریب پڑی پانی کی چھاگل پر پڑی اور احساس ہوا کہ وجود کی یہ شکستگی درحقیقت بے پناہ پیاس کی وجہ سے ہے۔ اس نے لپک کر وہ چھاگل اٹھالی اور اسے کھول کر جلدی جلدی اپنی پیاس بجھانے لگا۔ تقریباً آدھا پانی پینے کے بعد اسے زخمی دشمن کا خیال آیا تو چھاگل اس کے قریب ڈال دی اور اس کی طرف سے رخ بدل لیا۔ اپنے جانی دشمن کے ساتھ وہ اس سے زیادہ صلہ رحمی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ ایک بار پھر قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ اس نے یہ بھی زحمت نہیں کی تھی کہ خاک و خون میں لتھڑے ان دشمنوں کے چہروں سے ڈھاٹے ہٹا کر انہیں شناخت کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے جیسے معلوم تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور چہرے دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ دشمن تھے اور صورت بدل بدل کر انہیں اس کی راہ میں آتے ہی رہنا تھا۔ ان کی وجہ سے وہ اپنا سفر نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوسرے شکار کی چھاگل اٹھائی اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس بار اسے ریت کے اس ٹیلے کی اوٹ میں پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ پانی نے اسے نئی توانائی بخش دی تھی اور اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر سوچنے اور حرکت کرنے کے قابل تھا۔

ٹیلے کی اوٹ میں پہنچ کر اس کی عقل نے مزید کام کرنا شروع کر دیا اور اسے وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں جو اس نے صحرا میں سفر کے متعلق پڑھ رکھی تھیں۔ اسے یاد آ گیا کہ دن کے وقت صحرا میں سفر جاری رکھنے کے بجائے رات زیادہ مناسب رہتی ہے اور صحرا کے مسافر کے حق میں یہی بہتر ہوتا ہے کہ وہ دن کسی سائے وغیرہ میں آرام کرتے ہوئے گزارے۔ ریت کے ٹیلے کا سایہ اسے میسر آ چکا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ سورج اپنا سفر مزید طے کرے گا تو اس کی شعاعیں دوسرے زاویے سے اس جگہ قہر برسانے لگیں گی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اس نے ٹیلے کے ساتھ ہی ایک گڑھا سا کھودنا شروع کر دیا۔ یہ چھ ساڑھے چھ فٹ لمبائی کی قبر جیسا گڑھا تھا جو اس نے خود اپنے لیے تیار کیا تھا اور اسے آخری آرام گاہ کے بجائے عارضی آرام گاہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ گڑھے کی گہرائی ڈھائی تین فٹ کے قریب ہو جانے پر اسے اطمینان محسوس ہوا۔ آستینوں سے چہرے کا پسینا صاف کرنے کے بعد اس نے چھاگل سے پانی کے چند گھونٹ بھرے اور اپنے تیار کردہ گڑھے میں اتر گیا۔ اندر ریت ٹھنڈی تھی۔ اتنی دیر سے جھلتے اس

کے بدن کو سکون کا احساس ہوا اور وہ آنکھیں موند کر اس گڑھے میں لیٹ گیا۔

پیاس بجھنے اور جسمانی آرام میسر آجانے کے بعد آنتیں بھوک کا احساس دلانے لگی تھیں لیکن فی الحال اس کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس تپتے صحرا میں خوراک کی تلاش میں نکلنا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ ابھی وہ آرام کرلے اور رات میں جب سفر کا آغاز کرے تو اس مسئلے کا حل تلاش کرے۔ حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی کی مدد سے بھوک کے احساس کو جھٹکا اور سونے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ بے پناہ تھکن اور نیند کی کمی کا شکار اس کا بدن نیند کی آغوش میں گیا تو اس پر کچھ زیادہ ہی بے خبری طاری ہوگئی۔ اس عالم میں جانے وہ کتنی دیر تک سویا رہتا کہ آس پاس پیدا ہونے والی آہٹوں، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور انسانی آوازوں نے اس کی نیند میں خلل ڈال دیا۔ وہ کسی وحشی جانور کی طرح بھڑک کر اٹھا اور اپنے پہلو میں پڑی تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈالا لیکن اسے دیر ہوچکی تھی۔ اس کے سر پر کم سے کم بھی آٹھ تلواریں لہرا رہی تھیں۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ جو سمجھا تھا کہ تعاقب میں آنے والے ان چار دشمنوں کو ٹھکانے لگا کر صحرا میں قدم رکھنے کے بعد وہ اپنے دشمنوں سے جان چھڑا چکا ہے، بہت بری طرح گھیرے میں آیا تھا۔

''تلوار پھینک کر باہر آجاؤ۔ ذرا سی بھی غلط حرکت تمہاری موت بن جائے گی۔'' گڑھے کے کنارے پر کھڑے افراد میں سے ایک نے سخت لہجے میں حکم دیا تو وہ چونکا۔ اس کے اردگرد کھڑے وہ سارے لوگ اگرچہ اپنے چہروں کو ڈھاٹوں سے چھپائے ہوئے تھے لیکن یہ وہ نہیں تھے جن سے بچتا اور چھپتا چھپاتا وہ یہاں تک آپہنچا تھا۔ وہ، اس زبان سے بہت مختلف زبان بول رہے تھے جو اس کے خون کے پیاسے بولا کرتے تھے۔

''میری طرف سے بے فکر رہو۔ میں کوئی بھی غلط حرکت نہیں کروں گا۔'' اس کے لیے یہ بات باعثِ اطمینان تھی کہ اسے گھیرنے والے اس کے دشمن نہیں بلکہ اجنبی ہیں اور ان اجنبیوں کو ان کی زبان میں جواب دے کر اس نے مصالحت کی پہلی کوشش کی تھی۔ ہاتھ سے تلوار پھینک دینا دوسرا قدم ثابت ہوا اور اس کے بعد وہ اچک کر گڑھے سے باہر آگیا۔ صحرا میں شام اتر آئی تھی اور اب ہوا جسم سے ٹکراتی تھی تو اسے جھلساتی نہیں تھی۔

''کون ہو تم؟'' اس کے دوستانہ اقدامات کے نتیجے میں بھی وہاں لہجے کی درشتی نرم نہیں پڑی تھی اور بولنے والا ویسے ہی کڑے تیوروں کے ساتھ بول رہا تھا۔

''ساشا.....'' مقابل کے تیوروں کو خاطر میں لائے بغیر اس نے بھرپور اطمینان اور اعتماد سے جواب دیا اور یوں اپنا نام بتایا جیسے وہ کسی بڑی ریاست کا فرماں روا ہو اور لوگ دور دور تک اس کا نام جانتے ہوں۔

''کون ساشا.....؟'' مقابل کے سخت لہجے میں حیرت جھلکی اور اس نے کچھ غور سے اس نوجوان کو دیکھا جس کا دھول مٹی میں اٹا جسم اور لباس گواہی دے رہے تھے کہ وہ لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ لباس اور جوتوں کی خراب حالت کے باوجود دیکھنے والی آنکھیں ان کا بیش قیمت ہونا بھانپ سکتی تھیں۔ اس کے سر پر دستار نہیں تھی اور شانوں تک آتے بال پسینے اور دھول مٹی کے ساتھ مل کر جٹاؤں کی شکل اختیار کر چکے تھے لیکن اس کی فراخ پیشانی اور کھڑے ہونے کا پُراعتماد انداز اسے منفرد بنا رہا تھا۔

''اپنا مکمل تعارف کرواؤ.....تم کون ہو اور کہاں سے آرہے ہو؟'' اس بار اس نے قدرے نرم لہجے میں ذرا سنبھل کر پوچھا۔

''میں ایک تاجر ہوں۔ اپنے تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا کہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ہمارے قافلے پر حملہ کر دیا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع نہیں ملا اور ہم میں سے بیشتر اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ میں نے کچھ دیر ڈاکوؤں سے مقابلے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ اہلِ قافلہ میں سے کوئی میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تو خود کو ہلاکت میں ڈالنا حماقت جانا اور خود بھی راہِ فرار اختیار کی۔ رات کی تاریکی کے باعث میں بھاگتے ہوئے سمت کا تعین نہیں کر سکا تھا اس لیے راہ سے بھٹک گیا۔ رات اور دن کا بیشتر حصہ ویرانوں میں بھٹکتے بھٹکتے جانے کیسے میں اس صحرا میں آپھنسا اور اس کی جھلسا دینے والی گرمی سے خود کو بچانے کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ گڑھا کھود کر دن کے وقت اس میں آرام کروں اور پھر رات میں اٹھ کر اپنی بقا کے لیے جدوجہد کروں۔'' وہ اتنی روانی سے بول رہا تھا کہ اس کے بیان پر جھوٹ کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا لیکن پوچھ تاچھ کرنے والے کے پاس ابھی پوچھنے کو بہت کچھ تھا۔

''تمہارے پاس کوئی ساز و سامان نظر نہیں آتا۔ نہ تمہارا کوئی ساتھی ہے پھر تم نے تنہا یہ گڑھا کیسے کھودا؟''

''تلوار، ڈھال اور اپنے ہاتھوں کی مدد سے۔'' اس نے فخر سے بتاتے ہوئے اپنے ہاتھ سامنے کیے۔ ان ہاتھوں کی سختی، مضبوطی اور کچھ مقامات سے جھلسی ہوئی رنگت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ ہاتھ سخت محنت کے عادی ہیں اور اس کے دعوے کے مطابق اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ باقاعدہ کھدائی کا سامان نہ ہوتے ہوئے بھی وہ صحرا کی گرم ریت کو کھود کر اپنے لیے ایک ٹھنڈی پناہ گاہ حاصل کر سکیں۔

''تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟'' سوال کرنے والے کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ الجھ چکا ہے۔ وہ واقعی الجھ چکا تھا۔ اس کی قیمتی پوشاک تو اس کے تاجر ہونے کے دعوے کے ساتھ میل کھاتی تھی لیکن اس نے تاجروں کے کبھی ایسے ہاتھ نہیں دیکھے تھے۔ وہ اپنے مال واسباب کی فروخت کے لیے طویل اور دشوار گزار سفر تو ضرور کرتے تھے لیکن دورانِ سفر سخت کاموں کے لیے خدام ساتھ لے کر چلتے تھے۔ ایسے میں وہ تاجر ہونے کے اس دعوے دار کے ایسے ہاتھوں کو کیسے قبول کرتا۔

''میں ساحلی پٹی کے قریب ایک بہت ہی چھوٹی سی ریاست دُخان کا رہنے والا ہوں۔ ممکن ہے کہ آپ میں سے کسی نے اس ریاست کا نام بھی نہ سنا ہو۔'' اپنے مخاطب کی الجھن سے بے خبر اس نے اپنے تئیں ایک مناسب جواب دے کر جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن جان چھوٹنی اتنی آسان بھی نہیں تھی۔

''ہم تمہیں ابوبکیٰ کے پاس لے چلتے ہیں۔ وہی تمہارے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرے گا۔'' ڈھاٹا پوش نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہوئے ایک اونٹ کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اس پر بیٹھ جائے۔ آٹھ نو افراد پر مشتمل اس قافلے کے پاس سواری کے گھوڑوں کے علاوہ چار عدد اونٹ بھی موجود تھے۔ اونٹوں پر سامان لدا ہوا تھا تاہم اسے جس اونٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا تھا، اس پر نسبتاً کم سامان موجود تھا اور ایک آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش نکل سکتی تھی۔

''میں کئی پہر کا بھوکا ہوں۔ کیا مجھے آپ لوگوں سے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کچھ مل سکتا ہے؟'' اس نے اونٹ کی طرف ایک نظر ڈالی اور فوری طور پر اس کی جانب بڑھنے کے بجائے بے تکلفی سے مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کے جواب میں اس کے مخاطب نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ ایک گھوڑے کی طرف بڑھا اور اس کی گردن سے لٹکتے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی پوٹلی برآمد کی۔ یہ پوٹلی

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون ICS میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا۔ ایک کالا انگریز اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس کے والد بے تکلفانہ کمرے میں چلے آئے۔ ان کی دیہاتی وضع قطع ایسی تھی کہ صاحب بہادر کو اپنے دوست کے سامنے انہیں اپنا والد بتاتے ہوئے شرم آئی، لہٰذا یہ کہہ کر ان کا تعارف کروایا کہ یہ میرے والد کے ایک دوست ہیں۔ والد محترم کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے بیٹے کے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا..... میں ان کے والد کا نہیں بلکہ ان کی والدہ کا دوست ہوں۔

☆☆☆

ساغر نظامی کی بہن بھی شاعرہ تھیں اور مینا تخلص رکھتی تھیں۔ ماجد حیدر آبادی سے چونکہ ساغر صاحب کی چشمکیں چلتی رہتی تھیں اس لیے ساغر صاحب مشاعرے میں اس شرط پر جاتے تھے کہ ماجد صاحب کو نہیں بلایا جائے گا۔ ایک مشاعرے میں صدارت ساغر نظامی کی تھی۔ چونکہ ماجد صاحب مدعو نہیں تھے اس لیے وہ مشاعرہ سننے کے لیے سامعین میں آ کر بیٹھ گئے۔ لوگوں کو جب پتا چلا تو سب نے شور مچا دیا کہ ماجد صاحب کو ضرور سنیں گے اور مجبوراً منتظمین کو ماجد صاحب کو دعوت سخن دینی پڑی۔ ماجد صاحب مائک پر آئے تو کہنے لگے کہ چونکہ مجھے مدعو نہیں کیا گیا تھا اس لیے کوئی غزل ساتھ نہیں ہے البتہ دو شعر فی البدیہہ کہے ہیں۔ جناب صدر اجازت دیں تو پیش کروں۔ اجازت ملنے پر یہ دو شعر سنائے۔

پھر آ گیا ہے لوگو برسات کا مہینا
لازم ہوا ہے اب تو سب کو شراب پینا
پہنچا جو کدے میں حیران رہ گیا میں
الٹا پڑا تھا ساغر اوندھی پڑی تھی مینا

مرسلہ۔ ناہید یوسف، اسلام آباد

ساشا کو تھما دی گئی۔ اس نے بے تابی سے پوٹلی کی گرہ کھولی۔ اس میں بھنے ہوئے چنے اور خشک گوشت کا ایک ٹکڑا موجود تھا۔ اس نے مٹھی بھر چنے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالے۔ خشک منہ کے ساتھ ان چنوں کو چبانا ایک مشکل عمل تھا۔ اس کی مشکل کو محسوس کر کے اسے پانی کی چھاگل پیش کر دی گئی۔ ذرا سی دیر میں وہ چنے اور خشک گوشت کا ٹکڑا ہڑپ کر چکا تھا اور سفر کے لیے تیار تھا۔ اس کے اونٹ پر سوار ہو جانے پر سفر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مرحلے پر وہ بالکل نہتا تھا اور اس سے اس کی تلوار کے علاوہ ڈھال بھی لے لی گئی تھی۔ چلتے ہوئے اہل قافلہ نے ایسی ترتیب اختیار کی تھی کہ اس کی سواری کا اونٹ مکمل طور پر ان کے گھیرے میں آ گیا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ انہیں جل دے کر بھاگ نکلتا۔ اس جیسا بندہ ایسا کچھ کرنے پر آتا تو لازماً کر گزرتا لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا کہ صحرا میں ایسی کوئی حماقت کرتا۔ اسے فی الحال کسی آبادی تک پہنچنا تھا۔ پہنچ جاتا تو ان لوگوں سے دشمنی یا دوستی کا تعین کر کے اپنا ردعمل بھی طے کر لیتا۔ فی الحال تو جو جیسا تھا ویسے ہی ٹھیک تھا۔

صحرا کے جہاز پر سوار وہ پہرے داروں جیسے اپنے ساتھیوں کے گھیرے میں آگے بڑھتا رہا۔ صحرا جو دن میں جلتی ہوئی ریت کا سمندر بن کر اس سے ملا تھا، بتدریج ٹھنڈا ہو کر اچھا لگنے لگا تھا۔ شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہوئی اور صحرا کے شفاف آسمان پر تاروں کے جلو میں چاند نے اپنی جھلک دکھائی تو ماحول رومان انگیز سا ہو گیا۔ اونٹوں کی گردنوں میں بندھی گھنٹیوں نے اس رومان انگیزی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا اور شاید یہ صحرا کی رومان پرور رات ہی تھی جس نے اس کے پیچھے آتے جوان کے دل کے تاروں کو چھیڑا اور وہ کوئی گیت گنگنانے لگا۔ گیت کے بولوں میں ایک طرف صحرا کی خوبصورتی اور رومان انگیزی کا ذکر تھا تو دوسری طرف اس بات کا دکھ کہ اس خوبصورت ماحول میں محبوب اس کے ساتھ نہیں ہے۔ ساشا کے دل کو اس گیت نے ایک الگ زاویے سے تکلیف دی۔ نوجوان تو صرف اس بات کا رونا رو رہا تھا کہ اس کا محبوب اس کے ساتھ نہیں ہے جبکہ اس کا اپنا یہ حال تھا کہ وہ سب کچھ جو اسے محبوب تھا، اس کے پاس نہیں رہا تھا اور وہ در بدر پھرتا اس صحرا میں آ پہنچا تھا جہاں معلوم نہیں اس کے لیے امان تھی یا نہیں۔ ''لگتا ہے بشار، ابوبکیٰ کے حکم پر سالم بھیڑ بھون رہا ہے۔'' انہوں نے صحرا میں خاصی مسافت طے کر لی تھی جب ایک گھڑ سوار نے مسرت آمیز انداز میں یہ بات کہی۔

''لگتا کیا ہے، بشار یقینی طور پر بھیڑ بھون رہا ہے۔ یہ بشار کے ہاتھوں بھونی جانے والی بھیڑ کی مہک ہی ہوتی ہے جو پڑاؤ کی روشنیوں کے آنکھوں تک پہنچنے سے قبل آدمی کے نتھنوں تک پہنچ جاتی ہے۔'' ایک دوسرے سوار نے کلکاری سی مار کر اپنے ساتھی کے خیال کی توثیق کی۔ وہ سب سورج کے مکمل طور پر غروب ہونے کے بعد اپنے چہروں کو ڈھاٹوں کی قید سے آزاد کر چکے تھے اسی لیے اس قابل تھے کہ کسی خوشبو کو سونگھ سکیں۔ کئی وقت کے فاقوں کے بعد اپنی آنتوں کو کھرچتی بھوک کو مٹھی بھر چنوں اور خشک گوشت سے ادھوری سیرابی کروانے والے ساشا نے تو اس خوشبو کو اپنے ہم سفروں سے بھی پہلے محسوس کر لیا تھا لیکن اس کی دوراندیشی اسے سمجھا رہی تھی کہ خود کو خوشبو ہی سے بے پناہ لذیذ محسوس ہونے والے اس گوشت کے خواب نہ دیکھنے دے۔ وہ اجنبیوں کے درمیان تھا اور ابھی ان اجنبیوں نے اس سے اپنا تعلق طے نہیں کیا تھا۔ وہ اگرچہ دشمنوں کا سا برتاؤ نہیں کر رہے تھے تو ان کے تیور زیادہ دوستانہ بھی نہیں تھے۔

''تیری خیر ہو بشار! تو نے ہمارے کٹھن سفر کا بڑا اچھا انعام تیار کر رکھا ہے۔'' ان کا قافلہ ایک ترتیب سے لگے خیموں کے درمیان پہنچا تو اہل قافلہ میں سے ایک نے بڑے سے الاؤ کے قریب کھڑے بھاری جثے والے اس آدمی سے پکار کر کہا جو الاؤ پر لٹکی بھیڑ کو بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

''بشار امیر کے خدام کا خادم ہے۔'' بھاری جثے کے برعکس اس کی آواز بہت مہین تھی۔ ساشا کو وہاں ٹھہرنے اور اس بھنتی ہوئی بھیڑ کا مزید دیدار کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اسے اس کے اونٹ سے اتار کر ایک خیمے میں لے جایا گیا۔

''تم یہاں آرام کرو۔ ابوبکیٰ کو تمہارے بارے میں اطلاع دے دی جائے پھر اس کے حکم کے مطابق تمہارے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ اس دوران تمہیں اس خیمے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔'' خیمے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس سے یہ جملے کہنے والا وہی جوان تھا جو اب تک اس سے گفتگو کی ذمے داری نبھاتا رہا تھا۔ وہ چھریرے بدن اور ذہین آنکھوں والا ایک خوش رو جوان تھا جس کے چہرے پر موجود سیاہ ڈاڑھی بھلی لگتی تھی۔ ساشا نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور خیمے کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ نوجوان نے بھی گویا اس کی خاموشی کو غنیمت جانا اور واپس پلٹ گیا۔

خیمے کا پردہ گرنے سے قبل ساشا ننگی تلوار کے ساتھ وہاں آ کھڑے ہونے والے اس شخص کو دیکھ چکا تھا جسے یقینی طور پر اس کی پہرے داری پر متعین کیا گیا تھا۔ اس پہرے

کر چکا تھا اور سفر کے لیے تیار تھا۔ اس نے اونٹ پر سوار ہو جانے پر سفر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مرحلے پر وہ بالکل نہتا تھا اور اس سے اس کی تلوار کے علاوہ ڈھال بھی لے لی گئی تھی۔ چلتے ہوئے اہل قافلہ نے ایسی ترتیب اختیار کی تھی کہ اس کی سواری کا اونٹ مکمل طور پر ان کے گھیرے میں آ گیا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ انہیں جل دے کر بھاگ نکلتا۔ اس جیسا بندہ ایسا کچھ کرنے پر آتا تو لازماً کر گزرتا لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا کہ صحرا میں ایسی کوئی حماقت کرتا۔ اسے فی الحال کسی آبادی تک پہنچنا تھا۔ پہنچ جاتا تو ان لوگوں سے دشمنی یا دوستی کا تعین کر کے اپنا ردعمل بھی طے کر لیتا۔ فی الحال تو جو جیسا تھا ویسے ہی ٹھیک تھا۔

صحرا کے جہاز پر سوار وہ پہرے داروں جیسے اپنے ساتھیوں کے گھیرے میں آگے بڑھتا رہا۔ صحرا جو دن میں جلتی ہوئی ریت کا سمندر بن کر اس سے ملا تھا، بتدریج ٹھنڈا ہو کر اچھا لگنے لگا تھا۔ شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہوئی اور صحرا کے شفاف آسمان پر تاروں کے جلو میں چاند نے اپنی جھلک دکھائی تو ماحول رومان انگیز سا ہو گیا۔ اونٹوں کی گردنوں میں بندھی گھنٹیوں نے اس رومان انگیزی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا اور شاید یہ صحرا کی رومان پرور رات ہی تھی جس نے اس کے پیچھے آتے جوان کے دل کے تاروں کو چھیڑا اور وہ کوئی گیت گنگنانے لگا۔ گیت کے بولوں میں ایک طرف صحرا کی خوبصورتی اور رومان انگیزی کا ذکر تھا تو دوسری طرف اس بات کا دکھ کہ اس خوبصورت ماحول میں محبوب اس کے ساتھ نہیں ہے۔ ساشا کے دل کو اس گیت نے ایک الگ زاویے سے تکلیف دی۔ نوجوان تو صرف اس بات کا رونا رو رہا تھا کہ اس کا محبوب اس کے ساتھ نہیں ہے جبکہ اس کا اپنا یہ حال تھا کہ وہ سب کچھ جو اسے محبوب تھا، اس کے پاس نہیں رہا تھا اور وہ دربدر پھرتا اس صحرا میں آ پہنچا تھا جہاں معلوم نہیں اس کے لیے امان تھی یا نہیں۔ ''لگتا ہے بشار، ابوبکیٰ کے حکم پر سالم بھیڑ بھون رہا ہے۔'' انہوں نے صحرا میں خاصی مسافت طے کر لی تھی جب ایک گھڑسوار نے مسرت آمیز انداز میں یہ بات کہی۔

خوشبو کو سونگھ سکیں۔ کئی وقت کے فاقوں کے بعد اپنی آنتوں کو کھرچتی بھوک کو مٹھی بھر چنوں اور خشک گوشت سے ادھوری سیرابی کروانے والے ساشا نے تو اس خوشبو کو اپنے ہم سفروں سے بھی پہلے محسوس کر لیا تھا لیکن اس کی دوراندیشی اسے سمجھا رہی تھی کہ خود کو خوشبو ہی سے بے پناہ لذیذ محسوس ہونے والے اس گوشت کے خواب نہ دیکھنے دے۔ وہ اجنبیوں کے درمیان تھا اور ابھی ان اجنبیوں نے اس سے اپنا تعلق طے نہیں کیا تھا۔ وہ اگرچہ دشمنوں کا سا برتاؤ نہیں کر رہے تھے تو ان کے تیور زیادہ دوستانہ بھی نہیں تھے۔

''تیری خیر ہو بشار! تو نے ہمارے کٹھن سفر کا بڑا اچھا انعام تیار کر رکھا ہے۔'' ان کا قافلہ ایک ترتیب سے لگے خیموں کے درمیان پہنچا تو اہل قافلہ میں سے ایک نے بڑے سے الاؤ کے قریب کھڑے بھاری جثے والے اس آدمی سے پکار کر کہا جو الاؤ پر لٹکی بھیڑ کو بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

''بشار امیر کے خدام کا خادم ہے۔'' بھاری جثے کے برعکس اس کی آواز بہت مہین تھی۔ ساشا کو وہاں ٹھہرنے اور اس بھنتی ہوئی بھیڑ کا مزید دیدار کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اسے اس کے اونٹ سے اتار کر ایک خیمے میں لے جایا گیا۔

''تم یہاں آرام کرو۔ ابوبکیٰ کو تمہارے بارے میں اطلاع دے دی جائے پھر اس کے حکم کے مطابق تمہارے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔ اس دوران تمہیں اس خیمے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔'' خیمے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس سے یہ جملے کہنے والا وہی جوان تھا جو اب تک اس سے گفتگو کی ذمے داری نبھاتا رہا تھا۔ وہ چھریرے بدن اور ذہین آنکھوں والا ایک خوش رو جوان تھا جس کے چہرے پر موجود سیاہ ڈاڑھی بھلی لگتی تھی۔ ساشا نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور خیمے کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ نوجوان نے بھی گویا اس کی خاموشی کو غنیمت جانا اور واپس پلٹ گیا۔

خیمے کا پردہ گرنے سے قبل ساشا ننگی تلوار کے ساتھ وہاں آ کھڑے ہونے والے اس شخص کو دیکھ چکا تھا جسے یقینی طور پر اس کی پہرے داری پر متعین کیا گیا تھا۔ اس پہرے

دار کی موجودگی ساشا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی۔ اس بے چارے کو یہاں متعین کرنے والوں کو کیا خبر تھی کہ اگر وہ جانا چاہتا تو یہ اکیلا پہرے دار اسے ہرگز نہیں روک سکتا تھا جیسے کہ وہ لوگ نہیں روک سکے تھے جن کے ارادوں کی تکمیل کے لیے اس کا خون ضروری تھا لیکن اس کا خون اتنا ارزاں نہیں تھا کہ کوئی بھی آسانی سے بہا ڈالتا۔ وہ ساشا تھا۔ اپنے بہادر، باعلم اور باہنر باپ کے ہاتھوں تراشا ہوا ایک شاہکار..... وہ کسی کے بھی ہاتھوں اتنی آسانی سے زیر نہیں ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

''تو تم ساشا ہو؟'' بھاری چہرے اور چھوٹی آنکھوں والے ابوبکیٰ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں اس سے پوچھا جیسے آنکھوں ہی سے اس کی ساری حقیقت کھوج نکالے گا۔

''ہاں میں ساشا ہوں۔'' اس نے بھی یوں جواب دیا گویا اپنے ہونے پر نازاں ہو۔

''یہ نام کچھ انجانا اور عجیب ہے۔ کیا تم اپنے نام کا مطلب بتا سکتے ہو؟''

''مطلب میں بھی نہیں جانتا لیکن مجھے اپنا نام عزیز ہے کیونکہ یہ نام مجھے میرے محبت کرنے والے ماں باپ نے دیا تھا۔'' اس نے ابوبکیٰ کی نظروں سے نظر ہٹائے بغیر اطمینان سے جواب دیا۔ ابوبکیٰ کے سامنے اپنی اس پیشی کے لیے اسے خاصا انتظار کرنا پڑا تھا۔ یقینی طور پر وہ اس کے سامنے اس وقت پیش کیا گیا تھا جب وہ بشار کے ہاتھوں تیار کی گئی بھنی بھیڑ سمیت کئی نعمتوں سے سیراب ہوکر بہت آسودگی کے ساتھ قیمتی قالین بچھے اس تخت پر فروکش ہوا تھا اور اب بھی اس کے دائیں ہاتھ میں ایک بلوریں جام دکھائی دیتا تھا جس میں موجود مشروب کی گاہے بگاہے چسکیاں لیتا وہ اس سے گفتگو بلکہ تفتیش کر رہا تھا۔

''سنا ہے تم دخان کے رہنے والے ہو؟''

''آپ نے ٹھیک سنا ہے۔''

''اور تم تاجر بھی ہو؟''

''جی ہاں۔'' اس کا جواب مختصر تھا۔

''کس چیز کی تجارت کرتے ہو تم؟''

''کپڑے، قیمتی موتیوں اور نوادرات کی۔''

''پھر تو تم ابوالخیر کو جانتے ہوگے۔ وہ بھی ان ہی اشیا کا تاجر ہے اور تجارت کے سلسلے میں دخان جاتا رہتا ہے۔'' ابوبکیٰ کی نظریں پھسل کر اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں موجود اس انگوٹھی پر آ ٹکی تھیں جس میں سرخی مائل کتھئی رنگت کا ایک بڑا سا بیضوی پتھر جڑا ہوا تھا۔

''نہیں میں ابوالخیر کو نہیں جانتا۔ نہ ہی میرے علم میں ہے کہ اس نام کے کسی میرے ہم پیشہ تاجر نے کبھی دخان کی زمین پر قدم رکھا ہو۔'' وہ اتنا اناڑی نہیں تھا کہ ابوبکیٰ کی چال میں آجاتا اور ایک فرضی کردار کے لیے شناسائی ظاہر کرتا۔

''اگر تمہارا تعلق دخان سے ہے اور تم ان ہی اشیا کی تجارت کرتے ہو جن کا تم نے ذکر کیا ہے تو تمہیں ابوالخیر سے واقف ہونا چاہیے تھا۔'' اس کے دوٹوک انکار نے ابوبکیٰ کا مزاج برہم کر دیا۔

''مجھے افسوس ہے لیکن میری یادداشت کے کسی خانے میں ابوالخیر تاجر کا نام موجود نہیں ہے۔ اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو میری اس سے ملاقات کروادیں، شاید روبرو ہونے پر میں اسے شناخت کرسکوں۔'' دل ہی دل میں ابوبکیٰ کی جھنجلاہٹ سے حظ اٹھاتے ہوئے اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''دخان کا تاجر ابوالخیر سے واقف نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔'' ابوبکیٰ نے جام اتنی زور سے پٹخا کہ اس میں موجود مشروب چھلک پڑا۔

''مجھے اپنی کم علمی پر افسوس ہے۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''افسوس نہ کرو اور ہمیں صاف صاف بتاؤ کہ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟'' ابوبکیٰ کا تحمل جواب دینے لگا۔

''میں آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' وہ سچ مچ حیران ہوا۔

''تمہیں اعتراف کرنا ہوگا کہ تم امیر سالک کے جاسوس ہو۔'' غیظ سے ابوبکیٰ کی آواز کچھ اور بلند ہوگئی۔

''میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔ رہا جاسوس ہونے کا الزام تو آپ جانتے ہیں کہ میں خود سے یہاں نہیں آیا ہوں۔ مجھے آپ کے لوگ ازخود صحرا سے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔'' اس نے ابوبکیٰ کے طیش سے خائف ہوئے بغیر مدلل جواب دیا۔

''میرے لوگوں نے تمہیں مشکوک پاکر ہی تمہیں یہاں لانے کی زحمت کی ہے۔ تمہاری داستان ہمارے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ ہم اس صحرا اور اس کے اردگرد کے دور دور تک کے علاقوں کی خبر رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں پہنچی جس سے یہ پتا چلتا کہ کسی تجارتی قافلے پر ڈاکوؤں نے دھاوا بولا ہو۔ تمہیں یقیناً امیر سالک نے ہی جاسوسی کے لیے بھیجا ہوگا۔ اسے کسی ذریعے سے

ہمارے یہاں پڑاؤ اور دیگر سرگرمیوں کی بھنک پڑ گئی ہوگی اسی لیے اس نے تمہیں ایک لٹے پٹے زخمی مسافر کی حیثیت سے یہاں جاسوسی کرنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''اور آپ نے اس مسافر کی کیا خوب خاطر داری کی کہ اسے طعام میں شریک کرنا تو دور کی بات، زخموں کے لیے مرہم تک مہیا نہیں کیا۔'' اس کے لہجے میں طنز اترا۔

''ہم اپنے امیر کے دشمن کی طرف سے بھیجے گئے کسی جاسوس کی خاطر داری کے پابند نہیں ہیں۔'' ابوبکیٰ نے نخوت سے جواب دیا۔

''شک نے آپ کی عقل پر پردہ ڈال دیا ہے لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ... اس وہم کو اپنے دل سے نکال دیں۔ ایک پریشان اور برباد مسافر پر ایسا لغو الزام لگا کر آپ کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔'' اس کے الفاظ میں گستاخی کی بُو تھی، ابوبکیٰ کی برداشت جواب دے گئی۔

''گرفتار کرلو اسے اور قید خانے میں بھجوا دو۔ وہاں یہ خود اپنی زبان سے اپنے جاسوس ہونے کا اعتراف کرے گا۔'' ابوبکیٰ چلایا تو یکدم ہی اردگرد کھڑے لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اتنی ڈھیر ساری تلواروں کی موجودگی میں خالی ہاتھ مزاحمت کی کوشش نقصان دہ ہو سکتی تھی اس لیے اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ یوں بھی وہ فی الحال خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیے بیٹھا تھا۔ وہ زندگی کے اتنے بڑے بحران سے گزر کر آیا تھا کہ یہ مصیبت اسے زیادہ بڑی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک غلط فہمی ہی تو تھی جو کبھی نہ کبھی دور ہو جاتی۔ غم تو ان باتوں کا تھا جنہیں اب شاید کبھی ٹھیک نہیں ہونا تھا لیکن یہ بھی طے تھا کہ کچھ ٹھیک ہوتا یا نہ ہوتا، اسے ذمے داروں کو کسی طور نہیں بخشنا تھا۔ اسے انہیں بتانا تھا کہ وہ ساشا ہے..... وہ ساشا، جسے اس کے بہادر، باعلم اور باہنر باپ نے بڑی احتیاط اور ذمے داری سے پروان چڑھایا تھا۔

☆☆☆

سیاہ دستار میں اس کا چہرہ چمکتا تھا اور گلے میں پڑی پھولوں کی مالا کا عکس اس کی اجلی رنگت کو کچھ اور بھی نکھارتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں کہ اس کا دل بسترِ علالت پر دراز اپنے باپ کی زندگی کا دیا لمحہ بہ لمحہ بجھتا دیکھ کر غم کے دریا میں ڈوبا جا رہا تھا۔

''آؤ جانِ پدر آؤ..... یہاں میرے قریب بیٹھ جاؤ۔'' بوڑھا جو اس کے انتظار میں داخلی راستے پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا، نحیف لیکن محبت سے بھرپور لہجے میں بولا اور بستر پر اپنے قریب ہی اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ اس نے خاموشی سے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے جھریوں بھرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر باری باری ان کی پشت پر بوسہ دیا۔

''سرداری کا اعزاز مبارک ہو جانِ پدر۔'' بوڑھے نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس کے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور اس نے شکوہ کناں نظر باپ کے نقاہت زدہ چہرے پر ڈالی۔ یہ چہرہ کچھ عرصہ قبل ایسا زرد، مرجھایا ہوا اور جھریوں زدہ نہیں تھا۔ عمر کے ستر برس گزار کر بھی اس کے باپ کے چہرے سے رعب و دبدبے کے ساتھ ساتھ تازگی جھلکتی تھی اور جسم کسی ٹھوس چٹان کی طرح مضبوط تھا لیکن قلیل عرصے میں ہی اس نے، اس چٹان کو بھربھرا ہو کر فنا کی طرف سفر کرتا دیکھا تھا۔ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر اپنی دہاڑ سے لوگوں کے دل لرزا دینے والا اس کا باپ کمر پر لگنے والے ایک تیر..... محض ایک تیر کے گھاؤ سے ایسا بے بس ہوا تھا کہ تمام تر علاج معالجے کے باوجود دوبارہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔

''اس دنیا میں کوئی بھی ہمیشہ کے لیے نہیں آتا میرے بیٹے۔ یہ خالقِ کائنات کا بنایا ہوا اصول ہے کہ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے واپس بھی جانا ہے۔ چاہے چند سانسیں لے کر، چاہے بھری جوانی میں یا پھر میری طرح عمر کے کئی عشرے بتا کر۔ انسان چاہے نہ چاہے، اسے اس قانونِ فطرت کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ موت نے اپنے وار سے پہلے مجھے اتنی مہلت عطا کر دی کہ میں اپنے چند ضروری امور نمٹا سکوں اور اپنی ذمے داریاں تمہارے شانوں پر منتقل کر سکوں۔'' بوڑھا اس کی آنکھوں کا شکوہ پڑھ کر بہت نرمی سے اسے سمجھانے لگا۔ کمزوری و نقاہت کے باعث اگرچہ اسے بولنے میں تکلیف ہوتی تھی لیکن اپنی ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادی کے بل بوتے پر وہ اپنی گفتگو کی روانی کو متاثر نہیں ہونے دیتا تھا۔

''مجھے فطرت کے قوانین سے انحراف نہیں بابا جان لیکن جب جب یہ خیال آتا ہے کہ کسی کی نااہلی نے ایک معمولی زخم کو آپ جیسے جری انسان کے لیے موت.....'' لفظ موت پر اس کی آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ بوڑھے کی سماعتوں تک اس کا مکمل جملہ نہیں پہنچ سکا اور اس نے جملے کا آخری ٹکڑا ہی سنا۔

''میرا دل غم و غصے سے بھر جاتا ہے بابا جان اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے نہایت سخت سزا دوں۔''

''کسی کو الزام نہ دو جانِ پدر! یہ موت ایسی ہی شاطر شکاری ہے کہ حملہ تو خود کرتی ہے لیکن الزام دوسرے کے سر دھر دیتی ہے۔ حکیم حاذق نے اتنے برسوں ہماری بہت خدمت کی۔ اس کا علم قابلِ ستائش ہے لیکن دنیا کا کوئی بھی شخص عقلِ کل نہیں ہوسکتا۔ وہ بیچارہ اگر نہیں بھانپ سکا کہ مجھے لگنے والا تیر زہر میں بجھا ہوا تھا تو یہ اس کی غلطی نہیں لاعلمی تھی۔''

اس نے اپنے تئیں بے قصور محسوس ہونے والے شخص کی حمایت کی۔ اس طرف داری نے ساشا کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ واقعی اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ حکیم حاذق نے ہمیشہ انہیں اپنے علم سے فائدہ پہنچایا تھا لیکن وہ نہیں بھانپ سکا تھا کہ سردار امان کو لگنے والا تیر زہر میں بجھا ہوا تھا۔ اس کے مطابق تیر پر موجود زہر کسی ایسی قسم کا تھا کہ زخم سے زہر کی علامات ظاہر نہیں ہوئی تھیں لیکن زہر بہت خاموشی سے اندر ہی اندر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا رہا تھا۔ حاذق کی بات میں جان تھی کیونکہ سب جانتے تھے کہ سردار امان کا وہ زخم چند دنوں میں مندمل ہوگیا تھا اور سردار حسبِ سابق سرگرم نظر آنے لگا تھا لیکن پھر اچانک ہی بظاہر مندمل ہوجانے والا زخم تکلیف دینے لگا تھا اور حکیم حاذق نے معائنے کے بعد انکشاف کیا تھا کہ اندر گہرائی میں مواد جمع ہوگیا ہے۔ اس مواد کو نکالنے کے لیے زخم کو چیرہ دیا گیا تھا لیکن سردار کی حالت سنبھلنے کے بجائے دن بہ دن بگڑتی ہی چلی گئی تھی اور بہت دیر میں جا کر حکیم پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ سردار کو لگنے والا تیر کسی ایسے زہر میں ڈوبا ہوا تھا جس کی علامات کو وہ شناخت نہیں کر سکا تھا اور زہر کو سارے جسم میں سرایت کر کے اپنا اثر دکھانے کا موقع مل گیا تھا۔

''جو ہوگیا اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ بیت جانے والے حادثوں پر کتنی ہی سینہ کوبی کی جائے، نقصان کا مداوا نہیں ہوسکتا اس لیے عقلمندی اسی میں ہے کہ ماضی کو بھلا کر حال پر توجہ دی جائے اور مستقبل پر نظر رکھی جائے۔ آج جس طرح بلا اختلاف تمہاری سرداری کو قبول کیا گیا ہے، میرے دل سے بہت سے اندیشے دور ہوگئے ہیں لیکن کچھ ایسی باتیں ہیں جو میں مرنے سے قبل تمہارے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔''

ختم ہوتے سردار نے نئے سردار کا ہاتھ کھینچ کر اسے کچھ اور بھی اپنے قریب کرلیا۔ سرگوشیوں میں کی جانے والی وہ گفتگو باپ بیٹے کی زندگی کی آخری گفتگو تھی۔

☆☆☆

اس نے گنبد نما چھت والے اس محل کو دلچسپی سے دیکھا جو اپنی قدامت کے باوجود پُرشکوہ تھا اور جس کی تعمیر میں کثرت سے استعمال کیے گئے قیمتی پتھر اعلان کر رہے تھے کہ ان دیواروں کے پیچھے بہت سا مال و دولت پوشیدہ ہے۔ مال و دولت والوں کے سوا ایسا شاندار محل بھلا کون بنوا سکتا تھا۔

''نیچے اترو۔'' اس کی نظریں ابھی محل کا طواف کر ہی رہی تھیں کہ اس کے ہاتھوں میں بندھی رسی کو جھٹکا دے کر چیخ کر حکم دیا گیا۔ اس حکم کی تعمیل میں وہ خاموشی سے نیچے اتر آیا لیکن اس کے اس قدر تعاون کے باوجود اس سے کوئی رعایت نہ برتی گئی اور دو تنومند آدمیوں نے اس کے وجود کے گرد لپٹی رسیوں کے سرے تھام کر تیزی سے اسے محل کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اتنی قوت اور اہلیت رکھتا تھا کہ اگر اپنے قدم زمین پر جما کر کھڑا ہوجاتا تو وہ دونوں ایک انچ بھی اسے اس کی جگہ سے نہیں سرکا سکتے تھے لیکن اس کے دل میں تو کوئی عجیب سا ہی سودا سما گیا تھا اور وہ اپنی مرضی سے اس قید خانے میں جانے کو تیار تھا جسے ابوبکیٰ نے اس کے لیے تجویز کیا تھا۔

''قیدی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔'' وہ دونوں اسے گھسیٹتے ہوئے محل کے دروازے تک پہنچے تو وہاں متعین پہرے داروں میں سے ایک نے درشت لہجے میں کہتے ہوئے ایک سیاہ پٹی اسے لانے والوں کی طرف بڑھائی۔ انہوں نے پٹی اس مہارت اور سختی سے اس کی آنکھوں پر باندھی کہ اردگرد کا ہر منظر اس کی آنکھوں سے چھپ گیا اور کنپٹیاں کھنچ سی گئیں۔

''آگے بڑھو۔'' حکم صادر کرنے کے ساتھ ہی اس کی پشت پر ایک لات رسید کی گئی اور حسبِ سابق رسی سے پکڑ کر گھسیٹا جانے لگا۔ یہ نہایت توہین آمیز سلوک تھا لیکن اس کی توجہ اپنے ساتھ برتے جانے والے سلوک کے بجائے ان راستوں پر مبذول ہوگئی تھی جن پر سے اسے گزارا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی تھی اور وہ ان راستوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی حسیات کسی ایسے حیوان کی طرح کام کر رہی تھیں جسے تاریکی میں رہنے اور اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے سارے گُر آتے ہوں۔ اس کا ذہن اپنے پیروں کے نیچے موجود زمین کی ساخت، سماعتوں میں اترتی آوازوں، حسِ شامہ سے ٹکراتی ہر قسم کی بو، قدموں کی تعداد و رفتار اور سمتوں کا پوری چابکدستی اور مستعدی سے حساب کتاب کر رہا تھا۔ یہ حساب اتنا زبردست تھا کہ اس کے آگے اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی بے معنی ہوکر رہ گئی تھی۔ اس بے معنی و بے مقصد پٹی سے اسے زیرِ زمین بنائے گئے ایک نیم تاریک قید خانے میں پہنچ کر نجات ملی۔

''اسے امیر سالک کا جاسوس ہونے کے شک میں گرفتار کیا گیا ہے۔ ابو یحییٰ کا حکم ہے کہ اس سے اس کی اصلیت قبول کروانے کے لیے اس کی کھال بھی ادھیڑنی پڑے تو ادھیڑ دو۔ ہم اس ادھڑی ہوئی کھال میں بھس بھروا کر امیر سالک کو بھیج دیں گے تاکہ وہ اپنے جاسوس یہاں بھیجنے کی غلطی کرنا بند کردے۔'' اسے لانے والوں نے اس طویل قامت انگارہ آنکھوں والے حبشی کو ابو یحییٰ کا پیغام دیا جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار چمک رہی تھی اور جس نے اپنے چٹان جیسے وجود کو ایک لنگوٹ کے سوا مزید کسی کپڑے سے ڈھکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''حکم کی تعمیل ہوگی۔'' اس کے وجود کی طرح اس کی آواز بھی ہیبت ناک تھی۔ ساشا کو لانے والے حبشی کا جواب سن کر واپس پلٹ گئے۔ ابھی انہوں نے تہ خانے کی سیڑھی کے پہلے قدمچے پر بھی پیر نہ رکھا ہوگا کہ ساشا کے پیٹ پر حبشی کی زوردار لات آکر لگی۔ اس اچانک حملے سے وہ لڑکھڑا سا گیا۔ کئی وقت کے فاقوں کے بعد ملنے والی معمولی خوراک تو اس کے خالی پیٹ میں جانے کہاں گم ہوگئی تھی لیکن حبشی کی لگائی گئی ضرب کی تکلیف پورے پیٹ میں بگولے کی طرح چکرانے لگی تھی۔ اس تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے بہ مشکل اس نے خود کو حبشی پر جوابی حملہ کرنے سے روکا لیکن دوسری طرف کسی رعایت کا تصور نہیں تھا۔ وہ شاید اس حبشی کے معاونین تھے جو اچانک ہی قید خانے کے نامعلوم گوشوں سے برآمد ہو کر اس کے وجود سے جونکوں کی طرح چمٹ گئے تھے اور بلا تخصیص اس کے جسم کے ہر حصے پر لاتوں اور گھونسوں کی برسات کر رہے تھے۔ اس مار پیٹ میں اس کے جسم پر لگے وہ زخم کھلنے لگے جنہیں اب تک مرہم بھی میسر نہیں آیا تھا۔ زخم کھلے تو قدرتی عمل کے تحت رک جانے والے خون کا اخراج بھی دوبارہ شروع ہوگیا۔ ان حالات میں بھی اس کی سخت جانی کمال کی تھی۔ وہ پٹ رہا تھا، اس کے جسم پر پرانے زخموں کے ساتھ ساتھ نئے زخموں کا اضافہ ہو رہا تھا لیکن وہاں موجود افراد کی سماعتیں اس کی چیخیں تو کیا کراہ بھی سننے سے محروم تھیں۔

''رک جاؤ۔'' اس سارے تماشے کو خاموشی سے ملاحظہ کرتے حبشی کی ہیبت ناک آواز قید خانے میں گونجی تو اسے مار مار کر اپنا سانس پھلا لینے والوں کے ہاتھ پیر ساکت ہوگئے۔

''اسے اندر لے جاؤ۔ یہ غیر معمولی شخص ہے، اس کی مدارت کا غیر معمولی ہی انتظام کرنا ہوگا۔'' وہ وہاں موجود معمولی روشنی میں بھی حبشی کی انگارہ آنکھوں کا لذت آمیز تاثر دیکھ سکتا تھا۔ اسے مار مار کر ہانپ جانے والے اس کی سخت جانی سے جھنجلائے ہوئے نظر آتے تھے لیکن وہ یوں خوش تھا جیسے کوئی پُرلطف کھیل شروع ہونے جا رہا ہے۔ حبشی کے حکم پر اس کے ماتحتوں میں سے دو نے ساشا کی ایک ایک ٹانگ تھامی اور اسے فرش پر گھسیٹتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف لے جانے لگے۔ تہ خانے کا فرش ہموار نہیں تھا۔ یوں گھسیٹے جانے سے اس کے زخموں میں آگ سی لگ گئی لیکن اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے رکھا۔ اسے اپنے باپ کا پڑھایا سبق یاد تھا۔

''جو تکلیف سہنے کا ہنر نہ جانتے ہوں، وہ راحت کے حقیقی حق دار نہیں ہوتے۔'' اسے یہ ہنر بہت بچپن سے سکھایا جاتا رہا تھا سو وہ حبشی کی وحشت کو سہنے کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار تھا۔

اسے تہ خانے کے سامنے کے حصے سے اٹھا کر جس پچھلے حصے میں لاکر پھینکا گیا تھا، وہ لوہے کی سلاخوں کے ذریعے کئی حصوں میں منقسم تھا اور وہ محسوس کرسکتا تھا کہ وہاں اسی کی طرح چند مزید لوگ بھی قید ہیں۔ وہ سارے قیدی اس سے دور تھے لیکن اس کی تیز حسیات ان کی موجودگی کو محسوس کرسکتی تھیں۔ وہ آنکھوں کو کھولنے کی زحمت کیے بغیر قید خانے کے کھردرے فرش پر خاموشی سے پڑا رہا لیکن اسے اس عیاشی سے بھی زیادہ دیر لطف اندوز نہیں ہونے دیا گیا۔ اپنے آس پاس ابھرنے والی کھٹ پٹ پر اسے آنکھیں کھول کر دیکھنا پڑا۔ وہ دو آدمی تھے جو لکڑی کے ایک مستطیل تختے کو اٹھا کر اندر لا رہے تھے۔ اس قدآدم تختے کو زمین پر بچھانے کے بعد انہوں نے اس کے فرش پر پڑے وجود کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور اس تختے پر لٹا کر پھرتی سے تختے کے ساتھ منسلک چرمی تسمے باندھنے لگے۔ تسموں کے بندھنے تک وہ درد کے ایک بحرِبے کراں سے گزر چکا تھا۔ اسے جس تختے پر لٹایا گیا تھا، اس پر لوہے کی بے شمار کیلیں اس طرح ٹھنکی ہوئی تھیں کہ اس کا بدن تختے پر منتقل کیے جاتے ہی ان کیلوں کے نکیلے سرے اس کی کھال کو چھیدتے ہوئے گوشت میں پیوست ہوگئے تھے۔ وہ دونوں آدمی تسمے باندھ کر پیچھے ہٹے ہی تھے کہ دیوہیکل حبشی نمودار ہوگیا۔ اسے تختے پر لیٹا دیکھ کر اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور قدم قدم چلتا عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

''تیری سخت جانی جلد میرے قہر کے آگے ایڑیاں رگڑتی نظر آئے گی اور تو خود اپنے منہ سے اعتراف کرے گا کہ تو امیر سالک کا بھیجا ہوا جاسوس ہے۔''

''تو مجھ سے ایک ایسی بات کا اعتراف کروانا چاہ رہا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ امیر سالک کا جاسوس ہونا تو دور کی بات، میں اس نام کے کسی شخص سے واقف بھی نہیں ہوں۔'' اس نے قطعیت سے خود پر لگائے جانے والے الزام کی تردید کی، جواب میں حبشی نے اسے اپنے قہر کا نمونہ دکھانے کے لیے اپنا دایاں پیر اس کے سینے پر رکھ کر دباؤ ڈالا۔ اس پیر کے دباؤ میں اس کے بھاری... بھرکم جسم کی ڈھیروں طاقت شامل تھی۔ ساشا کو بیک وقت دو عذابوں سے گزرنا پڑا۔ تختے پر ٹھنکی کیلوں کے سرے اس کے بدن میں کچھ اور گہرائی تک اتر گئے، ساتھ ہی بے تحاشا دباؤ سے سینے میں دم گھٹنے لگا۔

''مجھ پر جھوٹا الزام لگا کر تم جو قہر مجھ پر توڑ رہے ہو، اس کے جواب میں تمہیں سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' اپنی کراہوں کو روکتے ہوئے اس نے حبشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دعویٰ کیا۔ جواب میں اس نے اس کے سینے پر رکھا پیر اٹھا کر اس کے منہ پر ایک زوردار ٹھوکر لگائی اور غضب ناک لہجے میں بولا۔

''مجھے تیری یہ بک بک نہیں، تیرا اعتراف سننا ہے اور تجھے یہ اعتراف ہر حال میں کرنا ہوگا۔ چاہے تو اپنے دعوے میں سچا ہی ہو اور تیرا سچ مچ امیر سالک سے کوئی تعلق نہ ہو۔''

''تو میرے بدن سے روح تو کھینچ سکتا ہے لیکن میری زبان سے وہ نہیں کہلوا سکتا جو میں کہنا نہ چاہوں۔'' زبان پر خون کا نمکین ذائقہ محسوس کرتے ہوئے اس نے حبشی پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی اور ٹھوس یقین کے ساتھ دعویٰ کیا۔

''تو پھر جان لے کہ اس قید خانے سے آدمی کے جسم تو کیا، روح کو بھی آسانی سے نجات نہیں ملتی۔ تو مرنے کی آرزو میں تڑپتا رہ جائے گا لیکن موت بھی تجھے میرے قہر سے بچانے کے لیے یہاں قدم نہیں رکھ سکے گی۔'' اس نے ساشا کو ایک اور ٹھوکر رسید کی اور پیچھے ہٹ کر حکم کے منتظر کھڑے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر وہ فوراً حرکت میں آئے اور اپنی کمر کے ساتھ لٹکے کوڑے ہاتھ میں لے کر اسے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ لاکھ سخت جان سہی، تھا تو بہر حال گوشت پوست کا بنا انسان ہی، وہ بھی پچھلی مسافتوں سے نڈھال..... اس کی سخت جانی اس بے تحاشا ظلم و درندگی کے آگے جواب دے گئی اور اس نے اپنے دماغ کو اندھیروں کی یلغار میں پایا۔ اس اندھیرے نے کب اسے اپنی پناہ میں لے کر درد کے احساس سے نجات دلائی، اسے خبر بھی نہیں ہو سکی۔

☆☆☆

''سردار.....!'' وہ آنکھیں موندے بستر پر چپ چاپ لیٹا تھا کہ اپنے قریب سے ابھرنے والی نسوانی آواز پر چونک گیا۔

''مطربہ تم.....'' سر اور جسم کو سیاہ چادر سے ڈھانپے کھڑی لڑکی کو دیکھ کر وہ بے تحاشا چونکا اور بستر پر اٹھ بیٹھا۔

''بلا اجازت یوں اندر چلے آنے پر معافی چاہتی ہوں سردار!'' وہ صرف نام کی مطربہ نہیں تھی۔ اس کے لہجے کے لوچ میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ عام بات بھی کرتی تو لگتا کہ کوئی نغمہ چھیڑے بیٹھی ہے۔

''اتنے تکلف سے کیوں کام لے رہی ہو مطربہ! ہم بچپن کے ساتھی ہیں، ہمارے درمیان اس تکلف کی بھلا کیا گنجائش ہے۔''

''وہ بچپن بیت گیا جس میں، میں تمہیں ساشا کہہ کر پکارتی تھی۔ آج کی حقیقت یہ ہے کہ مجھ سمیت سب کو تمہیں سردار کہہ کر پکارنا ہوگا۔'' وہ چند قدم اور اس کے قریب چلی آئی۔

''وہ بچپن اتنی جلدی کیوں بیت گیا مطربہ..... کاش کہ وہ بچپن کبھی نہ بیتا ہوتا جس میں ماں کی ممتا کی خوشبو اور بابا کی شفقت کی چھاؤں تھی۔''

''کاش کے آگے ہمیشہ حقیقت کھڑی ہوتی ہے سردار اور حقیقت کو قبول کر لینے والے ہی اس دنیا میں سر اٹھا کر جی سکتے ہیں۔'' مطربہ کا لہجہ ناصحانہ تھا۔

''میں ماں کی موت کا غم بھول گیا تھا کہ اس وقت میرے پاس میرے بابا تھے۔ بابا گئے ہیں تو لگتا ہے مجھ سے ماں اور باپ دونوں بیک وقت چھن گئے ہیں اور میں اس دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں۔'' سردار امان کی موت اس کے لیے واقعی اتنا بڑا صدمہ تھا کہ وہ بری طرح بکھر کر رہ گیا تھا اور دنیا کے کاروبار سے اس کا دل قطعی اچاٹ ہو گیا تھا۔

''تنہا رہ جانا کوئی انہونی بات نہیں۔ انسان تنہا اس دنیا میں بھیجا ہی شاید اس لیے جاتا ہے کہ قدرت اسے اس کی ذات کی اہمیت جتانا چاہتی ہے۔ انسان کی اپنی ذات ہے تو سب کچھ ہے۔ آپ ہیں تو رشتے ناتے، دوست احباب، مال و دولت سب میسر آتے چلے جاتے ہیں لیکن پہلے انسان کو اپنا ہونا ثابت کرنا پڑتا ہے۔''

''میں تمہارا فلسفہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا تم مجھے یہ سمجھانے آئی ہو کہ مجھے اپنے بابا کی موت کا غم نہیں کرنا چاہیے؟'' اس کا لہجہ تھوڑا ترش ہوا۔

''نہیں، میں تمہیں یہ سمجھانے نہیں آئی۔ میں تمہیں یہ

سمجھانے آئی ہوں کہ تمہیں اس غم میں اتنا نہیں ڈوب جانا چاہیے کہ تمہاری اپنی ذات گم ہو جائے اور تم فراموش کر ڈالو کہ تمہارا بہت چاہنے والا باپ تمہارے سر پر سردار کی دستار رکھ کر گیا ہے اور ایک سردار کی ذات پر اپنے ذاتی غم کو منانے سے زیادہ دوسری ذمے داریاں واجب ہوتی ہیں۔'' اتنی دوٹوک بات کہتے ہوئے بھی اس کے لہجے کی نغمگی برقرار تھی اور شاید یہ اس نغمگی کا ہی کمال تھا کہ ساشا طیش میں آنے کے بجائے بے بس نظر آنے لگا۔

''تم مجھے بتاؤ مطربہ کہ میں کیا کروں؟'' اس نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کے نرم و نازک ہاتھ تھام کر یوں پوچھا جیسے وہ خود بھیڑ میں گم ہو جانے والا کوئی بچہ ہو۔

''ایک سردار کو یہ کوئی نہیں بتاتا کہ وہ کیا کرے، اگر بتائے تو یہ سردار کی شان کے خلاف ہوتا ہے۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتا سکتی ہوں کہ میری ساری خدمات تمہارے لیے وقف ہیں۔ تم اپنے دکھ، تھکن، پریشانیاں..... سب مجھ سے بانٹ سکتے ہو۔'' یہ سب کہتے کہتے مطربہ کا چہرہ جذبات کی شدت سے دہکنے لگا اور اس نے ساشا کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اپنا چہرہ اس کے گھٹنوں پر ٹکا دیا۔ اس کے اس انداز نے ساشا کو ٹھٹکا دیا۔ بچپن کی اس ساتھی سے بے تکلفی بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی اور وہ عرصے سے آتے جاتے ایک دوسرے سے دور سے ہی کلام کیا کرتے تھے پھر وہ کونسا جذبہ تھا جو رات کے اندھیرے میں مطربہ کو اس کی خلوت میں لے آیا تھا۔

''مجھے اپنی بچپن کی ساتھی کا یوں اپنے قدموں میں بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا۔ اٹھو..... اور یہاں اوپر بیٹھو۔'' مطربہ کے ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ اس نے ذرا سا زور لگا کر اسے اٹھایا تو وہ بے خودی کے عالم میں یوں اٹھ کھڑی ہوئی کہ اس کے جسم سے لپٹی سیاہ شال پھسل کر نیچے جا گری۔ شال کے نیچے اس نے سفید رنگ کا مہین شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا جس میں سے اس کا کندنی بدن جھلک دکھا رہا تھا۔ شاید سونے کے لیے بستر پر لیٹنے کے بعد اسے ساشا سے ملنے کا خیال آیا تھا اور وہ ایسے ہی خود کو چادر میں لپیٹ کر وہاں چلی آئی تھی۔

''مجھ میں تمہارے برابر بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے سردار! مجھے تمہارے قدموں میں جگہ ملی رہے تو میں اس میں بھی خوش رہوں گی۔'' وہ اپنے جسم کی حشر سامانی سے بے نیاز جذبات کی شدت سے خود بھی لرز رہی تھی اور اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

''مطربہ.....'' حیرت زدہ ساشا کے ہونٹوں سے اس کا نام پھسلا۔ رات کے اس پہر کونسا جذبہ مطربہ کو یہاں تک لے آیا تھا، اس پر واضح ہو چکا تھا۔

''میرے بارے میں غلط گمان نہ کرنا سردار! میں تمہارے قدموں میں اپنی جگہ سے زیادہ تم سے کچھ نہیں چاہتی لیکن یہ ضرور چاہتی ہوں کہ میرا سردار اب سردار لگنا چاہیے۔'' اس کی خوبصورت آنکھوں سے موتی جیسے آنسو لڑھک کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

''یہ قیمتی آنسو یوں خاک میں ملانے کے لیے نہیں ہیں مطربہ۔'' اس نے بے ساختہ ہی ہاتھ بڑھا کر اس کے رخساروں پر بہتے موتی اپنی انگلیوں پر چنے۔

''تو پھر وعدہ کرو کہ اپنے غم کو اپنے دل میں دفن کر کے پھر وہی ساشا بن جاؤ گے جس کے قدموں کی دھمک پر مطربہ کے دل کی دھڑکنیں رقص کرتی ہیں۔'' وہ کچھ اور کھلی۔

''وعدہ رہا۔ مطربہ کی آنکھوں میں حزن کے آنسو ہوں، میرا دل یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر سردار امان کی موت کے بعد پہلی بار مسکراہٹ چمکی۔ سچ تو یہ تھا کہ آج پہلی بار ہی کسی نے اسے یوں ہاتھ تھام کر غم کے دریا سے باہر کھینچنے کی کوشش کی تھی ورنہ اب تک تو وہ سوگواری میں ڈوبے چہروں اور تعزیتی کلمات کے درمیان ہی گھرا رہا تھا۔

''کنیز سردار کی اس عنایت پر شکر گزار ہے۔'' کمر کو خم دے کر اپنا سر اور شانے اس کے آگے جھکا کر وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر بولی تو اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ ساشا کو اس لمحے وہ اتنی پیاری لگی کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ساری شوخی بھول بھال کر عجیب سپردگی کی کیفیت میں اس کے سینے میں ایسے سمائی کہ اس کے دل کی دنیا زیر و زبر کر دی۔ مرد و زن کی فطری کشش نے سردار امان کی موت کا غم اڑنچھو کیا اور کچھ دیر قبل دنیا میں اپنے تنہا رہ جانے کا غم منانے والا انسان اس کے بدن کی مہک میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

''یہ کون ہے؟''

''ابوبکیٰ کا نیا شکار۔''

''بہت بے دردی سے پیٹا گیا ہے بیچارے کو۔''

''قیدیوں کے جسموں پر سجے زخم ابوبکیٰ کے لیے امیر سے اپنی وفاداری کی مہریں ہیں۔''

''امیر تو پہلے ہی ابوبکیٰ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا

ہے پھر اسے اپنی وفاداری کے ایسے ثبوت کیوں درکار ہوتے ہیں؟"

"امیر کے یقین کو پختہ کرنے کے لیے۔ اگر وہ ایسی حرکتیں نہ کرے تو امیر کو یقین کیسے آئے گا کہ ابوبکیٰ سے بڑھ کر اس کا کوئی وفادار و نمک حلال نہیں ہے۔"

"یہ ظلم ابوبکیٰ کو مہنگا بھی پڑ سکتا ہے۔ مظلوموں کی آہیں قدرت کی بے آواز لاٹھی کو حرکت میں لے آئیں تو اسے زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

"ظالم اس انداز میں سوچتا ہی کہاں ہے۔ ابوبکیٰ جیسے لوگ صرف اور صرف اپنے مفادات کے بارے میں سوچتے ہیں۔"

"یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا استادِ محترم! ابوبکیٰ تو اتنا مفاد پرست ہے کہ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، وہ وفاداری کی آڑ میں امیر کے ساتھ کوئی بھیانک کھیل کھیل رہا ہے اور ایک دن امیر کو کوئی شدید ترین نقصان پہنچا دے گا۔"

"شش..... آہستہ بولو بلکہ خاموش ہی رہو۔ ابوبکیٰ کو تمہارے ان خیالات کی بھنک بھی پڑ گئی تو یہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"واقعی..... یہ تو آپ نے بالکل درست فرمایا۔ اصل میں اس صورتِ حال پر دل کڑھتا رہتا ہے اس لیے آپ جیسے قابلِ اعتماد انسان کے سامنے اظہارِ خیال سے باز نہ رہ سکا۔"

"یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں اس لیے احتیاط ہر حال میں ضروری ہے۔" اس تنبیہ کے بعد ان دونوں افراد میں جاری گفتگو کا سلسلہ رک گیا اور بستر پر اوندھے منہ دراز ساشا نے کچھ ایسی آوازیں سنیں جس سے اسے اندازہ ہوا کہ ان دو میں سے ایک شخص وہاں سے رخصت ہو رہا ہے۔ اس نے آنکھوں میں ذرا سی جھری بنا کر اپنی نظر کی حد میں موجود اشیا کا جائزہ لیا۔ مختلف چھوٹے بڑے مرتبانوں اور طب سے متعلق چند آلات کو دیکھ کر اس کا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ وہ کسی مطب میں ہے۔ قید خانے میں بے ہوش ہونے کے بعد اسے اس جگہ کچھ دیر قبل ہی ہوش آیا تھا اور ہوش میں آتے ہی اس نے دو باتوں کو محسوس کیا تھا۔ ایک اپنے اردگرد پھیلی دواؤں کی بو، دوسرے بستر کے ساتھ منسلک چرمی تسموں سے بندھے اپنے ہاتھ پیر۔ اپنی بیدار مغزی کے باعث اس نے ہوش میں آجانے کے باوجود فوری طور پر اس بات کا اظہار کرنے کے بجائے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور دو افراد کے درمیان جاری اس کارآمد گفتگو کو سننے میں کامیاب رہا تھا۔ ابھی وہ اس گفتگو کے بارے میں غور و خوض کر ہی رہا تھا کہ اپنی جانب بڑھتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آنے والا اس کے قریب آ کھڑا ہوا اور اس کی ننگی پشت پر کسی ٹھنڈی اور نیم سیال شے کا لیپ کرنے لگا۔ جیسے جیسے وہ شے اس کی پشت پر پھیلتی جا رہی تھی، پشت پر جلن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر کار اس نے آنکھیں کھول دیں اور پشت پر یہ اذیت ناک لیپ کرنے والے شخص کی طرف گھور کر دیکھا۔

"اوہ..... تمہیں ہوش آ گیا۔" وہ ایک دبلا پتلا درمیانے قد کا بوڑھا تھا جس نے سفید چغہ نما لباس پہن رکھا تھا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ تھوڑا سا حیران نظر آتا تھا۔

"تم جس لعنتی شے کو میری پیٹھ پر مل رہے ہو، اس کی تکلیف سے تو قبر کا مردہ بھی اٹھ بیٹھتا۔" ساشا نے غصیلے لہجے میں اسے جواب دیا۔ اس شخص کے حق میں اچھا تھا کہ ساشا کے ہاتھ پیر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے، ورنہ شاید وہ اس کے ہاتھوں اپنی گردن تڑوا بیٹھتا۔

"یہ مرہم تمہارے زخموں کو ٹھیک کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سے تمہیں کچھ جلن تو ہوگی لیکن تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔" ساشا کے غصیلے لہجے کے مقابلے میں بوڑھے کا انداز نرم اور دھیما تھا۔

"کیا تم طبیب ہو؟" اس بار ساشا نے بھی قدرے نرم انداز اختیار کیا۔

"ہاں، میں طبیب ہوں اور حیران ہوں کہ تم اتنی جلدی ہوش میں کیسے آ گئے۔ میں نے تمہیں تکلیف سے بچانے کے لیے تمہارے حلق میں جڑی بوٹیوں کا جو عرق ٹپکایا تھا، اس کا اثر کئی گھنٹوں تک آدمی کو بے ہوش رکھتا ہے لیکن تم مقررہ وقت سے بہت پہلے ہوش میں آ گئے ہو۔" طبیب کچھ حیران نظر آتا تھا۔

"میں نے کہا نا کہ تم جو لعنتی شے میری پشت پر لگا رہے ہو، اس کی تکلیف سے تو قبر کا مردہ بھی اٹھ بیٹھے پھر بے ہوشی کا کیا ہے۔" ساشا نے جان بوجھ کر بے نیاز انداز اختیار کیا۔

"نہیں۔ وہ عرق اتنا معمولی اثر نہیں ہے۔ اس عرق کو پلا کر تو میں نے بعض مریضوں کی جراحی تک کی ہے۔ یقیناً تم میں ہی کچھ خاص بات ہے جو تم پر سے اس عرق کا اثر اتنی جلدی ختم ہو گیا ہے۔" طبیب اس کے نظر آنے والے آدھے رخ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"پہلے ابوبکیٰ مجھے کسی امیر سالک کا جاسوس قرار دے کر بے جرم وحشیوں کی طرح پٹوا چکا ہے، اب تم یہ نئی

بات کہہ کر مجھے کسی اور مشکل میں پھنسوادو۔''

''میں طبیب ہوں اور میرا کام لوگوں کو تکالیف سے نجات دلانا ہے۔تم میرا وحشیوں اور جنونیوں کے ساتھ تعلق نہیں جوڑ سکتے۔'' اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اسے ساشا کی بات اچھی نہیں لگی، یعنی اسے ابوبکیٰ اتنا سخت ناپسند تھا کہ وہ اس کے ساتھ معمولی سی بھی نسبت پسند نہیں کرتا تھا۔

''میں یہ تعلق جوڑنے پر مجبور ہوں کیونکہ تم مجھے ان وحشیوں اور جنونیوں کے درمیان ہی ملے ہو جنہوں نے ایک بے قصور مسافر کو اپنے فضول شک کے ہاتھوں ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔اگر تم ان سے مختلف ہوتے تو یہ جانتے ہوئے کہ میرے سینے اور پیٹ پر بھی کوڑے مارے جانے کے زخم ہیں، مجھے یوں اوندھا لٹا کر جانوروں کی طرح باندھ کر نہیں رکھتے۔'' وہ طبیب کو اندر تک کھنگال ڈالنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''مجھے افسوس ہے لیکن تمہاری پشت جتنی شدید زخمی ہے، تمہیں اوندھا لٹانے کے سوا کوئی حل ہی نہیں تھا۔رہی تمہاری بندشوں کی بات تو یہ مجبوری ہے۔قید خانے سے لائے جانے والے قیدی میرے سامنے اسی حال میں پیش کیے جاتے ہیں۔نہ میں ان کی بندشوں کو کھولنے کا مجاز ہوں اور نہ ان پہرے داروں کو ہٹانے کا جو قیدی کی یہاں موجودگی کی صورت میں مسلسل باہر موجود رہتے ہیں۔'' طبیب بھی عقل مند آدمی تھا۔اسے اپنی مجبوریاں گنوانے کے ساتھ ساتھ واضح کر دیا کہ اگر وہ یہاں سے فرار کی کوئی سوچ رکھتا ہے تو اسے کامیابی ملنا مشکل ہے۔

''کیا یہاں ایسا کوئی شخص نہیں ہے جس کے سامنے میں ابوبکیٰ کے ظلم کے خلاف شکایت کر سکوں؟'' اس نے یکدم ہی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

''ابوبکیٰ صرف امیر کو جواب دہ ہے اور امیر تک تمہاری رسائی نہیں ہو سکتی۔'' بوڑھے طبیب کی نظروں میں اس کے لیے ہمدردی تھی۔

''کیا امیر کو کبھی طبیب کی ضرورت پیش نہیں آتی؟'' ساشا نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔گفتگو میں مصروف ہو کر وہ اپنی پشت کی جلن فراموش کر چکا تھا اور طبیب کی ابوبکیٰ کے لیے ناپسندیدگی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''امیر کے سامنے ابوبکیٰ کے قیدیوں کے لیے سفارش پیش کرنے والے کی اپنی وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے۔'' طبیب نے اس سے نظریں چرالیں۔

''پھر تم خود کو ابوبکیٰ سے الگ نہ سمجھو۔ظلم پر خاموش رہنے والا بھی ظالم کا ساتھی ہی ہوتا ہے۔'' طبیب کو بھاری طعنے کی ضرب لگا کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ طبیب جس مزاج کا آدمی ہے، اسے یہ چوٹ سہنا بھی مشکل ہو جائے گا اور وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور سوچے گا۔

☆☆☆

''مجھے یقین تھا کہ اس مالا کے شایان شان بس یہی مقام ہو سکتا ہے۔'' فیروزی موتیوں کی اس بیش قیمت مالا کو مطربہ کی صراحی دار گردن میں اپنے ہاتھوں سے پہنا کر اس نے اس کے عریاں شانوں کو تھاما اور فخر سے بولا۔

''یہ میرے سردار کا حسنِ ظن ہے ورنہ میں تو اپنے سردار کے قدموں میں رہنے کو بھی اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں۔'' مطربہ نے اس کی پُرشوق نگاہوں کو اپنی گردن سے نیچے..... مزید نیچے اس مقام تک پھسلتے محسوس کیا جہاں مالا میں پرویا گیا سب سے مختلف شکل کا لمبوترا موتی ایک گہرائی میں گم ہو رہا تھا اور یقیناً موتی کے ساتھ ساتھ اس کی نظر بھی وہیں اٹک کر رہ گئی تھی۔

''تم جیسے گوہر نایاب قدموں میں نہیں، دل میں جگہ پاتے ہیں مطربہ۔'' اس نے مطربہ کی بات پر جذباتی ہو کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔

''یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں اپنے سردار کی نظروں میں یہ مقام رکھتی ہوں۔'' مطربہ کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

''میں اب تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا لینا چاہتا ہوں مطربہ! اس سے قبل کہ کوئی اور حکیم حاذق کے سامنے تمہارے لیے دستِ طلب دراز کرے، مجھے پہل کر دینی چاہیے۔'' ساشا کا لہجہ بھی جذبات سے بوجھل تھا۔

''چوری چھپے کی ان ادھوری ملاقاتوں سے میری سیرابی نہیں ہوتی۔تم یوں تھوڑی دیر کے لیے آ کر چلی جاتی ہو تو میرے دل کا صبر و قرار لٹ جاتا ہے۔''

''مجھے اپنے سردار کے جذبات کا احساس ہے لیکن سردار کی بھلائی کا سوچ کر ہی میں نے بابا سے بات کرنے سے فی الحال روک رکھا ہے۔سردار امان کو دنیا سے رخصت ہوئے ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ابھی تو عام لوگ بھی کسی خوشی کی تقریب کا نہیں سوچ سکتے، ایسے میں سردار امان کے بیٹے کا اپنی شادی کا ذکر چھیڑنا بہت معیوب سمجھا جائے گا۔نئے سردار کو اپنے لیے ایسی کسی ناپسندیدگی کا انتخاب کرنے سے بچنا چاہیے۔'' مطربہ نے اسے سمجھایا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں اپنے جذبات کا کیا

کروں؟'' اس نے مطربہ کو کچھ اور بھی شدت سے بھینچتے ہوئے اس کے وجود کی خوشبو اپنے اندر اتاری۔

''صبر.....'' وہ اس کی بات کے جواب میں شوخی سے کھلکھلا کر بولی، جواب میں اس نے اسے شکایتی نظروں سے گھورا تو فوراً سنجیدگی اختیار کر لی اور اپنے مخصوص گنگناتے سحر انگیز لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''سب کچھ رواج کے مطابق ترتیب سے چلے تو ہی بہتر ہوگا۔ بابا کی زبانی میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ نئے سردار کی پہلی کامیاب مہم کے بعد ایک جشن منانے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ اس جشن کے بعد سوگ ٹوٹ جائے گا اور ہر شخص کو اپنی خوشیاں منانے کی آزادی ہوگی۔ تمہیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''کب منایا جا رہا ہے یہ جشن.....؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''اس بارے میں تو مجھے علم نہیں ہے۔ یقیناً ہمارے بزرگ کسی حتمی تاریخ کے طے پا جانے کے بعد رسمی اجازت لینے کے لیے تم سے رجوع کریں گے۔''

''کاش وہ جلد از جلد مجھ سے رجوع کریں۔'' ساشا کے حسرت زدہ لہجے میں کہنے پر وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر شوخی سے بولی۔

''لوگ جب جشن منائیں گے سو منائیں گے، میں تو اپنے سردار کی کامیابی کا جشن آج اور ابھی منانا چاہتی ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''ایسے۔'' اس نے اپنے نم اور پُرحدت ہونٹ ساشا کے ہونٹوں پر رکھے لیکن پھر شرماتے ہوئے ثانیے بھر میں ہی جدا ہو کر قریب رکھا ایک پیمانہ اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ آتشیں سیال کا نشہ مطربہ کے حسن کے نشے سے مل کر دوبالا ہوا تو وہ ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے باپ کے سکھائے گئے بے شمار ہنر و اسباق پر حسین مطربہ کا پڑھایا گیا سبق عشق بھاری تھا۔ اس سبق کو پڑھتے ہوئے وہ اپنی زندگی بھی نچھاور کر سکتا تھا۔

☆☆☆

''تو تمہیں بھی ابوبکیؒ نے جاسوسی کے شک میں گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنوایا ہے؟'' وہ ایک بار پھر اسی قید خانے میں موجود تھا اور اوندھا لیٹا حالات پر غور کر رہا تھا کہ اپنے قریب سے سنائی دینے والی آواز پر چونکا۔ اس نیم تاریک قید خانے میں اسے سلاخ دار دیوار کے اس پار ایک شخص کھڑا دکھائی دیا۔

''بھی..... سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' اس نے اپنے پڑوسی قیدی کو دلچسپی سے دیکھا۔ پہلی بار یہاں لائے جانے پر اسے قید خانے میں کچھ مزید قیدیوں کی موجودگی کا احساس ہوا تھا لیکن اس کا پڑوس خالی تھا۔ آج یہ خالی پڑوس آباد ہو چکا تھا اور ایک شخص سلاخوں کو تھامے کھڑا اس سے مخاطب تھا۔

''یہ قید خانہ آئے دن ان قیدیوں کی چیخوں سے گونجتا رہتا ہے جنہیں ابوبکیٰ امیر سالک کا جاسوس ہونے کے شک میں یہاں بھجواتا ہے۔ میں بھی ان ہی قیدیوں میں سے ایک ہوں۔''

''کیا تم واقعی کوئی جاسوس ہو؟''

''ہرگز نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جاتا تو میں تم سے گفتگو کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔''

''بہت خوب! یعنی تم خود کو بے گناہ ثابت کر چکے ہو۔'' ساشا تھوڑی سی کوشش سے اٹھ کر اس کے قریب جا پہنچا۔

''ایسا بھی نہیں ہے۔ میں اب بھی زیر تفتیش ہوں لیکن زیر عتاب نہیں۔ زیر تفتیش قیدیوں کو وقفے وقفے سے آرام کے ایسے مواقع میسر آتے رہتے ہیں جن سے وہ گمان کرتا ہے کہ اب اس کے بُرے دن ٹل گئے ہیں لیکن پھر اچانک ہی کسی وقت اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔'' روشنی مناسب نہ ہونے کے باوجود ساشا نے اس کے دبلے پتلے کمزور چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ محسوس کر لی۔

''شاید یہ وقفے اس لیے دیے جاتے ہیں کہ زیر تفتیش ملزم کچھ بتائے بغیر موت سے دوچار نہ ہو جائے۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ اس قید خانے میں آنے کے بعد انسان موت کو زندگی سے بہتر سمجھنے لگتا ہے لیکن اسے خواہش کے باوجود مرنے بھی نہیں دیا جاتا۔'' نوجوان کے جواب نے ساشا کو سمجھا دیا کہ بے تحاشا تشدد کے بعد اسے علاج معالجے، آرام اور غذا کی جو سہولیات فراہم کی گئی تھیں، وہ نہ تو اس کی بے گناہی کی یقین دہانی تھیں، نہ صیاد کی رحم دلی۔ یہ بس ایک درمیانی وقفہ تھا جس میں اسے دوبارہ تشدد سہنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔

''کیا یہاں لائے جانے والے قیدیوں کو کسی عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا؟''

''عدالت.....'' نوجوان استہزائیہ ہنسا۔

''یہاں عدالت، قاضی، منصف..... سب کچھ ابوبکیٰ ہے اور ابوبکیٰ اتنا مغرور ہے کہ اگر کسی پر ایک بار کوئی الزام عائد کر دے تو دنیا بھر کے دلائل اور ثبوت پیش کیے جانے کے باوجود اسے بے گناہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے حکم پر

یہاں لائے جانے والے یا تو اپنا ناکردہ جرم تسلیم کر کے سزا پالیتے ہیں یا مرتے دم تک زیرِ تفتیش رہتے ہیں۔"

"مگر کوئی بے گناہ ہوتے ہوئے خود کو مجرم کیسے تسلیم کرسکتا ہے؟ میں تو ہرگز بھی ایسا نہ کروں گا۔" ساشا نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

"یسوع تم پر رحم کرے۔" نوجوان نے دعائیہ لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو؟ تم نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔" ساشا کی اس میں دلچسپی بڑھی۔

"میرا نام لوئیس ہے۔ غریب گھرانے کا فرد ہوں۔ بے روزگاری اور فاقوں سے گھبرا کر اپنے علاقے سے نکلا تھا کہ کسی امیر وغیرہ کی ملازمت اختیار کر کے اپنے حالات بہتر کروں گا لیکن یہاں آ کر ابوبکیٰ کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں امیر سالک کا بھیجا ہوا جاسوس ہوں جو یہاں ملازمت حاصل کر کے محل کے راز جاننا چاہتا ہے۔"

"یہ امیر سالک کون ہے؟"

"میں زیادہ نہیں جانتا۔ یہیں ساتھی قیدیوں سے معلوم ہوا ہے کہ وہ یہاں کے امیر کا چھوٹا بھائی ہے اور دونوں بھائیوں میں کسی خفیہ وجہ سے تنازعہ چل رہا ہے۔" اس نے جواب دیا پھر ساشا کی طرف تجسس سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تم کون ہو؟ میں نے تمہارے متعلق یہاں چند افواہیں سنی ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ اگرچہ تم خالی ہاتھ ہو لیکن گرفتاری کے وقت تمہارے جسم پر موجود قیمتی لباس اور دائیں ہاتھ میں موجود انگشتری سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ تم کوئی بہت صاحبِ حیثیت شخصیت ہو۔"

"میں نے ابوبکیٰ کو بتایا تھا کہ میں ایک تاجر ہوں۔" اس نے نوجوان لوئیس کو بھی اپنے بارے میں وہی سب کچھ بتایا جو اس سے قبل ابوبکیٰ کو بتا چکا تھا۔

"معاف کرنا..... تمہاری شخصیت تمہارے اس تعارف سے مطابقت نہیں رکھتی شاید اسی لیے ابوبکیٰ نے تمہاری بات تسلیم نہیں کی۔"

"شخصیت سے میں تاجر کے بجائے کیا محسوس ہوتا ہوں؟"

"تمہیں دیکھ کر کسی سپاہی کا خیال آتا ہے۔ تاجر تمہاری طرح اتنے مضبوط جسم اور اعصاب کے مالک نہیں ہوتے۔" لوئیس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میرے والد کی سوچ تھی کہ تاجر کو چونکہ دور دراز سفر اختیار کرنے ہوتے ہیں اور سفر میں ڈاکوؤں اور لٹیروں سے واسطہ پڑنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اس لیے تاجر کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ ان مصائب کا سامنا کر سکے۔ میری پرورش و تربیت میں انہوں نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی تھی۔" ساشا نے بہت اعتماد سے وضاحت پیش کی۔

"تمہارے والد یقیناً ایک دور اندیش انسان تھے لیکن کبھی کبھی تدبیر تقدیر کے آگے ہار بھی جاتی ہے۔ تمہارے تجارتی قافلے پر حملے سے لے کر تمہارا بھٹک کر اس طرف آ نکلنا اور پھر ابوبکیٰ کے چنگل میں پھنس جانا تقدیر کی کارگزاری نہیں تو اور کیا ہے۔" لوئیس نے ایک سرد آہ بھری۔ ساشا جواباً اس کی تائید میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سنائی دینے والی کھٹ پٹ نے اسے پلٹ کر اپنی جگہ جا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ لوئیس بھی تیزی سے پلٹ گیا۔ حسبِ توقع آنے والے اس قید خانے کے ملازمین ہی تھے۔ وہ قیدیوں کے لیے کھانا لے کر آئے تھے۔ وہاں مختلف قیدیوں کے لیے مختلف قسم کا کھانا ہوتا تھا۔ ساشا کو جو کھانا دیا گیا، اس میں سبزیوں پر مشتمل سالن اور چپاتیوں کے علاوہ یخنی بھی شامل تھی جس میں بکرے کے گوشت کے ریشے تیر رہے تھے۔ کھانا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اسے مقوی غذا کھلا کر جلد از جلد صحت یاب کرنے کی کوشش کی جارہی تھی تاکہ دوبارہ تختۂ مشق بنایا جاسکے۔

وہ دوبارہ تختۂ مشق بننے کا ارادہ تو نہیں رکھتا تھا لیکن اپنے ذاتی ارادوں کی تکمیل کے لیے جلد صحت یاب ضرور ہونا چاہتا تھا اس لیے خوب ڈٹ کر کھایا اور یخنی کا پورا پیالہ اپنے اندر انڈیل لیا۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد اس پر سستی طاری ہونے لگی تھی لیکن فوری طور پر سونے کے لیے لیٹنے کے بجائے اس نے ہلکی پھلکی چہل قدمی کر لینا مناسب سمجھا۔ چہل قدمی کے لیے جگہ بہت محدود تھی، وہ تین سے چار قدم ہی چلتا تو اس کا ایک چکر پورا ہو جاتا۔ دس پندرہ چکر لگانے کے بعد اس نے چہل قدمی کا یہ سلسلہ موقوف کر دیا۔ طبیب اسے مطلع کر چکا تھا کہ پشت کے زخموں کے مکمل طور پر بھرنے تک اسے احتیاط کرنی ہوگی۔ اس احتیاط میں پشت کے بل لیٹنے سے پرہیز کرنا سرفہرست تھا اس لیے وہ حسبِ سابق اوندھا لیٹ گیا۔ ابتدا میں وہ پہلو کے بل لیٹنے کی کوشش بھی کر چکا تھا لیکن دونوں پہلو مارے جانے والے کوڑوں سے زیادہ متاثر ہوئے تھے اس لیے اوندھا لیٹنا ہی سب سے کم تکلیف دہ تھا کہ جسم کے اس حصے پر ہی سب سے کم چوٹیں موجود تھیں۔

سونے کے لیے اسے کوئی آرام دہ بستر یا بچھونا فراہم نہیں کیا گیا تھا، بس ایک پتلی سی پیوند زدہ گودڑی تھی جسے نہ جانے کتنے برسوں سے بغیر دھوئے یونہی قیدیوں کو بطور بستر فراہم کیا جارہا تھا۔ اس گودڑی میں پتا نہیں کن اور کتنے بے گناہ اور گناہ گار انسانوں کے جسموں اور پسینوں کی بو بسی ہوئی تھی جو اوندھے لیٹے ساشا کی ناک میں براہِ راست گھسی جارہی تھی۔ لیکن وہ ساشا تھا..... نامساعد حالات میں بھی اپنی بقا کی جنگ لڑنے کا حوصلہ رکھنے والا ساشا..... چنانچہ اس بدبودار گودڑی پر بھی نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی۔ سونے سے قبل جو آخری خیال اس کے ذہن میں تھا، وہ ان چار افراد کے متعلق تھا جو اس کے تعاقب میں صحرا تک پہنچے تھے۔ ان میں سے تین کو تو اس نے ہلاک کردیا تھا لیکن چوتھے کو شدید زخمی حالت میں وہیں پڑا چھوڑ آیا تھا۔ اسے اس سلسلے میں کوئی خبر نہیں مل سکی تھی کہ وہ لاشیں یا کوئی زخمی ابوبکیٰ کے آدمیوں کو ملا تھا۔ اگر زخمی، زندہ حالت میں ابوبکیٰ کو مل جاتا تو اس کے متعلق بہت سے انکشافات کرسکتا تھا۔ یہ انکشافات یقینی طور پر اس کے لیے خطرناک ثابت ہوتے۔ وہ دل ہی دل میں اس وقت اپنے اندر پیدا ہوجانے والے جذبۂ ترحم کو کوستا ہوا سویا تھا۔

☆☆☆

وہ اسے اس کی خوشبو سے پہچان لیتا تھا۔ اب بھی اس کے اندر داخل ہوتے ہی اسے اس کی اپنے قریب موجودگی کا احساس ہوگیا لیکن ہمیشہ کی طرح اس کے استقبال کے لیے والہانہ اٹھ کھڑے ہونے کے بجائے جس زاویے سے لیٹا تھا، اسی زاویے پر آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ وہ درمیانی فاصلہ پاٹ کر اس کے اتنے قریب آگئی کہ وہ اس کے وجود کی خوشبو تو کیا، جسم کی حدت بھی محسوس کرسکتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے رخ نہ بدلا۔

''سردار.....'' آخرکار وہ اس کے رخسار پر اپنا ملائم ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پکاری۔

''کون..... کون ہے؟'' اس نے خوابیدہ لہجے میں اس کی پکار کا جواب دیا۔ اس کا لمس محسوس ہونے کے بعد وہ اپنے سونے کی اداکاری جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ اگر کوشش بھی کرتا تو یہ ایک ناقابلِ یقین بات ہوتی۔ سب جانتے تھے کہ سردار امان کی طرح اس کا بیٹا بھی سوتے ہوئے بھی ایک آنکھ کھلی رکھ کر سونے والوں میں سے تھا۔

''کیا مطربہ کے سوا بھی کوئی سردار کی خلوتوں کو مہکانے کے لیے آتا ہے؟'' اس کی موی انگلیاں اب ساشا کے بالوں میں گردش کررہی تھیں۔

''اگر تم اس طرح اتنے لمبے لمبے وقفوں سے آتی رہیں تو کوئی آ بھی سکتا ہے۔'' اس نے قدرے روٹھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا..... کون؟ کیا یہاں کوئی ایسی عورت ہے جو مطربہ کی برابری کرسکے؟'' اس کے حیرت کے اظہار میں بھی ایک ادا تھی۔

''جب جانتی ہو کہ کوئی نہیں ہے تو پھر اپنے لیے اتنا تڑپاتی کیوں ہو؟'' ساشا نے یکدم ہی اسے اپنے اوپر کھینچ لیا۔ مطربہ کی مہکتی سانسیں اس کی گرم سانسوں سے الجھنے لگیں۔

''صرف دو دن ہی تو نہیں آئی ہوں۔''

''تمہارے لیے یہ دو دن صرف ہوں گے۔ مجھے تو لگا کہ دو صدیاں بیت گئیں۔'' ساشا نے اس کی جھولتی لٹ کو آہستہ سے کھینچا۔

''ایسی بے قراری کا دعویٰ..... اور عالم یہ تھا کہ گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہے تھے۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''سو نہیں رہا تھا۔ تمہیں جتا رہا تھا کہ میں تم سے ناراض ہوں۔''

''سردار کی ناراضگی کنیز کی جان بھی لے سکتی ہے۔''

''مریں تمہارے دشمن۔ تمہیں تو میری آخری سانس تک میرے ساتھ رہنا ہے۔'' وہ گویا تڑپ اٹھا۔

''مجھے بھی اپنی ہر سانس تمہارے سنگ بتانے کی تمنا ہے لیکن مجبوریاں پاؤں پکڑ لیتی ہیں۔ تم خود بھی اس بات کو سمجھ سکتے ہو کہ رات کے اندھیرے میں یوں تم سے ملنے چلے آنا میرے لیے کتنا پُرخطر کام ہے۔''

''اسی لیے تو میں جلد از جلد تمہارا ہاتھ تمہارے بابا سے مانگ لینا چاہتا ہوں۔'' ساشا اپنے رومانی جذبات سے باہر آکر سنجیدہ ہوا اور بستر پر اٹھ بیٹھا۔

''بس اب دو ہی دن کی تو بات رہ گئی ہے۔ دو دن کے بعد جشن کی تقریب انجام پاجائے گی پھر تم بابا سے میرا ہاتھ مانگنے کے لیے آزاد ہوگے۔''

''اس جشن کے ساتھ اگر تمہارا ہاتھ مانگنا مشروط نہ ہوتا تو شاید میں اس جشن کے انعقاد سے انکار کردیتا۔ جب جب میں اس جشن کے بارے میں سوچتا ہوں، میرے اندر درد کی ایک لہر سی اٹھتی ہے اور دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ جشن میری اس سرداری کی خوشی میں منایا جانے والا ہے جو مجھے میرے بابا کو کھو کر ملی ہے۔'' وہ ایک بار پھر اس غم سے نڈھال نظر آرہا تھا جس نے سردار امان کی موت کے بعد

بہت شدت سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ مطربہ جس نے بے تحاشا کوشش سے اسے اس کیفیت سے نکالا تھا، اس کی یہ حالت دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے بے بس سی نظر آنے لگی لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی یہ بے بسی اس کی ساری محنت کو ضائع کردے گی چنانچہ ایک بار پھر پورے عزم سے اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھی اور اس کا مضبوط اور کھردرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے بولی۔

''میرا سردار ایک دانا باپ کا بیٹا ہے اور ورثے میں ملی دانائی کی روشنی میں یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ فطرت کے قوانین کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے بالآخر واپس جانا ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کا سوگ مسلسل جانے والے کو واپس تو نہیں لاسکتا لیکن اس کی روح کو بے قرار کردیتا ہے۔ جانے والوں کی روحیں صرف اس صورت میں شاد اور پرسکون رہ سکتی ہیں کہ وہ جنہیں اپنا وارث مقرر کر گئے ہیں، وہ اپنی ذمے داریاں پوری خوبی سے نبھائیں اور دنیا میں اپنے مقرر کردہ کردار کے مطابق اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کرتے چلے جائیں۔ یہ سرداری بھی تمہیں سردار کی طرف سے سونپا گیا ایک تحفہ اور ذمے داری ہے۔ اگر تم اسے کشادہ دلی سے قبول کر کے اس کے فرائض نہیں نبھاؤ گے تو سردار امان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔''

''میں بابا کی روح کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا لیکن کبھی کبھی میرے لیے یہ دکھ ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے کہ اب میرے بابا میرے پاس نہیں ہیں۔'' وہ جو بہت مضبوط اور بہادر تھا، صرف مطربہ کے سامنے ہی اپنا دل کھول کر رکھ سکتا تھا، سو کھول کر رکھ دیا تھا۔

''کیوں ساتھ نہیں ہیں.....؟ ایک بیٹا اپنے باپ کے وجود کا ہی تو حصہ ہوتا ہے۔ باپ اپنے بیٹے کے پور پور میں سمایا ہوا ہوتا ہے۔ بیٹے کے اعضاء، عادات، کردار..... سب باپ کا ورثہ ہوتے ہیں اور اس ورثے کی قدر کرنے والے بیٹے اپنے باپ کو ہر پل اپنے ساتھ محسوس کرسکتے ہیں۔'' اس کے دلائل میں جان تھی یا نہیں لیکن ساشا کو قائل کرنے کے لیے اس کی آواز کا لوچ اور ہاتھ کا لمس ہی کافی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی حزنیہ کیفیت سے باہر آنے لگا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اپنی اس غمگین کیفیت میں تمہیں ابھی تک سردار کی ان امانتوں کو بھی دیکھنے کا خیال نہیں آیا ہے جن کے بارے میں وہ قبل از مرگ تمہیں آگاہ کر گئے تھے۔'' اس کا مزاج بحال ہوتا دیکھ کر مطربہ نے اسے ایک اور حوالے سے ٹوکا۔

☆ جب ٹانگیں کھینچنے والے اچانک پاؤں دبانے لگ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ ساری دال ہی کالی ہے۔

☆ جس امت کو قبرستان سے گزرتے وقت مُردوں کو سلام کرنے کا حکم ہے، آج وہ اتنی بے حس ہوگئی ہے کہ زندہ لوگوں کو بھی بغیر مطلب کے سلام کرتی ہے، نہ ہی سلام کا جواب دیتی ہے۔

☆ کچھ لوگ ہوائی چپل کی طرح ہوتے ہیں۔ منہ پر تعریفیں کرتے ہیں مگر پیچھے سے کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔

☆ محبت کرنے والے انا کو توڑنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ مان رکھتے ہیں اور مان جاتے ہیں۔

☆ کبھی وقت ملے تو اپنے بوڑھے والدین کے چہروں کی طرف ضرور دیکھنا تاکہ تمہیں پتا چلے کہ تمہارا مستقبل بناتے بناتے وہ خود کتنا ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔

☆ جو لوگ آپ سے حسد کرتے ہیں، دراصل ان کو آپ کی خوبیوں کا زیادہ علم ہوتا ہے اور جو لوگ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی برائی کرتے ہیں، وہ آپ کی اچھائیوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور جو لوگ آپ کو ہارا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ سے کبھی نہیں جیت سکتے۔ اس لیے ہر اس شخص سے خوش رہیں، جو آپ سے ناخوش ہو۔

☆ لوگ دوسروں کی خامیوں کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ خود فرشتے ہوں۔

☆ انسان تب سمجھ دار نہیں ہوتا جب وہ بڑی بڑی باتیں کرنے لگ جائے بلکہ انسان سمجھ دار اس وقت ہوتا ہے، جب وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھنے لگ جائے۔

☆ بُرے وقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ انسان کو اچھا سبق سکھا کر رخصت ہوجاتا ہے۔

☆ آنسو ہر دل پر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ یہ صرف ان دلوں کو پگھلا سکتے ہیں جن میں رب بستا ہو۔

☆ انسان سب سے سستا محبت کے نام پر بکتا ہے اور سب سے مہنگی انسان کو محبت ہی پڑتی ہے۔

☆ شادی کے لیے کسی اچھے مذہبی گھرانے کی صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی کا انتخاب کریں تاکہ دین، آپ کی اگلی نسلوں تک منتقل ہوتا رہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدرآباد

''وہ سب کچھ بھلا کہاں بھاگا جارہا ہے۔ کبھی بھی دن جا کر دیکھ لوں گا۔'' ساشا کے انداز میں بے نیازی تھی۔

''اوپر والا میرے سردار کو ہزار برس کی زندگی دے لیکن وقت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا اور نہ ہی سب سردار امان کی طرح اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ زہریلا تیر کھا کر بھی اتنی مہلت پالیں کہ اپنی اولاد کو وصیت کر سکیں۔'' مطربہ نے اسے احساس دلایا تو وہ چونکا پھر اس کی طرف دیکھ کر شوخی سے بولا۔

''جشن والی رات سب مجھے تحفے پیش کریں گے لیکن میں اپنی سرداری کی خوشی میں اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کو اس راز میں شریک کر کے اسے ایک منفرد تحفہ دینا پسند کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میری طرح تم میرے رازوں کو بھی بہت اچھی طرح سنبھال لو گی۔ سنبھال لو گی نا.....؟''

اس نے شرماتی لجاتی مطربہ کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا گلابی پڑتا چہرہ اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

''کنیز اپنے سردار کے اعتماد پر پورا اترنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے کو بھی سستا سودا جانے گی۔'' وہ اس کے کان کے بالکل قریب گنگناتی سرگوشی میں بولی اور یکدم ہی اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔ ساشا کی باہیں فوراً ہی اس کو خود میں سمو لینے کے لیے حرکت میں آ گئیں۔ اس وقت وہ دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان تھا کہ محبوب کا دل، وجود اور وفائیں سب کچھ اسے حاصل تھا اور جسے اتنا کچھ حاصل ہو جائے، اسے کچھ بھی لاحاصل نہیں لگتا۔ ساشا کے قدموں تلے بھی ساری دنیا تھی۔

☆☆☆

نیند پوری ہونے سے قبل آنکھ کھلنے کا اس کے نزدیک یہ مطلب ہوتا تھا کہ ماحول میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس وقت اس کی آنکھ کھلی تو اگرچہ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی لیکن یونہی ادھ کھلے پڑے پڑے اس کی ساری حسیات کسی جانور کی طرح چوکنا ہو گئیں۔ جلد ہی اس نے جان لیا کہ اس کے پڑوسی لوئیس کے ساتھ کوئی موجود ہے اور اس سے سرگوشی میں گفتگو کر رہا ہے۔ ایک قیدی سے کسی کا خفیہ ملاقات کرنا خاصا معنی خیز تھا۔ تجسس نے ساشا کو اپنی سماعتیں پوری طرح سرگوشیوں میں جاری اس گفتگو کی طرف مرکوز کر لینے پر مجبور کر دیا۔

''تم سمجھ گئے ہو نا کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟''

''مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ میں اس کے بغیر بھی اپنے کام کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' بیزار لہجے میں یہ جواب دینے والا لوئیس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

''نقشے کے حصول کے بعد تمہیں امیر زادی کے ساتھ قصر سے نکلنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا لیکن امیر زادی کی خواب گاہ تک تمہاری رسائی اسی وقت ہو سکے گی جب تم نقشہ ہمارے حوالے کر دو گے۔''

''نہیں۔ میں یہ شرط قبول نہیں کر سکتا۔ نقشہ میں قصر کے خارجی راستے پر اسی وقت تمہارے حوالے کروں گا، جب میں اور امیر زادی گھوڑے کی پشت پر سوار ہو چکے ہوں گے۔'' لوئیس نے اس کی شرط ماننے سے انکار کر دیا۔

''ایسی صورت میں تم ہمیں دھوکا بھی دے سکتے ہو۔ عین ممکن ہے کہ امیر زادی کے ساتھ ساتھ تم نقشہ بھی لے کر فرار ہو جاؤ۔'' ساشا کے لیے لوئیس کے مخاطب کی آواز اجنبی نہیں تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ قید خانے کا حبشی نگراں رات کی تاریکی میں لوئیس سے یہ خفیہ مذاکرات کر رہا ہے۔ ان مذاکرات کے لیے وہ اس علاقے میں بولی جانے والی عام زبان کے بجائے ایک دوسری زبان استعمال کر رہے تھے لیکن ساشا کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ متعدد زبانوں سے واقف تھا۔ ان میں سے کچھ زبانیں اس نے اپنے اردگرد موجود مختلف النوع انسانوں سے سیکھی تھیں اور کچھ اس کے باپ نے اسے بطورِ خاص سکھائی تھیں۔

''مجھے صرف امیر زادی سے غرض ہے۔ نقشہ میرے لیے ایک بیکار شے ہے۔ میں اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔''

''لیکن امیر سالک یا ہمارے کسی دوسرے مخالف تک تو پہنچا سکتے ہو۔'' حبشی اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''میرے لیے سب کچھ امیر زادی کا ساتھ ہے۔ کسی دوسرے چکر میں پڑ کر میں انہیں کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ یوں بھی میں جانتا ہوں کہ تم لوگ اتنے کمزور نہیں ہو کہ مجھے نقشے سمیت فرار کا موقع دے دو گے۔ ایسی کسی جسارت کا نتیجہ مجھے اپنے جسم میں اتر جانے والے تیروں کی صورت میں بھگتنا ہو گا۔''

''یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں اس بات کا احساس ہے لیکن تم اتنے محتاط کیوں ہو؟ تمہیں ہم پر بھروسا کرنا چاہیے اور نقشہ پہلے ہی ہمارے حوالے کر دینا چاہیے۔ خارجی راستے پر اس تبادلے کی صورت میں کوئی اتفاقی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے اور ابوبکیٰ نقشے کو اپنی رسائی میں دیکھنے کے لیے سخت بے قرار ہیں۔'' حبشی، لوئیس کو آمادہ کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

''محتاط رہنا میری مجبوری ہے۔ میں محلاتی سازشوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تم لوگوں پر الزام نہیں لگا رہا لیکن ہونے کو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نقشہ حاصل کرنے کے بعد تم مجھے قصر سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہ دو اور مجھے فرار کی کوشش میں ناکام بنانے کے بہانے مار دیا جائے۔'' لوئیس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''اس طرح شک کا اظہار کر کے تم ابویکیٰ کی توہین کر رہے ہو۔'' ساشا کی سماعتوں سے حبشی کی برہم آواز ٹکرائی۔

''میں صرف اپنے مفادات کی حفاظت کا انتظام کر رہا ہوں اور یہ میرا حق ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے میں نے گرفتاری، قید اور تشدد کے کڑے مراحل طے کیے ہیں۔ نقشے تک رسائی میرے لیے سہل ہی سہی لیکن اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ میں کسی کی نظروں میں آجاؤں۔ ایسی صورت میں صرف اور صرف دردناک موت ہی میرا مقدر ہوگی اس لیے تم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ میری شرط مانے بغیر تم مجھ سے کوئی کام نہیں لے سکتے۔'' لوئیس کا انداز حتمی تھا۔

''مجھے ابویکیٰ کو آگاہ کرنا ہوگا۔'' حبشی بے بس سا محسوس ہونے لگا۔

''جو کرنا ہے جلدی کرو۔ دیر کرنے میں مجھ سے زیادہ ابویکیٰ کا نقصان ہے میری معلومات کے مطابق اب دو تین راتوں سے زیادہ کی مہلت باقی نہیں رہی ہے۔''

''میں ابویکیٰ کو پیغام بھجواتا ہوں۔'' ایسا لگا کہ حبشی، لوئیس کے پاس سے واپس جانے لگا ہے لیکن پھر وہ واپس پلٹا اور بولا۔

''میں نے تمہیں ساشا نامی اس قیدی کو کریدنے کی ذمے داری سونپی تھی۔ تمہیں اس سلسلے میں کوئی کامیابی حاصل ہوئی یا نہیں؟''

''وہ مجھے ذہین انسان معلوم ہوتا ہے۔ اس نے مجھے اس سے زیادہ ایک لفظ نہیں بتایا جو پہلے ہی ابویکیٰ کو بتا چکا ہے۔'' لوئیس اور حبشی نگراں کی گفتگو کے اس حصے نے ساشا کے وجود میں نفرت کی ایک لہر دوڑا دی۔ وہ جو خود کو اس کی طرح مظلوم ظاہر کرتا رہا تھا، اصل میں اس کے خلاف جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ سامنے آکر بہادری سے مقابلہ کرنے والے دشمن کے مقابلے میں اس کے نزدیک اس طرح دھوکا دینے اور سازشوں کے جال بُننے والے کردار زیادہ قابلِ نفرت تھے اور اب لوئیس کو اس کی نفرت سہنا تھی۔ کیسے؟ یہ سوچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ایک حتمی فیصلے پر پہنچ کر وہ مطمئن ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ پہلے کی طرح بدبودار گودڑی پر مزے سے گہری نیند سو رہا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد اسے حسبِ توقع طبیب کے پاس بھجوا دیا گیا۔ اس موقع پر اس کی آنکھوں پر حسبِ معمول پٹی باندھی گئی تھی۔ پٹی باندھنے والے نہیں جانتے تھے کہ وہ بصارت کو چھوڑ کر اپنی باقی تمام حسیات کو استعمال کر کے تہ خانے میں قائم قید خانے سے لے کر قصر ہی کے ایک حصے میں قائم شفاخانے (مطب) تک کا پورا راستہ ازبر کر چکا ہے۔ راستوں کو ازبر کرنے کی یہ عادت بالکل ان چوہوں کی سی تھی جو بظاہر بے مقصد اپنے بل کے آس پاس کے علاقے میں مسلسل گردش کرتے رہتے ہیں اور پھر مشکل وقت میں یہی عادت انہیں بچاؤ میں مدد دیتی ہے کیونکہ وہ کسی اور کے مقابلے میں راستوں سے زیادہ اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ ساشا کو بھی اس کے باپ نے جو بات سب سے زیادہ ذہن نشین کروائی تھی، وہ تھی ''آگاہ'' رہنا۔ اس آگاہی میں زبان دانی، فنونِ حرب اور روزمرہ کے معمولی کاموں سے لے کر وہ سب کچھ شامل تھا جو انسان کے مشاہدے میں آتا ہے۔

''تمہارے زخم بہت تیزی سے بہتر ہو رہے ہیں۔'' مطب میں طبیب نے اس کے زخموں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی رائے دی تو اس کے لہجے میں ستائش تھی۔

''یہ یقیناً تمہاری باکمال دواؤں کا اثر ہے۔'' ساشا آگاہ تھا کہ تعریف وہ ہتھیار ہے جو اتنی خاموشی سے سامنے والے کو زیر کرلیتا ہے کہ خود اسے بھی اپنے زیر ہونے کا علم نہیں ہو پاتا۔

''میری دواؤں کے باکمال ہونے کا امیر سے لے کر ان کے مصاحب تک سب اعتراف کرتے ہیں لیکن میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ ہر دوا ہر شخص پر ایک جیسے اثرات مرتب نہیں کرتی۔ کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے اور تمہارے معاملے میں یہ فرق بہت زیادہ واضح ہے۔ میں عرصے سے قیدیوں کے زخموں کا علاج کر رہا ہوں لیکن میں نے تم جتنی برق رفتاری سے کسی کے اتنے گہرے زخموں کو مندمل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' طبیب کے لہجے کی ستائش برقرار تھی۔

''پھر تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ بنانے والے نے ہی مجھے اس خوبی کے ساتھ بنایا ہے۔'' ساشا نے زیرِلب مسکراتے ہوئے طبیب کو عاجزی سے جواب دیا۔ وہ اس کی حیرت دور کرنے کے لیے اسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس

کی قوتِ مدافعت بڑھانے کے لیے اسے بچپن سے ہی ایسی جڑی بوٹیوں کا عرق پلایا جاتا رہا ہے جن کی کڑواہٹ کا مقابلہ شاید ہی دنیا کی کوئی کڑوی شے کر سکے۔

''تمہارے زخموں کو اتنی تیزی سے بھرتے دیکھ کر جہاں مجھے حیرت ہے، وہیں افسوس بھی ہو رہا ہے۔ زخموں کے جلدی بھرنے کا مطلب ہے کہ تم بہت جلد دوبارہ زیرِعتاب آنے والے ہو۔'' طبیب اس کی پشت پر مرہم کا لیپ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''شاید مجھے تھوڑی مہلت مل جائے۔ ابوبکیٰ اور اس کے حواری جس نئے فتنے کو کھڑا کرنے والے ہیں، اس کے شور وغل میں کسی کا مجھ جیسے معمولی شخص کی طرف دھیان جانا مشکل ہے۔'' اس نے سرسری لہجے میں طبیب کو وہ اطلاع منتقل کی جسے پہنچانے کا فیصلہ وہ رات ہی کر چکا تھا۔

''کیا مطلب..... کیسا فتنہ؟'' حسبِ توقع طبیب چونک گیا اور مرہم لگانا بھول کر اس سے پوچھنے لگا۔

''عنقریب ایک قیدی، قید خانے سے فرار ہونے والا ہے۔ وہ قیدی تنہا فرار نہیں ہوگا۔ امیر کی عزت بھی اس کے ساتھ ہی قصر سے رخصت ہوگی۔'' اس نے سرگوشی میں طبیب کو آگاہ کیا۔

''یہ کیا بک رہے ہو تم..... کہیں کسی چوٹ نے تمہارے دماغ کو تو نہیں الٹ دیا ہے؟'' طبیب نے اضطراری کیفیت میں اس کے زخموں کا خیال کیے بغیر اس کے وجود کو جھنجوڑ ڈالا۔

''آواز نیچی رکھو۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اچھی طرح تم جانتے ہو کہ اس شفاخانے کے باہر جو پہریدار موجود ہیں وہ امیر سے زیادہ ابوبکیٰ کے وفادار ہیں۔'' ساشا نے اسے ٹوکا تو وہ ڈھیلا پڑ گیا اور پست لہجے میں بولا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، کیا اس کے پس منظر سے مجھے آگاہ کر سکتے ہو؟''

''پس منظر کا تو مجھے علم نہیں لیکن یہ جانتا ہوں کہ یہ کسی خاص نقشے کا معاملہ ہے جس کے حصول کے لیے ابوبکیٰ قیدی کے ساتھ سودے بازی کر رہا ہے۔'' اس نے ایک اور پتا پھینکا۔

''نقشہ.....'' طبیب کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بھی کسی نقشے کے بارے میں واقف ہے۔

''تم مجھے تفصیل سے آگاہ کرو کہ یہ سب باتیں کس طرح تمہارے علم میں آئیں؟'' اس نے کسی قدر کپکپاتی آواز میں اس سے مطالبہ کیا۔ ساشا دھیرے دھیرے اسے رات اپنی آنکھ کھلنے اور لوئیس وحبشی کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ طبیب، امیر کا وفادار ہے اور اس کے لیے طبیب کی وفاداری کا فائدہ اٹھا کر امیر تک رسائی حاصل کرنے کا یہ ایک نہایت عمدہ موقع تھا۔

''خوفناک..... بے حد خوفناک۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ابوبکیٰ اس حد تک چلا جائے گا۔'' ساری بات سن کر طبیب نے حیرت ونفرت کی ملی جلی کیفیت میں تبصرہ کیا۔ ساشا خاموش رہا۔ اسے طبیب کے تبصروں کے بجائے اس کے ردِعمل میں دلچسپی تھی۔ وہ اس حوالے سے طبیب سے کچھ پوچھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ طبیب فوراً چوکنا ہو گیا۔

''قیدی کی مرہم پٹی میں اور کتنا وقت لگے گا اے طبیب؟'' دروازے سے جھانک کر کھردرے لہجے میں سوال کرنے والا چوڑے چہرے کا مالک وہ شخص ان پہریداروں میں شامل تھا جو ساشا کو یہاں تک لے کر آئے تھے۔

''اس کے کچھ زخم بگڑنے لگے ہیں۔ ان زخموں کی دیکھ بھال کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہوگا۔ ایسا کرو کہ کسی کے ذریعے سلیمان کو پیغام بھجوا کر بلا لو۔ مجھے اس کی مدد درکار ہے۔'' طبیب کا چہرہ اس مداخلت پر بس پل بھر کے لیے ہی متغیر ہوا تھا پھر اس نے تیزی سے خود کو سنبھال کر پورے اعتماد سے پہریدار کو مطمئن کرنے کا انتظام کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں سلیمان کو پیغام بھجوا دیتا ہوں۔'' پہریدار دروازے پر سے غائب ہو گیا۔

''سلیمان میرا شاگرد اور نائب ہے اور میں اس پر بعینہٖ ویسا ہی اعتماد کر سکتا ہوں جیسا کہ خود اپنی ذات پر۔'' طبیب نے سرگوشی میں اسے آگاہ کیا اور ایک بار پھر اس کی پشت پر مرہم لگانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''کیا امیر کو اس سازش سے آگاہ کیا جائے گا؟'' ساشا نے طبیب سے دریافت کیا۔

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں لیکن پہلے میں سلیمان سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''

طبیب کے اس جواب کے بعد ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ سلیمان نامی وہ نوجوان جلد ہی وہاں پہنچ گیا۔ وہ درمیانی قامت اور مضبوط جسامت کا ایک خوش شکل انسان تھا جس کے چہرے پر موجود چھوٹی سی ڈاڑھی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر تھا کہ وہ ایک ذہین شخص ہے۔

''ہمارے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے سلیمان!

کی قوتِ مدافعت بڑھانے کے لیے اسے بچپن سے ہی ایسی جڑی بوٹیوں کا عرق پلایا جاتا رہا ہے جن کی کڑواہٹ کا مقابلہ شاید ہی دنیا کی کوئی کڑوی شے کر سکے۔

''تمہارے زخموں کو اتنی تیزی سے بھرتے دیکھ کر جہاں مجھے حیرت ہے، وہیں افسوس بھی ہو رہا ہے۔ زخموں کے جلدی بھرنے کا مطلب ہے کہ تم بہت جلد دوبارہ زیرِعتاب آنے والے ہو۔'' طبیب اس کی پشت پر مرہم کا لیپ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''شاید مجھے تھوڑی مہلت مل جائے۔ ابوبکیٰ اور اس کے حواری جس نئے فتنے کو کھڑا کرنے والے ہیں، اس کے شور وغل میں کسی کا مجھ جیسے معمولی شخص کی طرف دھیان جانا مشکل ہے۔'' اس نے سرسری لہجے میں طبیب کو وہ اطلاع منتقل کی جسے پہنچانے کا فیصلہ وہ رات ہی کر چکا تھا۔

''کیا مطلب..... کیسا فتنہ؟'' حسبِ توقع طبیب چونک گیا اور مرہم لگانا بھول کر اس سے پوچھنے لگا۔

''عنقریب ایک قیدی، قید خانے سے فرار ہونے والا ہے۔ وہ قیدی تنہا فرار نہیں ہوگا۔ امیر کی عزت بھی اس کے ساتھ ہی قصر سے رخصت ہوگی۔'' اس نے سرگوشی میں طبیب کو آگاہ کیا۔

''یہ کیا بک رہے ہو تم..... کہیں کسی چوٹ نے تمہارے دماغ کو تو نہیں الٹ دیا ہے؟'' طبیب نے اضطراری کیفیت میں اس کے زخموں کا خیال کیے بغیر اس کے وجود کو جھنجوڑ ڈالا۔

''آواز نیچی رکھو۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اچھی طرح تم جانتے ہو کہ اس شفاخانے کے باہر جو پہریدار موجود ہیں وہ امیر سے زیادہ ابوبکیٰ کے وفادار ہیں۔'' ساشا نے اسے ٹوکا تو وہ ڈھیلا پڑ گیا اور پست لہجے میں بولا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، کیا اس کے پس منظر سے مجھے آگاہ کر سکتے ہو؟''

''پس منظر کا تو مجھے علم نہیں لیکن یہ جانتا ہوں کہ یہ کسی خاص نقشے کا معاملہ ہے جس کے حصول کے لیے ابوبکیٰ قیدی کے ساتھ سودے بازی کر رہا ہے۔'' اس نے ایک اور پتا پھینکا۔

''نقشہ.....'' طبیب کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بھی کسی نقشے کے بارے میں واقف ہے۔

''تم مجھے تفصیل سے آگاہ کرو کہ یہ سب باتیں کس طرح تمہارے علم میں آئیں؟'' اس نے کسی قدر کپکپاتی آواز میں اس سے مطالبہ کیا۔ ساشا دھیرے دھیرے اسے رات اپنی آنکھ کھلنے اور لوئیس وحبشی کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ طبیب، امیر کا وفادار ہے اور اس کے لیے طبیب کی وفاداری کا فائدہ اٹھا کر امیر تک رسائی حاصل کرنے کا یہ ایک نہایت عمدہ موقع تھا۔

''خوفناک..... بے حد خوفناک۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ابوبکیٰ اس حد تک چلا جائے گا۔'' ساری بات سن کر طبیب نے حیرت ونفرت کی ملی جلی کیفیت میں تبصرہ کیا۔ ساشا خاموش رہا۔ اسے طبیب کے تبصروں کے بجائے اس کے ردِعمل میں دلچسپی تھی۔ وہ اس حوالے سے طبیب سے کچھ پوچھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ طبیب فوراً چوکنا ہو گیا۔

''قیدی کی مرہم پٹی میں اور کتنا وقت لگے گا اے طبیب؟'' دروازے سے جھانک کر کھردرے لہجے میں سوال کرنے والا چوڑے چہرے کا مالک وہ شخص ان پہریداروں میں شامل تھا جو ساشا کو یہاں تک لے کر آئے تھے۔

''اس کے کچھ زخم بگڑنے لگے ہیں۔ ان زخموں کی دیکھ بھال کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہوگا۔ ایسا کرو کہ کسی کے ذریعے سلیمان کو پیغام بھجوا کر بلا لو۔ مجھے اس کی مدد درکار ہے۔'' طبیب کا چہرہ اس مداخلت پر بس پل بھر کے لیے ہی متغیر ہوا تھا پھر اس نے تیزی سے خود کو سنبھال کر پورے اعتماد سے پہریدار کو مطمئن کرنے کا انتظام کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں سلیمان کو پیغام بھجوا دیتا ہوں۔'' پہریدار دروازے پر سے غائب ہو گیا۔

''سلیمان میرا شاگرد اور نائب ہے اور میں اس پر بعینہٖ ویسا ہی اعتماد کر سکتا ہوں جیسا کہ خود اپنی ذات پر۔'' طبیب نے سرگوشی میں اسے آگاہ کیا اور ایک بار پھر اس کی پشت پر مرہم لگانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''کیا امیر کو اس سازش سے آگاہ کیا جائے گا؟'' ساشا نے طبیب سے دریافت کیا۔

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں لیکن پہلے میں سلیمان سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''

طبیب کے اس جواب کے بعد ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ سلیمان نامی وہ نوجوان جلد ہی وہاں پہنچ گیا۔ وہ درمیانی قامت اور مضبوط جسامت کا ایک خوش شکل انسان تھا جس کے چہرے پر موجود چھوٹی سی ڈاڑھی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر تھا کہ وہ ایک ذہین شخص ہے۔

''ہمارے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے سلیمان!

میں چاہتا ہوں کہ تم اس جوان کی زبان سے وہ داستان سنو جس نے میرے ہوش اڑا دیے ہیں۔ تمہارے اس داستان سے آگاہ ہونے کے بعد ہم باہمی مشاورت سے کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔'' طبیب، سلیمان کو کوئی سوال کرنے کا موقع دیے بغیر اس کا بازو کھینچ کر ہیجانی لہجے میں بولا تاہم اس کی آواز بلند نہیں تھی اور اس نے خیال رکھا تھا کہ باہر موجود پہریدار اس کی بات نہ سن سکیں۔ اس کے اس انداز پر سلیمان نے تھوڑا سا الجھ کر اس کی طرف دیکھا اور شاید کوئی سوال کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن طبیب اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ بلی کی چال چلتا ہوا پہلے دروازے کی طرف گیا تھا اور آہستگی سے کنڈی بند کردی پھر اسی انداز سے چلتا ہوا کھڑکی تک پہنچا اور اس پر پڑے پردے کو بالکل معمولی سا سرکا کر باہر جھانکا۔ باہر جھانکنے کے بعد وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔

''مجھے وہ داستان سناؤ دوست جس نے میرے استادِ محترم کو اس قدر مضطرب کردیا ہے۔'' طبیب کی یہ حالت دیکھ کر سلیمان نے ایک گہری سانس لی اور ساشا سے مخاطب ہوا۔ ساشا کو خود بھی وقت کی کمی کا احساس تھا چنانچہ بغیر حیل وحجت کے ایک بار پھر ساری داستان اس کے گوش گزار کردی۔

''یا حیرت..... اس قدر دیدہ دلیری! کیا حبشی اور لوئیس کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ کوئی ان کی گفتگو سن لے گا؟'' سب سن کر سلیمان بھی ششدر رہ گیا۔

''ان کا خیال ہوگا کہ رات کے آخری پہر کوئی ان کی گفتگو نہیں سن سکے گا۔ دوسری احتیاط انہوں نے یہ برتی تھی کہ سرگوشیوں میں اور ایک ایسی زبان میں گفتگو کررہے تھے جو اس خطے میں عام نہیں ہے۔'' ساشا نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی۔

''تم کیسے وہ زبان سمجھ سکے؟'' سلیمان نے بال کی کھال ادھیڑی۔

''میں تاجر ہوں اور تجارت کے سلسلے میں اکثر دور دراز علاقوں کا سفر کرتا رہتا ہوں اس لیے میری بہت سی زبانوں سے واقفیت ہے۔'' ساشا نے وضاحت کی۔

''تمہاری دی اطلاع بہت اہم لیکن بے حد حساس ہے۔ صرف قیدی کے فرار یا نقشے کی چوری کا معاملہ ہوتا تو ہم براہِ راست امیر کو مطلع کرسکتے تھے لیکن یہاں امیر زادی کا بھی تذکرہ ہے اور لوئیس جس انداز میں انہیں اپنے ساتھ لے جانے کی بات کررہا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر زادی خود بھی.....'' سلیمان نے حدِ ادب کا خیال رکھتے ہوئے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا لیکن اس کے بغیر بھی بات واضح تھی۔

''ضروری نہیں ہے کہ امیر کو ان کے دختر والے معاملے سے آگاہ کیا جائے۔ ان تک لوئیس کے فرار اور مذکورہ نقشے کی چوری کے منصوبے کی اطلاع پہنچانا ہی کافی ہوگا۔ ابوبکیٰ کی سازش آشکار ہوگئی اور لوئیس گرفتار ہوگیا تو ان دونوں سے ساری سچائیاں خود ہی اگلوالی جائیں گی اور تم لوگوں پر ایسے کسی راز سے آگاہی کا بوجھ نہیں آئے گا جسے امیر اپنی عزت کے لیے خطرہ سمجھے۔'' ساشا نے مشورہ دیا۔

''ان حالات میں یہ ایک بہترین مشورہ ہے۔ میرا خیال ہے استادِ محترم آپ کو فوری طور پر امیر سے ملاقات کی درخواست بھیجنی چاہیے۔ مجھے شک ہے کہ سازشی اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں زیادہ تاخیر نہیں کریں گے۔ ہمیں یہ سوچ کر قدم اٹھانا چاہیے کہ آج کی رات ہی اس منصوبے پر عمل کیا جاسکتا ہے۔'' ساشا کی تائید کرتے ہوئے سلیمان نے طبیب کی طرف رخ کیا اور اسے سمجھانے لگا۔

''لیکن میں ملاقات کا سبب کیا بیان کروں گا؟ بے سبب ملاقات ابوبکیٰ کے جاسوسوں کو چوکنا کرسکتی ہے۔'' طبیب نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

''آپ کہہ سکتے ہیں کہ امیر نے آپ کو جس معجون کی تیاری کا حکم دیا تھا، وہ تیار ہوچکا ہے اور آپ امیر کو وہ معجون پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اس کے طریقۂ استعمال سے بھی آگاہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے ملاقات ضروری ہے۔'' سلیمان نے اسے راہ دکھائی۔

''لیکن ابھی معجون تیار نہیں ہوا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب آپ امیر کو ملاقات کی اصل وجہ سے آگاہ کریں گے تو انہیں آپ کی دروغ گوئی کا شکوہ نہ رہے گا۔''

''لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ امیر فوری طور پر ملاقات کا وقت نہ دیں۔ معجون کے مقابلے میں انہیں دوسرے اہم معاملات بھی درپیش ہوسکتے ہیں۔'' ساشا کو ملاقات کا بہانہ زیادہ مضبوط نہیں لگا تھا اس لیے اپنا اعتراض پیش کیا۔

''تم نہیں جانتے دوست..... امیر اس معجون کے لیے کس قدر بے قرار ہیں۔ وہ بہت جلد نئی شادی کرنے والے ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ شادی سے پہلے پہلے معجون ان کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔'' سلیمان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنی تجویز کے حق میں جو دلیل دی، اسے سمجھ کر ساشا کو قائل ہونا پڑا۔

''جو طے کرنا تھا، وہ طے ہوچکا۔ بہتر ہے اب میں

اس نوجوان کو قید خانے کی طرف روانہ کردوں ورنہ باہر موجود پہریدار مشکوک بھی ہوسکتے ہیں۔'' طبیب جو ایک بار پھر کھڑکی کا پردہ سرکا کر خاموشی سے باہر جھانک آیا تھا، اضطراب سے بولا تو سلیمان نے اس کے خیال کی تائید کی۔

''مجھے امید ہے کہ امیر کے سامنے میری اس خدمت کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔'' پہریداروں کو بلائے جانے سے قبل ساشا نے اپنا مدعا بیان کرنا ضروری سمجھا۔

''بے فکر رہو نوجوان..... تمہارے حوالے کے بغیر امیر کو اس سازش کی اطلاع دینا ممکن ہی نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ہم ابوبکیٰ کی طرح مطلب پرست اور خودغرض نہیں ہیں۔ تمہارے لیے تو یوں بھی پہلے ہی سے ہمارے دل میں ہمدردی کے جذبات ہیں۔'' طبیب نے اسے اطمینان دلایا۔ اس روز ساشا تہ خانے میں قائم قید خانے میں واپس لوٹا تو اسے قید خانے کی گھٹن اور تاریکی پہلے جیسی نہ لگی۔ قسمت کی یاوری اور اپنی فہم وفراست سے وہ اس قید خانے کی گھٹن زدہ تاریک فضا میں ایک روزن کھولنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

☆☆☆

ساشا نے اپنے سامنے رکھی قیمتی پوشاک کو نظر بھر کر دیکھا اور اس کے دل میں اداسی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ آج رات اس کی سرداری کا جشن منایا جارہا تھا اور اسے اس جشن میں یہ قیمتی پوشاک زیب تن کرنی تھی لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ وہ تب بھی خوش نہیں ہوا تھا جب سردار امان کی زندگی میں اس کے سر پر اس کی دستار رکھی گئی تھی۔ ایک بیٹا اپنے چاہنے والے باپ کی ابدی جدائی کے بدلے میں ملنے والی سرداری پر کیسے خوش ہوسکتا تھا لیکن دل کی کیفیت کے تحت دنیا کے دستور تو نہیں چلائے جاسکتے۔ کسی نہ کسی کو تو سردار امان کے بعد اس کی جگہ سنبھالنی ہی تھی تو پھر سردار کا بہادر اور باصلاحیت بیٹا ہی درست انتخاب تھا۔ یہ انتخاب سردار نے خود اپنی زندگی میں کیا تھا اور آج ایک جشن منعقد کرکے سردار امان کے اس فیصلے کی توثیق کی جارہی تھی۔ یہ جشن ایک طرح سے اعلانِ وفاداری بھی تھا۔ اس جشن کے ذریعے اسے بتایا جارہا تھا کہ اس کے لوگ اس کے سردار بننے پر خوش ہیں اور لوگوں کی خوشی کے لیے اسے اپنی اداسی کو چھپانا تھا۔

''اس جشن کے بعد میں حکیم حاذق سے مطربہ کا ہاتھ مانگ سکوں گا۔'' اداسی کی کیفیت کے دوران اس خیال نے اس کے ذہن کو چھوا تو اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر پوشاک کو اٹھالیا۔ اپنے جسم پر موجود عام لباس کو اتار کر قیمتی پوشاک زیب تن کرتے ہوئے اس کا ذہن اب مسلسل مطربہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ دو دن سے اس نے اسے اپنی جھلک نہیں دکھائی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس طرح وہ اس کی آتشِ شوق کو بھڑکا رہی ہے۔ وہ واقعی مطربہ کے لیے سخت بے چین تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی اور اتنی تیزی سے اس کے حواسوں پر چھائی تھی کہ اس کے بغیر رہنا ناممکن لگنے لگا تھا۔

''آج آؤ تو سہی..... تمہاری ساری شرارتوں کا گن گن کر بدلہ لوں گا۔'' وہ اب مطربہ کے تصور سے مخاطب تھا۔

''بس آج آخری رات ہوگی جب تم چھپ کر مجھ سے ملنے آؤ گی، اس کے بعد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنالوں گا۔'' تصور میں اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کرتا وہ داخلی راستے پر ہونے والی آہٹ پر چونک کر متوجہ ہوا۔

''کون ہے.....؟ اندر آجاؤ۔'' باہر ایک سائے کی موجودگی محسوس کرکے اس نے بہ آوازِ بلند حکم دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی پیامبر ہوگا جو اسے جشن میں شرکت کے لیے پہنچ جانے کا پیغام دینے آیا ہوگا۔

''سردار کی اجازت کا شکریہ۔'' اندر داخل ہونے والے نسوانی وجود نے اسے چونکا دیا۔ وہ حکیم حاذق کی کنیز تھی۔

''سب خیر تو ہے؟ تم اس وقت کیسے آئی ہو؟'' اس کی یہاں موجودگی اس کے لیے تعجب خیز تھی۔

''فی الحال تو خیر ہی ہے لیکن آنے والا وقت نئے سردار کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔'' وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھنا چاہتا ہوں؟'' ساشا کی تیوری پر بل پڑے۔

''میں آپ کے لیے ایک اہم اطلاع لے کر آئی ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی واضح ہوجائے گا۔''

''کیا مطربہ نے تمہیں یہ ذمے داری سونپی ہے؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''وقت کم ہے، بہتر ہوگا کہ آپ میری بات غور سے سنیں۔'' کنیز نے اس کے اندازے کی تصدیق یا تردید نہیں کی۔

''کہو..... میں سن رہا ہوں۔'' ساشا کی تیوری کے بل چڑھ گئے اور وہ پلٹ کر اپنی مسند پر جا بیٹھا۔

''میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آج کے جشن میں.....'' کنیز نے بھی مزید تمہید باندھے بغیر اسے وہ بات بتانا شروع کردی جسے بتانے کے لیے وہ یہاں تک آئی تھی۔

(جاری ہے)

''بے فکر رہو نوجوان..... تمہارے حوالے کے بغیر امیر کو اس سازش کی اطلاع دینا ممکن ہی نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ہم ابوبکیٰ کی طرح مطلب پرست اور خود غرض نہیں ہیں۔ تمہارے لیے تو یوں بھی پہلے ہی سے ہمارے دل میں ہمدردی کے جذبات ہیں۔'' طبیب نے اسے اطمینان دلایا۔ اس روز ساشا تہ خانے میں قائم قید خانے میں واپس لوٹا تو اسے قید خانے کی گھٹن اور تاریکی پہلے جیسی نہ لگی۔ قسمت کی یاوری اور اپنی فہم و فراست سے وہ اس قید خانے کی گھٹن زدہ تاریک فضا میں ایک روزن کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ساشا نے اپنے سامنے رکھی قیمتی پوشاک کو نظر بھر کر دیکھا اور اس کے دل میں اداسی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ آج رات اس کی سرداری کا جشن منایا جا رہا تھا اور اسے اس جشن میں یہ قیمتی پوشاک زیب تن کرنی تھی لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ وہ تب بھی خوش نہیں ہوا تھا جب سردار امان کی زندگی میں اس کے سر پر اس کی دستار رکھی گئی تھی۔ ایک بیٹا اپنے چاہنے والے باپ کی ابدی جدائی کے بدلے میں ملنے والی سرداری پر کیسے خوش ہو سکتا تھا لیکن دل کی کیفیت کے تحت دنیا کے دستور تو نہیں چلائے جا سکتے۔ کسی نہ کسی کو تو سردار امان کے بعد اس کی جگہ سنبھالنی ہی تھی تو پھر سردار کا بہادر اور باصلاحیت بیٹا ہی درست انتخاب تھا۔ یہ انتخاب سردار نے خود اپنی زندگی میں کیا تھا اور آج ایک جشن منعقد کر کے سردار امان کے اس فیصلے کی توثیق کی جا رہی تھی۔ یہ جشن ایک طرح سے اعلانِ وفاداری بھی تھا۔ اس جشن کے ذریعے اسے بتایا جا رہا تھا کہ اس کے لوگ اس کے سردار بننے پر خوش ہیں اور لوگوں کی خوشی کے لیے اسے اپنی اداسی کو چھپانا تھا۔

''اس جشن کے بعد میں حکیم حاذق سے مطربہ کا ہاتھ مانگ سکوں گا۔'' اداسی کی کیفیت کے دوران اس خیال نے اس کے ذہن کو چھوا تو اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر پوشاک کو اٹھا لیا۔ اپنے جسم پر

''آج آؤ تو سہی..... تمہاری ساری شرارتوں کا گن گن کر بدلہ لوں گا۔'' وہ اب مطربہ کے تصور سے مخاطب تھا۔

''بس آج آخری رات ہوگی جب تم چھپ کر مجھ سے ملنے آؤ گی، اس کے بعد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنا لوں گا۔'' تصور میں اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کرتا وہ داخلی راستے پر ہونے والی آہٹ پر چونک کر متوجہ ہوا۔

''کون ہے.....؟ اندر آ جاؤ۔'' باہر ایک سائے کی موجودگی محسوس کر کے اس نے بہ آوازِ بلند حکم دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی پیامبر ہوگا جو اسے جشن میں شرکت کے لیے پہنچ جانے کا پیغام دینے آیا ہوگا۔

''سردار کی اجازت کا شکریہ۔'' اندر داخل ہونے والے نسوانی وجود نے اسے چونکا دیا۔ وہ حکیم حاذق کی کنیز تھی۔

''سب خیر تو ہے؟ تم اس وقت کیسے آئی ہو؟'' اس کی یہاں موجودگی اس کے لیے تعجب خیز تھی۔

''فی الحال تو خیر ہی ہے لیکن آنے والا وقت نئے سردار کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھنا چاہتا ہوں؟'' ساشا کی تیوری پر بل پڑے۔

''میں آپ کے لیے ایک اہم اطلاع لے کر آئی ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی واضح ہو جائے گا۔''

''کیا مطربہ نے تمہیں یہ ذمے داری سونپی ہے؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''وقت کم ہے، بہتر ہوگا کہ آپ میری بات غور سے سنیں۔'' کنیز نے اس کے اندازے کی تصدیق یا تردید نہیں کی۔

''کہو..... میں سن رہا ہوں۔'' ساشا کی تیوری کے بل چڑھ گئے اور وہ پلٹ کر اپنی مسند پر جا بیٹھا۔

''میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آج کے جشن میں.....'' کنیز نے بھی مزید تمہید باندھے بغیر اسے وہ بات بتانا شروع کر دی جسے بتانے کے لیے وہ یہاں تک آئی تھی۔

(جاری ہے)

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مارچ 2020

نگران اعلیٰ

معراج رسول

www.pklibrary.com